اجرا: ۱۹۳۸ء　　بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ　　فون: 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد (۵۶)　　مارچ، اپریل ۱۹۹۴ء　　شمارہ (۳، ۴)

فی پرچہ: ۱۲ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ: ۲۵ ڈالر
زر سالانہ: ۵۰ روپے	پاکستان، برما، سیلون: ۱۵ ″
کتب خانوں سے: ۱۰۰ روپے	انگلستان: ۱۲ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

[illegible] پرنٹر پبلشر مغنی تبسم نے [illegible] پریس [illegible] حیدرآباد [illegible] سے طبع کروا کر
ادارۂ ادبیات اردو [illegible] سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

سب رس کے نئے رنگ روپ کو ہمارے قارئین اور قلم کاروں نے پسند کیا اس کی ہمیں خوشی ہے۔ ہم صوری خوبیوں کے ساتھ معنوی پہلو پر بھی توجہ دے رہے ہیں اور رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ کمپیوٹر کمپوزنگ اور آفسیٹ طباعت کی اپنی کچھ دشواریاں ہیں جن کی وجہ سے اس بار بھی ہم دو مہینوں کا مشترکہ شمارہ شائع کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان دشواریوں پر ہم جلد ہی قابو پالیں گے اور کوشش کریں گے کہ سب رس ماہ بہ ماہ پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرے۔

ہماری خواہش پر جناب اسامہ فاروقی صاحب نے مشہور روسی نقاد اور محقق محترمہ نتالیا پری گارینا کی تصنیف "غالب" کا روسی زبان سے ترجمہ کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اردو میں اس ترجمے کی اشاعت سے غالبیات میں اہم اضافہ ہوگا۔ اس کتاب کے ابواب بالاقساط ہم سب رس میں شائع کریں گے۔ پہلی قسط زیر نظر شمارے میں شائع کی جارہی ہے۔

حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کی ممتاز اور نامور شخصیتوں اور اداروں پر مضامین کا سلسلہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔ آئندہ جب حیدرآباد کی علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ لکھی جائے گی تو مورخ کے لیے یہ مضامین مفید اور اہم ماخذ ثابت ہوں گے۔

۲۱-۲۲ مارچ ۹۴ء کو یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے "دکنی کلچر کے چند پہلو" کے زیر عنوان ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں ممتاز اسکالروں اور دانش وروں نے مقالے پڑھے تھے۔ جولائی ۱۹۹۴ء میں سب رس کا خاص نمبر شائع کیا جائے گا جس میں یہ مقالے شائع کیے جائیں گے۔

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

(فارم ۴) قاعدہ نمبر (۸)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کا نام: ڈاکٹر [illegible]

قومیت: ہندوستانی

پتہ: ادارۂ ادبیات اردو ایوان اردو

نام و پتہ مالک: ادارۂ ادبیات اردو [illegible]

میں [illegible] تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم کی حد تک صحیح ہیں۔ دستخط [illegible]

تاریخ ۱۰ مارچ ۱۹۹۴ء

ابراہیم یوسف

اردو مثنویوں سے ماخوذ ڈرامے

انیسویں صدی میں جب پارسیوں نے تھیٹر کو کاروباری شکل دی اور یہ منافع بخش نظر آیا تو چھوٹی بڑی متعدد کمپنیاں قائم ہو گئیں جس سے ڈراموں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ معتبر ادیب اور شاعر تو اس طرف متوجہ نہیں ہوئے کہ ان کے نزدیک یہ شرفا کا فن نہیں تھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اسے اپنایا۔ یہ کمپنیوں کے مالکوں کے تنخواہ دار ملازم تھے اور منشی کہلاتے تھے۔ چوں کہ مالکان کمپنی ان سے برابر نئے ڈراموں کی فرمائش کرتے رہتے تھے اور انھیں مجبور کرتے تھے کہ وہ جلد از جلد ڈرامہ پیش کریں اور وہ مالک کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھے۔ ان ڈرامہ نگاروں کے لیے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ داستانوں اور مثنویوں سے استفادہ کریں۔ اس سے فائدہ یہ تھا کہ انھیں بنا بنایا پلاٹ مل جاتا تھا خواہ اس میں ڈرامائی عناصر کی کمی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ان میں پریوں، دیو اور جنات کے مافوق الفطرت کرداروں پریوں کے ذریعے رقص و سرود کی محفلیں سجانے میں آسانی ہوتی تھی۔ دیو اور جنات کے ذریعہ فوق الفطرت واقعات پیش کیے جا سکتے تھے جن میں عوام بہت دلچسپی لیتے تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ مثنویوں میں ہر موقع کے اشعار موجود تھے جن کو یہ ڈرامانگار جوں کا توں یا معمولی تبدیلی کے بعد اپنے ڈراموں میں بلا تکلف استعمال کر لیتے تھے۔ مثال کے طور پر جب زہرِ عشق کو مرزا نظیر بیگ نے ڈرامائی شکل دی تو اس مثنوی کے سو سے زیادہ اشعار اپنے ڈرامے میں استعمال کیے۔

جن مثنویوں کو بنیاد بنا کر ڈرامے لکھے گئے ہیں ان میں میر حسن کی سحرالبیان، دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم، نواب مرزا شوق کی زہرِ عشق، واجد علی شاہ کی دریائے تعشق، خواجہ اسد علی خاں لطق کی طلسمِ الفت اور نواب محبت خاں کی اسرارِ محبت خاص ہیں۔ آئیے اب ہم فرداً فرداً ان ڈراموں کا جائزہ لیں جو مثنویوں سے ماخوذ ہیں اور دیکھیں کہ ان مثنویوں کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا گیا۔

۱۔ معروف مثنویوں سے ماخوذ ڈرامے (سحرالبیان، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق)

سحرالبیان اردو کی سب سے مقبول اور مشہور مثنوی ہے جسے میر حسن نے ۱۱۹۹ء میں تصنیف کی۔ اس مثنوی کا قصہ مختصراً اس طرح ہے کہ "کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ"۔ وہ اولاد سے محروم تھا۔ بہت دعاؤں کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ ایک دن وہ چھت پر سو رہا تھا کہ ایک پری کا ادھر سے گزر ہوا اور وہ بے نظیر پر عاشق ہو گئی اور اسے اٹھا کر پرستان لے گئی۔ شہزادہ تنہائی سے پریشان رہنے لگا۔ پری نے اسے ایک اڑنے والا گھوڑا دیا کہ اس پر بیٹھ کر تفریح کیا کرے۔ ایک دن بے نظیر نے اپنا گھوڑا ایک باغ میں اتارا جہاں اس کی ملاقات بدر منیر سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ اب بے نظیر ہر روز بدر منیر سے ملنے جانے لگا۔ ایک دیو نے بے نظیر کو بدر منیر کے ساتھ دیکھ لیا اور اس کی چغلی پری سے کر دی۔ پری نے غصے میں آکر بے نظیر کو ایک کنویں میں قید کر دیا۔ جب بے نظیر کئی دن نہیں آیا تو بدر منیر پریشان رہنے لگی۔ وزیر زادی نجم النسا جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکلی۔ ایک دن وہ جنگل میں بیٹھی بین بجا رہی تھی کہ جنوں کا بادشاہ فیروز شاہ ادھر سے گزرا اور جوگن پر عاشق ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا اور پھر نجم النسا نے فیروز شاہ کی مدد سے بے نظیر کو آزاد کرایا۔ بدر منیر کی شادی بے نظیر سے اور نجم النسا کی فیروز شاہ سے ہو گئی۔

سحرالبیان کو آرام، رونق، ظریف، شیخ حافظ عبداللہ اور فقیر محمد شیخ نے ڈرامائی شکل دی۔ فقیر محمد شیخ نے ڈرامہ خود نہیں لکھا ہے بلکہ گجراتی رسم الخط سے اردو رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ باقی لوگوں کے لکھے ہوئے ڈراموں میں آرام کے ڈرامے کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے ڈرامے کی جس طرح تدبیر گری کی ہے دوسروں نے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے علاوہ آرام ہی کے مکالموں میں معمولی تبدیلی کرکے نئے ڈراموں کے خالق بن گئے۔ آرام نے اپنے ڈرامے کا نام "بے نظیر بدر منیر عرف نوطرز اردو" رکھا ہے لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم نامی اس کا نام " بے نظیر بدر منیر عرف تماشائے دل پذیر" لکھتے ہیں۔ یہ نام آرام کے ڈرامے کا نہیں بلکہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا ہے۔ آرام کے ڈرامے میں تین ایکٹ ہیں۔ پہلے میں چار، دوسرے میں تین اور تیسرے میں پانچ سین ہیں۔ آرام نے لاتعداد شعر سحرالبیان کے جوں کا توں استعمال کیے ہیں۔ بعض میں معمولی تبدیلیاں کرلی ہیں۔ مثلاً

میر حسن

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ	کیا کس نے ہے ایسا تعمیر باغ
ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ	ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ
غرض سب کو واں عالمِ خواب تھا	یہاں سب کو تو عالمِ خواب ہے
مگر جاگتا ایک مہتاب تھا	مگر جاگتا ایک مہتاب ہے

وغیرہ وغیرہ۔

پورا ڈراما منظوم ہے مگر آرام کا باقاعدہ شاعر ہونا مشکوک ہے اس لیے ان کے کہے ہوئے بہت سے شعر بحر سے خارج ہیں یا پھر ان میں دوسرے سقم موجود ہیں۔ آرام کی زبان پر دکنی زبان کے واضح اثرات ہیں اور بعض جگہ زبان اردو محاورے کے خلاف استعمال کی گئی ہے۔

آرام نے سحرالبیان کے قصّے میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔ سحرالبیان میں وزیرزادی نجم النسا بے نظیر کی تلاش میں جوگن بن کر نکلتی ہے مگر آرام نے بے نظیر کے ماں باپ اور بدر منیر کو بھی فقیرانہ لباس میں جنگلوں کی خاک چھنوادی اور بے نظیر کے ماں باپ کی بدر منیر سے جنگل میں ملاقات کرائی۔ آرام کی اس تبدیلی کی بظاہر یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ قصّے کے داستانی انداز کو ڈرامائی روپ دینا چاہتے تھے مگر ہمارے نزدیک اس میں انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ واقعات کے پیش کرنے میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ کوئی بھی سین وہ تاثر نہیں چھوڑتا جو ڈرامے کے لیے ضروری ہے۔ ہاں گانوں کے لیے ضرور مناسب مواقع پیدا کیے گئے۔ ایک غزل بہادر شاہ ظفر کی اور دو فارسی کی غزلیں بھی گائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی فرماتے ہیں کہ یہ ڈراما زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ اس ڈرامے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ بمبئی میں لکھا جانے والا یہ پہلا منظوم ڈراما ہے۔

گلزارِ نسیم، دیاشنکر نسیم کی معروف مثنوی ہے جسے انھوں نے ۱۸۳۸ء میں مکمل کیا۔ گلزارِ نسیم کا قصہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ نہال چند لاہوری کے مذہبِ عشق سے ماخوذ ہے جسے خود نہال چند لاہوری نے عزت اللہ بنگالی کی فارسی میں لکھی داستان سے ترجمہ کیا ہے۔ نسیم نے حسبِ ضرورت اصل قصّے میں معمولی تبدیلیاں کی ہیں۔ قصہ مختصراً اس طرح ہے:

بادشاہ زین الملوک کے یہاں پانچواں بیٹا یہ نحوست لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اگر باپ کی نظر بیٹے پر پڑ گئی تو باپ اندھا ہو جائے گا اور ایک روز باپ کی نظر بیٹے پر پڑ جاتی ہے اور وہ بینائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج اس پھول سے ممکن ہے جو بکاؤلی کے باغ میں لگا ہے۔ زین الملوک کے چاروں بیٹے اس پھول کو حاصل کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ پانچواں تاج

الملوک بھی اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چاروں بھائی راستے میں دلبر بیسوا سے جوئے میں سب کچھ ہار کر اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ تاج الملوک دلبر کی چالاکی کا پتہ لگا لیتا ہے اور اس کا توڑ کر کے اس کا سب کچھ جیت لیتا ہے اور واپس آنے کا وعدہ کر کے پھول کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے اور حمالہ دیونی کی مدد سے پھول حاصل کر لیتا ہے۔ حمالہ نے ایک انسان کی لڑکی کو پالا ہے جس کا نام محمودہ ہے۔ حمالہ اس کی شادی تاج الملوک سے کر دیتی ہے۔ تاج الملوک دلبر بیسوا کے پاس واپس آتا ہے۔ اپنے بھائیوں کو آزاد کراتا ہے اور باپ کے پاس روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں اس کی ملاقات بھائیوں سے ہوتی ہے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاج الملوک نے وہ پھول حاصل کر لیا ہے تو وہ جبراً اس سے پھول چھین لیتے ہیں اور باپ کے سامنے دعویٰ کرتے ہیں کہ پھول وہ لائے ہیں۔ بکاؤلی پھول کے چور کی تلاش میں نکلتی ہے اور زین الملوک کے دربار میں انسانی شکل میں رسوخ حاصل کر لیتی ہے۔ تاج الملوک حمالہ دیونی کی مدد سے ایک محل اور باغ تعمیر کراتا ہے اور اپنے باپ کی دعوت کرتا ہے۔ باپ دعوت میں آتا ہے۔ اب راز کھلتا ہے کہ پھول تاج الملوک لایا ہے اس کے بھائیوں نے نہیں۔ بکاؤلی تاج الملوک کی بہادری اور خوب صورتی پر عاشق ہو جاتی ہے اور اسے اپنے ساتھ پرستان لے جاتی ہے اور داد عیش دیتی ہے جب بکاؤلی کی ماں جمیلہ کو اس کا علم ہوتا ہے تو وہ بکاؤلی کو قید کر دیتی ہے اور تاج الملوک کو دریائے طلسم میں پھنکوا دیتی ہے اور وہ ایک طلسمی جنگل میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے ساتھ عجیب عجیب واقعات پیش آتے ہیں۔ ایک درخت کے جادوئی اجزا اس کے ہاتھ لگتے ہیں جن کی مدد سے وہ اس سے نکلتا اور روح افزا پری کو آزاد کراتا ہے اور پھر روح افزا پری کی سفارش پر جمیلہ بکاؤلی کی شادی تاج الملوک سے کر دیتی ہے۔ بکاؤلی راجہ اندر کے دربار کی رقاصہ بھی ہے۔ راجہ اندر کو جب بکاؤلی اور انسان کے تعلقات کا علم ہوتا ہے تو وہ بکاؤلی کو جلا کر پاک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بکاؤلی روز جلا کر پاک کی جاتی ہے اور جب وہ اس پر باز نہیں آتی تو راجہ اندر اسے نصف پتھر کی بنا کر ایک مندر میں قید کر دیتا ہے۔ تاج الملوک بکاؤلی کو تلاش کرتا ہوا اس مندر میں پہنچتا ہے اور بکاؤلی سے ملاقات کرتا ہے۔ اسی دوران وہاں کے راجہ کی لڑکی چتراوت تاج الملوک پر عاشق ہو جاتی ہے۔ جب تاج الملوک اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور چتراوت کو پتہ چلتا ہے کہ ہر روز رات میں ایک مندر میں جاتا ہے تو وہ مندر کو کھدوا دیتی ہے۔ اس جگہ سرسوں اگتی ہے جسے کسان کی بانجھ عورت کھاتی ہے اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جو بکاؤلی ہے۔ اس کے جوان ہونے پر تاج الملوک کی شادی بکاؤلی اور چتراوت سے ہو جاتی ہے۔

اردو ڈراما نگاروں کے لیے یہ قصّہ سب سے پُرکشش رہا ہے اور جتنے ڈرامے اسے بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں کسی اور پر نہیں۔ اگر ہم اس قصّے کو بغور دیکھیں تو پورا قصّہ واضح طور پر تین حصّوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ پہلا حصّہ ابتدا سے لے کر جمیلہ کے بکاؤلی کو قید کرنے اور تاج الملوک کو دریائے طلسم میں پھنکوانے تک، دوسرا حصّہ تاج الملوک کا دریائے طلسم میں پھینکے اور اس سے نکلنے تک اور تیسرا راجہ اندر کا بکاؤلی کو نصف پتھر بنا کر مندر میں قید کرنے سے اختتام تک۔ ڈراما نگاروں کے لیے پہلا اور تیسرا حصّہ پُرکشش رہا ہے اور دوسرے کو سب نے نظرانداز کر دیا ہے۔ پہلے حصّے پر آرام، حسینی میاں ظریف، حافظ عبداللہ، امیر جان ادا، اور مولوی الٰہی بخش ناری نے ڈرامے لکھے ہیں جب کہ تیسرے حصّے پر محمود میاں رونق، وناٹک پرشاد طالب، کریم الدین مراد اور مرزا نظیر بیگ کے ڈرامے ملتے ہیں۔

ڈراما نگاروں نے قصّے میں حسب ضرورت معمولی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً رونق کے ڈرامے سنگین بکاؤلی میں راجہ اندر بکاؤلی کو نصف پتھر کی بنا کر بارہ سال قید کی سزا دیتا ہے لیکن چار سال بعد خوش ہو کر سزا معاف کر دیتا ہے اور اس کی شادی تاج الملوک سے کرا دیتا ہے۔ وناٹک پرشاد طالب اور رونق کے ڈراموں میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ مولوی الٰہی بخش ناری کے ڈرامے کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قصّہ

گل بکاولی سچا قصہ ہے۔ اس سلسلے میں محمد یعقوب صاحب نے گلدستۂ حیرت معروف بہ تواریخ بکاولی، سید محمد اسماعیل نے تاریخ بکاولی میں، مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں، محمود نیازی نے تلمیحات میں، گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون " قصۂ گل بکاولی" میں اور حیات اللہ انصاری نے اپنے مضمون " اصلی گل بکاولی" میں بہت کچھ لکھا ہے۔ طلسم بکاولی ایکسپورنگ اسوسی ایشن بھی قائم کی گئی تھی اس نے بڑی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہ قصہ بالکل فرضی نہیں ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے دو ڈرامے ہیں ایک امیر جان ادا کا " ثمرۂ نیک و بد سلوک معروف بہ عشق بکاولی اور تاج الملوک"۔ اور دوسرا کریم الدین مراد کا "چترا بکاولی"۔ امیر جان ادا کا ڈراما قصے کے پہلے حصے سے متعلق ہے جب کہ مراد کا ڈراما قصے کے تیسرے حصے سے ہے۔ امیر جان حافظ عبداللہ کا بھی اس نام کا ڈراما موجود ہے اس لیے اس ڈرامے کو حافظ عبداللہ کا ہی ڈراما قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ صرف چند لفظی تبدیلیوں کے بعد اسے امیر جان ادا کے نام سے شائع کرا دیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں تین ایکٹ ہیں۔ پہلے ایکٹ میں آٹھ، دوسرے میں چار اور تیسرے میں چھ سین ہیں۔

ڈرامے میں دو غزلیں کسی مجید کی اور ایک غزل رونق کی ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کا وہ حصہ بھی شامل ہے جہاں پھول غائب ہونے پر پریشان ہو کر کہتی ہے:

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون + ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون

ڈرامے میں محمودہ اور حمادیونی ...... وغیرہ وغیرہ کے کردار خارج کر دیے گئے ہیں۔ ان کی جگہ ایک دیو جو بھوکا ہے اور تاج الملوک کو کھا جانا چاہتا ہے تاج الملوک کے یہ کہنے پر

یہ آگہی دیتا ہوں اس دم تجھے سلیمان نبی کی ہوں میں نسل سے

نہ اب دیر کر مجھ کو کھا لے شتاب کرے گا کہاں تک سوال و جواب

حضرت سلیمان کا نام سن کر ڈر جاتا ہے ایک دوسرے دیو کے ذریعہ تاج الملوک کو بکاولی کے باغ میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے تاج الملوک پھول چرا لیتا ہے۔ پھر تاج الملوک اور بکاولی کا ایک دوسرے پر عاشق ہونا، جمیلہ کا بکاولی کو قید کرنا تاج الملوک کو دریائے طلسم میں پھنکوا دینا، تاج الملوک کا روح افزا پری کو دیو کے چنگل سے آزاد کرانا اور روح افزا پری کی سفارش پر بکاولی اور تاج الملوک کی شادی ہونا پیش کیا گیا ہے۔

ڈرامے کی خوبی اسے ایکٹ اور سینوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اٹھارہ سینوں میں کوئی سین بھرتی کا نہیں سین اس تسلسل سے آتے ہیں کہ قصہ کہیں ٹھہرتا نہیں بلکہ برابر آگے چلتا رہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں داستانی انداز بھی نہیں ہے جو اس قسم کے دیگر ڈراموں میں در آیا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر " ثمرۂ نیک و بد سلوک معروف بہ عشق بکاولی و تاج الملوک"۔ انیسویں صدی کا اچھا ڈراما کہا جا سکتا ہے۔

"چترا بکاولی" کریم الدین مراد کا بہت ہی معروف اور مقبول ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب دادا بھائی ٹھوٹھی نے احسن لکھنوی کو ملازم رکھا تو یہی ڈراما انھیں دے کر کہا کہ وہ اس انداز کا ڈراما انھیں لکھ دیں اور انھوں نے چند اوراق لکھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا خیال ہے کہ یہ ڈراما رونق کے ڈرامے طلسم بکاولی سے ماخوذ ہے مگر ابو رونق کے ڈرامے کا کچھ حصہ بانٹ دیا گیا ہے اس کا کوئی تعلق مراد کے ڈرامے سے نہیں ہے۔ چترا بکاولی میں تین ایکٹ کا ڈراما ہے پہلے میں پانچ، دوسرے میں [illegible] اور تیسرے میں پانچ سین ہیں۔ [illegible]

راجہ اندر کو جب معلوم ہوتا ہے کہ بکاؤلی ایک انسان سے محبت کرتی ہے تو وہ غصے میں اسے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سبز پری راجہ اندر سے درخواست کرتی ہے کہ بکاؤلی ہماری سردار ہے اسے قتل نہ کیا جائے اگر سزا دینا ہی مقصود ہے تو:

سزا کوئی ایسی لکھی رہے کہ زندہ رہے اور جلتی رہے
یہ پوشاک جوتی بدلتی رہے تو پھر نوری سانچے میں ڈھلتی رہے

اس پر راجہ اندر اسے جلا کر خاک کرنے اور پھر زندہ کرکے دربار میں لانے کا حکم دیتا ہے۔ بکاؤلی روز جلائی جاتی ہے اس پر بھی وہ اپنے عشق سے باز نہیں آتی تو راجہ اندر اسے نصف پتھر کی بنا کر ایک مندر میں قید کر دیتا ہے۔ یہاں مراد نے ایک خوش گوار تبدیلی کی ہے۔ راجہ اندر اسے اصلی شکل میں آنے کی یہ شرط لگا دیتا ہے کہ جب اس کا معشوق کسی دوسری عورت کو ساتھ لا کر اس سے شادی کرنے کی اس سے اجازت چاہے گا اور یہ اجازت دے دے گی تو اپنی اصلی شکل میں آجائے گی۔ لیکن اگر اس نے یہ راز اپنے معشوق کو بتلا دیا تو وہ بھی پتھر کا ہو جائے گا۔ بکاؤلی کے غائب ہو جانے پر تاج الملوک اس کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ اسے کچھ جوگیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مندر یکایک نمودار ہو گیا اور اس کا دروازہ صرف رات میں کھلتا ہے۔ تاج الملوک رات میں اس مندر میں جاتا ہے اور وہاں اس کی ملاقات بکاؤلی سے ہوتی ہے۔ اب ہر رات وہ اس مندر میں جانے لگتا ہے۔ اسی دوران وہاں کے راجا کی لڑکی چترا، تاج الملوک پر عاشق ہو جاتی ہے۔ جب تاج الملوک اس کی طرف مائل نہیں ہوتا تو ایک دن وہ غصے میں کہتی ہے کہ تمھارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم چور ہو جواری ہو، مکار ہو۔ تاج الملوک ان الزامات سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے اگر وہ یہ الزامات ثابت کر دے تو وہ اس کا غلام بن کر رہے گا۔ چترا اسے بتلاتی ہے کہ اس نے بکاؤلی کے باغ سے پھول چرایا۔ اس لیے وہ چور ہے، دلبر بیسوا سے جوا کھیلا اس لیے جواری ہے، دلبر کی چونے میں چالاکی معلوم کرنے کے لیے اس کی نوکرانی کا بیٹا بنا اس لیے مکار ہے۔ یہ باتیں چترا کو ایک خط سے معلوم ہوئی تھیں جو تاج الملوک کے باپ نے چترا کے باپ کو لکھا تھا۔ تاج الملوک قائل ہو جاتا ہے۔ اب چترا اسے شادی کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ تاج الملوک، چترا کو بتلاتا ہے کہ وہ ایک دیوی کا پجاری ہے اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ دونوں مندر جاتے ہیں۔ تاج الملوک بکاؤلی سے چترا سے شادی کرنے کی اجازت چاہتا ہے جوں ہی بکاؤلی اجازت دیتی ہے مندر غائب ہو جاتا ہے اور بکاؤلی اپنی اصل شکل میں آجاتی ہے دونوں کی شادی تاج الملوک سے ہو جاتی ہے۔

چترا بکاؤلی انیسویں صدی کا نہ صرف مقبول ڈراما تھا بلکہ دوسرے ڈراما نگار اس کی تقلید کرتے تھے۔ مراد نے قصے میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے اس کے ڈرامائی حسن کو بہت بڑھا دیا ہے۔ چترا کی سہیلیوں کی نوک جھونک اور شوخیاں ڈرامے کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتی ہیں۔ مراد نے پولیس کے کالے کرتوتوں کو بھی بڑی جراءت سے پیش کیا ہے جو اس ڈرامے کا ایک اضافی وصف ہے اس ڈرامے کے گانوں کی مقبولیت کے بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں: "چترا بکاؤلی کے گانوں کی نمایاں خصوصیت ان کا سیدھا سادہ اور چلتا ہوا ترنم ہے اور یہ کبھی مناسب بحر کے انتخاب سے پیدا کیا گیا ہے کبھی مصرعوں کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اور ان موقعوں پر ترنم اور خوش آہنگی کی کیفیت کو ابھارنے میں ہم وزن اور ہم قافیہ الفاظ کو نمایاں دخل ہے۔" (کریم الدین مراد کے ڈرامے: مرتب سید امتیاز علی تاج: صفحہ ۱۵۳)۔ نثر کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "مکالموں میں استعمال ہونے والی نثر بھی سلیس اور سادہ ہے۔ جملوں کی ساخت میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے ہم وزن یا ہم قافیہ فقروں سے مدد لی گئی ہے۔ اس طرح نثر میں بھی نظم کا سا خوش گوار اور مترنم تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ سادگی کے علاوہ ان جملوں میں جا بجا زبان کا چٹخارہ میں ملتا ہے اور زبان کا لطف بھی۔" (کریم الدین مراد کے ڈرامے: مرتب سید امتیاز علی تاج۔ صفحہ ۱۵۲)۔

زہرِ عشق تصدق حسین خان معروف بہ نواب مرزا شوق کی بہت ہی مشہور مثنوی ہے ۔ عطاء اللہ پالوی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۷۲ھ اور ۱۲۷۹ھ کے درمیان بتلاتے ہیں جب کہ سید محمد عقیل رضوی ۱۲۷۹ھ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین اپنی تصنیف "اردو مثنوی شمالی ہند میں" حتمی طور پر ۱۲۷۷ھ لکھتے ہیں۔ اس مثنوی کا قصہ بہت مختصر ہے۔ ہیرو کا نام معلوم نہیں کیوں کہ شاعر نے خود اپنا قصہ بیان کیا ہے۔ ہیروئین کا نام ماہ جبیں ہے۔ ایک روز دونوں اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے موسم کا لطف اٹھا رہے تھے کہ نظریں چار ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کچھ دن بے چینی سے گزرتے ہیں۔ آخر ماہ جبیں ہیرو کو خط لکھتی ہے اور پھر ملاقاتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ کچھ دن بعد یکایک ماہ جبیں ملاقاتیں بند کر دیتی ہے۔ ہیرو پریشان ہو جاتا ہے۔ آخر نوچندی کا دن آتا ہے۔ ماہ جبیں اس بہانے درگاہ آتی ہے اور ہیرو سے ملاقات کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ ملاقاتوں کا پتہ چل گیا ہے اور اس پر پابندی لگا دی گئی اور :

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

اور یہ بھی بتلاتی ہے کہ اب اسے زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے اور زہر کھا کر خودکشی کر لے گی اور ہیرو کو کچھ ہدایات دیتی ہے۔ ہیرو اسے اس سخت اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ گھر جا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کے دفن سے آنے کے بعد ہیرو بھی زہر کھا لیتا ہے۔ تین دن اس کی حالت بہت خراب رہتی ہے۔ بے ہوشی کی حالت میں ایک دن ماہ جبیں خواب میں آتی ہے اور کہتی ہے میں نے تمہیں اس اقدام سے باز رہنے کو کہا تھا مگر تم نے اتنی جلد میری وصیت کو بھلا دیا۔ ہیرو ہوش میں آجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زہر کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ ہیرو صحت یاب ہو گیا ہے۔

زہرِ عشق کو بنیاد بنا کر لکھے گئے تین ڈراموں کا پتہ چلتا ہے۔ سب سے پہلے احسن لکھنوی نے ۱۸۶۷ء میں "دستاویزِ محبت" کے نام سے لکھا اور بقول ڈاکٹر نامی جب پہلی بار لکھنؤ میں کھیلا گیا تو تہلکہ مچ گیا۔ اس کے بعد مرزا نظیر بیگ نے ناٹک "ستم الفت معروف بہ نتیجۂ محبت" کے نام سے ۱۸۹۴ء میں پہلی بار لکھا اور پھر ۱۸۹۸ء میں اس میں ترمیم و تنسیخ کی۔ آخر میں دل لکھنوی نے ۱۹۲۹ء میں زہرِ عشق عرف شہیدِ حسرت کے نام سے لکھا۔ احسن لکھنوی کا ڈراما زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ دل لکھنوی کا دستیاب نہیں ہے یا کم از کم مجھے نہ مل سکا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر مرزا نظیر کا ۱۸۹۸ء کا نسخہ ہے۔ ہیروئین کا نام تو ماہ جبیں ہی ہے لیکن ہیرو کا نام دل حزیں رکھا گیا ہے۔ دل حزیں مسئلے، عشق کا قائل نہیں اس مسئلے پر وہ اپنے دوستوں سے بحث کرتا رہتا ہے۔ آخر ایک دن عشق مجسم ہو کر انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور دل حزیں کو عشق کی طاقت بتلانا چاہتا ہے۔ ڈرامے میں عشق کا کردار یونانی دیوتا کیوپڈ سے ملتا جلتا ہے جو دو دلوں میں محبت کی جوت جلاتا رہتا ہے۔ چناں چہ ایک خوش گوار موسم میں مہ جبیں اور دلِ حزیں بام پر موسم کا لطف اٹھا رہے ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے پر نظر پڑتی ہے اور عشق اپنا تیر چلا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ سب واقعات پیش آتے ہیں جو مثنوی زہرِ عشق میں واقع ہوتے ہیں اور انجام مہ جبیں کی خودکشی پر ہوتا ہے۔ مرزا نظیر بیگ نے ایک کردار شیخ بے ڈھنگ کا شامل کر دیا ہے جو دو بیویوں کے شوہر ہیں۔ یہ کردار صرف مزاح پیدا کرنے کے لیے ہے جس سے ڈرامے کے حزنیہ ماحول پر منفی اثر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ مہ جبیں کی قبر پر آسمان سے ایک پری اترتی ہے اور مہ جبیں قبر میں سے دل حزیں کو نصیحت کرتی ہے۔ مثنوی میں یہ نصیحت مہ جبیں نے خواب میں آکر کی ہے۔ پری کا آسمان سے اترنا اور قبر میں سے آواز آنا تماشائیوں کے ذوق کی تسکین کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ عشق نامی کردار نے بھی کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا ہے بلکہ اس کے موقع بے موقع وارد ہونے سے کہانی کے فطری بہاؤ میں جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ مرزا نظیر بیگ نے لاتعداد اشعار مثنوی کے جوں کے توں

استعمال کر لیے ہیں۔ گیتوں، ٹھمریوں اور غزلوں کا مناسب موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ راگ، راگنیوں اور دھنوں میں تنوع ہے۔ مرزا نظیر بیگ نے غیر ضروری تبدیلیاں کر کے اس کلاسیکل ٹریجڈی کا حلیہ ہی بدل دیا ہے۔

ب۔ دیگر مثنویوں سے ماخوذ ڈرامے۔ (اسرار محبت، طلسم الفت، دریائے تعشق وغیرہ)

اسرار محبت، نواب محبت خاں محبت نے اپنے دوست مسٹر جانسن کی فرمائش پر ۱۱۹۷ء میں تصنیف کی۔ نواب محبت خاں، حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے تھے۔ اپنے والد کی شہادت کے بعد لکھنو میں آکر رہنے لگے تھے اور جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین، "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے صفحہ نمبر ۳۸۱ پر لکھتے ہیں کہ "پنجاب اور سندھ کے اس قصے کی جزئیات میں خفیف سا اختلاف ہے"۔ سید محمد عقیل رضوی "اردو مثنوی کا ارتقا۔ شمالی ہند میں" کے صفحہ نمبر ۱۱۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ مثنوی سرزمین پنجاب کے ایک عشقیہ افسانے سے متعلق ہے جس کی ہیروئین سسی اور ہیرو پنوں ہے۔ سسی کو مصنف ہیر کی بھتیجی بتاتا ہے"۔ قصہ مختصر اس طرح ہے:

سسی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے گھرانے میں عشق کرنا عام تھا۔ ہیر بھی اسی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ سسی جب جوان ہوئی تو عشق کرنے کا ارمان اس کے دل میں کروٹیں لینے لگا۔ اسی زمانے میں بلوچیوں کا ایک قافلہ وہاں آکر ٹھہرا جس میں پنوں نام کا ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ سسی اس کو دل دے بیٹھی۔ دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک روز جب دونوں ایک جگہ سو رہے تھے قافلہ والوں کو اس کا پتہ چل گیا اور وہ خاموشی سے پنوں کو اٹھا کر لے گئے۔ سسی کی آنکھ کھلی تو پنوں کو نہ پایا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قافلہ کوچ کر گیا ہے۔ سسی، پنوں کی تلاش میں نکل پڑی۔ گھر والے اسے ایک جنگل سے تلاش کر کے لے آئے مگر سسی کی بے تابیاں بڑھتی گئیں۔ ایک دن اسے خبر ملی کہ پنوں سندھ میں ہے۔ سسی گھر بار چھوڑ کر سندھ کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب شہر کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی نشانی پنوں کے پاس بھیجی لیکن نشانی پنوں کے پاس پہنچنے اس سے قبل سسی کو خبر ملی کہ پنوں کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ خبر سن کر سسی کی حرکت قلب بند ہو گئی جب پنوں اس سے ملنے آیا تو سسی کو مردہ پایا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور ختم ہو گیا۔ پنوں کی ہونے والی بیوی نے جب یہ سنا تو اس نے بھی خودکشی کر لی۔

مثنوی میں تشویش کا پہلو موجود ہے اور ڈرامائی مواقع بھی مگر جانے کیوں ڈراما نگاروں کی نظر اس مثنوی پر نہیں گئی۔ ممکن ہے اس زمانے میں یہ مشہور نہ رہی ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا انجام المیہ ہے اور اس وقت المیہ لکھنے کا عام طور پر رواج نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں نہ تو فوق الفطرت واقعات ہیں اور نہ فوق الفطرت کردار جو اس زمانہ کا عام مذاق تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو اس پر کوئی قابل ذکر ڈراما نہیں لکھا گیا۔ ندیم صہبائی فیروزپوری نے "سسی پنوں عرف مجاز حسرت" کے نام سے ڈراما لکھا مگر اس کا کوئی تعلق نواب محبت خاں کے بیان کردہ قصے سے نہیں ہے۔ اگر کوئی ذمہ دار ڈراما نگار اس پر ڈراما لکھتا تو بہترین المیہ ڈراما لکھا جا سکتا تھا۔

طلسم الفت کے مصنف خواجہ اسد علی خاں قلق، خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق طلسم الفت کی تاریخ تصنیف میں اختلاف ہے لیکن سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں کہ مثنوی کے آخر میں مظفر علی اسیر کی کہی ہوئی تاریخ "نہایا گیا خوب مثنوی ہے" جس سے ۱۲۸۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح سنہ تصنیف کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ مثنوی قلق کی زندگی ہی میں ۱۸۷۸ء میں مطبع مجمع العلوم لکھنو سے شائع ہوئی۔ قصہ مختصراً اس طرح ہے:

عشق آباد کے لوگ اس قدر عاشق مزاج ہیں کہ قیس اور فرہاد کے عرس کرتے اور ان کے نام کی مالا جپتے ہیں۔

بادشاہ عالم شاہ خود بھی رنگین مزاج ہے مگر اولاد سے محروم ہے۔ دعاؤں اور منتوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کا نام جان جہاں رکھا جاتا ہے۔ شہزادے کے بارے میں نجومی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کسی پر عاشق ہوجائے گا۔ جان جہاں کو کہانیاں سننے کا شوق ہے لیکن وہ نئی کہانیاں سننا چاہتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی کہانیاں اس کے نزدیک پرانی ہوچکی ہیں اور ان کی صداقت بھی مشکوک ہے۔ جب اسے حسن آباد کی شہزادی عالم آرا کے متعلق بتلایا جاتا ہے تو وہ اس پر عاشق ہوجاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے سمندر کے راستے سے روانہ ہوتا ہے لیکن راستے میں جہاز تباہ ہوجاتا ہے اور وہ تباہ حال، شعلہ پری کے باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ شعلہ پری اس پر عاشق ہوجاتی ہے مگر شعلہ پری کی ماں خاموشی سے شہزادہ کو حسن آباد پہنچا دیتی ہے۔ یہاں عالم آرا کی چھوٹی بہن روشن آرا اس پر عاشق ہوجاتی ہے اور دھوکا دے کر اس سے شادی کرلیتی ہے۔ جان جہاں کو جب اس دھوکے کا علم ہوتا ہے تو وہ راتوں میں اٹھ کر عالم آرا کے پاس چلا جاتا ہے۔ روشن آرا اس کی شکایت اپنے باپ سے کرتی ہے۔ ایک رات جب جان جہاں عالم آرا کے پاس ہوتا ہے بادشاہ آجاتا ہے۔ راز کو راز رکھنے کے لیے وزیر زادی دلربا پردوں میں آگ لگادیتی اور جان جہاں کو دوسرے راستے سے نکال دیتی ہے۔ جان جہاں جنگل میں چلا جاتا ہے۔ جنگل میں اس کی ملاقات اپنے وزیرزادے ہمدم سے ہوتی ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ شعلہ پری بھی اسے تلاش کرتی ہوئی وہاں آجاتی ہے۔ اسے جب سارے حالات کا علم ہوتا ہے تو وہ جان جہاں کی ہمدرد ہوجاتی ہے اسے لے کر حسن آباد آتی ہے۔ دلربا سمجھا بجھا کر روشن آرا سے فارغ خطی لکھوالیتی ہے۔ اب راستہ صاف ہوجاتا ہے جان جہاں کی عالم آرا سے اور ہمدم کی دلربا سے شادی ہوجاتی ہے۔

مثنوی طلسم الفت سے ماخوذ دو ڈراموں کا پتہ چلتا ہے۔ سب سے پہلے محمد الف خاں حبابؔ نے ۱۸۸۱ء میں "شرر عشق۔ طلسم ارض النعمان" کے نام سے لکھا۔ اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں حافظ عبداللہ نے "طلسم الفت عرف گنجینۂ محبت" کے نام سے۔ حباب کا شرر عشق چار ایکٹ کا ڈراما ہے۔ پہلے ایکٹ میں سات، دوسرے میں نو، تیسرے میں آٹھ اور چوتھے میں بھی آٹھ سین ہیں گویا کل بتیس سین ہیں۔ مثنوی طلسم الفت میں شہزادہ، عالم آرا کے حسن کا تذکرہ سن کر عاشق ہوتا ہے مگر شرر عشق میں شہزادہ شکار کھیلنے جاتا ہے اور ایک ہرن کا پیچھا کرتا ہوا ایک باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ایک دم تاریکی چھاجاتی ہے اور آواز آتی ہے کہ سامنے جو گھوڑا کھڑا ہے اس پر سوار ہوجاؤ۔ جان جہاں گھوڑے پر سوار ہوجاتا ہے۔ گھوڑا اڑ کر ہوا میں معلق ہوجاتا ہے۔ ایک محل نظر آتا ہے جس میں عالم آرا بیٹھی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر عاشق ہوجاتے ہیں آواز پھر آتی ہے اور جان جہاں سے واپس جانے کو کہتی ہے۔ جان جہاں واپس اپنے محل چلا جاتا ہے اور پھر وہ واقعات پیش آتے ہیں جو مثنوی میں بیان کیے گئے ہیں۔ حباب نے یہ تبدیلی کیوں کی ہے اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ عوام اس قسم کے کرتبوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ عوام کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے تین چار کامک سین شامل کیے گئے ہیں جو اصل ڈرامے سے غیر متعلق، غیر ضروری اور بے موقع ہیں۔ ڈراما داستانی انداز کا ہے جس میں کسی ایسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا جہاں ڈرامائی کشمکش پیدا ہوسکتی تھی۔ ڈرامے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں سوائے اس کے کہ اس کی زبان اس دور کے ڈراموں کی زبان سے قدرے بہتر ہے۔

گنجینۂ طلسم الفت کو حافظ عبداللہ نے ۱۸۸۷ء میں "طلسم الفت عرف گنجینۂ محبت" کے نام سے ڈرامائی شکل دی۔ یہ ڈراما ہمارے پیش نظر نہیں ہے لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اردو تھیٹر جلد دوم کے صفحہ نمبر ۱۲۲ پر اس کے متعلق معلومات فراہم کردی ہیں اور مختصر پلاٹ بھی تحریر فرمایا ہے جس سے حافظ صاحب کے ڈرامے کے بارے میں کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نامی نے جو پلاٹ عنایت فرمایا ہے اور اگر ڈرامے کے پلاٹ میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں کی گئی

ہے (ڈاکٹر نامی کی ہر بات پر اعتماد کر لینے سے اکثر گمراہی کا خطرہ موجود رہتا ہے) تو یہ ڈراما نہ صرف حباب کے ڈرامے سے بہتر ہے بلکہ مثنویوں اور داستانوں سے ماخوذ ڈراموں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں تمام واقعات جو فوق الفطرت ہیں حذف کر دیے گئے ہیں۔ پری کا کردار بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ عالم آرا کا باپ جان جہاں سے اپنی دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ عالم آرا کی چھوٹی بہن روشن آرا بھی جان جہاں پر عاشق ہو چکی ہے وہ مغلانی کو رشوت دے کر اپنی طرف ملا لیتی ہے جب مغلانی، عالم آرا کا عندیہ معلوم کرتی ہے تو اسے یہ نہیں بتلاتی کہ وہ جان جہاں ہے۔ عالم آرا شادی سے انکار کر دیتی ہے اور جان جہاں کی شادی روشن آرا سے ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد راز کا فاش ہونا، جان جہاں کا عالم آرا سے ملاقاتیں کرنا، روشن آرا کی شکایت پر بادشاہ کا آنا۔ دلربا کا پردوں میں آگ لگا کر جان جہاں کو دوسرے راستے سے نکال دینا واقعات پیش آتے ہیں اور آخر میں دلربا سمجھا بجھا کر روشن آرا سے فارغ خطی لکھوا لیتی ہے اور عالم آرا کی شادی جان جہاں سے ہو جاتی ہے۔ اگر آج کا کوئی ڈراما نگار اس مثنوی کو ڈرامائی شکل دیتا تو ان ہی واقعات کو لیتا۔ حافظ عبداللہ کا ڈراما، حباب کے ڈرامے سے کہیں بہتر ہے۔ حافظ صاحب نے ڈرامائی مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا ہے جب کہ حباب نے داستانی انداز برقرار رکھا ہے۔ حافظ صاحب کے ڈراموں کی طویل فہرست میں یہ ڈراما نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

(نوٹ:۔ حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا جو پلاٹ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے عنایت فرمایا ہے اسی پر بھروسہ کیا گیا ہے۔)

دریائے تعشق، واجد علی شاہ کی ایک طویل مثنوی ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس سنہ میں لکھی گئی اور کس سنہ میں شائع ہوئی۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کسی منظور نظر کی فرمائش پر اکیس دن میں لکھی۔ سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اسے اسٹیج کیا تھا۔ قصے کا خلاصہ یوں ہے:

کسی ملک کا بادشاہ اور وزیر دونوں لاولد تھے۔ ایک درویش کامل نے انھیں یہ خوش خبری سنائی کہ بادشاہ کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوگی اس کا نام غزالہ رکھا جائے اور وزیر کے یہاں لڑکا ہوگا نام گل پیرہن رکھا جائے۔ غزالہ کے پیدا ہونے کے بعد نجومیوں نے پیشین گوئی کہ دس سال تک اس کے لیے خطرہ ہے۔ وہ آسمان نہ دیکھنے پائے۔ غزالہ کی پرورش ایک تہہ خانہ میں کی گئی مگر حساب کی غلطی سے وہ دو دن پہلے تہہ خانے سے نکل آئی۔ ایک دن وہ باغ میں جھولا جھول رہی تھی کہ ایک چیخ سنائی دی نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دیو ایک خوبصورت نوجوان کو اذیت پہنچا رہا ہے۔ نوجوان کو دیکھ کر غزالہ اس پر عاشق ہو گئی بعد میں معلوم ہوا کہ نوجوان ایک شہزادہ ہے اور اس کا نام ماہرو ہے اور وہ غزالہ پر عاشق ہے مگر ماہرو پر لعل پری عاشق تھی اور وہ غزالہ کا دم بھرتا تھا۔ اس لیے لعل پری ایک دیو کے ذریعے ماہرو کو غزالہ کے محل میں لے جا کر اذیت دیتی تھی۔ غزالہ، ماہرو کے غم میں بے چین رہنے لگی اسی دوران غزالہ کی شادی طے ہو گئی۔ شادی کے دن غزالہ آہ و زاری کر رہی تھی کہ جنوں کے بادشاہ سبز قبا کا وہاں سے گزر ہوا اور غزالہ کی آہ و زاری سن کر رحم آیا اور وہ دولہا دلہن کو لے کر اڑ گیا جب اس نے غزالہ کا قصہ سنا تو اسے اپنی بہن بنا لیا اور ماہرو کو تلاش کرنے کا وعدہ کیا اور غزالہ کے ہونے والے دولہا کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ غزالہ کے غائب ہو جانے پر وزیر زادہ گل پیراہن جوگی بن کر اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ خوبصورت تھا اور بین بجانے میں ماہر۔ ایک روز جنگل میں بیٹھا بین بجا رہا تھا کہ تین پریاں زعفران پری، ارغوان پری اور مشک پری وہاں آئیں اور اس کی بین سن کر متاثر ہوئیں اور مدد کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور اس سے بین بجانا سیکھنے لگیں۔ ایک دن انھوں نے لعل پری کی دعوت کی اور گل پیرہن کی بین سنوائی۔ لعل پری بہت خوش ہوئی اور اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی جس دن لعل پری ان تینوں کے یہاں مہمان تھی سبز قبا شہزادہ ماہرو کو آزاد کرا کے لے گیا جب لعل پری واپس آئی اور ماہرو کو

یاتو بہت پریشان ہوئی اور اپنے باپ لعل شہباز سے شکایت کی اس نے تلاش کرایا تو پتہ چلا کہ وہ سبز قبا کے پاس ہے۔ لعل
از نے سبز قبا کو لکھا کہ وہ ماہرو کو واپس کردے ورنہ جنگ کے لیے تیار رہے۔ سبز قبا جنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔
ں پریاں اپنی اپنی فوج اور گل پیرہن کو ساتھ لے کر سبز قبا کی مدد کو آجاتی ہیں۔ جنگ ہوتی ہے جس میں سبز قبا کی جیت
ہے اور لعل شہباز مارا جاتا ہے۔ لعل پری سارا واقعہ اپنی بہن فرخندہ پری کو سناتی ہے جو عیاری میں ماہر ہے۔ وہ سبز قبا
کل بنا کر سبز قبا کے یہاں پہنچتی ہے اور ماہرو کو اڑا لاتی ہے اور لعل پری کے حوالہ کر دیتی ہے۔ لعل پری ماہرو کو رام
نے کی تدبیر کرتی ہے مگر کامیاب نہیں ہوتی۔ آخر وہ ایک بڑی دعوت کا انتظام کرتی ہے جس میں سبز قبا، غزالہ، تینوں
ں اور گل پیرہن کو بھی بلاتی ہے۔ دعوت کے بعد اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے خودکشی کرنا چاہتی ہے مگر غزالہ
ہ روک دیتی ہے اور اسے لے کر سبز قبا کے شہر آجاتی ہے جہاں ماہرو کی شادی غزالہ اور لعل پری سے ہو جاتی ہے۔ مشک بو
؛ گل پیرہن سے محبت کرتی تھی۔ ان دونوں کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ کچھ دن بعد سبز قبا سب کو ان کے وطن واپس بھیج دیتا
۔

دریا نے تعشق کو بنیاد بنا کر لکھے گئے دو ڈراموں کا پتہ چلتا ہے کہ ایک محمد الف خاں حباب کا۔ "نیرنگِ قاف۔ غزالہ
و۔ دوسرا کیدار ناتھ صورت کا۔ "غزالہ و ماہرو عرف تماشائے خوش گلو"۔ صورت کا ڈرامہ دستیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر
العلیم نامی حباب کے ڈرامے کا نام "غزالہ و ماہرو عرف تماشائے خوش گلو" تحریر فرماتے ہیں لیکن سید امتیاز علی تاج
اسے ایڈٹ کر کے حباب کے ڈراموں میں شامل کیا ہے اور سرورق پر اس کا نام "نیرنگ قاف عرف غزالہ ماہرو" ہے۔
وزیر مالک مطبع گلزار محمدی لکھنو نے اسے شائع کیا ہے اور اپنے مقدمے میں بھی یہی نام لکھا ہے۔ ڈاکٹر نامی نے نام
ں تبدیل کر دیا پتہ نہیں چلتا۔

حباب کا ڈراما چار ایکٹ کا ہے۔ پہلے ایکٹ میں سات دوسرے میں نو تیسرے میں پندرہ اور چوتھے میں چار سین
، یعنی کل پچیس سین ہیں۔ حباب نے مثنوی کے قصے میں بہت کچھ حذف و اضافہ کیا ہے۔ مثنوی میں سبز قبا، غزالہ اور
ہ کے شوہر کو لے جاتا ہے لیکن ڈرامے میں غزالہ کے شادی سے انکار کرنے پر اس کی ماں اسے قید کر دیتی ہے اور سبز قبا
قید خانے سے لے جاتا ہے۔ مثنوی میں وزیرزادہ گل پیرہن جوگی بن کر غزالہ کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن ڈرامے میں
ہ کا بھائی خوش اطوار جوگی بن کر نکلتا ہے۔ سبز قبا اور لعل شہباز کی جنگ حذف کر دی گئی ہے۔ باقی واقعات مثنوی کے
بق ہیں۔ مثنوی میں گلنار پری اور سبز قبا کی محبت پیش نہیں کی گئی ہے لیکن ڈرامے میں گلنار پری کو سبز قبا سے محبت
تے ہوئے پیش کیا گیا ہے مگر گلنار پری سے ایک جادوگر محبت کرتا ہے اور ایک روز وہ جادو کے زور سے گلنار پری کو
ر قبا کے محل سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ سبز قبا جادو نہیں جانتا وہ پریشان ہو جاتا ہے مگر اتفاق سے غزالہ اور خوش اطوار
چچا بہتر اورنگ آجاتے ہیں جو عیاری میں ماہر ہیں۔ کافی پیسہ وصول کر کے جاتے ہیں اور اپنی عیاری سے گلنار پری کو
گر کے قبضے سے چھڑا لاتے ہیں۔ بہتر اورنگ کی عیاری کے متعدد سین ڈرامے میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ سین مثنوی
قصے میں اضافہ ہیں۔ اس طرح حباب نے مثنوی میں حذف و اضافہ کے بعد اپنا ڈراما تیار کیا ہے۔

ڈراما انیسویں صدی کے روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ سست رفتار ہے اور کسی واضح نقطہ عروج پر بھی نہیں
تا۔ شروع سے آخر تک داستانی انداز برقرار رہتا ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں عیاری کو بھی
مل کیا گیا ہے جو داستانوں کا موضوع ہے۔ اس ڈرامے سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی اور ڈرامے میں عیاری نہیں ملتی
ہ دور کا ناظر عیاری کے سین دیکھ کر محظوظ ہوتا ہوگا۔ ڈرامے کی زبان اس دور کے ڈراموں کی زبان سے قدرے بہتر ہے۔

گانوں میں زیادہ تر غزلوں اور ٹھمریوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ سعدی کی ایک فارسی غزل بھی گائی گئی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے دیگر ڈراموں کے مقابلے میں کچھ سلیقہ برتا گیا ہے۔

ان کے علاوہ چند اور مثنویاں ہیں جن کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے قصوں کو بنیاد بنا کر ڈرامے لکھے گئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ یا تو مثنوی دستیاب نہ ہو سکی یا ڈراما۔ ان مثنویوں میں سے ایک عارف الدین عاجز کی مثنوی لعل و گوہر ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "عارف الدین عاجز نے ۸-۱۱۵۰ھ میں مثنوی لعل و گوہر لکھی۔ ایک مرتبہ پریوں کی شہزادی گوہر کا تخت ہوا پر جا رہا تھا۔ وہ شہزادہ لعل پر عاشق ہو گئی اور اس کا پلنگ اٹھوا منگالیا۔" (اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین: ص ۳۰۵)۔ نروان جی مہروان جی آرام نے ایک ڈراما لعل و گوہر کے نام سے لکھا ہے جسے سید امتیاز علی تاج نے ایڈٹ کر کے آرام کے ڈرامے حصہ دوم میں شامل کر دیا ہے۔ تاج صاحب آرام کی وطنیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگرچہ کتاب میں (دکن میں اردو از ہاشمی) لعل و گوہر کا افسانہ درج نہیں ہے لیکن ڈرامے ہی کے نام کی ایک مثنوی (لعل و گوہر از عاجز) موجود ہونے سے یہ خیال پختہ ہوا کہ آرام دکنی تھا اور اس نے اپنے ڈرامے کا افسانہ ایک دکنی مثنوی سے اخذ لیا تھا۔ (آرام کے ڈرامے جلد اول: مرتب سید امتیاز علی تاج ص ۷) یہ ایک علاحدہ بحث ہے کہ اس طرح آرام کی وطنیت کا تعین کیا جا سکتا ہے یا نہیں کیوں کہ آرام نے سحر البیان اور پدماوت کے قصوں پر بھی ڈرامے لکھے ہیں پھر اسے شمالی ہند کا کیوں نہ مان لیں۔ خیر۔ بہر حال یہ مثنوی نہ تو تاج صاحب نے ملاحظہ فرمائی ہے اور نہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر جین نے جو کچھ عنایت فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوہر، شہزادہ لعل کو اٹھوا منگواتی ہے لیکن ڈرامے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری پریاں شہزادہ لعل کو اٹھا لاتی ہیں اور اسے گوہر کے پاس سلا دیتی ہیں اور دونوں کے حسن سے محظوظ ہوتی ہیں جب دونوں کی آنکھ کھلتی ہے تو دونوں کو حیرت ہوتی ہے اور ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پریاں لعل کو پھر اس کے محل میں پہنچا دیتی ہیں۔ شہزادہ لعل، گوہر کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانتا ہے اور گوہر کے ماں باپ، انسان سے محبت کرنے کے جرم میں گوہر کو قید خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ جنگل میں ہیرا پری، شہزادہ لعل پر عاشق ہو جاتی ہے اور اسے اڑا لے جاتی ہے لیکن جب لعل اس کی خواہش پوری نہیں کرتا تو غصے میں آ کر اسے جادو سے ہرن بنا کر جنگل میں چھوڑ دیتی ہے۔ پرندوں کی گفتگو سے لعل کو ایک جادوئی درخت کے مختلف اجزا کی خصوصیات کا علم ہوتا ہے جن کے استعمال سے پہلے وہ انسانی شکل میں آتا ہے اور پھر انھیں کی مدد سے گوہر کو قید سے آزاد کراتا ہے۔ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آرام نے اپنے ڈرامے کی بنیاد عاجز کی مثنوی پر رکھی ہے یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ڈرامے کی پریاں شمالی ہند کی پریوں سے مختلف ہیں وہ پھولوں کے تحفے ایک دوسرے کو پیش کرتی ہیں حسین چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں، ناچتی گاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ معمولی عیوب کو نظر انداز کر دیا جائے تو آرام کا ڈراما اپنے زمانے کے بہترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔

مجموعی طور پر جب ہم ان ڈراموں پر نظر ڈالتے ہیں جو مثنویوں کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ صرف انھیں مثنویوں کو بنیاد بنایا گیا ہے جن میں فوق الفطرت واقعات اور کردار ہیں اور ان مثنویوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جن میں ایسے واقعات اور کردار نہیں ہیں مثلاً نواب محبت خاں کی مثنوی اسرار محبت جس میں سسی پنوں کی داستان محبت بیان کی گئی ہے نظر انداز کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس زمانے میں یہ ڈرامے لکھے گئے عوام فوق الفطرت کرداروں پر یقین رکھتے تھے اور ان میں دل چسپی لیتے تھے۔ فوق الفطرت واقعات کو کرتب/اسٹیج کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا جسے دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور کمپنیاں خوب منافع کماتی تھیں۔ فوق الفطرت کرداروں سے ان

(آگے ص ۱۲۷)

ڈاکٹر ایس۔ مسعود سراج

اقبال کی تاریخ گوئی

تاریخ گوئی ایک اہم، مشکل، خاصا قدیم اور منفرد فن ہے۔ بامعنی الفاظ کے ذریعے کسی لفظ یا فقرے یا عبارت یا مصرع یا اشعار کے مکتوبی حروف کے اعداد سے بحساب ابجد کسی واقعے کے ظہور میں آنے کی تاریخ کا تعین کرنا تاریخ گوئی کہلاتا ہے۔ اس فن کے لیے محض علم حساب جمل سے واقفیت کافی نہیں ہے بلکہ بڑی نکتہ دانی، نکتہ سنجی اور ریاضت درکار ہے۔ تاریخ کے لیے نہ کسی خاص موضوع کی قید ہے نہ کسی خاص واقعے کی، ذاتی، غیر ذاتی، معاشرتی و تہذیبی، سیاسی و سماجی، علمی و ادبی غرض ہر قسم کے واقعات اور موضوعات کی تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ واقعہ ولادت کا ہو یا سالگرہ کا، شادی بیاہ کا ہو یا تخت نشینی کا، عمارتوں کے سنگ بنیاد کا ہو یا تکمیل کا، تصنیف و تالیف کتب کا ہو یا اشاعت کتب کا، کسی کی کامیابی کا ہو یا معزولی کا، فتوحات جنگ کا ہو یا شکست کا یا کسی کی وفات کا ہو تاریخ نکالی جا سکتی ہے۔ تاریخ کے ذریعے دن، تاریخ، مہینے، سال یا محض سال کا تعین کیا جاتا ہے۔ چوں کہ نثر کے مقابلے میں کلام موزوں کے یاد رہ جانے کے امکانات زیادہ رہتے ہیں اس لیے زیادہ تر تاریخیں منظوم اور عام طور پر قطعات کی صورت میں ملتی ہیں۔ حروف اور اعداد کے رشتے کا لطف شعری پیکر میں کچھ اور ہی جادو جگاتا ہے۔

اقبال کی تاریخیں اپنی برجستگی اور معنویت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں بڑی روانی، صفائی اور جامعیت ہے۔ وہ تصنع اور آورد سے پاک ہیں۔ اگرچہ ان کی تاریخیں ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں میں شامل نہیں ہیں لیکن فنی اعتبار سے بڑی اہم ہیں۔ انھوں نے مختلف واقعات اور حادثات پر تاریخیں کہی ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم کیفیت کے اعتبار سے یہ بڑی گراں قدر ہیں۔ اقبال کے تاثرات تاریخ کے سانچے میں ڈھل کر بڑے دل نشین انداز میں سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے کئی تاریخیں قرآن مجید کی آیات سے برآمد کی ہیں۔ ان کی کہی ہوئی تاریخوں میں جو سب سے قدیم تاریخ دستیاب ہوتی ہے وہ سرسید کی رحلت سے متعلق ہے۔ یہ تاریخ انھوں نے اپنے استاد سید میر حسن شاہ کے ایما پر کہی۔ سید میر حسن شاہ اردو، فارسی اور عربی کے جید عالم تھے اور اسلامیات کے ماہر تھے۔ ایک استاد کی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ یہ اقبال کی خوش بختی تھی کہ انھیں شاہ صاحب جیسے صاحب بصیرت استاد سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اقبال کے ذوق کو سنوارنے، نکھارنے اور جلا بخشنے میں بلکہ اقبال کو صحیح معنوں میں اقبال بنانے میں شاہ صاحب کا اہم حصہ ہے۔

اقبال کے دل میں اپنے استاد کے لیے بڑی عظمت اور عقیدت تھی۔ یہ عقیدت آخری دم تک برقرار رہی۔ جب کبھی انھیں کوئی موقع ملتا سیالکوٹ جا کر شاہ صاحب سے اپنے شکوک رفع کر لیتے۔ اقبال کی عقیدت مندی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت انھیں سر کا خطاب پیش کیا گیا تو انھوں نے یہ شرط رکھی کہ جب تک میرے استاد کو شمس العلما کا خطاب نہ دیا جائے گا کوئی خطاب قبول نہیں کروں گا۔ جب گورنر پنجاب نے دریافت کیا کہ "شاہ صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے۔" اقبال نے جواب دیا کہ میں ان کی تصنیف میں موجود ہوں۔

شاہ صاحب کے سر سید سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہ سر سید کے مداح، ان کی قومی و ملکی خدمات کے دل سے معترف تھے۔ سر سید کو شاہ صاحب پر پورا اعتماد تھا۔ وہ شاہ صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اقبال کو سر سید سے جو بے انتہا عقیدت تھی اس میں سر سید کی شخصیت، ان کی شان دار خدمات، ان کی تحریک سے قطع نظر خود شاہ صاحب اور سر سید کے تعلقات کا بھی دخل رہا ہے۔ سر سید کی وفات کا گہرا اثر استاد اور شاگرد دونوں نے قبول کیا۔ شاہ صاحب کالج جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں سر سید کی وفات کا تار ملا۔ اس سانحے نے ان کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ راستے میں اقبال مل گئے جو ان دنوں ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ شاہ صاحب نے سر سید کی وفات کی خبر سنائی اور کہا کہ مرحوم کی تاریخ وفات کی ۔۔کرنا۔ اقبال خود بھی اس سانحے سے متاثر تھے۔ استاد کے ارشاد نے اس تاثر کو اور بھی گہرا کر دیا۔ ایک دوست کی دوکان پر بیٹھے اور تھوڑی دیر میں تاریخ کہہ دی اور شاہ صاحب کے فرزند سید ذکی شاہ کے حوالے کر دی کہ شاہ صاحب کو جا کر سنا دیں۔ جب سید ذکی شاہ نے مادہ تاریخ شاہ صاحب کو سنایا تو فرمانے لگے۔ بہت خوب میں نے بھی ایک مادہ نکالا اور وہ ہے:

غفرلہٗ 1315ھ

(ترجمہ: اس کی مغفرت کی گئی)۔

اقبال نے قرآن پاک کی درجِ ذیل آیت سے تاریخ نکالی تھی:

اِنّی مُتَوَفِّیکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ ط

ترجمہ: وہی موت دینے والا ہے، وہی درجات بلند کرنے والا اور پاک کرنے والا ہے (الزامات اور بہتان طرازیوں سے)۔ یہ آیت مبارک جہاں حضرت عیسیٰ کی شان رفعت اور بلند سیرت و کردار کو ظاہر کرتی ہے وہیں ان پر تہمت لگانے والوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ فقیر وحید الدین رقم طراز ہیں کہ:

"ڈاکٹر اقبال نے اس آیت سے تاریخ نکال کر سر سید کی شخصیت کا بڑا حسین اعتراف کیا ہے۔ سر سید احمد کی وفات کی تاریخ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی تھی یا ان کی علمی و قومی خدمات کو اس سے بہتر خراج عقیدت کیا پیش کیا جا سکتا تھا۔

سر سید کی حیات کو، ان کی خدمات کو، ان کی تحریک کو، ان کے مخالفین کے رویے کو پیش نظر رکھا جائے اور اس آیت مبارک کے مفہوم کو دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بہترین تاریخ بھی ہے اور ایک زبردست خراج عقیدت بھی۔

استاد اور شاگرد دونوں کی تاریخیں دونوں اپنی اپنی جگہ بڑی لاجواب ہیں۔ مادہ ہائے تاریخ کے انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے ان دونوں تاریخوں کو بہترین قرار دیا ہے۔ اقبال کی تاریخ سر سید کے لوح مزار پر کندہ کرائی گئی ہے۔ یہ تاریخ ہزاروں لوگوں کی نظر سے گزری ہوگی۔ مگر بہت کم اس بات سے واقف ہوں گے کہ یہ مادہ تاریخ اقبال کی فکر کا نتیجہ ہے۔ حالی ان تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ سر سید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں۔"

حالی نے مادہ ہائے تاریخ تو درج کر دیے مگر لکھنے والوں کا نام نہیں لکھا۔ جب شاہ صاحب نے حالی کی توجہ مبذول کروائی اور ناموں کے درج نہ ہونے کی شکایت کی تو حالی نے جواب میں لکھا کہ "مجھے ناموں کا علم نہیں تھا۔ آئندہ ایڈیشن میں اس فروگذاشت کی تلافی کر دی جائے گی۔" افسوس ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہوئی۔

فقیر سید وحید الدین نے اعجاز احمد کے حوالے سے لکھا کہ جب اس مادۂ تاریخ پر جس کا تعلق حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی سے ہے سیالکوٹ کے بعض علمائے دین نے اعتراض کیا اور یہ بات اقبال تک پہنچی تو انھوں نے دوسرا مادۂ تاریخ نکالا۔

كَانَ مَسِيْحٌ لِكُلِّ مَرَاضٍ۔ ۱۳۱۵ھ۔

مولوی سید میر حسن شاہ صاحب کا انتقال ستمبر ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ شفیق استاد کے انتقال کی خبر ملتے ہی آخری دیدار ، اقبال سیالکوٹ پہنچے۔ اقبال اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے دل میں شاہ صاحب کے لیے بڑی در محبت تھی۔ ان کی وفات پر حسب ذیل مادہ تاریخ نکالا:

مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ ۱۳۴۷ھ۔

اقبال مشہور مستشرق پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن کی خدمات کے معترف تھے۔ ان کی تاریخ وفات " ذالک الفوز ھر سے نکال کر خود اقبال نے اپنی وسیع النظری کا ثبوت بھی دیا اور خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ تاریخ ہے:

نازش اہل کمال ای۔ جی۔ براؤن ۔۔۔ فیض او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتم او سینہ چاک ۔۔۔ از فراق او دل مشرق دو نیم
تا بفردوس بریں ماوی گرفت ۔۔۔ گفت ہاتف " ذالکَ الفوزُ العظیم "۔

(ترجمہ: یہی بڑی کامیابی ہے)۔[1]

سرسید کے رفقا میں نواب وقار الملک کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے سرسید تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ سرسید ن کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ اقبال کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کی وفات پر اقبال نے مادہ تاریخ کہا ۔

ت انجام بخیر۔ ۱۳۳۵ھ۔

شیخ عبدالحق کی وفات پر اقبال نے ایک درد انگیز قطعہ تاریخ کہا اور لفظ غفران سے تاریخ وفات برآمد کی:

چوں مئے جامِ شہادت شیخ عبدالحق چشید
باد بر خاکِ مزارش رحمتِ پروردگار
باعزیزان داغِ فرقت داد در عینِ شباب
آستیں ہا از دُرِ اشکِ غمش سرمایہ دار
بندۂ حق بود و ہم خدمت گزارِ قومِ خویش
سالِ تاریخِ وفاتِ او ز " غفراں " آشکار

۱۳۳۱ھ

میاں شاہ دین ہمایوں پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اقبال کے اچھے دوستوں میں تھے۔ ان کی رحلت پر اقبال نے دو صنعت ضرب میں کہیں اور دوست کو خراج عقیدت پیش کیا:

چو سالِ فوتِ ہمایوں دلِ حزیں می جُست
زہشت خلد ندا کرد ورشتۂ " المؤمن "

۱۹۷ × ۸ ـ ۱۳۳۶ھ

کے اعداد ۱۹۷ ہوتے ہیں۔ ۱۹۷ کو ۸ سے ضرب دینے سے مطلوبہ سن برآمد ہو جاتا ہے۔ یعنی ۱۳۳۶ھ۔

قطعہ

در گلستان دہر ہمایوں ۔۔۔ مثل صبح

آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رسید
بی جنت عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت
علامۂ فصیح • زہر چار سو شنید

۴x ۳۳۴ـ ۱۳۳۶ھ

اس قطعہ میں "علامۂ فصیح" کے اعداد کو اگر چار سے ضرب دیا جائے تو مادہ تاریخ نکل آتا ہے۔

اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد قناعت پسند اور درویش مزاج شخص تھے۔ علما اور صوفیہ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کا انتقال یکم اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ اس سانحے پر اقبال نے ایک مصرع سے دو تاریخیں کہیں۔ قطعہ ہے:

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہرواں ، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخِ رحیل
آمد آواز اثر رحمت و آغوش لحد

۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

۱۹۲۴ء میں اقبال کی لدھیانہ والی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بچہ ہونے والا تھا۔ کسی اندرونی پیچیدگی کے باعث فوت ہوگئیں۔ اقبال نے برجستہ قطعہ تاریخ نظم کیا۔

اے دریغا ز مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخنِ پاکِ مصطفیٰ آورد
بہر سالِ رحیلِ او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد

۱۳۴۳ھ

اقبال کی تیسری بیگم یعنی والدہ جاوید کا ۲۳/ مئی ۱۹۳۵ء کو انتقال ہوا۔ والدہ جاوید کی وفات اس اعتبار سے اور بھی زیادہ دردناک تھی کہ انھیں میورو ڈپر اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ہونے ابھی تین ہی دن گزرے تھے انھیں لاہور کے ایمپریس روڈ پر واقع قبرستان "بیبیاں پاک دامناں" میں دفن کیا گیا۔ ایک اونچے ٹیلے پر ایک پختہ قبر ہے جس پر اقبال کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"

۱۳۵۴ھ

قرآن مجید کی آیت مَازَاغَ الْبَصَرُ وَ مَاطَغٰی کی طرف اشارہ ہے۔ "نہ پھیری آنکھ اور نہ نافرمانی کی۔"

اقبال اور سر سید کے پوتے سر راس مسعود کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ نہ صرف سر راس مسعود بلکہ ان کی بیگم بھی اقبال کی بڑی معترف تھیں۔ اقبال بھی سر راس مسعود اور ان کی بیگم کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ میاں بیوی دونوں اقبال کے بڑے قدرداں تھے۔ سر راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اقبال نے نہ صرف بچی کا نام تجویز کیا بلکہ ایک لاجواب قطعہ تاریخ بھی کہا۔ اس میں ایک طرف سر سید کے خاندان کو خراج تحسین پیش کیا گیا تو دوسری طرف ایک لڑکی کی ولادت کو باعث برکات لامحدود قرار دیا ہے:۔

راس مسعود جلیل القدر کو جو کہ اصل و نسل میں محمود ہے
یادگارِ سید والا گہر نورِ چشم سیدِ محمود ہے
راحتِ جان و جگر دختر ملی شکر خالق ، منت معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود باعثِ برکات لامحدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دخترِ مسعود ہے

۱۹۳۷ء

بقول سید وحید الدین اس قطعہ کا چوتھا شعر:

خانداں میں ایک لڑکی کا وجود
باعث برکاتِ لامحدود ہے

حکیمانہ ہی نہیں مصلحانہ بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا ترجمان ہے کہ حضور اپنی لخت جگر اور سعادت مند بیٹی سیدہ فاطمہ الزہرا کو بے حد و بے انتہا چاہتے تھے۔ اس لیے کسی گھر میں بھی لڑکی کی پیدائش غم کی نہیں خوشی کی بات ہے۔ بیٹے کی طرح بیٹی بھی اللہ کی دین ہے۔

لاہور کے مشہور معالج ڈاکٹر محمد حسین اور اقبال کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ دونوں ہم جماعت بھی تھے۔ محمد حسین کے بھائی سید نادر حسین تحصیل دار کو برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش میں قتل کر دیا گیا۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد حسین نے ایک تاریخ کہی اور اقبال کے پاس بغرض اصلاح لائے۔ چوں کہ وہ تاریخ سنگ مزار پر کندہ کرانے کے لیے موزوں نہ تھی اقبال نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور چند روز بعد اپنے دوست کے احساسات کو دوسرا پیکر قطعے میں ڈھال دیا۔ اس مادہ تاریخ کو خود اقبال نے الہامی قرار دیا ہے۔ اقبال رقم طراز ہیں:

مخدومی قبلہ صاحب۔

السلام علیکم۔

دل میں درد ہو تو اس کے اظہار کا بہترین طریقہ شعر ہے۔ بھائی کے فراق نے آخر آپ کو شاعر بنا دیا۔ مگر جو قطعہ آپ نے کہے ہیں وہ سنگ مزار کے لیے موزوں نہیں۔ یہ قطعۂ تاریخ عرض کرتا ہوں۔ اسے آپ مزار پر کندہ کرائیے۔ مادۂ تاریخ الہامی ہے۔

محمد اقبال

گفت ہاتف مصرعِ سالِ رحیل
کشت سید را یزیدِ کافرے
۱۳۳۷ھ

مصطفےٰ کمال پاشا نے جب یونانیوں کو بندرگاہ سمرنا سے باہر کیا تو اقبال نے اس فتح پر قطعہ تاریخ یوں نظم کیا:

شارخِ ابراہیم رانم مصطفیٰ
مہدیِ آخر زماں ہم مصطفےٰ
گوش کن اے بے خبر تاریخِ فتح
گفت اقبال اسمِ اعظم مصطفیٰ
۱۳۴۲ھ

اقبال نے مومن یا غالب کی طرح اپنی کوئی تاریخ وفات تو نہیں کہی لیکن ان کی تاریخ وفات ان کی مشہور نظم "مسافر" کے ایک مصرع سے نکلتی ہے:

"صدق واخلاص و صفا باقی نماند"
۱۳۵۷ھ

اقبال کی تاریخیں اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ وہ برجستہ ہیں، واقعے سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اس میں بھرتی کے الفاظ کم ہیں۔ تعمیہ یا تخرجہ کی محتاج نہیں ہیں۔ قرآن پاک کی آیتوں سے بڑی موزوں اور بر محل تاریخیں نکال کر انھوں نے اس فن میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تاریخوں میں برجستگی بھی ہے، خیال کی ندرت بھی ہے اور شعریت بھی ہے ان کی تاریخیں ان کے فکر و فن کا اعجاز ہیں۔

حوالے

۱۔ فقیر وحید الدین۔ روزگارِ فقیر ص ۱۲۸۔
۲۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید حصہ اول۔ ص ۲۲۱۔
۳۔ عبدالواحد، سید۔ باقیاتِ اقبال۔ ص ۱۲۶
۴۔ فقیر وحید الدین۔ روزگارِ فقیر حصہ دوم۔ ص ۱۵۷
۵۔ سالک، عبدالمجید۔ ذکرِ اقبال ص ۲۸۹۔
۶۔ دسنوی، محمد بشیر الحق (مرتب)۔ تبرکاتِ اقبال۔ ص ۴۱
۷۔ ایضاً۔ ص ۳۴
۸۔ عبدالواحد، سید۔ باقیاتِ اقبال ص ۱۲۶
۹۔ دسنوی، محمد بشیر الحق۔ تبرکاتِ اقبال۔ ص ۳۴
۱۰۔ عبدالواحد، سید۔ باقیاتِ اقبال ص ۱۲۶۔
۱۱۔ فقیر وحید الدین۔ روزگارِ فقیر حصہ اول۔ ص ۱۹۸۔
۱۲۔ سالک، عبدالمجید۔ ذکرِ اقبال۔ ص ۱۲۱۔
۱۳۔ ایضاً۔ ص ۱۹۵۔
۱۴۔ فقیر وحید الدین۔ روزگارِ فقیر حصہ اول۔ ص ۱۶۴۔
۱۵۔ ایضاً۔ ص ۱۹۲۔

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

ریاست حیدرآباد میں گوکھلے میموریل اسکالرشپ کا قیام

آصف سابع کی وسیع النظری

گوپال کرشن گوکھلے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے قومی افق پر ابھرنے والی شخصیتوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں نہایت کم عمری میں ترقی اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی گوکھلے جیسی بہت کم شخصیتیں ہماری قومی تاریخ میں دیکھی گئی ہیں۔ گوکھلے (۱۸۶۶-۱۹۱۵) ۱۸۸۹ء میں کانگریس میں شریک ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں جب کہ وہ صدر کل ہند کانگریس منتخب ہوئے اس وقت انھیں کانگریس کے سب سے کم عمر صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

گوکھلے اس زمانے میں ملک کے ایک ممتاز سیاست داں اور ایک بہترین پارلیمنٹرین ہی نہیں بلکہ ماہر تعلیم بھی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک میں تعلیم کو خصوصی اہمیت دی جانے اور علم کی روشنی کے ذریعے ہندوستانی عوام کے سماجی اور سیاسی شعور کو بیدار کیا جائے۔ اس اہم شخصیت کی پچاس سال کی عمر میں موت کے بعد بمبئی میں ان کی ایک یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس یادگار کے قیام کے لیے آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں سے بھی مالی اعانت حاصل کرنا طے پایا تھا۔ اس بارے میں ساری کارروائی آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈز کے ذخائر میں محفوظ ہے۔ اس کارروائی کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ سابق ریاست حیدرآباد نے مالی امداد اور اعانت کے معاملات میں فیاضی ہی نہیں دکھائی بلکہ مذہبی عصبیت اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اعلیٰ ترین صلاحیتوں کی قدر اور عزت کی۔ یہ کارروائی اس ریاست کے حکمران اور سارے نظم و نسق کے صاف ذہن، جذبہ رواداری اور روشن خیالی کا مستند ثبوت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

گوکھلے میموریل فنڈ کی جانب سے جہانگیر بہمن جی کا جو خط آصف سابع کو بذریعہ ڈاک وصول ہوا تھا اسے معہ منسلکات واپس کرتے ہوئے آصف سابع نے اپنے حکم نامہ مورخہ ۱۵/رجب ۱۳۳۳ھ - ۳۰/ مئی ۱۹۱۱ء میں تحریر کیا کہ اس بارے میں فریدوں جنگ بہادر کی رائے عرض کی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں فریدوں جنگ بہادر نے ایک عرض داشت مورخہ یکم جون ۱۹۱۵ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کی جس میں انھوں نے لکھا کہ جہانگیر بہمن جی کے مکتوب اور اس کے منسلکات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گوکھلے کے میموریل کے لیے آصف سابع سے مالی امداد دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں فریدوں جنگ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اگر اس بارے میں معین المہام (صدر المہام) فینانس کی بھی رائے لے جائے تو مناسب ہوگا اور اگر آصف سابع کا ارشاد ہو تو وہ معین المہام فینانس کی رائے طلب کرکے اس کے ساتھ اپنی بھی رائے عرض کریں گے۔ عرض داشت میں درج کردہ فریدوں جنگ کی رائے کے بارے میں آصف سابع نے اسی تاریخ کے اپنے حکم نامہ میں تحریر کیا "اس بارے میں مسٹر گلانسی کی بھی رائے لی جائے۔" فریدوں جنگ نے مسٹر گلانسی معین المہام فینانس کی رائے طلب کی اور مسٹر گلانسی کی رائے وصول ہونے پر انھوں نے ایک عرض داشت مورخہ ۱۷/ جون ۱۹۱۵ء میں گلانسی کی رائے کے ساتھ اپنی رائے درج کرتے ہوئے اسے آصف سابع کے ملاحظے کے لیے روانہ کیا۔ اس عرض داشت میں فریدوں جنگ نے لکھا کہ مسٹر گلانسی نے رائے دی ہے کہ بیرون

ریاست کسی مدرسے کے لیے چندہ بھیجنے کی بجائے خود اپنی ریاست، حیدرآبادیوں کے لیے مقامی طور پر گوکھلے میموریل اسکالرشپ کے نام سے ایک وظیفہ تعلیمی قائم کرنا بہتر ہوگا۔ اس وظیفے کے شرائط اسکالرشپ کمیٹی طے کرے گی اور ان شرائط کی نسبت آصف سابع کی منظوری حاصل کی جائے گی۔ فریدوں جنگ بہادر نے عرض داشت میں مسٹر گلانسی کی رائے درج کرنے کے بعد لکھا "انھیں مسٹر گلانسی کی رائے سے کامل اتفاق ہے اس سے بہ مصداق بیک کرشمہ دو کار مسٹر گوکھلے کی یادگار بھی قائم ہو جائے گی اور اس سے ہمارے ہی ملک کے نوجوان مستفید ہوں گے۔" فریدوں جنگ نے مسٹر گلانسی کی رائے پر خود اپنی رائے کے ساتھ درج کرتے ہوئے لکھا کہ اگر آصف سابع ان آرا کو منظوری عطا فرماتے ہیں تو وظیفے سے متعلق شرائط بغرض منظوری پیش کرنے کے لیے وہ سررشتہ فینانس کو لکھیں گے اور جہانگیر بہمن جی کو اطلاع دی جائے گی کہ باہر کی کسی یادگار میں چندہ دینے کے عوض آصف سابع نے خاص طور پر حیدرآباد ہی میں گوکھلے میموریل اسکالرشپ قائم کرنے کو پسند فرمایا ہے لہٰذا افسوس ہے کہ ان کی استدعا کے بموجب چندہ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ آصف سابع نے عرض داشت میں پیش کردہ متفقہ رائے کو منظوری عطا کی۔ عرض داشت پیش ہونے کے دوسرے ہی روز حسب ذیل فرمان صادر ہوا۔

> "سر فریدوں جنگ بہادر اور مسٹر گلانسی کی متفقہ رائے مناسب ہے کہ باہر کی کسی یادگار میں چندہ دینے کے عوض خاص طور پر حیدرآباد میں ہی گوکھلے میموریل اسکالرشپ کے نام سے ایک وظیفہ تعلیمی قائم کرنا بہتر ہوگا۔ اس کی اطلاع مسٹر جہانگیر بہمن جی کو دے کر لکھا جائے کہ مذکورہ وجہ سے ان کی استدعا کے بموجب چندہ کا دیا جانا متعذر ہے۔"

مذکورہ بالا فرمان کے ذریعہ وظیفے کے قیام کی منظوری مل چکی تھی مگر اس وظیفے کے اجرا کے لیے ضروری شرائط کا طے کیا جانا باقی تھا چناں چہ اس سلسلے میں کمیٹی عطائے وظائف تعلیمی کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں اس وظیفے کے اجرا کے سلسلے میں چند تجاویز پیش ہوئیں۔ یہ تجاویز آصف سابع کی منظوری حاصل کرنے کی غرض سے صیغہ فینانس کے حوالہ کی گئیں۔ صیغہ فینانس نے ایک عرض داشت مورخہ ۲۸/ جولائی ۱۹۱۵ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کی جس میں لکھا گیا کہ بذریعہ فرمان حیدرآباد میں گوکھلے میموریل اسکالرشپ کے نام سے ایک وظیفہ قائم کرنے کی منظوری دی جا چکی ہے اور اس بارے میں کمیٹی عطائے وظائف تعلیمی نے بالاتفاق حسب ذیل تجاویز طے کی ہیں۔

(۱) گوکھلے اسکالرشپ ان طلبہ کے من جملہ جنھوں نے نہایت قابل اطمینان ہائی اسکول لیونگ سرٹیفیکیٹس حاصل کیے ہوں بہترین طالب علم کو دیا جائے گا۔

(۲) وظیفہ مذکورہ کمیٹی عطائے وظائف تعلیمی ہائی اسکول لیونگ بورڈ کی رپورٹ وصول ہونے پر عطا کرے گی۔

(۳) اس وظیفہ تعلیمی کی مقدار تیس روپے سکہ عثمانیہ ماہانہ ہوگی۔

(۴) ہر وظیفہ یاب کو گوکھلے پرائز کے نام سے ایک سو روپے کی کتابیں (جن کا انتخاب پرنسپل نظام کالج کریں گے) دی جائیں گی۔

ان تجاویز کو درج کرنے کے بعد عرض داشت کے آخر میں لکھا گیا کہ اگر آصف سابع ان تجاویز کو منظوری عطا فرمائیں تو امسال بھی ایک وظیفہ کا اجرا عمل میں آئے گا۔ آصف سابع نے فوری ان تجاویز کو منظوری دے دی اور جس تاریخ کو عرض داشت پیش کی گئی تھی اسی تاریخ کو حسب ذیل فرمان صادر ہوا۔

> "گوکھلے میموریل اسکالرشپ کی نسبت کمیٹی وظائف تعلیمی کے تجاویز معین المہام فینانس کی رائے کے مطابق منظور کیے جاتے ہیں جسمیت۔"

اس سال بھی ایک وظیفہ تعلیمی دیا جائے۔

حیدرآباد میں گوکھلے میموریل اسکالرشپ کے نام سے ایک تعلیمی وظیفہ قائم کیے جانے کے باوجود بمبئی کی گوکھلے میموریل فنڈ کمیٹی نے گوکھلے میموریل کے لیے چندہ دینے کے لیے مزید درخواست روانہ کی جس کے بارے میں پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ایک عرض داشت مورخہ ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کی گئی جس میں کہا گیا کہ حیدرآباد میں یادگار قائم ہوجانے کے بعد بمبئی میں گوکھلے کی یادگار قائم کرنے کے لیے چندہ دینا حکومت حیدرآباد کے لیے ضروری نہیں ہے۔ آصف سابع نے عرض داشت میں پیش کردہ رائے سے اختلاف نہیں کیا لیکن اپنی جانب سے چندہ دینا طے کیا۔ اس بارے میں بلا کسی تاخیر یعنی ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء کو ہی آصف سابع کا جو فرمان صادر ہوا تھا اس کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> "مسٹر گلانسی اور سر فریدوں جنگ بہادر نے جو رائے دی ہے وہ اصولاً ٹھیک ہے مگر چوں کہ ہز ہائنس آغا خاں اور دوسرے معزز لوگ اس چندے میں شریک ہیں۔ لہٰذا میری طرف سے بھی پانچ ہزار کا چندہ دیا جانا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ چندہ دیتے وقت مسٹر گلانسی کی رائے کے مطابق کمیٹی کو ترکیب سے سمجھا دینا چاہیے کہ میں علاقہ بمبئی کا کوئی رئیس نہیں ہوں جیسا کہ کمیٹی کا خیال پایا جاتا ہے۔"

اس کارروائی کے بارے میں جو حقائق سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سابق ریاست حیدرآباد میں تعلیم کے میدان میں اس زمانے کا یہ سب سے اہم اعزاز تھا۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اہم اعزاز یا بڑا تعلیمی وظیفہ ریاست کے کسی فرد یا چوں کہ حکمران ریاست کا مذہب اسلام تھا اس لیے کسی بڑی مسلم شخصیت کی کمی نہیں تھی۔ آصف سابع چاہتے تو اپنے نام سے ہی یہ اعزاز و وظیفہ جاری کر سکتے تھے لیکن گوکھلے کا کم عمری میں اوج کمال کو پہنچنا، ان کی قومی و عوامی خدمات میں تعلیمی خدمات کا نمایاں حصہ اور ان کا تعلیم کی ترقی اور اشاعت پر توجہ مرکوز کرنا، ایک غیر ریاست میں ان کے نام سے سب سے اہم تعلیمی اعزاز و وظیفہ قائم کیے جانے کا سبب و محرک بنا۔ ریاست حیدرآباد میں یہ وظیفہ برسوں تک دیا جاتا رہا اور گوپال کرشن گوکھلے کی شخصیت کو خراج ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ سابق ریاست حیدرآباد کے حکمران اور نظم و نسق کی اعلیٰ ظرفی کی بھی یاد تازہ کرتا رہا۔

ماخذ

FILE NO. 113 OF 133 H OF POLITICAL DEPARTMENT
INSTALMENT NO. 79, LIST NO. 3, SERIAL NO. 550

مقدمہ گوکھلے میموریل فنڈ

نتالیا پری گارنا

مرزا غالب

روسی سے ترجمہ ۔ محمد اسامہ فاروقی

کچھ مصنفہ کے بارے میں

بقول مسلم شمیم، روسی مستشرقین نے اردو زبان کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے ہماری ناواقفیت یا کم آگاہی میں دیگر عوامل کے ساتھ سابقہ سوویت یونین کے مخصوص داخلی حالات کا جہاں عمل دخل رہا وہاں یہ بات بھی محلّ نظر رہے کہ اردو کے لیے روس میں بیش تر تخلیقی اور تحقیقی کام روسی زبان میں ہوا ہے اور روس اور باقی دنیا کے درمیان زبان کی دیوار حائل رہی ہے۔ یہ جان کر واقعی خوش گوار حیرت ہونی چاہیے کہ روس میں تمام دنیا کی زبانوں اور ثقافتوں کے باب میں عمومی طور پر اور تیسری دنیا کی ثقافت اور زبان و ادب کے ضمن میں خاص طور پر ایسے کارنامے انجام دیے گئے ہیں جن پر کوئی بھی معاشرہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ روس میں اردو کے لیے وہاں کے متعدد اداروں میں جو کام ہوا ہے وہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے یکساں وقیع اور گراں قدر ہے۔ کسی دوسرے بیرونی ملک میں شاید اس پیمانے پر اور اس نوعیت کا کام نہیں ہوا ہے۔

زیر نظر کتاب "مرزا غالب" کی مصنفہ نتالیا پری گارنا جن کا تعلق ادارۂ علوم مشرقیہ ماسکو سے ہے، انھیں ممتاز مستشرقین کے زمرے میں شامل ہیں۔ آپ کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور نتیجۃً آپ نے برّصغیر ہندوستان کے ان دو عظیم شاعروں کے کارناموں پر دادِ تحقیق دی ہے جنھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہماری مراد شاعر مشرق اقبال اور مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہے۔ محترمہ پری گارنا کی تحقیقی تصنیف "محمد اقبال کی شاعری" ۱۹۷۲ء میں ماسکو سے شائع ہوئی۔ اس میں اقبال کی ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کی شعری تخلیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کی دوسری علمی تصنیف "محمد اقبال کی تخلیقات کی شعریات" کے عنوان سے، ادارۂ علومِ مشرقیہ ماسکو کے زیر اہتمام ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آئی جس میں اقبال کے ۱۹۲۷ء تک کے کلام پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتابیں راقم الحروف کو ۱۹۸۰ء کے دہے کے اواخر میں اقبال اکیڈمی، حیدرآباد کے کتب خانے میں اتفاقاً دست یاب ہوئیں۔ یہ کتابیں محترمہ نے ۲۶ / مارچ ۱۹۸۱ء میں اپنے سفرِ حیدرآباد کے دوران اقبال اکیڈمی، حیدرآباد کو تحفتہً دی تھیں۔ کتابیں روسی زبان میں ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سے اب تک استفادہ نہیں کیا گیا تھا۔ کتابیں اور ان کے توسّط سے مصنفہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ:

بیاورید گر این جا بود زبان دانے
غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی دارد

پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اس بلند عالمی معیار کی کتابیں اور ان سے اردو دنیا ناواقف محض ہے۔ میں اقبال پر اس سلسلۂ کتب کے تیسرے کا انتظار کر رہا تھا کہ ۱۹۸۶ء میں محترمہ پری گارنا کی نئی تصنیف "مرزا غالب" ماسکو سے شائع ہوئی اور خوش قسمتی سے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی مل ہی گیا۔ کتاب پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ غالب کے کلام پر اس زاویے سے شاید اب تک روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اور اگر اس علمی تصنیف سے بھی اردو قارئین ناواقف محض ہی رہے تو یہ مصنفہ اور اردو دنیا دونوں کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ میں نے جب اس سلسلے میں مصنفہ سے خط کتابت کی اور دیگر امور کے علاوہ ترجمے کے بعض مسائل مثلاً کتاب میں محولہ اردو فارسی کے اشعار اور نثری عبارتوں کے اصل متن کی فراہمی، کا ذکر کیا تو آپ نے ازراہ نوازش اس سلسلے میں مکمل تعاون کا وعدہ فرمایا۔ آپ کے مکتوب مورخہ ۶/ جون ۱۹۹۳ء کا اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا

"آپ کا خط دراصل میری تصانیف کے بارے میں ہندوستانی قارئین کی طرف سے موصول ہونے والی پہلی رائے ہے۔ یہ ایسا ردِ عمل ہے جس کی توقع رکھنے کی میں حق دار بھی نہیں تھی کیوں کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہاں کبھی کوئی ایسا روسی زبان سے واقف شخص بھی معرضِ وجود میں آنے گا جو میری تصانیف کو پڑھ سکے اور ان کے سوز و گداز کو سمجھ سکے۔ خود میرے وطن میں بھی ان تصانیف کو سمجھنے والے قارئین کی تعداد کوئی ایسی زیادہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں ان کے مضامین کے تناظر سے ناآشنا روسی قاری کے لیے بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے دل چسپی ہونی چاہیے، ان کی تہذیب و ثقافت کے تعلق سے کسی طرح کے تعصبات نہیں ہونے چاہئیں اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ عیسائی تہذیب و ثقافت سے اپنے جداگانہ تشخص میں بیش بہا اقدار کی حامل ہے۔۔۔۔۔۔ غالب کے تئیں اپنی محبت اور غالب کے کلام، خصوصاً فارسی کلام کی صحیح تفہیم کے لیے میں بہت کچھ ظ۔ انصاری کی مرہونِ منت ہوں۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ۱۹۶۷ء میں جشنِ غالب سے کچھ قبل غضنفر علی اوف اور میں نے جب غالب کا مطالعہ شروع کیا تو نہ ہم لوگ اور نہ ہی اس وقت ماسکو میں مقیم ایرانی ادبیات شناس غالب کی بعض ابیات سے عہدہ برا ہونے کے لائق تھے۔ خوش قسمتی سے اسی وقت، غالب پر پی ایچ۔ ڈی کرنے کے ارادے سے ظ۔ انصاری ماسکو آئے اور انھوں نے بہت سی باتوں کی توضیح و تشریح اپنے ذمے لے لی، اور بڑی خوبی سے اس ذمہ داری کو پورا کیا۔ میں نہ ان کو اور نہ غالب سے ان کی محبت کو فراموش کر سکتی ہوں۔ غالب کے کلام کے مطالعے، ترجمے اور اس پر کام میں گزارے ہوئے ماہ و سال مجھے ہمیشہ ایک مخصوص روحانی جوش و خروش کے دور کی طرح سے یاد آتے ہیں، انبساطِ روح کی ایک ایسی مستقل کیفیت کے دور کی حیثیت سے جس کی وجہ یہ خیال تھا کہ میرے پاس میرے دل کو عزیز، اس دروازے کی کنجی ہے، جس کی دوسری طرف مسرت کا خزانہ میرا انتظار کر رہا ہے۔۔۔۔۔ فی الوقت میں ایک بہت اہم بات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ غالب کی غزل کی ابیات "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" وغیرہ اور مرینا سوِیتاِیوا کی نظم کے درمیان مماثلت پر سب سے پہلے مجھے ظ۔ انصاری نے توجہ دلائی تھی۔ وہ روسی شاعری سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور وہ بھی دونوں شاعروں کے ان اشعار کی مماثلت سے بہت متاثر تھے۔ اگر ممکن ہو تو انصاری مرحوم کے حق میں انصاف کی خاطر اور علمی دیانت داری کے مدِ نظر اس بات کا اعتراف اس رسالے کے مدیر کے نام شاید ایک خط کی شکل میں کیا جانا چاہیے جہاں آپ کا ترجمہ شائع ہو۔ اپنی کتاب میں میں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ ایک تو یہاں کچھ زیادہ ہی مفصل وضاحت کی ضرورت پڑتی اور دوسرے یہ کہ نفسِ مضمون کے لیے یہ ایک غیر ضروری تفصیل ہوتی، لیکن ہندوستان میں اشاعت کے موقع پر اس کی بڑی اہمیت ہے۔

میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس خیال سے کہ میری کتاب اردو میں بھی منظرِ عام پر آ سکتی ہے۔ میں اپنے جذبات میں کیسا ہیجان محسوس کر رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ اب تک ہندوستان، بہ شمول حیدرآباد، میں میرے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا گیا یوں سمجھیے کہ وہ سب ادھار میں تھا۔ حیدرآباد میں میرے تمام ملاقاتیوں نے جن کی جیتی جاگتی اور خوش گوار یاد دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے پر بھی میرے دل پر نقش ہے مثلاً انور معظم، جن کے ساتھ اقبال پر ہماری کافی گفتگو رہی، پروفیسر غلام عمر خاں، عالم خوند میری، جنھیں افسوس کہ اب مرحوم لکھنا پڑتا ہے، اشرف رفیع اور ان کے شوہر، عثمانیہ یونی ورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر انعام دار، ان سب نے یوں کہیے کہ بس میرے کہنے پر اعتبار کر لیا، لیکن میں نے جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک لفظ بھی پڑھ سکنے کے موقف میں نہیں تھے۔ دعا ہے کہ آپ کو خدا صحت اور فرصت دے کہ آپ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکیں اور میری اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر سکیں۔ اپنی طرف سے میں حوالے فراہم کرنے اور ماخذ کی نشان دہی کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں، اس لیے کہ اشاعت کی نوعیت کے مدِ نظر اس میں وہ تفصیلات شامل نہیں کی جا سکیں

عام طور سے علمی کتابوں کے لوازمات میں شمار ہوتا ہے۔
محترمہ نے ازراہ نوازش اپنا وعدہ پورا کیا اور کتاب کے پہلے چھتیس صفحات کا اردو ترجمہ جو میں نے ان کی خدمت
اگست ۱۹۹۳ء میں بھیجا تھا، اسے انھوں نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ ان صفحات میں محولہ اشعار اور نثری عبارتوں
صل متون بھی اکثر و بیشتر فراہم کر دیے۔ بقیہ اگلی بار تلاش کر کے فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ ہمارے اپنے
ین غالبیات سے بھی گزارش ہے کہ اس سلسلے میں مترجم سے تعاون فرمائیں تاکہ جب تصنیف باقاعدہ کتابی شکل میں
ہو تو ہر طرح سے مکمل ہو۔

مترجم

(سلسلہ ص ۱۶)

موں میں ہماری ملاقات بالعموم پریوں اور دیوؤں سے ہوتی ہے کبھی کبھی پری زادوں سے بھی ہوتی ہے جو پریوں کے طبقے
مرد ہوتے ہیں لیکن یہ انتہائی کاہل اور بے اثر ہوتے ہیں۔ اجنہ سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے۔ پریوں کے کردار عام طور پر
ہیں۔ وہ ہوس پرست ہوتی ہیں اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے خوب صورت اور نوجوان مردوں کو اڑا کر پرستان لے
ہیں اور اس سے جنسی تسکین کی خواہش کرتی ہیں اور اس کے انکار کرنے پر انھیں ایذا بھی پہنچاتی ہیں۔ وہ انھیں چھپا کر
تی ہیں اور راز فاش ہو جانے پر ماں باپ یا راجا اندر کا شکار بھی ہوتی ہیں۔ ان ڈراموں میں کبھی کبھی کوئی دیو یا ساحر کسی
پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے قید کر کے اپنی جنسی بھوک مٹانا چاہتا ہے مگر کسی بھی ڈرامے میں ان کی یہ خواہش پوری
ں کی گئی ہمیشہ کوئی انسان ساحروں اور دیوؤں کو شکست دے کر پری کو آزاد کرا لیتا ہے۔
تمام ڈراموں کا موضوع عشق ہے کوئی سماجی پہلو مشکل ہی سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما نگاروں نے مثنوی کے
قصے میں جہاں تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے وہ کہیں خوش گوار ہے اور کہیں ناخوش گوار۔ مثلاً مرزا نظیر بیگ نے زہر عشق
قصے میں پری کا ماہ جبیں کی قبر پر آسمان سے اترنا، ماہ جبیں کا قبر میں سے ہیرو سے باتیں کرنا اور درمیان میں کچھ مزاحیہ
شامل کر کے اس کلاسیکل ٹریجڈی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے کریم الدین مراد نے چترا بکاؤلی میں جو
یلی کی ہے اس سے انجام کو ایک منطقی جواز مل گیا ہے۔ آرام نے سحر البیان کے قصے میں جو تبدیلی کی ہے وہ بظاہر داستانی
کو ڈرامائی شکل دینا نظر آتا ہے لیکن انھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ طلسم الفت کے قصے میں سے تمام فوق
رت واقعات اور کردار خارج کر کے حافظ عبداللہ نے ایک جراءت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ مثنویوں سے ماخوذ یہ ڈرامے
ڈرامے کے سرمایہ کا بہت قیمتی حصہ ہیں جو ہماری غفلت کا شکار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں محفوظ کیا
ئے۔

***

نتالیا پیری گارنا

پیش لفظ

موجودہ دلی کے محلے بستی نظام الدین میں جیسے ہی آپ داخل ہوں آپ کو پھلہاروں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی دکا دکھائی دیں گی۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مال ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ دکان دار بے کار کبھی بیٹھے نہ رہتے۔ گاہک نہ ہوں تو وہ گیندے کے پھول اور کھلائے ہوئے گلاب کے ہار پروتے رہتے ہیں اور اگر پھول بالکل خ حالت میں ہوں تو انھیں نوچ نوچ کر ان کی پنکھڑیاں اکٹھا کرتے ہیں۔ کشتیوں میں ابھی ابھی چنی ہوئی گلاب کی پنکھڑیوں انبار لگے رہتے ہیں۔ گاہک کے لیے چشم زدن میں چوڑے سوکھے پتے کو موڑ کر دونا تیار کر دیا جاتا ہے اور اس کے اندر بھر پنکھڑیاں چھڑک دی جاتی ہیں۔ پھر کھونٹی پر گچھوں کی شکل میں ٹنگے پھول کے گجروں سے مال بہ قدر ضرورت الگ کیا ہے اور دونے میں رکھ کر گاہک کے حوالے کیا جاتا ہے۔ دکان دار دریا دل ہو تو وہ اوپر سے کبھی کچھ گلاب کی پنکھڑیاں چھڑ دیتا ہے۔

لیکن گلی میں اشیاءِ خوردنی کی مدہوش کرنے والی بو، انگیٹھیوں پر کڑکڑاتے ہوئے تیل کی چراند، عورتوں کے با کے جوڑوں میں گندھے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کی خوش گوار مہک اور کاری گروں کی دکانوں کے پاس سلگتے ہوئے لوبان کے نیل گوں دھوئیں کے مرغولوں کی وجہ سے گلاب کی خوش بو کا پتہ کبھی نہیں چلتا۔

اور شاید اس میں کچھ مصلحت بھی ہے۔ آخر گلاب اپنی خوش بو کی دولت وہاں کیوں بانٹے جہاں اس کے حسن و جمال قصیدہ خوانی کرنے والا ہی کوئی نہ ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ گلاب کا عاشقِ زار بلبل ہندوستان میں نہیں پایا جاتا۔۔۔ گل د کی داستانِ عشق سے مملو فارسی شاعری کے لیے بادی النظر میں، ہندوستان کی زمین ساز گار کیسے ہو سکتی ہے؟

لیکن یہ بستی نظام الدین ہی ہے جہاں کی خاک میں فارسی دنیا کے عظیم شاعر امیر خسرو دہلوی آسودہ ہیں جو ہندوستان کی عہدِ جدید کی زبانوں ہندی اور اردو کے اولین شاعروں میں بھی شمار ہوتا ہے۔

امیر خسرو کے مزار کے پاس ہی گلی کو ایک وسیع، سمنٹ کے فرش والی کھلی زمین سے علاحدہ کرنے والے جن کے پیچھے ایک سفید منقش پویلین مرزا غالب کی قبر اور سادہ سے لوح مزار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ شاعر کے جشن گرہ اور مشاعروں کے موقع پر یہاں بڑی بھیڑ رہتی ہے اور سنگِ مزار گلاب کی پنکھڑیوں کے انبار، گجروں اور پھولوں کے ہار سے ڈھک جاتا ہے۔ مگر عام دنوں میں یہاں سناٹا رہتا ہے، جنگلے کا دروازہ مقفل رہتا ہے، نہ پھول دکھائی دیتے نہ انسان اور دھوپ کی ناقابلِ برداشت تپش کے باوجود ہر جانب سے ہواؤں کے نرغے میں اس اکیلے مزار کو دیکھ کر دل کا جاتا ہے۔ جب کبھی غالب موت کے بارے میں سوچتے تھے وہ اس کا تصور خاکسترِ انسان کو ساری دنیا میں بکھیرنے ہوائے سرد کی شکل میں کرتے تھے۔ اپنی ایک فارسی غزل میں وہ لکھتے ہیں:

بعد مردن مشتِ خاکم در نورد صرصر است
بے قراری می زند موج از سراپا یم ہنوز

(میری موت کے بعد میری خاکستر بر فیلی ہواؤں کا شکار ہو جائے گی لیکن اس خیال سے میں اب بھی کانپ اٹھتا ہوں)۔
وہ اکثر اس بارے میں سوچا کرتے کہ ان کے کلام کے لیے کیسے نصیب کی توقع رکھی جا سکتی ہے اور کیسی زندگی اس کے
ٔدر میں لکھی ہے:

پیدا ست بے نیازی عشق از فنائے ما
گر زورقے شکست زدریا چہ می شود

ہم تو چلے جائیں گے لیکن عشق کی ازلی ماہیت تو تبدیل نہیں ہوگی۔ گرداب میں کشتی ڈوب جانے تو اس میں سمندر کا کیا
مان؟)

غالب نے اس شعر میں عہدِ وسطیٰ کے صوفی ابوالحسن خرقانی کے اس قول کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے: "سمندر کو
ی کی تباہی سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔" خرقانی انفرادی تجربے کی قدر و قیمت کا اندازہ قنوطیت کے نقطۂ نظر سے لگاتے
، وہ صرف وجودِ الٰہی کی دائمی اور ناقابلِ انحطاط ماہیت کی ثناخوانی کرتے ہیں۔

لیکن غالب کے شعر میں یہی الفاظ ایسا لگتا ہے کہ شخصی تجربے کی اہمیت اور غم کے مفہوم کے بارے میں غور و فکر
شاعر کے مقام اور غرض و غایت کے بارے میں خیال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ایک فارسی شاعر لکھتا ہے:

"تو گلاب بیچتا ہے؟ مگر سوال یہ ہے کہ اس کے بعد تو گلاب سے زیادہ خوب صورت کون سی شے خرید سکتا
ہے؟ چاہے تیرا گاہک ایک بادشاہ سے بھی زیادہ غنی کیوں نہ ہو، تجھے بہرحال منافع تو نہیں ہوگا۔"

لیکن یہ اشعار منافع اور کاروبار کے بارے میں نہیں ہیں۔ ان میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ چاہے اس "جنس" کی
ی ہی مانگ کیوں نہ ہو حسن کی بازار میں قیمت نہیں آنکی جا سکتی۔ حسن کے قدردانوں کے لیے گلاب، اس کے لگانے
نے ہر دام سے بیش قیمت ہے۔ اور یہی حال شاعری کا ہے۔ اس کی قیمت کا اندازہ کسی بھی مروجہ پیمانے سے نہیں لگایا
سکتا۔ مشرق کے شاعروں کے الفاظ میں زندگی کے بازار میں تخیل اور ہنر کے گلاب فروخت کرنے والا ہمیشہ نقصان ہی
ں رہتا ہے۔ عام طور سے زمانے کے پاس اس کے مال کی قیمت چکانے کے لیے زرِ نقد کی کمی رہتی ہے۔

مشرق میں حیاتِ جاودانی پا لینے والے شاعر کے نام کے گرد ہمیشہ تقدس کا ہالہ رہتا ہے اور اس کی آخری آرام گاہ
وام زیارت گاہ بن جاتی ہے۔

امیر خسرو کا تعلق نسلی اعتبار سے وسطی ایشیا کے ترک قبیلے لاچین سے تھا۔ ان کا سنہ پیدائش ۱۲۵۳ء اور سنہ وفات
۱۳۲۵ء تھا اور نام کے ساتھ "دہلوی" کی نسبت سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی شعری تخلیق کار میں وہ شہرِ دہلی سے جڑے تھے
ہے۔

یہ قسمت کا عجیب کرشمہ ہے کہ اردو شاعری کے عبقری اور ہندوستان کے آخری عظیم فارسی گو شاعر مرزا اسد اللہ خاں
لب، امیر خسرو کی طرح نسلاً ترک تھے۔ ان کے ہم عصر شاعر میر نے ایک بار کہا "ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتدا ایک

ترک لاچین سے ہوئی اور ایک ترک ایبک پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

امیر خسرو کو طوطیٔ ہند کا لقب دیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ ایک روسی قاری کو اس ترکیب الفاظ میں کوئی قابل تعریف بات نہ دکھائی دے، لیکن ہندوستان میں صرف اعلیٰ درجے کا شاعر ہی اس لقب کا مستحق ہو سکتا ہے، کیوں کہ مشرق کی بہت سی اقوام کی شاعری میں طوطے کو بہت ہی عقل مند اور خوش بیان پرند سمجھا جاتا ہے۔ اور خوش بیانی میں طوطے سے مقابلے پر اتر آنے میں شعرا کبھی سبکی نہیں محسوس کرتے۔ غالب لکھتے ہیں:

طوطیاں را نبود ہرزہ جگر گوں منقار
خوردہ خونِ جگر از رشکِ سخن گفتنِ ما

طوطیٔ خوش بیان نے یوں ہی اپنی منقار سرخ خونِ دل میں نہیں ڈبوئی ہے۔ اس کو دراصل اس بات کا آزار شک ہے کہ میں نے کس خوبی سے اپنی جراحتوں کی نقشہ کشی کی ہے۔

فارسی کے گلستانوں کا بلبل کہلانا، یہ نام وری میں حافظ، سعدی، نظامی، فردوسی، رودکی اور انھیں امیر خسرو کا ہم سر ہونا ہے، جن کے بغیر ہم فارسی شاعری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لقب کا مستحق ہونا ایک فارسی گو شاعر کے خوابوں اور آرزوؤں کی انتہا ہے۔

لیکن طوطیٔ ہند کہلانا ایک خاص عزت کی بات ہے، اور یہ غالب ہی تھے جو وراثت میں ان دونوں القاب کو پانے کے مستحق تھے۔ امیر خسرو کی طرح فارسی شاعری کے گلستانوں میں بھی ان کا اپنا مقام تھا اور خوش بیان طوطیانِ ہند میں بھی۔ یہ اس روایت کی خصوصیت تھی جس پر غالب عمل پیرا تھے۔ ان کے عہد کے اردو شعرا لازمی طور سے فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے اور اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے، لیکن خود اس شعری ذولسانیت کی نوعیت میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ دراصل ہندوستان میں فارسی شاعری کے آخری دن آ چکے تھے، جب کہ اردو شاعری اپنی تشکیل کے دور سے گزر کر اپنی بہارِ جاں فزا کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

مرزا غالب کی شاعری کی عظمت کو سمجھنا ان کے عہد میں معدودے چند افراد ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ شاعر کے پیمبرانہ الفاظ کی صداقت کو آشکار ہونے کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی:

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

(میرے دیوان سے لوگ اسی وقت سخن کی سرمستی حاصل کر سکیں گے جب کہ خریداروں کے کال کے باعث یہ شراب کہنہ ہو جائے گی۔ میرے ستارے کو عدم میں قبولیت کی بلندی حاصل ہے، اس لیے میری شہرت دنیا میں میرے بعد ہوگی۔)

شاعرانہ بصیرت کے مظاہر اپنی ماہیت میں تو ایک ہی ہیں، لیکن یہ ماہیت زبانوں کی مختلف ظاہری اشکال، پرانی روایات کی غیر نفوذ پذیری، زمانے کی تغیر پذیری، مختصر یہ کہ "چہرے کے جداگانہ تاثرات" کی وجہ سے ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کے باوجود بھی شاعری ان مشترک خصوصیات کی بدولت جو دنیا کے تمام بڑے شاعروں میں پائی جاتی ہیں

ہمیشہ بہ آسانی پہچانی جا سکتی ہے۔

غالب عالمی ادب کے ان متعبر اور دل کو چھو لینے والے عبقریوں میں سے ایک تھے جن کے اشعار کا ترجمہ کرنے کی بجائے اکثر دوسرے شاعروں کے کلام کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی روح کو دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "اصل م" اور "تراجم" اپنے از سرِ نو اتحاد کے بس منتظر ہی ہیں۔ اور پھر غالبؔ ہوریس (۶۵ تا ۸ قبل مسیح) کے "مترجم" بن جاتے ہیں اور مرینا سوئے تائے وا (۱۸۹۲ء - ۱۹۴۱ء) روسی شاعری کے وسائل سے غالب کے کلام کی از سرِ نو تخلیق کا کام انجام دیتی ہیں:

"آہ، شباب اور موت کے بارے میں میرے اشعار
جن کو کوئی پڑھتا نہیں
اور جو کتب فروشوں کے ہاں گرد میں اٹے ہوئے منتشر ہیں
جن کا نہ فی الحال کوئی خریدار دکھائی دیتا ہے، نہ مستقبل میں
آہ، میرے اشعار بیش بہا ~~اشعار~~ شراب کی طرح
تمھاری باری بھی ایک دن ضرور آئے گی۔"

بیسویں صدی عیسوی میں غالب کی شہرت ان کے وطن، برِ صغیر ہندوستان کی سرحدوں کے پار دور دور تک پھیل گئی۔ بلاشبہ دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد، لاہور اور کراچی کو اب بھی پہلے کی طرح ان بڑے مراکز کی حیثیت حاصل ہے جہاں غالب کی تخلیقات کے مطالعے، ان کی اشاعت، تصحیح متن اور ان پر تحقیق کا کام بڑی سرگرمی سے ہوتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں غالب کی تصانیف اور ان کے تراجم کی اشاعت، غالب کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کاموں، مقالات و مضامین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دہلی کے ایوانِ غالب اور غالب اکیڈیمی میں کتب خانوں کی الماریاں دنیا کے سبھی ملکوں سے آنے والی، غالب کے بارے میں کتابوں کا بوجھ مشکل سے برداشت کر پاتی ہیں۔ ان الماریوں میں تاریخ ادب کے سوویت ماہرین کی بھی کاوشیں، مضامین کے مجموعے، روسی اور سوویت یونین کی دوسری قومی زبانوں میں تراجم بھی ہیں۔ یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں غالب کا کلام صرف تراجم کی شکل ہی میں نہیں پڑھا جاتا۔ تاجکوں کو فارسی تاجک ادب کی کلاسیکی روایت سے براہِ راست وراثت میں ملی ہے اور غالب کے کلاسیکی فارسی کلام کا اصل متن ان کے لیے قابلِ فہم ہے۔ وسطی ایشیا اور برِ صغیر ہندوستان کے روایتی ادبی اور ثقافتی تعلقات کی توثیق وسطی ایشیا میں کلامِ غالب کی پذیرائی سے بھی ہوتی ہے۔ جمہوریۂ تاجکستان کی سائنسی اکیڈیمی کے کتب خانوں میں غالب کی متعدد تصانیف کے قدیم طباعت کے ایڈیشن محفوظ ہیں، اور تاجک اسکالروں نے نہ صرف غالب کا کلام جدید تاجک رسم الخط میں چھاپا ہے، انھوں نے غالب کے سوانح حیات، غالب پر تحقیقی تصانیف اور غالب کے اردو خطوط کا جدید تاجک میں ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔

اس کے باوجود فی الحال غالب کے ادبی ورثے کا باقاعدہ علمی مطالعہ مستقبل کا کام ہے۔ اس میں غالب کے کلام و نثر کے یورپ کی زبانوں میں ترجمے کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس نوعیت کے کام کی ایک مثال رالف رسل اور خورشید الاسلام کی کتاب ہے، جنھوں نے غالب کے بہت سے خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپی تاریخ ادب اور ادبی تنقید کے لیے اہم علمی مواد فراہم کر دیا ہے۔

۱۹۶۹ء میں ماسکو سے شائع شدہ غالب کی غزلیات کے مجموعے نے مشرقی شاعری کے منظوم روسی ترجموں کی

روایت کو جاری رکھا، جب کہ "منتخبات۔ مرزا غالب (۱۹۸۰ء) میں غالب کی غزلیات کے نثری ترجمے ملتے ہیں۔

قارئین کی خدمت میں پیش کی جانے والی یہ کتاب شاید حالیہ تاریخ ادب میں اس عظیم شاعر کی تخلیقی کاوشوں کو اس کے سوانح حیات کے تناظر میں متعارف کرانے کی واحد کوشش ہے۔ کتاب میں تازہ ترین علمی حقائق اور شاعری، شعریات، تاریخ اور علوم شرقیہ کے دوسرے شعبوں کی نئی تحقیقات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

غالب کی زندگی بیشتر آگرہ اور دہلی کے اسلامی ماحول میں مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہوں کے دور حکومت میں گزری، جس کا خاتمہ ۱۸۵۷۔۱۸۵۹ء کی اس عظیم عوامی بغاوت کی ناکامی کے ساتھ ہوا جس کی مصیبتیں غالب کو بھی جھیلنی پڑیں۔ اپنی زندگی کے باقی دن انھوں نے ایسے ہندوستان میں گزارے جو اب بلا شرکت غیرے تاج برطانیہ کے زیر نگیں تھا۔ معاشرے کی روحانی زندگی میں روایت کی غیر معمولی اہمیت تھی، اس لیے اس کتاب میں مذہبی اور جمالیاتی معیاروں سے وابستہ فکر شاعرانہ کی خصوصیات پر بھی قدرے تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

عہد حاضر سے ہم آہنگی غالب کی شاعری کی ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے لیکن اس خوبی کی صحیح قدر و قیمت جاننے کے لیے ان قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج کی صحیح حدود سے بھی واقفیت ضروری ہے جن کے اندر یہ شاعری پروان چڑھی۔ غالب کے ہم عصروں اور شاعری میں ان کے پیش روؤں کے مذہبی نظریات، معاشرے کا دستور اور رسم و رواج، شرفا کے ان حلقوں کی عادات و تعصبات جن سے غالب کا تعلق تھا، مختصر یہ کہ وہ سب جس سے اس عہد کا مزاج عبارت تھا، عجائبات کا ایک مرکب کہلانے کا مستحق ہے اور کبھی کبھی تو اس کی توضیح و تشریح ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ غالب کی زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو وسیع تاریخی اور ثقافتی سیاق و سباق کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کے باوجود اگر غالب کے عہد کے لوگوں سے ہمارا روحانی رشتہ ان امور کے مقابلے میں زیادہ استوار ہے جو ہم کو ان سے الگ کرتے ہیں تو اس کے لیے ہم کو بڑی حد تک غالب کی شاعری کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ سبھی ادبی شہ پاروں کی طرح غالب کی شاعری بھی پرانی روحانی روایات میں مضمر تمام رکاوٹوں اور حد بندیوں کو بالآخر توڑنے اور انسان کے دل سے دل تک سیدھا راستہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کی مصنفہ کی یہ کوشش رہی ہے کہ نہ صرف تاریخی صورت حال اور غالب کے عہد کی فضا کو دوبارہ چشم تصور کے سامنے لایا جائے اور شاعر کی زندگی کے واقعات کو اس شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے جو سلسلۂ کتب "مشرق کے ادبا و فضلا" کے مقاصد کے پیش نظر ممکن ہو، بلکہ اس کے آگے ایک اور قدم بڑھاتے ہوئے اس عہد کے انسان کی روحانی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

(باقی آئندہ)

***

(سلسلہ ص ۴۹)

میں مشہور ہیں۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی MRCP پروفیسر میڈیسن رہے۔ Fluresin پر کافی تحقیق کی اور پہلے عثمانین FRCP ہیں۔ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر جی بی راما FRCS عثمانیہ کے سرجن اور پروفیسر رہے۔ شہر کے نامور سرجنس میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جے۔ وی۔ دیسائی FRCS ماہر امراض نسواں تھے۔ پروفیسر اور سپرنٹنڈنٹ گاندھی اسپتال رہے۔ ڈاکٹر حامد علی بیگ MRC.Patch پروفیسر بایو کیمسٹری رہ چکے ہیں۔ کئی ممالک میں کام کر چکے ہیں اور اب دکن میڈیکل کالج کے وائس پرنسپل ہیں۔ میں نے حافظے سے کام لے کر عثمانیہ میڈیکل کالج کے درخشاں تاروں کے نام لکھے ہیں۔ فروگزاشت ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

یورپ سے واپسی پر ڈاکٹر سید عبدالمنان اور ڈاکٹر قاضی عبدالباری
کی گل پوشی (۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء)
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر سید عبدالمنان۔ فریدہ (دختر) ڈاکٹر قاضی عبدالباری

شہزادی اسریٰ مکرم جاہ اور جناب ظہیر احمد سفیر سعودی عرب نے
زیرِ تعمیر پرنس اسریٰ ہسپتال کا معائنہ کیا
تصویر میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، پرنس اسریٰ اور ظہیر احمد

ڈاکٹر سید عبدالمنان

ڈاکٹر سید عبدالمنان اور ڈاکٹر سلطان

اقبال متین

توقیت نامہ

(ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کی زندگی کے چند اہم سنین اور تاریخیں)

۱/ مئی ۱۹۱۶ء	ولادت بہ مقام حیدرآباد
۱۹۳۰ء	سٹی ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کیا۔
۱۹۳۲ء	کلیہ جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا۔
۱۹۳۷ء	عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔
جولائی ۱۹۳۷ء	ملازمت سیول ۔ دواخانہ عثمانیہ۔
۱۹۳۸ء	شادی بہ مقام مذفورٹ سکندرآباد۔
۱۹۳۹ء	ملازمت دواخانہ، سلطان بازار
۱۹۴۰ء	ملازمت دواخانہ نامپلی، دواخانہ خیریت آباد۔
۱۹۴۱ء	۔۔ ملازمت بہ حیثیت ڈاکٹر افواج باقاعدہ سرکار عالی۔ ۔۔ پرنس اعظم جاہ، کمانڈر ان چیف افواج باقاعدہ سرکار عالی کے شخصی معالج منتخب ہوئے ۔ ان کی قابلیت اور طریقۂ علاج سے متاثر ہو کر پرنس نے سات سال تک (یعنی ۱۹۴۷ء تک) ان کی منزلت کی۔
۱۹۴۷ء	۔۔ حکومت وقت (سرکار نظام) کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈیپوٹیشن پر انگلستان روانہ ہوئے۔ ۔۔ LEEDS GENERAL INFIRMARY میں ایک سال عملی کام کیا۔
۱۹۴۸ء	۔۔ عملی تعلیم کے حصول کے بعد L.R.C.P. اور M.R.C.S. کی تکمیل کی۔ ۔۔ ایڈن برا یونیورسٹی سے ڈپلوما ان ٹراپی کل میڈیسین اینڈ ہائی جن (D.T.M & H) حاصل کیا۔
۱۹۴۹ء	رائل انفرمری INFIRMARY ایڈن برا میں کام کیا۔
۱۹۵۰ء	۔۔ گلاسگو سے F.R.F.P.& S کا امتحان کامیاب کیا۔ ۔۔ رائل کالج آف فزیشین ایڈن برا سے M.R.C.P. کیا۔ ۔۔ پیرس کے مشہور دواخانے ہوٹل ڈیو (HOTEL DUE) میں زیادہ زبانیں جاننے کا دلچسپ تجربہ ہوا اور مقبولیت کی ایک انوکھی سند مریض نے پیش کی۔ (تفصیل مضمون میں)۔ ۔۔ یورپ کے اسی دورے میں فرانس، اٹلی، سوئٹزرلینڈ کی سیر کی جس کو تعلیمی اور تفریحی دونوں حیثیتیں حاصل ہیں۔ ۔۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں اپنے وطن حیدرآباد دکن کو واپس ہوئے۔
۱۹۵۱ء	۔۔ وطن واپس ہوتے ہی ۱۹۵۰ء کے اواخر ہی میں جنرل ملٹری ہاسپٹل میں

بحیثیت ڈاکٹر رجوع ہوئے۔ حیدرآباد نے انقلاب کی پذیرائی میں شاہی سے رشتہ توڑلیا اور افواج باقاعدہ کی برخواستگی عمل میں آئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر منان کی خدمات انڈین ملٹری ہاسپٹل ترمل گیری کے حوالے کی گئیں اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے بحیثیت مڈیکل اسپیشلسٹ ختم مارچ ۱۹۵۱ء تک کام کیا اور سبک دوش ہوئے۔

۔۔ یکم اپریل سے خانگی پریکٹس شروع کی۔

۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۵ء — اعلیٰ حضرت حضور نظام شاہ دکن کے خاص فزی شین کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ ڈاکٹر بہادر خاں صاحب معروف سرجن کا اس انتخاب سے تعلق خاطر رہا۔

۱۹۵۸ء — بغداد اور ایران کا سفر

۱۹۵۹ء — حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔

۱۹۶۳ء — ۔۔ دختر فریدہ سلمہا کی شادی۔

۔۔ بنجارہ ہلز روڈ نمبر (۱۱) پر ذاتی مکان کی تعمیر اور منتقلی۔

۔۔ فرزند فیض سلمہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان کو روانگی۔

۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء — گریجویٹ کانسٹی ٹیونسی سے عثمانیہ یونیورسٹی کی سینٹ (SENATE) کے ملیے منتخب ہوئے اور فوری بعد سنڈی کیٹ (SYNDICATE) کے لیے بھی انتخاب عمل میں آیا۔ چھ سال یعنی دو میقات تک ممبر رہے۔

۱۹۶۸ء — ۔۔ انڈین میڈیکل کونسل کے تین سال کے لیے رکن نامزد کیے گئے۔

۔۔ پرنسس اسریٰ کی خواہش پر شفاخانہ اسریٰ کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان اس دواخانے کے بانی ہیں۔ شاہ علی بنڈہ پر صرف خاص کے توشک خانے کی چھوٹی سی عمارت میں اس شفاخانے کا آغاز ہوا تھا۔

۔۔ طور بیت المال کے صدر منتخب کیے گئے۔ ہنوز ڈاکٹر صاحب موصوف ہی صدارت پر فائز ہیں۔

۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء — معتمد گورننگ بورڈ انوار العلوم کالج۔

۱۹۷۳ء تا ۱۹۹۲ء — شفاخانہ اسریٰ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ۱۹۷۷ء میں بہت ہی دیدہ زیب عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بہ حیثیت اعزازی فزیشین اور بہ حیثیت مہتمم دواخانہ ۱۹۹۲ء تک کارگزار رہے۔

۱۹۸۰ء — ۔۔ مجلس عاملہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے رکن منتخب ہوئے۔

۔۔ مجلس انتظامی ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظام اینڈ علاء الدین ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر (۱۹۹۲ء تک)۔

۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۳ء — ۔۔ وائس پریسیڈنٹ وقر شہوار ٹرسٹ فار ٹکنیکل ایجوکیشن۔

۔۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے رکن بنائے گئے۔

۱۹۸۳ء — ۔۔ ڈاکٹر علی محمد خسرو سفیر ہند برائے جرمنی کی دعوت پر جرمنی کا دورہ کیا۔ وہاں سے سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ اور انگلستان بھی گئے۔

-- ندوۃ العلماء لکھنؤ کی انتظامی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۸۳ء -- رشین پیس کمیٹی کی دعوت پر ماسکو اور لینن گراڈ کا دس روزہ دورہ کیا۔

-- گورننگ بورڈ ممتاز کالج کے رکن اور بعد ازاں صدر نشین بنائے گئے۔ آج بھی اس عہدے پر فائز ہیں۔

۱۹۸۴ء ممتاز یار الدولہ وقف بورڈ کے رکن اور بعد ازاں صدر نشین بنائے گئے۔ اس عہدے پر آج تک فائز ہیں۔

۱۹۸۵ء صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نامزد کیے گئے۔ اب بھی اس عہدے پر فائز ہیں۔

۱۹۸۶ء -- فیلوشپ میڈیکل اسسٹنٹ ان انڈین میڈیکل اسوسی ایشن۔

-- ممبر آف دی گورننگ کونسل آف سلطان العلوم ایجوکیشن سوسائٹی۔

-- عمرے سے مشرف ہوئے اور ساتھ ہی خلیجی ممالک کا دورہ کیا۔

۱۹۸۸ء -- فیلو آف دی کالج آف جنرل پریکٹیشنرز حیدرآباد۔

-- مسلم میٹرنٹی ہاسپٹل کی مشاورتی کمیٹی کے رکن از ابتدا تا ایں دم۔

-- کنسلٹنگ فزیشین:

○ ڈاکٹر سلطانس نرسنگ ہوم ماں صاحب ٹینک۔

○ محمد میموریل ہاسپٹل بہادر پورہ۔

***

(سلسلہ ص ۷۹)

جھلاتی رہتی ہیں۔

وہ بولی "کیوں نہ غصہ کروں۔ جسے اس پیٹ میں رکھی رہی وہ اب میری جانب دیکھتا تک نہیں۔ اس بد نصیب کا تو وہ چہرہ بھی دیکھ نہیں پائے۔ انھیں کی نشانی کو میں نے پال پوس کر بڑا کیا۔ جب یہ سینے سے لپٹ کر دودھ پیتا تھا تو لگتا تھا کہ وہ ہی میری گود میں بچہ بن کر لیٹے ہوئے ہے۔ مگر اس لڑکے نے دودھ تو میرا پیا اور آگیا تیرے کہنے میں۔ کبھی کبھی پوچھا کر میں جی رہی ہوں یا مر رہی ہوں۔ بے رحم کہیں کا۔ صرف چار روٹیاں مل جانے سے ماں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اسے کوئی پیار کرنے والا بھی تو چاہیے۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

تائی بولی۔ خالی پیٹ مالش ہوتی ہے، کچھ کھا ہی لو۔

وہ بولی، مجھے بھوک نہیں ہے۔ میرے پیٹ میں ایک بہت بڑا کرہ ہے جو کئی سال سے خالی ہے۔ کمرے کے فرش پر چیونٹیوں کے انڈے لڑھکتے رہتے ہیں اور اندھیرے میں کھو جاتے ہیں۔ وہ چپ چاپ دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ سامنے کی دیوار پر ایک مکڑی اپنا جال کاڑ رہی تھی۔

اقبال متین

ڈاکٹر سید عبدالمنّان

(چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد)

یہ باتیں ۱۹۴۰ء کی ہیں۔ میں نے منان بھائی کو پہلی بار اپنی پھوپی اماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ غالباً میٹرک کا بگڑا ہوا طالب علم تھا۔ میں اور لطیف ساجد اسکول اور کالج سے بھاگ کر آصفیہ لائبریری میں جو ان دنوں اسٹیٹ لائبریری ہے، دن گزارتے تھے۔ جانے کیا افتاد پڑی تھی۔ کچھ ہو گیا ہوگا۔ اسکول میں میری حاضری کم پڑ گئی ہوگی۔ پھوپھی اماں نے یہ کہہ کر میرے تردد کو دور کیا کہ چلو ممتاز بی بی کے دلہا سے تمہارے لیے طبی صداقت نامہ لے لیتے ہیں۔ اس طرح پہلی ملاقات میں ڈاکٹر منان سے میں نے اپنی کسی بیماری کا علاج نہیں کروایا۔ اس لیے کہ مجھے کوئی بیماری اگر تھی تو ان دنوں اس کا نام جوانی تھا جو منتاہوں دیوانی ہوتی تھی۔ مجھے اس دیوانی نے ایک ایسی لڑکی کے سپرد کیا تھا جس نے شعور کی گتھیاں سلجھانے کا کام میرے سپرد کر دیا اور خود بڑے اطمینان سے پھوپھی اماں کے گھر بیٹھی رہی۔ اب اس بیماری کا علاج نہ منان بھائی کے پاس تھا اور نہ ہی پھوپھی اماں اس مرض کے ازالے کے لیے مجھے منان بھائی سے رجوع کر سکتی تھیں۔ چناں چہ صاف صاف منان بھائی کے سامنے میرے اسکول کے اوصاف حمیدہ رکھنے پڑے۔ میں خجل ہوتا رہا اور منان بھائی نے کچھ کہے بغیر چپ کے سے ایک بیماری مجھے عنایت کر دی جس کو میں نے جیب میں محفوظ کر لیا اور اسکول میں میرا کام بن گیا۔

اس پہلی ملاقات میں میری آنکھوں نے دیکھا تھا کہ منان بھائی کے دیوان خانے میں ایک معمولی سی لکڑی کی کرسی دھری تھی جس کا کشن CUSHION بھی اگر اس کو کشن کہا جاسکے تو لکڑی کا ہی تھا۔ اس سے لگی ایسی ہی میز اور اس کی دوسری جانب ایسی ہی ایک اور کرسی۔

عزا خانۂ زہرا سے ذرا آگے سڑک کی داہنی جانب، گلی میں ایک چھوٹا سا مکان تھا اور اس چھوٹے سے مکان میں ایک دراز قد چھریرے بدن کا دل موہ لینے والا ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ میرے منان بھائی تھے جو صرف میری ممتاز آپا کے ساتھ رہتے تھے۔ ویسے ڈاکٹر منان آج بھی میرے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اب ایک عالم ان کے ساتھ ہے اور اب یہ میرے نہیں ہمارے ہو گئے ہیں۔ جس کو دیکھو وہی دعوے دار ہے کہ منان اسی کے ہیں۔ آج بھی یہ ممتاز آپا کے ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن خلقت خدا ان کے ساتھ رہتی ہے۔

ان دنوں میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ٹوٹتی ہوئی معصومیت، شعور کے اوبڑ کھابڑ راستے بہرحال قدموں تلے بچھاتی ہے۔ کچھ سوچے نہ سوجھے میں بھیگتی ہیں تو ذہن نچلا نہیں بیٹھتا۔ لگتا ہے زندگی کا بہت کچھ بھیگ رہا ہے۔ میرے دل میں منان بھائی کا گھر دیکھ کر طبی سرٹیفکیٹ پالینے کے بعد بھی الجھن سی تھی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ہو جانا معمولی بات نہیں تھی اور ڈاکٹر ہو کر ایسی ازدواجی زندگی گزارنا اور غیر معمولی بات تھی کہ شادی کی بارات تو گزر گئی لیکن اپنے اجالے گھر کے کسی گوشے میں کہیں چھوڑ سے۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ ممتاز آپا جس گھرانے سے منان بھائی کے گھر آئی تھیں

س کے تمول کی میرے بزرگ قسم کھا سکتے تھے۔ بجز اس معمولی سی لکڑی کی کرسی اور فالتو سی میز پر ڈاکٹری کرنے والا جس
لو میری پھوپھی اماں نے دلہا بنایا تھا، یا تو ڈاکٹر نہیں ہو سکتا یا دلہا نہیں۔ لیکن میرے منان بھائی خیر سے ان دونوں خواص
سے متصف تھے۔ ممتاز آپا میری تایازاد بہن ہیں۔ حیدرآباد کے جاگیردارانہ سماج میں معاشرہ جس اڑن کھٹولے پر اڑتا تھا،
اں چھوٹے موٹے دلہا دلہن بھی اس کس مپرسی کی سوغات کو اپنے گھر کی زینت نہیں بنا سکتے تھے اور منان بھائی کی شادی
خانہ آبادی ہوئے سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا ایسے میں وہ سارا فرنیچر کیا ہو گیا جو منان بھائی کا گھر سجانے ممتاز آپا
اپنے ساتھ لے آئی تھیں؟ لیکن میں اپنی اس ذہنی الجھن کو کس سے رجوع کر سکتا تھا۔ پھوپھی اماں سے ایسی بات نہیں
پھی جا سکتی تھی۔ اپنے مستقبل کا پاس و لحاظ تھا مجھے کہ کہیں وہ کچھ اور مطلب نہ نکال لیں کیوں کہ میں نے اور میری
پھوپھی زاد بہن نسیرہ نے غیر شعوری طور پر مستقبل کے عہد و پیمان لفظ و تکلم کی اعانت کے بغیر کچھ اس طرح کر رکھے تھے
ن کی آنکھوں کے سوا کوئی زبان نہیں تھی۔

میں نوہ میں تھا۔ میرے خاندان کے کسی بزرگ نے آخر ش مجھے بتلایا کہ اس سر پھرے انا پسند دلہا کے پندار
نے جہیز کے نام سے فرنیچر قبول ہی نہیں کیا۔ مجھے پہلے ہی کمیونسٹ لٹریچر نے معاشرے کی معاشی نابرابری کے احساس
نے کبیدہ خاطر بنا رکھا تھا، ایسے میں منان بھائی کی منزلت، دل ہی دل میں میرے نزدیک اور بڑھ گئی۔ میں نے کبھی اپنی
پھوپھی اماں کو اپنی شادی میں کچھ نہ لے کر منان بھائی کے عطا کیے ہوئے پہلے طبی صداقت نامے کا معاوضہ کچھ اس طرح
نہیں پیش کیا کہ نہ مجھے کچھ خبر ہوئی نہ پھوپھی اماں کو دیکھیے کیسے چھوٹے چھوٹے واقعات ذہن کی تربیت میں کیسے اتق
جاگر کر جاتے ہیں۔

اس طرح منان بھائی نے میری عادتیں خراب کیں۔ ۱۹۷۸ء کے اواخر میں حیدرآباد چھوڑنے تک میرے محکمے کی
دھی نوکری میں نے کی اور آدھی ملازمت ڈاکٹر منان نے سرانجام دی۔ میں نے ہر قسم کی رخصت حاصل کی۔ بھلا کوئی
ملازم سرکار ایک دن کی رخصت خاص بھی اس آسانی سے "لگا دیتا ہے"؟ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ عہدہ دار تنگ
تھے۔ کارنامہ ملازمت، نامۂ اعمال سے کم سیاہ نہ تھا۔ اور اس سیاہی کے پوتنے میں منان بھائی ہاتھ بٹاتے جاتے تھے۔
مجھے بیمار پڑنے کی ضرورت ہوتی کہ میں اپنی صحت کے ساتھ ان کی طرف لپکتا۔ منان بھائی مڈیکل سرٹیفکٹ چاہیے۔ منان قلم
تھامنے کے بہانے ہاتھ بڑھا کر قلم کے ساتھ کسی بیماری کو بھی دبوچ لیتے جو سامنے ہی میز پر دست بستہ پڑی ملتی اور اس
بیماری سے مجھے نواز دیتے۔ عطا کردہ صداقت نامہ میری جیب میں ہوتا۔ عہدہ داروں پر ڈاکٹر کے نام اور ڈگریوں کی دھونس جم
اتی اور میرا کام بہر حال بن جاتا۔

آپ نے کہیں ایسا مسیحا دیکھا ہے جو جب چاہتا ہے بیماری چھین لیتا ہے اور جب چاہو بیماری سے نواز دیتا ہے۔ منان
واقعی قلم کے دھنی ہیں اور دل کے غنی بھی۔ جو بیماری چاہو دے جاؤ اور جو بیماری چاہو لے جاؤ۔ اس طرح انھوں نے اپنی
میز پر میرے محکمے کی آدھی ملازمت میرے بجائے کی اور وقتاً فوقتاً نئی نئی بیماریوں سے مجھے نوازا۔ یہ سب کچھ آپ کو اس لیے
بتا رہا ہوں کہ آپ نے ان کی صرف مسیحائی دیکھی ہوگی۔ یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دوسروں کا دکھ درد بانٹنے کے لیے اپنے اجلاس
پر دوسروں کا دفتری کام بھی انجام دیا کرتے ہیں۔

منان بھائی کی شخصیت بھی بڑی جو مکھا شخصیت ہے بلکہ وہ ایک مشن ہیرا ہیں۔ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے
لیے ان پر آنکھیں کھونٹ دار کرنے پڑیں گے۔ یہ مشن ہیرا ہر نظر کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔ کیا اپنا کیا پرایا، سب کے سب گھائل
بھی ہیں، قائل بھی۔ میں ایک نادر کی بات بتاؤں۔۔۔۔ اور منان بھائی سے اجازت لیے بغیر بتاؤں۔۔۔؟ میں ایک بار ان کی کلینک

سے کے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ ایک بے پردہ خاتون، برقع پوش خاتون سے کہہ رہی تھیں:
"یہ عجیب ڈاکٹر ہیں، ان سے علاج کرواتے ہوئے بیمار رہنے کو جی چاہتا ہے۔"
برقع پوش خاتون نے کہا۔ اسی لیے تو کہتی ہوں، پردے کی بڑی فضیلت ہے۔ مجھے دیکھو برقع نے لاج رکھی ہوئی ہے۔
ڈاکٹر صاحب کو پتہ ہی نہیں کہ میں کب سے ان کی بیمار ہوں۔
دروغ بر گردن راقم، ویسے راوی اور راقم میں انمیں ہیں کا فرق ہے، رے، الف، زبر دونوں میں مشترک ہے، جیسے دونوں خواتین کے درمیان آنکھوں کا پردہ اور برقع کا پردہ دونوں مشترک ہیں۔
آپ کو ایک راز دار جانا ہی ٹھہرا تو پھر ایک اور راز کی بات سنائیں۔ مسز منان یعنی اپنی ممتاز آپا سے اجازت لیے بغیر۔ ایک بار میں منان بھائی کے گھر میں بیٹھا آپا سے باتیں کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ آپا نے اٹھ کر ریسور اٹھایا۔ بغور سنتی رہیں۔ پھر بڑی سادگی اور دھیرج سے کہنے لگیں:
"ابھی تو ڈاکٹر صاحب نہا دھو کر سج دھج کر باہر گئے ہیں۔ ان کا موٹر بس گیٹ تک پہنچا ہو گا۔ قریب ہوتا تو روک کر آپ سے بات کرواتی۔ مجھے آپ کا نام تو نہیں بتایا۔ ہاں کہیں اور ناشتے ہی پر گئے ہیں، اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کچھ بتا بھی رہے تھے ---- کوئی جانم یا بیگم کہا تھا۔ شاید لنچ تک آپ کے پاس بھی پہنچ جائیں۔"
ریسور رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔
"جانتا ہے کس سے بات کر رہی تھی۔"
میں نے کہا، جی نہیں، نہیں جانتا، کوئی خاتون ضرور تھیں۔
کہنے لگیں "بہت بے چین لگتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ناشتے پر بلایا تھا۔ جانے کیا کیا تیاری کی ہوگی بے چاری نے۔"
میں جانتا تھا منان بھائی نے ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا اور میں نے کیک کی بہت تعریف کی تھی۔ آپا کہنے لگیں:
"کیوں کیسا مذاق کیا ہے۔ بے چاری منتظر ہوں گی اور خفا بھی کہ ناشتہ مجھ کو چھوڑ کر کس کے ساتھ کر لیا۔"
آپا بڑے اعتماد سے ہنستی رہیں اور میں ان کے اعتماد پر ہنستا رہا۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

منان بڑے آدمی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بڑا آدمی اتنا ہی پیارا بھی ہو جتنے منان ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح داری، ان کے لہجے کی گھلاوٹ، ان کی بات چیت کی نرم نرم سپردگی۔ تکلم کی بے ساختگی میں مزاح کی چاشنی۔ جو بھی ان سے ملتا ہے انھیں کا ہو رہتا ہے۔ بھری محفل سے آدمی کو چرا لیں گے اور اس سرقے میں سب سے زیادہ دخل ان کی انسان دوستی کو ہے کہ جو ان کی فطرت ہے، ان کا مزاج ہے۔
آدمی کو اس کے جی جان سمیت چرا لینے کا فن منان بھائی کا بہت پرانا فن ہے۔ اس لوٹ لینے کے ہنر میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امیر و غریب، مرد و زن، شاہ و گدا سب یکساں ہیں۔ آپ ان کے اس وصف کا اندازہ اس واقعے سے لگا سکتے ہیں۔ اس بات میں زیبِ داستاں کے لیے مبالغہ اگر کہیں ہو سکتا ہے تو صرف اس حد تک ہے کہ مبالغے کی کہیں گنجائش ہی نہیں۔ کاش وہ بھیگی ہوئی آنکھیں آج بھی اس تحریر کو پڑھنے کے لیے کھلی رہتیں۔
۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر منان اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر نظام سرکار کی جانب سے ڈیپوٹیشن پر جب انگلستان جا رہے تھے تو انھیں دنوں پرنس اعظم جاہ نے بھی تفریحاً انگلستان کا قصد کیا۔

شاہ زادۂ وقت جو شاہ دکن کے بعد تخت و تاج کا وارث ہونے والا تھا۔ جس کی تیوری کے بل سے باشندگان شہر و سلطنت کے مقدر وابستہ ہونے والے تھے۔ منان کی دل پذیر و سحر انگیز شخصیت کے آگے کتنا مجبور محض تھا، سوچتے جائیے تو سوچ کے راستے متعین ہو سکتے ہیں۔ زندگی ایک ایسے دفتر کے جس کا اور چھور نہیں ملتا تازہ و پارینہ اوراق نظروں کے آگے بکھیر بکھیر کے کبھی موتی چنواتی ہے، کبھی آنسو رلواتی ہے۔ ذہن بیدار کو کچھ ہاتھ لگ گیا، لگ گیا۔ نہ ملا تو صرف ہاتھ کی لکیریں رہ گئیں جو ہر ایک سے پڑھی نہیں جاتیں۔

تفریح ختم ہوئی، سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ پرنس اعظم جاہ اپنی حکومت، اپنی سلطنت، اپنے پایۂ تخت، اپنے شہر نگاراں کے سارے دل افروز و ذی شان تصورات کو سمیٹے اپنے وطن کو لوٹنے کے لیے اپنے احباب، متعلقین، لواحقین و مصاحبین کے ساتھ ایروڈرم پر آئے۔ جمگھٹ میں گھرا، ہنستا بولتا یہ شاہ زادہ، پرواز کا وقت قریب ہو رہا تھا تو کہیں کھو جاتا۔ ہنستے ہنستے اسے سانپ سونگھ جاتا۔ شگفتگی چہرے پر بار نہ پاتی لیکن مصاحبین اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھڑی جمانے کا فرض ادا کرنے کے لیے ہی تو تھے۔ سو وہ کبھی کامیاب ہو جاتے۔ شاہ زادے کے چہرے کا تاثر بدل جاتا لیکن پھر وہی گمبھیرتا۔ ایروڈرم پر خدا حافظ کہنے والوں میں منان۔ بھی تھے۔ ہوائی جہاز کی پرواز کا وقت بہت قریب ہو گیا تو اعظم جاہ منان کی طرف بڑھے۔ منان کے پیچھے پیچھے بیرسٹر عطاالرحمن بھی تھے جنھوں نے یہ منظر نہ صرف دیکھا تھا، اس کی رقت میں شامل ہو گئے تھے۔ پرنس نے منان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ کہا "تم میرے ساتھ واپس چلو۔ میں تمھارے لیے یہاں کوئی کمی نہیں رکھوں گا۔ تمھیں تعلیم کے لیے پھر اسی اہتمام سے بھجوا بھی دوں گا۔ لیکن اس وقت تو چلے چلو تم"۔ منان نے بہت دل جوئی کی۔ پچکار کر سمجھایا کہ میں جلد ہی تعلیم ختم کر کے آجاؤں گا۔ پرنس نے سب سن کر منان کی طرف نظریں اٹھائیں تو ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پرنس نے صرف اتنا کہا کہ:

"منان کیا میں تمھیں چھوڑ کر رہ سکوں گا۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

منان کا گلا رندھ گیا۔ "جی میں بہت جلد تعلیم مکمل کر لوں گا بہت جلد آجاؤں گا۔"

پرنس نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا: "تو کیا تم مجھے چھوڑ کر رہ سکو گے ؟"۔ پرواز کا اعلان ہوا۔ اور منان بادیدۂ نم شاہ زادے کو رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا دیکھتے رہے۔

پھر نہ وہ شاہی رہی نہ پاس داریاں، وہ شان و شکوہ نہ دل داریاں۔ وہ آیا دھاپی وہ افراتفری مچی کہ ہر دستار فضیلت فراز سر کے لیے ترس ترس گئی۔ منان کی دور رس نگاہیں پہلے ہی سب دیکھ چکی تھیں۔ وہ والا شان اعظم جاہ کے ساتھ جذباتی رفاقتیں نبھانے میں اس وقت محتاط نہ ہو جاتے تو آج ان کا اپنا مستقبل بھی ان کی زندگی کا احتساب شاید وہاں تک کرتا جہاں تک آج منان کی شخصیت کی رسائی ہوئی ہے۔

منان کی اس ہر دل عزیزی سے تو آپ سب ہی واقف ہیں۔ ان کی اس معصومیت سے کتنے لوگ واقف ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم۔ جب مجھے قلب کا عارضہ ہوا اور یہ احساس ہوا کہ میں بھی صاحب دل ہوں تو میں نے ضرورتاً اپنے قلب کی حفاظت کے لیے منان بھائی سے کچھ جھجک کر، کچھ تامل کر کے آخر پوچھ ہی لیا۔

کیا میں مہینے میں آٹھ دس بار ڈیڑھ دو پگ وسکی پی سکتا ہوں؟۔

کچھ سوچ کر پوچھا۔ "متین بھائی۔ پگ کتنے اونس کا ہوتا ہے ؟"۔ میں دم بخود رہ گیا۔ ان کے سامنے سر بھی نہیں پیٹ سکتا تھا۔ دل پیٹ لینا بس میں نہیں تھا۔ سوچتا رہا کہ اس شخص نے مغربی ممالک میں تعلیم پائی، وہیں برسوں گزارے، کیا اسی "گریٹ فرینڈس" کو پگ (PEG) کی بجائے اونس (OUNCE) پر ٹرخایا ہو گا اور پھر منان بھائی تو نظام سرکار کی فوج

میں ڈاکٹر تھے۔ کیا نظام کی ساری فوج (PEG) کی بجائے اولسن میں ہی ناٹک ٹوئیاں جارتی رہی ہوگی۔ ایسی پا
معصومیت پہ پیار بھی آتا ہے ترس بھی آتا ہے۔

منان فارسی فرفر بولتے ہیں۔ بقول کسے (نام نہیں بتاؤں گا) منہ زبانی فارسی بولتے ہیں۔ لیکن نہ خمینی کی جمہوریت
عشوہ طرازی معلوم نہ ظرف قدح خوار کا اندازہ۔ نہ پیر مغاں سے نسبت نہ مئےکدے سے آشنائی۔ فارسی بولنا جانتے ہیں، فارسی
نہیں آتا۔ بزمِ "بنت عنب، کڑوی دوا کی خوراک ہوئی" احمد فراز کا یہ شعر اک ذرا تصرف کے ساتھ منان بھائی نذر کروں:

یہ میں بھی کیا ہوں، اسے جان کر اسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا، ہم سفر اسی کا رہا

لیکن اسی فارسی دانی نے، انھیں بہ انداز دگر نہال کرنا چاہا تھا سو وہ بھی منان قبول نہ کر سکے۔ "زبان یار من ترکی"
والی بات نہیں تھی۔ مریض یارِ من فارسی والی بات تھی۔ منان ساری نعمتوں سے منہ موڑ کر چلے آئے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء
ہے۔ پیرس کے مشہور دواخانے، ہوٹل ڈیو "HOTEL DUE" میں منان دوسرے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ گھوم
رہے تھے کہ ایک نرس دوڑی دوڑی آئی اور ایک کینیڈین ڈاکٹر سے کہنے لگی۔ میں بہت پریشان ہوں مدد کیجیے۔ اس نرس نے
تفصیل یوں بتلائی کہ دواخانے میں چند روز قبل ایک عجیب سی نئی زبان بولنے والا نوجوان داخل ہوا ہے۔ نہ میری زبان وہ
سمجھتا ہے نہ اس کی ایک بھی مجھے سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے علاج میں مجھے بہت دقت ہو رہی ہے۔ ذہنی الجھن کا الگ شکار ہو رہی ہوں
کینیڈین ڈاکٹر انگریزی جانتا تھا۔ منان کو سب کچھ بتایا تو منان اس کے اور نرس کے ساتھ بیمار سے ملنے گئے۔
صحیح طور پر نہیں معلوم کہ منان بھائی کو ہمدردی مریض سے تھی یا معالج سے۔ بیمار سے ملے تو معلوم ہوا کہ یہ گورا چٹا
ایرانی ہے۔ منان بھائی نے دل چسپی لی، حال احوال پوچھا۔ فارسی زبان یوں بھی منہ میں قند و نبات گھلاتی ہے۔ نوجوان کے
درد کو منان بھائی نے زبان و لہجے کے مرہم سے کچھ اس طرح بھگویا کہ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ تیزی سے شفایاب ہو رہا
ہے۔ اب اس نوجوان کو اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ ڈاکٹر منان کی مسیحا صفت شخصیت کو کچھ اس طرح اپنا لیا جائے کہ اس
مکمل علاج تک منان کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ اس نے بتلایا کہ وہ بہت متمول گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ پیٹ کے درد سے
تنگ آگیا ہے۔ اس دواخانے کی بہت تعریف سنی تو عاجز آکر کسی سے کچھ کہے سنے بغیر یہاں آگیا ہے۔

منان اس کی کیفیت فارسی میں پوچھتے جاتے، انگریزی میں کینیڈین ڈاکٹر کو سمجھاتے اور وہ فرانسیسی میں نرس کو
کیفیت لکھواتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ایرانی نوجوان پر ڈاکٹر نے توجہ دی تو اس کو ڈاکٹر منان سے نہ صرف امید بندھ گئی بلکہ
غریب الوطنی میں اس احساس نے دل کو تقویت دی کہ یہاں بھی اس کا کوئی ہے۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ منان جلد
اپنے وطن لوٹنے والے ہیں تو وہ اداس ہو گیا۔ منان ایک بار اس سے ملنے گئے تو ڈاکٹر قاضی عبدالباری بھی ساتھ تھے۔ منان
نے باری کو ملاتے ہوئے کہا کہ یہ بھی ڈاکٹری کی یہاں تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ میرے دوست بھی ہیں، ہم وطن بھی اور
روز میں اپنے وطن لوٹ جائیں گے تو نوجوان نے لجاجت سے رو نہار ہو کر کہا میری خاطر ہفتہ عشرہ ٹھہر جائیے۔ میرے و
میں مدد کیجیے۔ میں خود کو بہت بہتر پا رہا ہوں۔ میں پیرس کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹل میں آپ کا اور آپ کے دوست کے
و طعام کا انتظام کروا کے دلی خوشی محسوس کروں گا۔ اتنی خوشی کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ منان مجبور تھے۔ واپسی
تاریخ طے ہو چکی تھی۔ خود ان کو اور ڈاکٹر باری کو اس پیش کش کے قبول نہ کرنے کا قلق تھا۔ ڈاکٹر منان اس نوجوان کو دلا
دے کر چلے آئے۔

دلاسا دینے میں منان کو شاید مہارت اس لیے حاصل ہے کہ وہ دلوں کے معالج ہیں۔ میرے معالج بھی تو وہی

بیماری کے آغاز سے آج تک کتنی صفائی سے پگ (PEG) کو اونس میں گھول کر رکھ دیا ورنہ ساقی گری کی شرم کرنی پڑتی۔ اس پر مستزادیہ برخوردارانہ انداز تو دیکھیے: "معین بھائی پگ کتنے اونس کا ہوتا ہے؟ جی جل کر رہ جاتا۔ ہوتا ہوگا پانچ اونس کا یا آدھے پاؤ اونس کا مگر یہ "معین بھائی" کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ منان عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ رشتے میں بھی بڑے ہیں۔ انسان تو وہ مجھ سے بڑے ہیں ہی۔ پھر یہ معین بھائی کیوں بھئی۔ میں بھی کیوں اخلاص کا مارا بنا رہوں۔ کب تک یہ ظلم برداشت کروں۔ اپنی عمر چھپانے کے لیے اپنے چھوٹوں سے ایسی برخورداری! جی ہاں — سن رکھیے — منان مجھ سے عمر میں آٹھ سال سے زیادہ بڑے ہیں۔ لیکن میرے لیے صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ کون تسلیم کرے گا کہ میں منان سے عمر میں چھوٹا ہوں۔ لوگ ہنسیں گے۔ مرد تو صرف مسکرا کر رہ جائیں گے۔ بہت سی عورتیں تو غصے میں مسکرا بھی نہ سکیں گی۔ انتقام لینے کا بھی وسیلہ نہیں۔ بہت جی کڑا کرتا ہوں لیکن ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ رعب ہی ایسا گانٹھ رکھا ہے منان بھائی نے۔ ہر طرف جھنڈے گاڑ دیے۔

یہ دوائیں، یہ ساری مڈیکل سائنس تو ان کے گھر کی داسیاں ہیں۔ ہم نے ادب کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ عمر بھر قلم گھس کر ادب کے پھوس کی ایک جھونپڑی اپنے لیے بنائی تھی۔ انھوں نے یہاں بھی محل کھڑا کر دیے۔ ہر ادبی انجمن ان کی زنبیل میں۔ ہر اصلاحی اور فلاحی ادارے کے وہ کرتا دھرتا۔ ہر امدادی یا خیراتی درس گاہ کے وہ ان داتا۔ ساری نیکیاں بس اسی ایک نام کے ساتھ منسوب۔ سارا علم و ہنر ان کا۔ ساری دانشوری اور باشعوری ان کی۔ جب کوئی بت بن کر سامنے اس طرح کھڑا ہو جائے کہ ہر دیکھنے والے کی نظریں جھک جھک جائیں تو ہمارے لیے بھی پوجنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ دراصل کچھ اتھل پتھل مجھ ہی میں ہے۔ اتنے اچھے انسان مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ ہر دل میں گھر کیے بیٹھے ہیں۔ اچھی خاصی اجارہ داری ہے۔ ہمارا بھی تو کچھ ہو۔ آپ تو ہمارے سائے تک اٹھا لے جانے کے درپے ہیں۔ ہم ادھر بضد ہیں کہ اپنا پرتو بھی کچھ تو آپ پر پڑے۔ اپنی پرچھائیاں بھی کہیں تو آپ کا راستہ روکیں۔ لیکن مجبوری سی مجبوری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عمر کی بات چھڑی ہے تو ہم جل گئے ہیں ورنہ منان اپنی عمر چھپانا چاہتے ہی نہیں۔ بھلا انھیں ضرورت ہی کیا پڑی جب کہ ان کی عمر بڑھتی ہی بہت چھپ چھپ کر ہے۔ دراصل یہ بھی منان کی کسر نفسی ہے کہ انھوں نے مجھے ہمیشہ معین بھائی کہا اور صرف اس لیے کہا کہ ان کے آگے کچھ اپنی کسی بڑائی کا احساس مجھے بھی ہو۔ ورنہ منان بھائی کی عمر کے پیمانے میں "365" دن کا ایک مہینہ ہوتا ہے۔

مجھے بڑی تمنا تھی کہ منان بھائی کے خلاف بھی کبھی، کہیں کچھ سنوں۔ ایک دن یہ تمنا پوری ہوتی نظر آئی۔ دل بیمار بلیوں اچھلنے لگا۔ ایک صاحب اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ منان بھائی کے تجویز نسخے ہاتھ میں تھے۔ خوبصورت سی بیوی۔ بھلے سے میاں۔ اچھا سا بچہ میاں کی گود میں، کیوں کہ بچہ ہمیشہ میاں کی گود میں ہی اچھا لگتا ہے۔ بہت دل برداشتہ لگ رہے تھے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ کوچہ منان کی خاک شفا سے ان کی پہلی پہلی شناسائی ہے۔ اپنی مسز سے کہہ رہے تھے۔ "بس نام ہی نام ہے۔ اونچی دوکان پھیکا پکوان والی بات لگ رہی ہے۔ کچھ دیکھا ہی نہیں۔ سنا ہی نہیں۔ بچوں کی تو پھر آنکھیں دیکھیں، تمھاری تو آنکھیں بھی نہیں دیکھیں اور دونوں کے لیے دوائیں لکھ ماریں۔ جی چاہا میں تو جوان سے کہوں۔

"فکر نہ کرو منان جانتے ہیں کہ کون سی آنکھیں کہاں دیکھنی چاہئیں۔"

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ اپنے صاحب سے بیگم کچھ کہہ رہی تھیں۔

"کچھ دن علاج کر کے دیکھ ہی لیتے ہیں۔ آخر فیس تو دے ہی دی ہے نا۔"

دراصل ڈاکٹر منان کو اپنی مسیحائی کا عرفان ہو چکا ہے اور اسی عرفان مسیحائی نے ان کی دوکان چلا رکھی ہے۔ ورنہ ان صاحب کو تو ڈاکٹروں کے معمولی حربے بھی نہیں معلوم۔ لیکن دو ہی دن گذرے ہوں گے وہی خوب صورت جوڑا اپنے بچے

کے ساتھ منان بھائی کے کلینک میں خوش خوش بیٹھا اپنا نمبر لگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید اس اونچی دوکان کے پھیکے پکوان کا مزہ لگ گیا تھا اسے۔

برنارڈ شا نے کہا تھا کہ ڈاکٹر قاتل ہوتے ہیں اور اسٹیتھسکوپ ان کے قتل کرنے کا ہتھیار۔ برنارڈ شا نے یہ این ریش وبرودت شاید مقتول ڈاکٹر دیکھے ہی نہیں۔

منان بھائی جیسا قلندر صفت ڈاکٹر مجھے نہیں ملا۔ ان کی یہ قلندری جواں سالی سے ان کے ساتھ ہے جب کہ پیشہ ور ڈاکٹر والا لگ جانے تو پھر کوئی حربہ نہیں چھوڑتا۔ ڈاکٹر منان پر ڈاکٹر بنکٹ چندر کی شفقتیں ان دنوں زباں زد تھیں۔ ان دونوں کا دلوں سے تعلق اور دلوں کا تعلق سمجھ میں بھی آتا تھا۔ لیکن منان، ڈاکٹر بہادر خاں کے بھی چہیتے تھے جب کہ سرجری سے منان کا تعلق مریض کے ہاتھوں اپنی جیب کٹوا لینے سے زیادہ نہیں۔ اپنی جیب کٹوا لینے کے اوصاف میرے منان بھائی میں شروع سے پائے جاتے ہیں۔

اب دیکھیے نا۔ ۱۹۵۲ء کے اس واقعے کے آغاز و عواقب پر غور کیجیے ۔ ڈاکٹر بہادر خاں نے جن کا نام سرجری کی کتابوں میں محفوظ ہو چکا ہے، منان کو اپنی خوشی چھپائے بغیر کہلا بھیجا کہ فوری چلے آؤ کہ کنگ کوٹھی میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص فزی شین کی حیثیت سے تمہارے نام کا انتخاب ہو چکا ہے۔

منان، جب ڈاکٹر بہادر خاں سے ملے تو انھوں نے دیکھا کہ یہ شخص اپنے چہرے کی بشاشت کہیں چھوڑ آیا ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ، نہ جگنوؤں کی چمک جیسی حاضر جوابی۔ پوچھا، بات کیا ہے؟

منان نے کہا۔ "جی۔۔ میں کنگ کوٹھی کے قابل نہیں ہوں۔"

بہادر خاں چوکنے والے نہیں تھے، کہا:

"صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کنگ کوٹھی تمہارے قابل نہیں ہے۔۔"

ڈاکٹر منان سٹ پٹانے، خود کو سنبھالا۔۔ کہا "جی وہ۔۔ دستار۔۔ بگلوس۔۔ یہ سب کچھ مجھ سے ۔۔ کیا میرا کام کٹوایا نہیں جا سکتا۔

ڈاکٹر بہادر خاں نے مسکراہٹ دبا کر کہا اچھا جاؤ تم کام تو شروع کردو۔ تم جو چاہو گے دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر منان ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک شاہ کے خاص فزیشین رہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ کنگ کوٹھی میں ڈیوٹی رہتی۔ دستار اور بگلوس دونوں لزوم رومی ٹوپی نے چھین لیا تھا۔۔ حکیم مقصود جنگ اور حکیم بڑکر یونانی طب کے یہ بڑے نام بھی اپنی اپنی دستار فضیلت سنبھالے منان کی رومی ٹوپی کے ساتھ تھے۔

منان بھائی کے عروج میں بھی یہی قلندری ان کی پہچان بنی رہی۔ شہر کے ان چوٹی کے ڈاکٹروں میں شامل ہیں جو انگلیوں پر گنے جاتے ہیں، لیکن آج تک نہ معائنہ کرنا آیا نہ مریض کو اس کی بیماری بتلانا۔ مریض ادھر ان کے ہاتھ لگا ادھر اس کا مرض گیا۔ یوں دوکان نہیں چلتی۔ پہلے معائنہ کرنا چاہیے۔ مریض کو لٹانا چاہیے۔ پھر بٹھانا چاہیے۔ بٹھانے کے بعد انگلیوں سے اس کی پیٹھ ٹھونکنی چاہیے ۔ پیٹھ ٹھونکنے کے بعد ذرا اس طرح غور و خوض کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر کے اس عالم مراقبہ کو مریض بھی بغور دیکھے۔ پھر اس کو چت لٹا کر پیٹ پر سے قمیص کھسکا کر اپنے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں اس کے پیٹ کے کسی ناپسندیدہ حصے پر رکھ کر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کو بجانا چاہیے اور آواز کو بغور سننا چاہیے۔ خواہ کوئی آواز آئے کہ نہ آئے بغور سننے کی شرط لازم ہے۔ یہ عمل تین بار کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اسٹیتھسکوپ فوری سینے پر نہیں رکھنا چاہیے کہ مریض کے بھی سینہ سپر ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو ڈاکٹر اس عمل معائنہ سے گریز کرتے ہیں ان کی مسیحائی بہت

ہو بھی جاتے تو ان کی مالی توانائی مشکوک رہتی ہے۔ چوں کہ آپ ان کے بنجارہ ہلز کے مثالی خوش نما بنگلے میں جو کبھی فلم کی شوٹنگ تک کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، آج اردو شعر و ادب کی پرچھائیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اب یہاں آپ کو قمقموں کی روشنی میں موم بتیوں کا گداز مل سکتا ہے۔ یہاں کشنس (Cushions) کے صوفوں کی نرمی کو بستر شبِ ہجراں کی سلوٹوں کی صورت تصور میں دیکھ سکتے ہیں۔ چناں چہ میرے محترم منان بھائی سے بصد ادب التماس ہے کہ فنِ معائنہ کی طرف توجہ دیں۔ اب بھی بہت وقت پڑا ہے۔

منان کی ڈاکٹری کو تشخیص کے سارے بندھے ٹکے اصولوں سے بیر سا ہے۔ ان کی مسیحائی چہرہ دیکھ کر کام کر جاتی ہے۔ اگلے وقتوں میں ایک طبیب حاذق ہوا کرتے تھے۔ نام تھا حکیم "نابینا صاحب"۔ صاحب گویا نام کا جز تھا۔ نبض دیکھ کر بیماری تو کیا سلسلۂ حسب نسب بھی جان لیتے تھے۔ ان دنوں بھی ایک ڈاکٹر ہے جو صرف چہرے پر نظر ڈال کر بیماری تو کیا ذہن و دل کا سارا کرب پہچان لیتا ہے۔ یقین ہے کہ حکیم نابینا صاحب کی طرح سنہ ۲۰۹۴ء میں یعنی سو سال بعد لوگ منان بھائی کو ڈاکٹر "بینا صاحب" کے نام سے یاد کریں گے۔

آج عمر کی اس منزل میں بھی ڈاکٹر منان کی فعال شخصیت، محنت سے جی چرانے والوں کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ ان کی اس فعالیت کا خمیر اٹھا ہی محنت اور محبت کے اتصال باہمی سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی دوسروں کے دلوں میں ان کی چاہت کا مقام و احترام یک رنگ ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر سلطانس نرسنگ ہوم موقوعہ ماں صاحب ٹینک چلے آنے کی ایک بار زحمت کیجیے۔ آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ڈاکٹر منان نے کس طرح ڈاکٹر سلطان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح اپنے مرشدِ فن کے آگے بچھ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر منان کی عظمت کا عکس ڈاکٹر سلطان کی نجابت میں صاف نظر آتا ہے۔

مجھے جب منان بھائی نے ڈاکٹر سلطان سے پہلی بار ملایا تھا تو میری حیثیت اہلِ غرض کی تھی۔ میرے بیٹے وحید اقبال کی اپنے نرسنگ ہوم میں ٹریننگ کے لیے ڈاکٹر سلطان نے منان بھائی کی سفارش قبول کر لی تھی۔ میں نے جب ان کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے جس انکسار سے منان بھائی کی توصیف میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا اور جو جملے ان کی زبان سے ادا ہوئے میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر سلطان اس نرسنگ ہوم کے مالک و مختار ہیں۔ مانتا ہوں کہ منان بھائی کی شخصیت کے عکسِ جمیل نے ڈاکٹر سلطان کے جمالِ طبع کو آراستہ کیا ہے۔ لیکن اعتراف کا یہ انداز کہ معترف خود کو پاؤں کی دھول بنا لے ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے، بڑا ظرف چاہیے۔ گویا ڈاکٹر سلطان نے میرے شکریے کے جواب میں مجھے فیض احمد فیض کا یہ شعر یاد دلا کر تڑپا دیا۔

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک ذرا تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

منان بھائی کے اوصاف بیان کرنے سے زیادہ انھیں چھیڑنے میں مجھے لطف آتا ہے۔ ویسے وہ سامنے ہوں تو زبان میں لکنت آجاتی ہے اور یہی لکنت جب صریرِ خامہ بنتی ہے تو پھر خود مجھے لطف آنے لگتا ہے۔

ایک ایسی راز کی بات بتاتا چلوں جو کم از کم مجھے نہیں بتانی چاہیے۔ یہ ڈاکٹر میرے قبیلے کا بڑا دیوانہ ہے۔ اور یہ قبیلہ اپنی انا، اپنے پندار، اپنی اکڑفوں اور کھردرے پن کے سبب پہچانا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ ادیبوں اور شاعروں کا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے میں کوئی شخصیت چھوٹی پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ہر شخص دوسرے سے بڑا ہوتا ہے۔ ہر فرد دوسرے سے عظیم۔ اس عظمت کا کوئی اور چھور بھی نہیں ہے۔ کوئی پیمانہ یا آلۂ پیمائش بھی نہیں ہے۔ اس بڑائی کے لیے کسی سند کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ نجاری اور خیاطی سے لے کر جراحی اور مسیحائی تک ہر چھوٹے بڑے علم و ہنر کا امتحان ہوتا ہے۔ میرے قبیلے کا علم و ہنر یوں ہے کہ وہ

تعلیم روحانی سے شدید سی روحانیت نسبت خاص رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی بندۂ خدا اس کا امتحان لینے کا اہل نہیں ہے۔ اور اسی ۔
وہ خود بھی اپنا امتحان نہیں لے سکتا۔ کائنات چوں کہ میرے قبیلے کی جیب و دامن میں ہے اس لیے میرے قبیلے کا
کائنات میں سما ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر منان اس کا علاج معالجہ، دوا دارو، اس قدر محبت اور منزلت سے بلکہ خشوع اور خضو
سے کرتے ہیں کہ میرے قبیلے کی توقیر مسلم ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ دیکھا آپ نے بس، یہی فر
نابینا حکیم اور بینا ڈاکٹر میں ہے۔ حکیم نابینا سب کچھ پہچان کر بھی قبیلہ نہیں پہچان سکتے تھے اور آج ڈاکٹر بینا نہ صرف قبیہ
پہچان لیتے ہیں بلکہ ہر دکھ درد کا رشتہ اس قبیلے سے جوڑ کر اس کا مداوا کرتے ہیں۔

میں نے اب تک آنکھوں دیکھی اور من بیتی ہی سنائی ہے۔ آپ نے بھی تو کچھ دیکھا ہی ہوگا۔ یہ تو ضرور دیکھا ہوگا
منان فیس اس طرح لیتے ہیں جیسے کسی معشوق کا خط لے رہے ہوں۔ گھبرائے، گھبرائے، خجل خجل۔ بند مٹھی کا بھرم ب
مٹھی سے رکھیں گے۔ دراز میں اس طرح فیس ڈال دیں گے کہ خود ان کی نظر بھی نہ پڑے۔ اردو شاعری معشوق کی بے اعتنا
سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ڈاکٹر منان کے اکثر مریض ان سے اردو شاعری کا سا سلوک نہیں کرتے۔ بھلا ایسے پیارے آدمی
کون شرمندہ کرے۔ بس اسی حساب سے ڈاکٹر منان کے دراز میں فیس پہنچتی ہے۔ سینکڑوں مریض شہر میں میری طر
سفاک ہیں اور اسی شہر میں اگر کوئی ڈاکٹر نجیب الطرفین کے ساتھ ساتھ اجتماع ضدین بھی پکارا جا سکے تو وہ میرے منا
بھائی ہی ہیں۔ فیس لے کر اداس سے لگیں گے اور فیس نہ پا کر ایسے شاداں و فرحاں کہ چہرے کی کرنیں چھپانے نہیں چھپیں
گی۔ اسی لیے تو جن دنوں ان کی مسیحائی کا طوطی بول رہا تھا۔ کرائے کے مکان میں جو سلیمہ خاتون کی مسجد کے سامنے حمایت نگ
میں تھا، کیسے مطمئن اور مگن تھے وہ بس دو ہی قسم کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں بھرے کتے ہی ان کی امارت کی نشا
تھے۔ عمارت کی نشانی کچھ نہ تھی۔

میں جانتا ہوں کہ میری اور منان بھائی کی رفاقتوں کے سہارے خود میرے اپنے کتنے ہی ایسوں نے منان بھا
سے بھرپور استفادہ کیا جب کہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ان کے اپنے تصرف کے طور طریق بھی بڑے تصوف ؟
تھے۔ ممتاز آپا کو کبھی دیکھا ہو کہ نہ دیکھا ہو لیکن منان سے رشتہ استوار رکھا۔ سوچتا ہوں کوئی اور ہوتا تو کلینک کے نام سے ا
کا اچھا خاصہ ہاسپٹل ہوتا۔ بینک بیالنس کے نام سے بینک ہوتا۔ لیکن میں جانتا ہوں ان کے پاس کیا ہے۔ کیا نہیں ہے۔
شخص جو دینا زیادہ جانتا ہو اور لینا کم کم اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔ ویسے ان کی دولت مندی سے نہ مجھے انکار ہے نہ آپ کو ہو سکا
ہے۔ ان کی جائیدادیں شہر بھر میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر اس دکھی دل میں جو منان سے وابستہ ہوا ہے منان موجود ہیں۔ کتنے
انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل منان کے چلتے پھرتے مکان ہیں اور ان مکانوں میں پناہ لینے کے لیے منان نے اپنا سکھ چین
کھویا ہے۔ راتوں کی نیندیں تج دی ہیں۔ نم آنکھوں کے سمندر کھنگالے ہیں، تب کہیں جا کر انھیں یہ جائیدادیں ملی ہیں۔ یہ دولت
جو انھوں نے کمائی ہے نہ کسی قارون کے پاس تھی نہ کسی برلا، ٹاٹا کے پاس ہے۔ ہمارے شہر کا یہ بے سرمایہ، سرمایہ دار
دولت مند کروڑ پتیوں میں بھی اپنا ایک امتیاز رکھتا ہے۔

کوئے جاناں میں بھی آتا تھا طرح دار فراز
لیکن اس شخص کی کج دھج ہے سر دار جدا

-ooo-

ڈاکٹر سید عبدالمنان

عثمانیہ میڈیکل کالج

حکومت حیدرآباد میں شہر اور اضلاع کے دواخانوں میں کام کرنے کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے
یک عرصے سے میڈیکل اسکول قائم تھا جس میں میٹرک پاس کرنے کے بعد چار سالہ تعلیم ہوتی اور یل۔ یم۔ یس کا
پلوما دیا جاتا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد انجینیرنگ، طب، قانون، زراعت، علاج حیوانات کے شعبوں کے قیام کی تجویز
ہوئی تاکہ فنی تعلیم بھی اعلیٰ پیمانے پر ہوسکے۔ طب کی تعلیم کے لیے میڈیکل کالج کا قیام ١٩٢٧ء میں عمل میں آیا اور فیکلٹی
ف میڈیسن جامعہ عثمانیہ سے اس کا الحاق ہوا۔ طرز تعلیم انگلستان کی جامعات کے مطابق تھا۔ طب کی تعلیم جو بیش تر صوبہ
ات برطانوی ہند میں رائج تھی، اس کے مماثل رکھی گئی اور یم۔ بی۔ بی۔ یس کی طیلسان تک داخلے کے لیے تعلیم کا بندوبست
اکیا۔ کم از کم انٹرمیڈیٹ طبعیات، کیمیا اور حیاتیات کے مضامین کے ساتھ اچھے نمبرات حاصل کرنے والوں کو داخلہ دیا
اتا تھا۔ چوں کہ داخلے کے امیدوار طالب علموں کی تعداد منظورہ نشستوں سے کم ہوتی تھی اس لیے داخلے کے لیے مقابلے کا
نی امتحان نہیں تھا اور پرنسپل صاحب کے انٹرویو پر داخلہ دیا جاتا تھا۔ ابتدا میں ہر سال بہ مشکل پندرہ بیس طالب علم
تے۔ اس طرح پانچ سالوں میں جملہ تعداد سو سے زیادہ نہ ہوتی۔ یہی صورت حال ١٩٤٥ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد جب
داد ہزاروں تک پہنچ گئی تو داخلے کے لیے مقابلے کے امتحان منعقد کیے جانے لگے۔ تعلیم پانچ سال پر محیط تھی۔ پہلے ڈیڑھ
ال میں اناٹمی (تشریح الابدان) اور فعلیات کی تعلیم ہوتی۔ اس کے بعد پہلا فنی امتحان (1st Professional Exam) اس
کے بعد ڈیڑھ سال تک جرثومیات Bacteriology، امراضیات Pathology اور علم الادویہ Pharmeacology کی تعلیم
وتی۔ اس کے بعد دوسرا فنی امتحان (2nd Professional Exam) اس کے بعد چھ ماہ کی ایک میقات Term ہوتی جس
یں Medical Jurisprudence اور Forensic Medicine پڑھائی جاتی۔ اس کے بعد تیسرا فنی امتحان ہوتا۔ اس کے
ڑھ سال بعد طب، جراحی، امراض چشم، قبالت اور امراض نسواں کا آخری امتحان Medibine Surgery Ophtholeugy،
Obstetrin and Gyneacolog ۔ فائنل امتحان کامیاب کرنے کے بعد بطور ہاؤس سرجن ایک سال تک دواخانہ عثمانیہ
یں کام کرنا پڑتا۔ اس زمانے میں Stipend بھی دیا جاتا تھا۔ میڈیکل کالج میں فیس سالانہ صرف ایک سو روپیہ تھی۔
ہلے سال کے امتحان میں جو طالب علم اول آتا اس کو بر سری ملتی جو ٢٠ روپیہ ماہانہ وظیفہ اور معافی فیس پر مشتمل ہوتی۔ دوم
بر پر آنے والے کو سترہ روپیہ ماہانہ وظیفہ اور تیسرے نمبر پر آنے والے کو صرف معافی فیس ہوتی۔ چوں کہ اس وقت تک
معہ عثمانیہ کی عمارات تعمیر نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے قدیم افضل گنج دواخانے میں جو عثمانیہ دواخانے کی شاندار اور
سیع عمارت بننے کے بعد خالی تھا، اس میں طبیہ کالج قائم کیا گیا چار سال قبل تک "کلیہ طبیہ جامعہ عثمانیہ" کا بورڈ موجود
ما۔ اس عمارت میں پرنسپل اور ان کا انتظامی دفتر شعبہ فعلیات Phsycology، شعبہ علم الادویہ اور شعبہ علم الامراض،
ب خانہ اور چھوٹا سا حصہ طالب علموں کی یونین کے لیے۔ میڈیسن، سرجری اور اتھالوجی کے لکچر دواخانہ عثمانیہ کے لکچر
ل میں ہوتے۔ اناٹمی کا شعبہ ایک علحدہ عمارت میں تھا جس میں مردہ خانے، لکچر ہال اور Dissection ہال تھے۔ اس وقت
[illegible]

رزیڈنسی کی عمارت کے احاطے میں تعمیر ہوئی۔ پرنسپل کرنل فرحت علی تھے جو ایک گمبھیر شخصیت رکھتے تھے۔ ان کا حسن
انتظام اور ڈسپلن قابل تعریف تھا۔ اناٹمی کے پروفیسر ڈاکٹر برج موہن لعل، ڈاکٹر شنکر پرشاد سیہگل ریڈر اور ڈاکٹر رنگاریڈ
ڈیمانسٹریٹر تھے۔ اناٹمی کی کلاس صبح ۸ بجے شروع ہوتی اور بارہ بجے ختم ہوتی۔ وقفے کے بعد فعلیات کی کلاس ہو
ڈاکٹر سید عبدالرحمن پروفیسر فعلیات، آر۔ ین۔ ابھیانکر ریڈر اور ڈاکٹر عابد حسین ڈیمانسٹریٹر تھے۔ پروفیسر علم الادویہ ڈاکٹ
شنکر وامن ہارڈیکر تھے۔ یہ M.D.M.R.C.P. (اڈنبرا) تھے اور اپنی تحقیق ملیریا اور کونین کے استعمال کے لیے مشہور تھے۔ ا
کو دواخانۂ عثمانیہ میں اپنے خاص علاج کے لیے ایک وارڈ بھی تھا۔ پروفیسر آف میڈیسن پہلے ڈاکٹر مرزا حسن علی خان تھے
بعد کو ڈاکٹر بنکٹ چندر M.R.C.P. پروفیسر ہوئے۔ وہ مدتوں تک پروفیسر رہے اور تیس سال حیدرآباد کے افق پر چھا
رہے۔ سرجری کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید حسن تھے اور دواخانہ عثمانیہ کے فرسٹ سرجن بھی تھے۔ ماہر امراض چشم ڈاکٹر
عبدالرحیم صاحب، امراض چشم پڑھاتے تھے اور دواخانے میں Eye Ward کے Obstetrict صدر تھے۔ قبالت ا
امراض نسواں میجر اچ۔ آر۔ ڈبلیو ہنٹ پڑھاتے تھے۔ چوں کہ یہ اردو سے ناواقف تھے اس لیے جامعہ نے ان کو انگریزی م
پڑھانے کی اجازت دے رکھی تھی اور امتحان کے پرچے بھی انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ صحتِ عامہ کے پروفیسر جنا
محمد صدیق اور میڈیکل جورسپروڈنس کے ڈاکٹر مدن گوپال سنچر تھے۔ عثمانیہ میڈیکل کالج کے نام سے طب کی تعلیم کا مع
بلند ہوا اور جب یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے باہر کے ملکوں میں جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے فن کو آگے بڑھا
ایک طرف عوام کی خدمات بہتر سے بہتر طریقے پر ہونے لگیں۔ نیز فن کے معیار میں بھی اضافہ ہوا۔

حکومت حیدرآباد ابتدائی دور میں تیسرے سال کے امتحان میں اول آنے والے طالب علم کو انگلستان میں تعا
حاصل کرنے کے لیے وظیفہ دیتی تھی۔ پہلی مرتبہ یہ وظیفہ ڈاکٹر بہادر خاں کو ملا جو لیڈز یونیورسٹی میں شریک ہو
MBCHB کی سند حاصل کی۔ پھر MCH and FRCS میں کامیابی حاصل کی۔ واپسی پر عثمانیہ دواخانے کے فرسٹ سر
اور پروفیسر عثمانیہ ہاسپٹل مقرر ہوئے۔ سرجری میں بہت نام کمایا اور دواخانہ عثمانیہ کے مہتمم کی حیثیت سے وظیفے پر سب
دوش ہوئے۔

دوسرا وظیفہ ڈاکٹر ابوطاہر محمد عبدالقادر کو ملا۔ یہ بھی انگلستان سے لوٹنے ہی پر کئی عہدوں پر فائز رہے اور آخر
ناظم طبابت آندھرا پردیش بن کر وظیفے پر علاحدہ ہوئے۔

پہلے بیاچ کے ڈاکٹر منور علی بھی FRCS کرکے لوٹے تو عثمانیہ میں سرجن اور پروفیسر سرجری ہوئے۔ سا
حیدرآباد کے بعد کراچی منتقل ہوئے اور آخر تک وہاں کامیاب سرجن کے طور پر مشہور رہے۔ ڈاکٹر شنکر راؤ یادھو
MRCP کرکے لوٹنے کے بعد عثمانیہ دواخانے میں فزیشین اور پروفیسر ہوئے اور حیدرآباد کے مشہور فزیشین رہے۔ ڈا
نظام الدین نے امراض دق میں خصوصی مہارت حاصل کی اور دق کے علاج میں جب کہ موجودہ ادویہ ایجاد نہیں ہوئی تھ
انھوں نے ان مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ ان کا دوسرا کارنامہ گاندھی میڈیکل کالج کا قیام تھا۔ نامساعد حالات اور مال
کمی کی وجہ سے اس کالج کو حکومت کے حوالے کرنا پڑا۔ ڈاکٹر قاسم حسین صدیقی بھی انگلستان سے واپسی پر بیس سال
کاردنیر کے عہدے پر فائز رہے۔ ڈاکٹر کنول چندر نے امراض سینہ و دق میں خصوصی تعلیم حاصل کی۔ دواخانۂ امراض س
دق کے مہتمم رہے۔ ڈاکٹر غلام احمد ناظم صحت عامہ ہو کر وظیفے پر علاحدہ ہوئے۔ ڈاکٹر یوسف الدین ا... نے اڈنبرا سے
ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عثمانیہ میڈیکل کالج میں پروفیسر فارماکالوجی رہے۔ بعد کو عثمانیہ میڈیکل کالج کے پر
رہے۔

ڈاکٹر محمود علی نے امراض چشم میں FRCS Do لندن سے کیا۔ مدتوں کراچی میں لیاقت نیشنل ہاسپٹل میں کام انجام دیا اور اب آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ کام بھی کر رہے ہیں اور اردو میں سائنٹفک مضامین پر کتابیں جو معیاری ہیں شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر احمد محی الدین نے لندن یونیورسٹی سے اناٹمی میں پی ایچ۔ ڈی کی اور عثمانیہ میڈیکل کالج میں ریڈر رہے۔ ملایا یونیورسٹی میں پروفیسر پھر سندھ میں لیاقت میڈیکل کالج کے قیام میں بہت کام کیا اور وہاں پروفیسر اناٹمی رہے۔ بغداد میڈیکل کالج میں پروفیسر اناٹمی رہے۔ پھر Nigeria میں پروفیسر اناٹمی رہے۔ ملایا میں پھر دوبارہ پروفیسر ہوئے۔ بعد ازاں ریاض میں پروفیسر اناٹمی رہے۔ اس طرح تقریباً نو جامعات میں پروفسر اناٹمی رہے۔ انھوں نے اناٹمی میں معیاری کتاب تصنیف کی۔ غیر معمولی قابلیت، سمجھ بوجھ کے انسان ہیں۔ آج کل لیورپول میں خانہ نشین ہیں۔

راقم الحروف ڈاکٹر سید عبدالمنان گلاسگو اور اڈنبرا سے MRCP اور DT.MH اڈنبرا کے حصول کے بعد پراکٹس میں مشغول ہے۔ حیدرآباد کے پرانے شہر میں شاہ علی بنڈہ پر پیر ٹیبل اسپتال پرنسس اسریٰ اسپتال قائم کیا اور دس سال تک اس کا مہتمم رہا۔ اب یہ دواخانہ دکن میڈیکل کالج کا Teaching Hospital ہوگیا۔ ڈین آف فیکلٹی آف میڈیسن بھی رہا۔

ڈاکٹر میر موثق الدین MRCP کرنے کے بعد کئی دواخانوں میں فزیشین رہے۔ بمبئی کے St. George Hospital کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ وظیفے کے بعد مکہ معظمہ منتقل ہوگئے اور وہیں انتقال کیا۔ ڈاکٹر ابوالکلام صدیقی مرحوم نے کاکتیہ میڈیکل کالج کے قیام میں اہم رول ادا کیا اور کئی اضلاع پر سول سرجن رہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین جعفری مہتمم دواخانہ امراض متعدی رہے اور بعد کو شریک ناظم طبابت کے عہدے سے وظیفے پر علاحدہ ہوئے۔

ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ جو بطور Legend کے حیدرآباد کے عوام میں تیس سال تک مقبول رہے، شب و روز عوام کی خدمت کر کے ان کا دل موہ لیا۔ رات بھر موٹر میں سفر کرتے اور مریضوں کے مکان پر جاکر معائنہ اور علاج کرتے۔ وہ غیر معمولی شہرت کے حامل تھے۔ ڈاکٹر قاضی عبدالباری نے بھی تیس سال تک عوام کی خدمت کی۔ ڈاکٹر معین الدین خاں سندوزئی نے MRCP کے بعد امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر پیتھالوجی رہے۔ اب کویت میں کارگزار ہیں۔ ڈاکٹر معین بیگ، ڈاکٹر اشفاق حسین رضوی، ڈاکٹر عبدالحفیظ حقانی، ڈاکٹر ذکی حسن، ڈاکٹر اقبال علی خاں، ڈاکٹر قریشی اور کئی عثمانیہ کے فارغ التحصیل کراچی اور دیگر شہروں میں مقیم ہیں اور اپنے اپنے مخصوص علاج میں نامور ہیں۔ شعبہ امراض چشم میں ڈاکٹر شیام سندر نے FRCS.Do کیا بہت مشہور ہوئے اور عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حیدر خاں عثمانیہ میڈیکل کالج کے پہلے M.D. ہیں۔ امریکہ میں کارڈیالوجی کی ٹریننگ حاصل کی۔ اب شہر کے نامور کارڈیالوجسٹ ہیں۔ ڈین آف فیکلٹی آف میڈیسن بھی رہے اور گاندھی اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے وظیفے پر علاحدہ ہوئے۔ ادارہ Mesco کے صدر اور IDB کے کنوینر ہیں۔

ڈاکٹر ای۔ ین۔ واگھرے نے ایم ڈی اور بعد کو MRCP کیا۔ پروفیسر آف میڈیسن اور پھر عثمانیہ ہاسپٹل کے سپرنٹنڈنٹ رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر جے وی نرسنگ راؤ MRCP پروفیسر آف میڈیسن رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اعظم، ایم۔ ڈی۔ پروفیسر آف میڈیسن گاندھی میڈیکل کالج ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین ماہر امراض چشم کی حیثیت سے شہر کے مشہور معالج چشم ہیں۔

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ مجید خان ماہر امراض نفسیات و امراض دماغی کی حیثیت سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر

ڈاکٹر سید عبدالمنان

جینے کا فن

لوگ ہمیشہ بڑے کارناموں کی کھوج میں سرگرداں رہتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ زندگی کو ہنسی خوشی کے ساتھ بسر کیا جائے۔ اس دنیا میں آسان ترین کام یہ ہے کہ "مرجائیے"۔ مشکل ترین یہ کہ "زندہ رہیے"۔ جس نے زندہ رہنے کی مہم کو سر کرلیا اس نے گویا سب سے بڑا کارنامہ انجام دے دیا۔ بے شک جینا ایک مشکل فن ہے۔ اس کے لیے بھی ریاضت، شوق اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس نے اس فن کو سیکھ لیا اس سے یہ سوال ہی بے کار ہے کہ اس نے دنیا میں آکر کیا کیا سیکھا۔

کیسی خوش آئند بات ہے کہ اگر ہم خود ہنسی خوشی جئیں اور دوسروں سے بھی کہہ سکیں کہ اپنے چہروں کو غمگین اور اداس نہ بنائیں۔

زمانہ حال کے ایک مشہور فرانسیسی اہل قلم "اندرے ژید" نے اپنے سوانح میں لکھا ہے کہ خوش رہنا انسان کی ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ ہماری انفرادی زندگی اور اس کے بسر کرنے کی نوعیت کا اثر صرف ہم تک ہی محدود نہیں رہتا وہ متعدی ہوتا ہے۔ گویا ہمارے طرز زندگی کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کے جذبات و احساسات کا احترام کریں۔ خود افسردہ ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں پر پڑتا ہے۔ دریا کی سطح سے ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن کنارے تک پہنچنے تک اس سے کتنی ہی بے شمار چھوٹی بڑی لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں ہماری کوئی بات محض ہماری اپنی نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ صرف اپنے لیے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ یہ مسئلہ آسان نہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ جن مسائل کو دنیا صدیوں کی کاوشوں کے بعد بھی حل نہ کر سکی انھیں ہم محض اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے حل نہیں کر سکتے۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک تارک الدنیا کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے حسن قلم نے یہاں کھینچ رکھا ہے، جس میں سورج کا جلال، چاند کا جمال، ستاروں کی جھلملاہٹ، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائی ہے۔ ایک بجھے ہوئے دل اور اکتائے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم اس تصویر میں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں وہی زندگی سج سکتی ہے جو اپنے اندر امنگ اور ولولہ رکھتی ہو اور جو چاندنی میں نکھر کر تاروں کی چھاؤں میں دمک کر اور پھولوں کے بیچ میں کھل کر اپنے لیے جگہ پیدا کر سکتی ہو۔

"مسرت" کا لفظ عام ہے لیکن اس کا حصول مشکل۔ سوائے چند کے شاذ ہی کوئی ایسا ہو جس کے لیے خدا داد ملتی ایک پکے ہوئے پھل کی طرح دامن میں ٹپک پڑے۔ دنیا عجیب کارخانہ ہے۔ ایک انسان کی اکیلی جان کے لیے صدہا قسم کے

جھگڑے ہیں۔ ناکامیاں، اتفاقات، حادثات، فریب، بدگمانیاں اور کئی ایسے ناگزیر واقعات ہوتے ہیں جن سے آپ دامن بچا کر نہیں نکل سکتے۔ عام مرد، عورت جو ہنسی خوشی زندگی گزارنا چاہتے ہوں ان کے لیے ناخوشی کے متعدد حالات و اسباب کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ چند خوش نصیب بے شک ایسے ہوتے ہیں جنھیں اپنے لیے خوشی مہیا کرنے کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ وہ خوش قسمت فارغ البال انسان جس نے زندگی کی راحتیں ترکے میں پائی ہوں زمانہ اس کے لیے ساز گار ہو، صحت اچھی ہو مزاج سادہ اور ذوق صحیح رکھتا ہو اس کے لیے زندگی کے کٹھن راستوں سے اطمینان کے ساتھ گزر جانا آسان ہوتا ہے۔ اسے بعض اوقات ان دشواریوں کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا جو دوسروں کو پیش آتی ہیں۔

مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کیوں کہ زندگی ہر ایک کے لیے کچھ آزمائشیں رکھتی ہے۔ کم لوگ ہمیشہ امارت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ سدا خوش مزاج نہیں رہتے یا نہیں رہ سکتے۔ بہت سوں کو تکلیف دہ جذبات سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ جو خاموش اور منظم زندگی کے مغائر ہوتے ہیں۔ صحت جو ایک نعمت ہے اس کی بقا کا کسی کو مکمل یقین نہیں ہوتا۔ ازدواجی زندگی ہر ایک کے لیے دل خوش کن نہیں ہوتی۔ انھیں اسباب کی بنا پر عام آدمی کے لیے مسرت کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ انھیں یہ تحفہ نہیں ملتی اس کے لیے ذہنی و جسمانی کاوش اور جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

انسانی مسرت اور خوشی کا انحصار شخص اور ماحول کی ہم آہنگی پر ہے۔ بعض چیزیں مسرت فراہم کرنے کے لیے بنیادی کام انجام دیتی ہیں۔ مثلاً غذا، رہائش، صحت، کامیاب پیشہ اور محبت، بعض کے نزدیک اس فہرست میں خوش گوار ازدواجی زندگی اور اولاد بھی شامل ہیں۔

ان بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بغیر ایک غیر معمولی انسان ہی خوش رہ سکتا ہے۔ ورنہ اوروں سب کے لیے بنیادی ضرورتیں لازمی ہیں۔ ہاں ان چیزوں کے حسب دل خواہ حصول کے بعد بھی کوئی انسان خوش نہ رہے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ نفسیاتی الجھنوں اور جذباتی انتشار کا شکار ہے۔

اگر کسی انسان کا ماحول ناساز گار ہو تو اس کے لیے مسرت حاصل کرنا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ اس کی دل چسپیاں اور جذبات بجائے اپنی ذات کو محور بنالینے کے باہر کی طرف منتقل ہو جائیں۔ یہ سماجی اور شخصی فریضہ ہے کہ افراد کو تعلیم و تربیت کے دوران چند اچھی صفات پیدا کرنے کا موقعہ ملے تاکہ ہم سیکھ سکیں کہ کس طرح ماحول سے مطابقت پیدا کی جائے۔ جذبات پر قابو حاصل کیا جائے۔ اور خود پسندی سے گریز کیا جاسکے۔ ایسی دل چسپیوں اور مشغلوں کو فراہم کرنا بھی ضروری ہے جن سے ہمیں باہر کی دنیا سے اپنی ذات کا تعلق پیدا کرنے میں آسانی ہو اور ہم اپنے نفس کے قلعے میں قید ہو کر نہ رہ جائیں۔ اپنے جذبات میں آپ ہی گھٹ کر رہ جانا ایک سخت قسم کی قید ہے۔ مقید کرنے والے جذبات اکثر بے جا خوف، حسد، احساس گناہ، خود ترحمی اور خود پرستی کے ہوتے ہیں۔ ان تمام کا مرکز اپنی ہی ذات ہوتی ہے اور نتیجے کے طور پر انسان بیرونی دنیا سے تعلق توڑ بیٹھتا ہے۔

اپنی ذات کو محور بنالینے میں ایک اور قباحت بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی تنوع کی دل کشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یکسانیت کی وجہ سے اس میں اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے وہی شخص اکثر ہمیں مسرور دکھائی دیتا ہے جو مختلف قسم کی دل چسپیاں رکھتا ہو۔ کیوں کہ وہ آسانی سے دوسروں کا مرکز نگاہ بن جاتا ہے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ انسان اور کائنات فرد اور جماعت، شخص اور ماحول ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اپنے سوا دوسروں سے دل چسپی رکھنا، دوسروں کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کرنا، بے غرض دوستی سے لطف اندوز ہونا، یہ سب انسان کے نفس کی تربیت کرتے ہیں اور جب وہ اپنے خلوص کا جواب خلوص سے پاتا ہے تو اس کا جی کس قدر خوش ہوتا ہے۔ یہی انسانی خوشی کا راز ہے اور اسی سے

سماج اور افراد میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی میں خلل کسی نہ کسی ذہنی یا عملی بے ربطی سے پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اور باتوں کا ذکر غیر ضروری نہ ہو گا۔

ولولہ خیزی اور برانگیختگی انسانی سرشت میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ لیکن حد سے زیادہ اس کی طرف مائل رہنے سے یا اس کی ضرورت پڑنے پر مسلسل اعصابی تناؤ کی وجہ سے تکان پیدا ہوتی ہے۔ جیسے غذا میں ذائقہ ضروری ہے۔ لیکن ذائقے کی تلاش اگر بھوت بن کر سوار ہو جائے تو چٹخارے دار غذاؤں کی عادت پڑ جاتی ہے جس کے نتیجے میں معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے مناسب حد تک ان ہیجان و تلاطم انگیز خواہشوں کو پورا کرنا چاہیے اور جذبات کی رو میں بہہ جانے سے گریز کرنا چاہیے۔ تکان سے ہمیشہ بچنا ضروری ہے۔ صحت اور خوشی دونوں کے لیے یہ نقصان دہ ہے۔ مناسب جسمانی تکان صحت کے لیے مفید ہے لیکن حد سے زیادہ مضر۔ ذہنی یا اعصابی تکان جس کے آج کل زیادہ لوگ شکار ہیں صحت کے لیے خطرناک ہے۔ بعض لوگ جنھیں حسب دل خواہ زندگی میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی مسلسل تشویش اور وہم کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایک بار اعصاب زدہ ہو جانے کے بعد اس عادت کو ترک کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ غیر ضروری فکر ہے۔ بہت سے لوگ جنھیں غیر معمولی صدموں سے دوچار ہونا پڑا ہے یا جو اپنے حالات پر قابو نہ پا سکے ہوں اس مرض کا شکار ہونے کے بعد بیش تر ایسی فکروں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ غلط اور ناکافی سوچ بچار سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ دماغ کو مربوط فکر کا عادی بنانے، عادتوں کو منظم کرنے اور خوشی کے لیے اپنی کارکردگی میں اضافہ کرنے سے اکثر صورتوں میں اس سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کتنی اعصاب زدگی کے لیے کس پیمانے کا علاج ہو۔ صحیح وقت پر صحیح طریق فکر سے اکثر غیر اہم باتوں کو نظر انداز کر دینے سے بھی اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہر کام ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غیر ضروری فکروں میں سر کھپانے سے حاصل، ناقابل برداشت غموں کو دور کرنے میں وقت ہی مرہم کا کام کرتا ہے۔

حسد انسانی سرشت میں فتنے کی طرح منہ چھپائے رہتا ہے۔ اس کے لیے وہی پرانی مثل ٹھیک ہے کہ یہ آگ دوسروں کو جلانے سے پہلے اپنے آپ ہی کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ جو کچھ ہمیں نہیں ملا اس کے لیے آنسو بہانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں میسر ہے اس سے لطف اندوز ہونا سیکھیں۔ دوسروں سے رواداری اور خوش اسلوبی کا برتاؤ بڑی اچھی عادت ہے۔ اس سے دوسرے بھی خوش ہوتے ہیں اور ہماری خوشی کا بھی یہی سر چشمہ ہے، شعور، تحت الشعور اور غیر شعور۔ صحیح معنوں میں مسرور انسان وہی ہے جو خود کو ساری دنیا کا شہری سمجھتا ہو اور آزادانہ طور پر اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔ ایسا شخص دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے۔ وہ اس کے نشیب و فراز سے تجربہ حاصل کرتا ہے اور اس تجربے کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہ کو ہموار بناتا ہے۔ وہ دنیا میں رہ کر اپنی الگ دنیا نہیں بناتا۔ اس لیے اس کی خوشیاں اور اس کے غم صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ وہ اوروں کی خوشیاں اور غم بن جاتے ہیں۔ جس نے زندگی کے اس راز کو سمجھ لیا اس نے جینے کے فن کو پا لیا۔

-OOO-

ڈاکٹر سید عبدالمنان

بڑی بھول کی ڈاکٹر بن کر

جب ہم گزشتہ تیس سال قبل کے اس یادگار دن کا خیال کرتے ہیں جب کہ ہم نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا اور آج کے دن تک اس پیشے کے ناتے ہم پر کیا کیا گزری، کیا کیا بیتی تو ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ ہمیں وہ پند و نصائح اچھی طرح یاد ہیں اور وہ صدائیں کانوں میں گونج رہی ہیں جو کہ بزرگوں اور بہی خواہوں نے ہمیں عملی زندگی میں قدم رکھنے کے ابتدائی دنوں میں نصیحتیں کی تھیں۔ ان نصیحتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ ایک اچھے ڈاکٹر کو مجسم ایثار ہونا چاہیے، بیماروں کی خدمت کو اپنے آرام و آسائش اور اپنی دلچسپی پر ہر وقت ترجیح دینی چاہیے۔ غرض ایک ڈاکٹر کو اپنے میں وہ تمام خواص پیدا کرنے چاہئیں جن سے وہ انسان سے فرشتہ بن جائے۔ ہم نے ان نصیحتوں پر بہت کچھ عمل کر کے اپنے اور اپنے پیشے کے وقار کو برقرار رکھنے کی کوشش میں جو جسمانی، ذہنی تکالیف اٹھائی ہیں اور جو جو پاپڑ بیلے ہیں ان کے کچھ نمونے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ان واقعات کو سن کر آپ خود ہی تصفیہ فرما سکتے ہیں کہ اگر ہمارے دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ بڑی بھول کی ہم نے ڈاکٹر بن کر تو کیا غلط ہے۔

ابھی ہم کو ڈاکٹر بنے اور پریکٹس کرتے بہت تھوڑی سی مدت گزری تھی کہ ہمارے ایک رشتہ دار جو ایک بڑے عہدے پر فائز، خوش حال اور متمول ہوتے تھے ان کے یہاں سے ہماری طلبی ہوئی۔ گو کہ ہم نے سند بھی لے لی تھی اور ملازم بھی تھے، لیکن ابھی ہم میں وہ خود اعتمادی پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک فن داں میں کچھ دنوں کی مشق کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ہم تعمیلِ حکم میں علی الصبح ہی سیکل پر اپنا چھوٹا سا بیاگ لیے ان کے در دولت پر حاضر ہوئے کچھ دیر بعد طلبی ہوئی۔ صاحب خانہ اور ان کی بیگم نے حال دریافت کیا اور وہی پند و نصائح جو ہمارے لیے آموختہ کے برابر تھے دہرائے گئے جس سے ہمارے کان بھر گئے تھے اور جس کو سن سن کر کبھی ہم خود پر اور کبھی اس پیشے پر لعنت بھیجتے کہ ہم نے کیوں یہ راہ اختیار کی۔ اس تمہید کے بعد ملازمین و متعلقین کی ایک فوج کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ان میں بچے، جوان اور بوڑھے، اور بوڑھے بھی بالکل آثارِ قدیمہ کے نمونے جن میں بظاہر بیماری کے اثرات کم اور ضروریات زندگی کی آسائشوں کے کمی کے اثرات زیادہ تھے۔ ہم ایک ایک کی کیفیت سنتے اور معائنہ کر کے نسخہ تجویز کرتے، ہمارے غریبوں کو ڈاکٹر نصیب ہی کہاں آتا ہے اور کب کوئی سیدھے منہ بات کرتا ہے جب کوئی سننے پر آمادہ ہو تو یہ دل کی بھڑاس نکالتے اور اپنے مرض کی کیفیت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ہم نے ان سب کی کیفیات کو صبر سے سنا تاکہ اس سے ان کی تسلی تو ہو۔ غرض اس مرحلے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا اور جب ہم صاحب خانہ اور ان کی بیگم کے سامنے اپنی کارگزاری کا حال بیان کرنے حاضر ہوئے تو انھوں نے ہماری خدمات کو سراہا اور نہایت ہی شفقت سے فرمایا کہ آئندہ بھی کبھی وقت بے وقت تکلیف دی جائے گی اور چوں کہ بیماری بغیر اطلاع کے وارد ہوتی ہے اس لیے ڈاکٹر کو فائر بریگیڈ کے عملے کی طرح ہمیشہ چوکس رہنا چاہیے۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ شاید اب کبھی صاحب خانہ یا ان کی بیگم کے علاج کا بھی موقع ملے گا

لیکن یہ حسرت خاک میں مل گئی جب کہ بیگم صاحبہ نے اپنے میاں کی بات سختی کے ساتھ ٹال دی کہ وہ ہم جیسے مبتدی سے نہ تو خون کے دباؤ کی جانچ کرائیں گی نہ ہی امتحان کرائیں گی۔ وہ عزت تو صرف ایک کہنہ مشق ڈاکٹر ہی کو دی جاتی ہے جو ان سے مانوس ہیں، ایرے غیروں سے وہ کیسے رجوع ہو سکتی ہیں۔ صاحب خانہ کو ہماری دل شکنی اور انا کے مجروح ہونے کا احساس تھا اس لیے انھوں نے دبے الفاظ میں اپنی بیگم سے یوں سفارش کی کہ ان کی صاحب زادی جن کو کچھ زکام سا ہو گیا ہے کیوں نہ دکھلا کر نسخہ تجویز کر دیا جائے۔ ان کے فیملی ڈاکٹر کو شاید آنے میں دیر لگے۔ لیکن بیگم نے خشمگیں نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر یہ بات بھی ٹال دی کہ دوشیزہ لڑکی کا علاج جوان ڈاکٹر سے کیسے کروایا جا سکتا ہے۔ صاحب خانہ کی سفارش اور بیگم صاحبہ کی اس کو رد کرنے کے درمیان ہمارے دماغ میں زبردست بھونچال اٹھے اور دب گئے۔ وہ اب تو مٹ چکے ہیں لیکن بہت دنوں تک ہمارے احساسات پر چھائے رہے۔ قلیس میں ہم کو ایک پیالی چاء اور کچھ بسکٹ پیش کیے گئے۔ چوں کہ ہم بغیر ناشتے کے گھر سے روانہ ہوئے تھے اور جلد دواخانہ پہنچنا تھا اس لیے چاء زہر مار کر کے یہ مصرع گنگناتے ہوئے کہ "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے۔ دواخانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دواخانہ پہنچے تو یہ احساس غالب تھا کہ "بڑی بھول کی ڈاکٹر بن کر۔

اس سے زیادہ دلچسپ اور جان لیوا حادثہ جو پیش آیا وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ایک دن مطب میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ یکایک دو نوجوان قوی الجثہ، حواس باختہ، حیران و پریشان کمرے میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ زلزلہ آگیا ہے۔ اس قدر بوکھلائے ہوئے تھے کہ ان کا مطلب سمجھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ غرض یہ مطلب سمجھ میں آیا کہ ان کے والد کے قلب پر حملہ ہوا ہے حالت نہایت خطرناک ہے اس لیے فوری ان کے ساتھ چلنا چاہیے۔ ان پہلوانوں کے ساتھ جانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا غرض ہم طوعاً و کرہاً ان کے ساتھ ہو لیے ایک صاحب نے موٹر چلانا شروع کی اور ایک ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ موٹر کیا تھی ہنجاب میل تھی۔ ٹرافک کے سب اصولوں کو خیرباد کر کے غلط سائیڈ پر، کبھی فٹ پاتھ پر، کبھی کسی گڑھے میں سے اچکا کر حادثوں سے دوچار ہوتے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کو اپنا آخری سفر سمجھ کر گناہوں سے توبہ کی اور عہد کیا کہ اگر اب کی بار زندہ بچے تو پھر ایسے سفر پر کبھی روانہ نہ ہوں گے۔ اللہ اللہ کر کے گھر کے سامنے موٹر رکی اندر سے شور فغاں اور آہ و بکا کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم نے سمجھ لیا کہ معاملہ خطرناک ہے اور ہمیں طبی امداد پہنچانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ایک پہلوان نے ہمیں گود میں اٹھالیا اور اس بھیڑ کو جو جمع ہو گئی تھی چیرتے ہوئے مریض کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ صاحب ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اب ہم دوگونا مشکل سے دوچار تھے کہ کس طرح ان کی موت کا اعلان کریں۔ ماحول بالکل ناموافق تھا ہم نے دو چار منٹ امتحان کیا اور پھر جب پلٹ کر دیکھا تو ایک سنجیدہ صاحب نظر آئے تو ہم نے ان کے کان میں آہستہ کہہ دیا کہ موت واقع ہو چکی ہے اور اب علاج کا کوئی موقع نہیں۔ بس یہ اعلان کرنا ہی تھا ایسا معلوم ہوا کہ خلا میں کوئی راکٹ چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک پہلوان نے ہم سے بغل گیر ہو کر رونا شروع کیا یہ تو اپنا غم غلط کر رہے تھے اور میں جاں کنی کے مراحل طے کر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری سانس رک جائے گی میں نے اس کو آخری وقت سمجھ کر خاموشی اختیار کی اس لیے کہ اس وقت چیخنے سے بھی فائدہ نہ تھا۔ وہاں کا ہر شخص اپنی پوری آواز سے چیخ رہا تھا۔ وہ تو اللہ کو زندہ رکھنا مقصود تھا اور آپ کے سامنے اس واقعے کو دہرانا قسمت میں لکھا تھا کہ یکایک اس پہلوان کے ایک اور قریبی عزیز آن پہنچے اور پہلوان کی آنکھیں ان سے چار ہوئیں بس انھوں نے مجھے چھوڑ کر ان کو دبوچا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کہیں قندِ مکرر کی طرح مجھے دوبارہ نہ دبوچا جائے اپنا بیاگ اٹھایا اور باہر بھاگنے کی کوشش کی لیکن جسم اس قدر چور چور تھا کہ بیان سے باہر۔ غرض کسی طرح باہر نکلا۔ موٹر کا انتظار فضول

تھا واپسی میں اس موٹر میں اور اس ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا سرکس کے کرۂ موت کی سواری سے کم نہ تھا اس لیے رکشا بلایا اور واپس ہوا۔ اس واقعے کو مدتیں گزر گئیں لیکن جب کبھی پرانی یادیں تازہ ہوتی ہیں تو یہ خیال بھی تازہ ہو جاتا ہے کہ میں نے اس واقعے کے بعد کئی دن تک اس پیشے کو ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یہی سوچتا تھا کہ "بڑی بھول کی ہم نے ڈاکٹر نا کرہ

یوں تو دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں لیکن واہ رے فرخندہ بنیاد کے مہمان ہمیں ایک عجیب و غریب ہستی سے پالا پڑا۔ ایک دن ہم مطلب میں کام میں مشغول تھے کہ یکایک کمرے کے باہر کچھ گڑبڑ سنائی دی۔ باہر نکل کر دیکھا تو میرا ملازم اور ایک ماما آپس میں تکرار کر رہے تھے میرا ملازم اس ماما کو کمرے کے اندر جانے سے روک رہا تھا اور وہ س پر مصر تھی کہ فوراً اس کو داخلہ دیا جائے۔ یہ ماما ٹھیٹ دکھنی زبان میں الاپ رہی تھی اور دوسرے مریضوں سے جو نتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے مخاطب تھی۔ جوں ہی میں کمرے سے باہر نکلا اس نے میرے پیر پکڑ لیے اور کہنے لگی کہ فوراً چلیے میری بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے میں نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی کہ مطلب کے دوران چلنا مشکل ہے کن اس کی چرب زبانی اور ہٹ دھرمی کے آگے ایک نہ چلی اس نے نہ صرف مجھے بلکہ ہر مریض کو ہموار کر لیا۔ ہر وقت یہ کہتی کہ دارا جلدی کیجیے ورنہ میں بیگم صاحبہ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکوں گی۔۔۔۔۔۔ غرض مجبوراً میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ تمام اس نے بیگم صاحبہ کے اوصاف حمیدہ، ان کے غصے، ان کی سابقہ جود و سخا کی داستانیں، حالیہ مالی پریشانیوں، گھریلو جھگڑوں، آپسی رقابتوں غرض خاندان کی مختصر سوانح اپنے الفاظ میں بیان کی۔ شہر کے گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے ایک بے رونق اور تباہ حال ڈیوڑھی کے سامنے آئے۔ کسی زمانے میں شاید یہ امیروں کی رہائش گاہ رہی ہو لیکن اب تو کسی تباہ شدہ واب کی حویلی کا کھنڈر معلوم ہو رہی تھی۔ ہر طرف کوڑا کرکٹ، سیاہ دیواریں، غریب ملازمین، ان کے بچے، فرش غائب۔ رض پردہ کی دیوار کے پاس مجھ کو کھڑا کر کے وہ اندر غائب ہو گئی اور ہم پورے بیس منٹ باہر چہل قدمی کرتے رہے اس کے بعد ہمارا داخلہ ڈیوڑھی کے زنانی حصے میں ہوا۔ مختلف دالانوں اور کمروں سے ہوتے ہوئے بیگم صاحبہ کے کمرے تک پہنچے۔ بیگم صاحبہ کمرے میں تھیں اور ہماری کرسی کمرے کے باہر ڈال دی گئی۔ مریض اور ڈاکٹر میں آٹھ فیٹ کا فاصلہ تھا۔ ہ دیر بعد دروازہ کھلا اور آواز سے میں نے ان کے معمر ہونے کا اندازہ لگایا۔ بیگم صاحبہ نے پہلے شخصی استفسارات فرمائے یعنی شجرہ، حسب نسب، کسی جاگیردار یا نامور گھرانے سے تعلق، قابلیت، علاج کا تجربہ، بیماروں میں کسی معروف شخص کے علاج کا تجربہ غرض کہ جائز و ناجائز ہر قسم کے سوالات کی بوچھار کر دی اور ہم اس ملزم کی طرح جو کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے رہ کر بے چون و چرا وکیل کی جرح کے جواب دیتا ہے، تحمل کرتے رہے اور دل ہی دل میں اس ماما کو کوستے رہے کہ اس نے یہ ڈرامہ کھیل کر ہم کو مطب سے کھینچ لایا ورنہ ایسا بیمار جس کا آخری وقت ہو کس طرح اتنے سوالات کر سکتا ہے۔ غرض اب کوئی چارۂ کار نہ تھا اس لیے سعادت مندی سے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ جب الجھن حد سے بڑھی تو بیگم صاحبہ کی تکلیف اور بیماری کی کیفیت دریافت کی تو یوں ارشاد فرمایا کہ کیفیت میں ہرگز بیان نہ کروں گی کیفیت سن کر تو سب ہی دوا دے سکتے ہیں تم خود تشخیص کر کے نسخہ تجویز کرنا۔ مجھ کو اس وقت تک کسی ایسے مریض سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مجھے ڑا احساس ہوا کہ شاید بعض اوقات ہم کو انسانوں کے بجائے حیوانات کے ڈاکٹر کی طرح فرائض بھی انجام دینے پڑیں گے۔ ساتھ ہی میرے دل میں حیوانات کے ڈاکٹروں کی عزت و وقعت دوچند ہو گئی کہ ان بیچاروں پر کیا گزرتی ہوگی کہ صبح سے شام ت ٹیکڑوں بے زبانوں کا علاج کرتے ہیں اور ہم ایک ہی سے پریشان ہیں۔ جب امتحان کی نوبت آئی تو بیگم صاحبہ لیٹ گئیں ور ایک سفید چادر سر سے پیر تک اڑا دی گئی۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ موقع ابھی ہے کیوں نہ میں فرار ہو جاؤں لیکن اس

خطرناک ماما کا خیال آتے ہی میں نے ارادہ بدل دیا اور چادر کے اوپر سے تکمیل ضابطہ کے لیے امتحان کیا۔ کمرے باہر آکر نسخہ تجویز کیا اور میں اس ماما کو دل ہی دل میں لعن طعن کرتا ہوا واپس ہوا۔ یہ تجربہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تھا ڈاکٹری فن کی ناقدری کا ایک نمونہ۔ اس لیے یہ احساس جاگزیں ہوا کہ "بہت بھول کی ہم نے ڈاکٹر بن کر۔"

داستانیں یوں تو بہت ہیں لیکن ایک اور واقعہ بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ نو دس سال پہلے کی بات ہے رات کے بارہ بجے کا وقت تھا اور میں گہری نیند میں تھا کہ پھاٹک پر کسی نے دستک دی۔ طوعاً کرہاً اٹھا اور پوچھا تو باہر ان صاحب نے آواز دی کہ حضور خان صاحب حاضر ہے ایک منٹ تکلیف کیجیے۔ میں جب باہر گیا تو وہ نہایت عاجزی اور لجاجت سے بولے کہ حضور میری بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا خان صاحب بہت تھک گیا ہوں کل صبح پر کیوں نہیں رکھتے۔ لیکن انھوں نے اپنی تقریر سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور ان کے اصرار و عاجزی کے سامنے میں بے بس ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ ان کا گھر تو مشکل سے آدھے میل پر ہے میں واپس ہو سکوں گا۔ میں بیاگ لے کر موٹر میں بیٹھ گیا ابھی کچھ نیند کا غلبہ تھا چار پانچ منٹ کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا ٹیکسی شہر کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے خان صاحب سے کہا کہ آپ مجھے کہاں اغوا کیے لیے جا رہے ہیں۔ آپ کا مکان تو اس طرف ہے۔ بس خان صاحب نے چلتی ہوئی گاڑی میں ایک غوطہ لگایا اور میرے پاؤں پر سر رکھ کر دونوں پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے یوں گویا ہوئے کہ حضور آپ کے خادم سے ایک غلطی ہوئی ہے، میں نے ایک دوسرا عقد کر لیا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے وہاں حضور کو تکلیف دے رہا ہوں۔ ایک استدعا ہے کہ حضور میری بڑی بی بی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ مجھے ان سب باتوں سے کیا واسطہ لیکن آپ نے چلنے سے پہلے صاف صاف بتا دیا ہوتا تو میں ہرگز آپ کے ساتھ نہ آتا۔ اس دوران موٹر شہر کے مشہور اور بدنام محلے میں پہنچ گئی جہاں کوٹھوں سے ابھی تک پائل کی جھنک اور طبلے کی صدا اور نشاط کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ شروع ہوا۔ جی میں آ رہا تھا کہ موٹر سے کود جاؤں یا ضد کر کے ہرگز موٹر سے نہ اتروں لیکن ہر دو صورتوں میں سوائے بدنامی کے اور چارہ کار نہ تھا۔ خیال آ رہا تھا کہ کسی جان پہچان والے نے دیکھ لیا تو وہ میرے متعلق کیا خیال کرے گا اور میری نیک نامی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس دوران موٹر گھر کے قریب رک گئی۔ خان صاحب ابھی تک میرے پاؤں پر سر رکھے ہوئے دونوں پاؤں پکڑے ہوئے تھے۔ اس حرکت سے ایک طرف تو اپنی انکساری اور معذرت کا اظہار کر رہے تھے دوسری طرف مجھے گرفتار کیے ہوئے تھے کہ کہیں فرار نہ ہو جاؤں۔ غرض کہ موٹر سے اتر کر گھر میں خان صاحب کے داخل ہوا۔ خان صاحب کی دوسری بیوی کو کوئی خاص بیماری تو نہ تھی صرف .... کا مرض تھا۔ خان صاحب کافی معمر اور وہ نہایت جوان۔ غرض میں نے دونوں کے لیے نسخے لکھے اور دبے پاؤں باہر آیا، جس طرح کوئی چور چوری کے بعد گھر سے نکلتا ہے۔ چھلانگ لگا کر موٹر میں بیٹھ گیا اور اس محلے کی سرحد پار کرنے کے بعد اطمینان کا سانس لیا۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آ رہے تھے۔ ایک ہفتہ تک اس سانحے کا دل پر اثر رہا۔ ڈاکٹری فن شریف اور باعزت پیشہ ہے لیکن جب ایسے حالات میں انسان گھر جائے تو کس قدر مشکل ہوتی ہے۔ یہی سوچا کہ "بڑی بھول کی ڈاکٹر بن کر۔" (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ حیدر آباد)

•●•

کے۔ ایس۔ شفیق

سید عبداللطیف رضوی

کسی انسان کی شخصیت و کردار کی جانچ پرکھ کے لیے جانے مانے اور مقررہ اصول و معیار ہیں۔ ان معیاروں پر جتنا ہی کوئی پورا اترے گا اتنا ہی وہ مقبول و معزز متصور ہوگا۔ شخصیت کے ارتقاع میں بیش تر دخل کسب، کوشش و جدوجہد کا ہوتا ہے اور حسب نسب کا زندگی کو سنوارنے اور بلند و بالا بنانے میں یا تو بالکلیہ کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو محض برائے نام۔ قابل عزت و احترام وہی شخص سمجھا جانے گا جو علی الترتیب کردار، علم، اخلاق، انصاف، رواداری اور دنیوی وجاہت کا حامل ہو۔ دین داری سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں جہاں اور معیارات اور تصورات زوال پذیر ہوئے ہیں وہیں انسان کو بھی غلط اور گمراہ کن اوزان و پیمانہ جات سے ناپا تولا جانے لگا ہے۔ "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپا جاتا ہے خواہ برخوردار کسی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں۔ مال و دولت، زر، زمین کو باعث شرف و قدر و منزلت سمجھا جاتا ہے۔ خواہ یہ سب کچھ دھوکا فریب، لوٹ کھسوٹ، دینی و دنیوی و اخلاقی قوانین و قواعد کو بالائے طاق رکھ کر ہی کیوں نہ حاصل کیے گئے ہوں۔ سربراہی خواہ میدان سیاست میں ہو کہ سرکاری ملازمت میں، کاروبار و تجارت میں ہو کہ صنعت و حرفت میں، اس کی بنیاد اور حصول کا ذریعہ خاندانی گروہ بندی ہو کہ رشوت و سفارش یا زور و زبردستی موجودہ خرابی و گراوٹ کا یہی سب باعث ہیں۔

مرحوم لطیف رضوی صاحب سے میری واقفیت اور وابستگی وسیع بھی تھی اور دیرینہ بھی۔ ان کی کرم فرمائی شفقت و عنایت کے گنج ہائے گرانمایہ سے میں بہرہ ور ہوا۔ اولاً ان کے بہ حیثیت استاد ہونے کے (شعبہ معاشیات، جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۳ء) ثانیاً بہ حیثیت صدر محکمہ لیبر کمشنر حکومت حیدرآباد (۴۸ء تا ۵۰ء) ثالثاً بہ حیثیت اڈمنسٹریٹر (کلکٹر اورنگ آباد ۵۵ء تا ۵۶ء) اور رابعاً بہ حیثیت مشفق مربی و ناصح کے اور تفاوت سن و سال کے باوجود ایک بے تکلف دوست، بذلہ سنج ہمراہی اور دلی ہمدرد و غم خوار و غم گسار کے سب سے بڑھ کر جو گوہر کم یاب ان کے کردار میں پائے گئے وہ ان کی دین داری و راست بازی، حق گوئی و حق شناسی کے جواہر پارے تھے۔ رہن سہن، نشست و برخاست، شگفتہ مزاجی، معیار زندگی اور مہمان نوازی میں بے مثال ولاثانی تھے۔

لطیف رضوی صاحب کے والد عبدالرزاق رضوی صاحب وضع دار بزرگ تھے۔ کٹل منڈی کے قدیم محلے میں ان کی رہائش تھی۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جنھیں حسین ساگر کے کنٹے پر شام کو چہل قدمی کا اتفاق ہوا ہے وہ واقف ہوں گے کہ دو بزرگ ہر شام ٹینک بنڈ پر تشریف لایا کرتے تھے۔ ان میں ایک تو عبدالرزاق صاحب مرحوم تھے اور دوسرے نواب داؤد جنگ (صنعت چرم سازی کے سربراہ)۔ سید عبدالرزاق رضوی صاحب کے چھ صاحبزادے تھے اور ایک صاحبزادی لطیف رضوی صاحب سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور دوسرے رشید رضوی، حمید رضوی، مجید رضوی، (کرکٹ کھلاڑی اور آرکٹاکٹ آصف اقبال کے والد) وحید رضوی (حال مقیم پاکستان) اور سب سے چھوٹے عزیز رضوی (حال مقیم امریکا) جو میٹرک (تاملی یانی اسکول) سے لے کر گریجویشن کی تکمیل تک میرے ہم جماعت تھے۔ (حبیب الرحمٰن صاحب معتمد اطلاعات و صنعت و حرفت و بانی اردو ہال حمایت نگر کے داماد) ایک ہمشیرہ تھیں جو عبدہ دار محکمہ اکم ٹیکس احمد رضوی سے

بیاہی گئی تھیں۔ نواب محمود یار جنگ معتمد مال، لطیف رضوی صاحب کے ماموں ہوتے تھے اور چونکہ لاولد تھے اس لیے لطیف رضوی صاحب شمر فائٹر سبھی عملاً نواب محمود یار جنگ کے متبنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ اس خاندان کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ نہ صرف علم وہنر بلکہ کھیل کے میدان میں بھی ان افراد نے بہت نام کمایا۔ مجید رضوی، وحید رضوی، غلام احمد، دستگیر قریشی، آصف اقبال کرکٹ میں اور علی سعید اور قیصر ٹینس کے مشہور کھلاڑی رہے ہیں۔

لطیف رضوی صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لندن اسکول آف اکنامکس سے بی۔ ایس سی (آنرز) کیا اور جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات میں لکچرر اور ریڈر رہے اور بہت ہی پسندیدہ اور چہیتے استاد سمجھے جانے لگے۔ بعد میں نائب ناظم و ناظم محکمۂ امداد و شمار ہوئے۔ لیبر کمشنر بنائے گئے۔ ۱۹۵۶ء میں ریاست کی لسانی بنیاد پر تقسیم کے وقت کلکٹر اورنگ آباد تھے۔ ایلورہ، اجنٹہ، دولت آباد کے قلعہ اور بی بی کے مقبرہ کی وجہ سے اورنگ آباد کو آثار قدیمہ اور سیر و سیاحت کے اعتبار سے منفرد مقام حاصل تھا اور ملک و بیرون ملک کے سیاح و تماش بینوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی اہمیت کے حامل مہمانوں کا کلکٹر ضلع کو قیام و طعام کی سہولتوں کی فراہمی کا اہتمام بطور خاص کرنا پڑتا تھا۔ موسم سرما میں جب کہ سیاح کثیر تعداد میں آتے تھے، کلکٹر کے ہاں ہر دوسرے تیسرے دن ڈنر ہوتا تھا اور میں بہ حیثیت عہدہ دار ابھی نچلی پائدان پر ہی تھا لیکن ذاتی تعلقات کی بنا پر ضرور مدعو کیا جاتا تھا اور مجھ سے بالاتر عہدے پر فائز اور عمر رسیدہ عہدہ داروں کو یہ امتیاز بہت کھلتا تھا اور نجی محفلوں میں شکایتاً تذکرہ بھی ہوتا تھا لیکن " این سعادت بزور بازو نیست۔" والا معاملہ تھا۔

اتفاق سے اس زمانے میں نہ صرف کلکٹر اورنگ آباد بلکہ مہتمم پولس بلونت رائے ملہوترہ صاحب بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ آئی۔ پی۔ ایس ہونے سے پہلے وہ بھی لطیف رضوی صاحب کی طرح استاد تھے۔ جالندھر کے کالج میں حیاتیات کے لکچرر، ٹینس کے کھلاڑی اور اردو شعر و شاعری کے دلدادہ، دور درشن کے "واہ کیا سین ہے۔" کے مصداق وہ منظر بھلائے نہ بھلایا جاسکے گا جب ملہوترہ صاحب بیر کا گلاس ہاتھ میں لیے میز تھپ تھپاتے ہوئے مترنم آواز میں نغمہ سرا ہوتے تھے:

پھولوں کی رت ہے، ٹھنڈی ہوائیں
اب ان کی مرضی آئیں نہ آئیں
روداد الفت کرلیں مکمل
کچھ تم سناؤ، کچھ ہم سنائیں
اپنی وفا یا ان کی جفائیں
کیا یاد رکھیں، کیا بھول جائیں

پولس ایکشن کے بعد سرپور پیپر ملز اور سرسلک فیکٹری برلا برادرس نے حاصل کرلی۔ اس زمانے میں عادل آباد، عثمان آباد، بیڑ اور گلبرگہ کے اضلاع بہ حیثیت لیبر آفیسر میرے تحت تھے۔ برلا انتظامیہ نے مقامی مزدوروں کو نکال کر چوکیدار اور چپراسی کے عہدوں کے لیے بھی باہر کے افراد کو مامور کرنا شروع کیا جس پر مجھے واجبی طور پر اعتراض تھا۔ انتظامیہ نے سمجھانے بجھانے بلکہ ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی حتیٰ کہ اس زمانے کے لیبر منسٹر وی۔ این۔ راؤ صاحب و دیا النکار نے برلا انتظامیہ کے دباؤ میں آکر لیبر کمشنر رضوی صاحب سے خواہش کی کہ مجھے اس علاقے سے کہیں اور بھیج دیا جائے مگر لطیف رضوی صاحب نے صاف کہہ دیا کہ "شفیق حق بجانب ہے، میں تو اس کا تبادلہ نہیں کروں گا۔ ہاں آپ بہ

حیثیت منسٹر ایسا کردیجیے اگر مناسب سمجھیں۔" اس زمانے میں رضوی صاحب جب کاغذنگر دورے پر آتے تو نہ برلا انتظامیہ کے گیسٹ ہاؤز میں ٹھہرتے تھے اور نہ ان کی فراہم کردہ موٹر استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے کے اور خاص طور پر آج کل کے حالات دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ "ببیں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا۔"

۱۹۵۶ء میں لطیف رضوی صاحب کرناٹک کو الاٹ کیے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے کارکردگی، قابلیت اور دیانت داری کے جوہر دکھائے اور اڈیشنل چیف سکریٹری اور بعد ازاں پبلک سروس کمیشن کے صدر نشین بنائے گئے۔ دین داری، صاف گوئی کے مردِ میدان تھے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانا ان کی سرشت میں سرے سے ناپید تھا۔ ایک دفعہ اندرا گاندھی بنگلور آئیں اور دیوراج ارس چیف منسٹر کے ہمراہ عہدہ دارانِ بالا کے ساتھ گفت و شنید ہو رہی تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ کا وقت ہوا تو رضوی صاحب نے چیف منسٹر سے ۲۰ منٹ کے لیے اجازت چاہی کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو آئیں۔ ارس صاحب تذبذب میں پڑ گئے۔ اندرا گاندھی نے وجہ دریافت کی تو انھیں بتانا پڑا۔ اندرا گاندھی نے نہ صرف اجازت دی بلکہ آدھے گھنٹے کے لیے مجلس مباحثہ ملتوی کر دی۔

رضوی صاحب جب بلگام کے ڈویژنل کمشنر تھے اس وقت بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کا اعلیٰ سطحی وفد دورے پر آیا۔ چیف سکریٹری ربیلو نے ٹیلی فون پر رضوی صاحب سے کہا ہمیں مالیاتی فنڈ سے بھاری رقمی امداد کی توقع ہے۔ اس وفد کے قیام و طعام کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ رضوی صاحب نے اطمینان دلایا کہ شایانِ شان انتظام کیا جائے گا۔ البتہ میرے گھر پر ڈنر کے موقعہ پر شراب نوشی کا اہتمام نہیں کر سکوں گا۔ ربیلو سمجھ دار آدمی تھے فوراً اطمینان دلایا کہ فکر نہ کیجیے مجھے معلوم ہے اور میں نے اسی لیے آپ کے اسسٹنٹ کو کہہ رکھا ہے کہ آپ کے ہاں ڈنر پر آنے سے پہلے ہی وہ اس مرحلے سے فارغ ہو کر آئیں۔

رضوی صاحب بنگلور کے زمانۂ قیام میں اکثر حیدرآباد آتے اور شرفِ ملاقات بخشتے۔ رحلت سے پہلے آخری بار جب آئے تو کہنے لگے کہ "شفیق نہ میں نے تیری بیوی کو دیکھا نہ تیرا گھر دیکھا اور نہ تیرے بچوں سے ملاقات کی۔" میں نے فوراً رضوی صاحب کو ڈنر پر مدعو کیا اور چند دوستوں بشمول ان کے بہنوئی احمد رضوی صاحب کو بھی دعوت دی۔ گھر پہنچنے پر جب میں نے اپنے لڑکے خالد کا تعارف کروایا تو کہنے لگے "اچھا تیرے بیٹے کا نام بھی خالد ہے۔" اس رات دو چار گھنٹے کیف و سرور میں گزرے۔ کیا خبر تھی کہ ان سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ چند ہفتوں بعد بنگلور میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

-oOo-

محمد نور الدین خان

لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق دہلوی

لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق سنہ ۱۸۷۷ء کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ صغریٰ بیگم صاحبہ اردو کے مشہور ادیب اور مترجم قرآن شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد جناب شرف الحق صاحب، شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے معروف عالم دین شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ڈاکٹر اشرف الحق کی ابتدائی تعلیم دلی میں ہوئی۔ ہائی اسکول کی تعلیم علی گڑھ کالج سے پانے کے بعد وہیں سے گریجویٹ ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ انگلستان جاکر مزید تعلیم حاصل کریں لیکن ان کے والد کو ان کا انگلستان جاکر پڑھنا پسند نہ تھا البتہ ان کے نانا ڈپٹی نذیر احمد جو روشن خیال علما میں سے تھے اپنے دونوں نواسوں مشرف الحق اور اشرف الحق کے انگلستان جاکر اعلیٰ تعلیم پانے کے پرزور حامی تھے اور مددگار بھی۔ چناں چہ شاہد احمد دہلوی مدیر ماہ نامہ "ساقی" نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر اشرف الحق اور ڈاکٹر مشرف الحق دو نواسوں نے اپنے نانا ہی کے گھر میں تربیت پائی اور جب یہ دونوں بھائی ولایت گئے تو ان کے نانا ہی نے ان کی کفالت کی تھی۔" (نقوش لاہور۔ ادبی معرکہ نمبر جلد دوم ص ۶۳۳) مخفی مبادکہ جناب شاہد احمد دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد کے حقیقی پوترے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے نانا ہی ان کی انگلستان و یورپ کی میڈیکل تعلیم کے بھاری اخراجات کے کفیل رہے۔ بارہ سال یورپ میں رہ کر اسکاٹ لینڈ سے (M.B.C.H.B) اور جرمنی سے (N.W.L.S.R) کی ڈگری لے کر اپنے وطن ہندوستان لوٹے۔

غفران مکان اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان کا عہد زریں تھا۔ شاہانہ سرپرستی اور علم و فن کی قدردانی کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہو رہا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی حیدرآباد تشریف لائے۔ دیگر علما کی طرح ان کی بھی یہاں پذیرائی اور قدردانی ہوئی۔ ایک سرکاری عہدے پر وہ فائز رہے لیکن بہت جلد ملازمت سے دست بردار ہو کر دلی واپس ہوگئے۔ البتہ جاتے ہوئے اپنے فرزند جناب بشیر الدین احمد اور داماد اشرف الحق کو سلک ملازمت سے وابستہ کر دیا۔ بشیر الدین صاحب اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد وظیفے پر سبک دوش ہوئے اور دلی واپس چلے گئے مگر شرف الحق صاحب وظیفے کے بعد حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہیں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر اشرف الحق تعلیم سے فارغ ہو کر ولایت سے سیدھے حیدرآباد اپنے والد کے پاس آگئے۔ یہ سنہ ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے جب حیدرآباد میں موسیٰ ندی کی طغیانی کی تباہ کاریوں کی وجہ بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور ہزارہا مکان و مال و اسباب نذر سیلاب ہوگئے جو بچے وہ بے سہارا ہوئے۔ حکومت کی جانب سے امدادی کام بڑی ذمہ داری اور سرعت سے ہو رہا تھا کہ ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ حکومت نے ریلیف کے کام اور طبی امداد پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایسے پرآشوب وقت جب ڈاکٹر اشرف الحق وارد حیدرآباد ہوئے تو حکومت نے ان کی خدمات حاصل کرنے میں دیر نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فرائض بحسن و خوبی اور بڑی ذمہ داری سے ادا کیے۔ جب حالات نارمل ہوگئے تو ان کی کارکردگی اور اعلیٰ ڈگری کے پیش نظر انھیں فوجی ہاسپٹل گولکنڈہ کے میڈیکل آفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

ڈاکٹر اشرف الحق کی شادی حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں جناب میر فتح سلطان کی صاحبزادی خیر النسا بیگم صاحبہ سے ہوئی جو حیدرآباد میں نامپلی روڈ (عابڈز) پر جہاں ان کا شان دار بنگلہ تھا آج بھی کوچہ فتح سلطان کے نام سے مشہور ہے۔ خیر النسا بیگم صاحبہ سے چند سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے دلی یں بجنور کی ایک خاتون عباسی بیگم صاحبہ

شادی کرلی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسری شادی کے بعد پہلی بیوی خیر النسا بیگم صاحبہ سے چار اولادیں ہوئیں۔ اس کے دوسری بیوی سے تین۔

اس موقع پر یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر اشرف الحق کے بڑے بھائی ڈاکٹر مشرف الحق انگلستان سے لٹریچر میں رمٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس ہوئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی بنگال میں پروفیسر مقرر ہوئے اور وہیں ۱۹۲۲ء ان کا ل ہوا۔ ان کے داماد جناب احتشام الدین دارالترجمہ عثمانیہ میں کام کرتے تھے۔ جن کے فرزند جناب شان الحق حقی تان کے معروف شاعر اور ادیب ہیں۔

ڈاکٹر اشرف الحق نے کارہائے مفوضہ کو بہ حسن وخوبی ذمہ داری سے انجام دیا۔ اس بنا پر کمانڈر فوج کی تحریک اور صدر م بہادر کی سفارش پر حضور آصف سابع نے انھیں لفٹننٹ اور پھر کیپٹن کا درجہ (Rank) دینے کا حکم نافذ کیا۔ مستقل سے بہ حیثیت میڈیکل آفیسر گولکنڈہ کمانڈ ہاسپٹل میں کار گزار رہ کر اس دواخانہ سے سنہ ۱۹۳۴ء وظیفۂ حسن خدمت پر ۔دوش ہوئے۔

وظیفے کے بعد دوبارہ وہ یورپ گئے اور پیرس، جرمنی اور ویانا (آسٹریا) جاکر ماہر فن ڈاکٹروں سے جنسیات کی تعلیم مل کی اور اعلیٰ ڈگری لے کر حیدرآباد واپس ہوئے۔ یہاں اپنے تعمیر کردہ مکان گولکنڈہ میں باقاعدہ کلینک کھولا۔ بندر پال تھے۔ اپنے فن میں ایسی مہارت تھی کہ آپریشن کرکے بندر کے غدود ضعیف آدمی میں لگادیتے تھے تو توانائی آجاتی اور ہ شباب ہوجاتا۔ ایسے کئی کامیاب آپریشن انھوں نے کیے۔ اپنے کلینک میں جدید میڈیکل آلات باہر سے منگوا کر رکھے ۔ گھر کے علاوہ ایک اور کلینک گن فاونڈری میں روبرو محبوبیہ گرلز ہائی اسکول بھی تھا۔ اس وقت ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر لحی صاحب تھے جو پولس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے۔ یہ وہی ڈاکٹر عبدالحی صاحب ہیں جن کی مرتب کردہ کتاب ت آصفیہ۔ جلد اول و دوم پاکستان سے شائع ہوئی اور بہت مشہور ہے۔

ڈاکٹر اشرف الحق نے گیارہ مختصر سے کتابچے شائع کیے تھے جن میں جنسیات پر پر معلومات مضامین تھے مثلاً تجدید ب کے مغربی طریقے، عمر گھٹنے کے اسباب، قوائے جسمانی پر غذا کا اثر، جوانی کا تحفظ، بڑھاپے کی روک تھام، غدودوں کے رہار مونس) اور علاج بالاعضا وغیرہ۔

گولکنڈے میں تین مکان انھوں نے تعمیر کیے۔ ایک مکان قدیم قطب شاہی مسجد سے ملحق تھا۔ قدیم مسجد بہت ستہ اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں تھی۔ انھوں نے از سر نو تعمیر کرائی۔ مسجد کی قربت کی وجہ غالب کا یہ شعر نہایت خوش خط اکر فریم میں اپنے ڈرائنگ روم میں رکھا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

کے انتقال کے بعد سب مکانات فروخت ہوگئے۔ یہ مسجد، مسجد ڈاکٹر اشرف الحق، کے نام سے موسوم و موجود ہے جس ، متولی اور نگران ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی صاحب زادی مشہور کانگریسی اور سماجی کارکن محترمہ سلیم اشرف صاحبہ ہیں۔

ڈاکٹر اشرف الحق کی بہت سیدھی سادی طبیعت تھی۔ غرور نام کو نہ تھا۔ غریبوں کے بہت ہمدرد تھے ان کا علاج ت کرتے تھے۔ کسی غریب کے ہاں شادی ہوتی اور وہ موٹر مانگتا تو نہ صرف بخوشی موٹر بھجواتے بلکہ موٹر کو پھولوں سے سجا یتے۔ مہمانوں کے خاطر مدارات بڑے ذوق و شوق سے کرتے۔ کھانے کا ویسے شوق نہ تھا سادہ غذا تھی لیکن دوسروں کو نے کا بہت شوق تھا ان کے لیے اچھے میٹھے بنوا کر رکھتے۔ ہر ایک کا خیال رکھتے خاص طور سے بچوں سے بہت محبت ۔ کبھی بچوں کو ڈراتے دھمکاتے نہ تھے۔ غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ گھر میں بہت خوش رہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ، شاعری عریانیت اور فحش گوئی کا کھلا نمونہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گھریلو زندگی میں فحش بات یا گندہ گالی کبھی ان کی

زبان پر نہ آئی۔ بے تکلیف دوست ملنے آتے تو ہنسی مذاق اور شاعری سب دیوان خانے میں ہوتی۔ گھر میں کبھی اپنا کوئی شعر نہیں سنایا۔ پیتے۔ بھی دیوان خانہ ہی میں تھے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ بہت پیتے تھے اور بلا نوش تھے اور پینے پر آتے تو رات دن پیتے تھے اسی کے ساتھ خاص بات یہ تھی کہ بعض وقت کئی کئی دن تک شراب کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ان میں خوبی یہ تھی کہ زیادہ پی کر بھی بہکتے نہ تھے۔ ان کے بے تکلف ہم پیالہ دوست جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح عمری "یادوں کی برات" میں اس کی تصدیق یوں کی ہے " بادہ خوری کے اس تواتر کے باوجود، کیا مجال کہ وہ بہک جائیں یا لڑکھڑانے لگیں۔ (ص ۵۰۸) یہ بات تھی کہ اول فول بکنے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کی بجائے وہ بڑے زندہ دل ہوجاتے تھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔

ان کے خاص بے تکلف دوستوں میں مولوی ابوالخیر مودودی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر دوست احباب کی محفل آراستہ ہوتی ان میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، جوش ملیح آبادی، حکیم شعیب اور خواجہ حسن نظامی کے نام آتے ہیں۔ پاکستان کے شاعر اور ادیب جناب جلیل قدوائی نے بعض نادر روزگار اور منتخب علمی و ادبی شخصیتوں پر اپنے مضامین لکھ کر " چند اکابر، چند معاصر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر زور پر بھی ان کا مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر زور کے مخلصانہ اصرار پر ۱۹۳۸ء میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے دلی سے حیدرآباد آئے تھے۔ جناب قدوائی لکھتے ہیں " مرحوم ڈاکٹر زور نے اپنی موٹر میں ساتھ لے جاکر مجھے گولکنڈے کی سیر کرائی اور نہ صرف تاریخی آثار دکھائے بلکہ نادر روزگار ہستی سے میری ملاقات کرائی۔ میری مراد کرنل اشرف الحق دہلوی مرحوم سے ہے۔ جو اپنی گوناگوں اوصاف بالخصوص اپنی منفرد قسم کی شعر گوئی کی وجہ سے اردو کے خواص میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ موخر الذکر کا عطا کیا ہوا مجموعہ کلام میرے پاس آج تک ان کی یادگار ہے۔" (ص ۱۹۳) جناب جلیل قدوائی کے بیان سے واضح ہے کہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی بلند مرتبہ شخصیت تھی اور ڈاکٹر زور ان کے دوستوں اور قدردانوں میں تھے۔

ڈاکٹر صاحب نماز، روزہ کے پابند نہ تھے لیکن اپنے آخری زمانے میں نماز پڑھتے تھے۔ صوفی ازم سے بہت متاثر اور قائل تھے۔ فقرا سے عقیدت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ سے وظیفے کے بعد (۹) نو سال زندہ رہے۔ آخر زمانہ میں انھیں دل کا عارضہ ہوگیا۔ علاج معالجہ چلتا رہا۔ جب بیماری نے زور پکڑا تو اپنی چھوٹی اہلیہ محترمہ عباسی بیگم صاحبہ کے گھر قریب گولکنڈہ ہاسپٹل لے گئے۔ وہیں ایک روز صبح صبح ان کی طبیعت بگڑ گئی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ میت کولاری میں درگاہ حضرت نورالدین شاہ قادری واقع ملے پلی لے گئے۔ میت میں ڈاکٹر صاحب کے رشتہ دار اور کثرت سے دوست احباب شریک تھے۔ درگاہ کی مسجد میں بعد نماز عصر نماز جنازہ ہوئی اور پھر درگاہ کے قبرستان کے ایک حصے میں تدفین ہوئی جہاں ان کے رشتہ داروں کی قبریں ہیں۔ یہ جگہ اپنے لیے ڈاکٹر صاحب نے پسند کی تھی۔ (تاریخ انتقال ۱۹/ فبروری ۱۹۴۳ء م ۱۳/ صفر ۱۳۶۲ھ)۔ حضرت امجد حیدرآبادی نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا جو قبر کے کتبے پر کندہ تھا لیکن اب کتبہ ٹوٹ گیا ہے۔

نوٹ :- یہ مضمون میں نے ڈاکٹر اشرف الحق کی سب سے بڑی صاحب زادی محترمہ رئیس النسا بیگم صاحبہ (بنجارہ ہلز) کے انٹرویو کی روشنی میں لکھا ہے۔ انٹرویو طویل تھا میں نے مختصر کردیا۔ میں محترمہ رئیس النسا بیگم صاحبہ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انٹرویو کے لیے اپنی قیمتی وقت عنایت فرمایا۔ انٹرویو کے وقت ڈاکٹر صاحب کی دو صاحبزادیاں محترمہ زیرک بیگم صاحبہ اور محترمہ سلیم اشرف صاحبہ موجود تھیں۔ میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آغا شاہد علی
(انگریزی سے ترجمہ: ہوشنگ مرچنٹ)

ڈاک خانے کے بغیر ملک

واپس میں اپنے وطن آیا
جہاں ایک مینار دفنایا گیا ہے۔
سرسوں کے تیل میں کوئی دیے کی بتی ڈبوتا ہے۔
ہر شب سیڑھیاں چڑھ کر ستاروں پر لکھے پیغام پڑھتا ہے
اس کی انگلیوں کے نشان ڈاک کی ٹکٹوں پر مہر لگاتے ہیں
وہ خطوں کے عجائب گھر میں۔ جہاں کسی بھی گھر کا پتہ نہیں
نہ برباد ہے نہ بے آباد۔

بے آباد؟ اس لیے کہ کتنے بھاگ گئے! خانہ بدوش بنے
ان میدانوں میں۔ جہاں ان کو برف کی بارش کی آخری خواہش ہے
چوں کہ پتھر کے پہاڑ پھر سے شیشے کے بن جائیں۔
وہ ہمیں وہاں سے آرپار دیکھ سکیں گے۔
دیکھیں گے کہ ہم دیوانے گھروں کو دفنا رہے ہیں۔
اک محرک آگ کی دیوار سے انھیں بچانے کو
سپاہی نے آگ لگائی، بھڑکائی
ہماری دنیا ایک جلتے پیپر ماشے کا ڈبہ بن گئی۔

جس پر لگے سنہرے ورق جل کر راکھ بن گئے
جب موذن مراتب اذاں کا وجود نہ رہا
ہمارے گھر جلتے ورق بن گئے
اب ہر شب ہم اپنے گھروں کو دفناتے ہیں
اور ان کے بھی گھر جو خالی کھڑے ہیں۔
ہم باوفا ہیں، ہر دروازے پہ ہم سوگ کے پھول چڑھاتے ہیں۔
شعلے بھی وفادار ہیں، ہر رات اک آگ کی دیوار ہے
ہر رات ہم اس اندھیرے کو ڈھونڈتے ہیں جو دیوار کی طرح ٹوٹ گرے

(۲)

راستے میں بے نام خط ملا " ہم آگ کے شعلوں میں اندھیرے کو دیکھتے ہیں۔
دوسرا کہتا ہے " مجھے لہو کا ساقی بناؤ، اپنے ہاتھوں کو بھگوؤ۔
ورنہ میرے ہاتھ پر پگھلتی برف سیاہی بن جائے گی۔
میری درد بھری انگلیوں کی مہروں سے ہر خط کو میں رات بھر میں چھاپ دوں گا۔"
دیوانہ رہبر، گمراہ ایسے بولتے ہیں۔
جیسے بھٹکتی روحیں سوختہ زمین پر بستی ہیں۔آوارہ روح
دعا کر کہ وہ اب بھی زندہ ہو۔
میں بارش میں اپنے وطن لوٹا ہوں کہ
وہ مجھے ملے، کہ میں جان سکوں کہ اس نے مجھے کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟
میں پیسے لایا ہوں، کشمیری شالوں میں بنے بادام جیسے پیسے
جن سے میں نیا ڈاک ٹکٹ خرید سکوں
جو ابھی سے نایاب ہو گیا ہے۔
کیوں کہ
وہ بے نام ہے، بے وطن ہے
بنا چراغ کے اسے ڈھونڈتا ہوں
کہیں وہ جیتے جی کسی گھر میں دفنایا تو نہیں گیا؟
نہیں، وہ زندہ ہے۔
دھوئیں کے در کھولتا ہے
خاکِ سیاہ سی اس کی سانس ہے۔

"سب کچھ ختم ہوا کچھ باقی نہیں رہا"
سناٹے کو میں اک آئینہ بناؤں گا
تاکہ میں اس کی صدا پھر سے دیکھ سکوں
اس سے راستہ پوچھوں
آگ لہروں میں دوڑتی ہے۔ کیا میں ندی کے اس پار جاؤں؟
ہر ڈاک خانہ بند ہے، یہ کاغذ کشمیری باداموں میں کٹا ہوا۔
یہ میری خبر زندانوں تک کون پہنچائے گا؟
اب سناٹا ہی میرے خط اس تک پہنچائے گا
یا بند ڈاک خانے کے سیاہ شیشے۔

(۳)

گم شدوں کا نقشہ جلایا جائے گا۔
میں مینار کا رکھوالا ہوں جب سے موذن مرا ہے
جلد آؤ میں زندہ ہوں روشنی میں اک بادام دکھائی دے رہا ہے۔
اس کی پنکھڑی گیلی ہے
کبھی سیاہ، کبھی سفید
جیسے وہ خزاں کے آخری ملک میں کھل رہا ہے۔
خرید لو اسے، میں اسے ایک ہی بار جاری کرتا ہوں شب کو
میں قتل کیا جاؤں، میری صدا ردکی جائے اس سے پہلے
آجاؤ
بھٹکتے دل، اس سیاہ بارش میں وفادار رہو۔
یہ تمھارا درد ہے
اسے تم محسوس کرو، اسے تو محسوس کرنا ہی ہوگا
"سب کچھ ختم ہو جائے گا، کچھ باقی نہیں رہے گا۔
پھر سے میں اس کی صدا دیکھ رہا ہوں "یہ لفظوں کا قبلہ ہے۔
یہاں تمھیں اپنے خط ملیں گے، اور میرے جو میں نے تم کو بھیجے تھے
جلد آؤ اور ان گم ہوتے لفافوں کو چاک کرو۔
اور میں مینار تک پہنچا۔
میں آگ کے اندر ہوں۔ مجھے اندھیرا مل گیا۔
یہ تمھارا درد ہے تمھیں اس کو محسوس کرنا ہوگا۔ اسے محسوس کرو۔
دل! اس دیوانی طرز کو دہراتے رہنا۔
کیوں کہ اس نے تیل میں دیے کی بتی ڈبو کر روشنی کی تھی۔
جس سے سیڑھیاں چڑھ کر ستاروں پہ کندہ پیغام پڑھے تھے
اس کے ہاتھ میں ٹکٹ چھاپنے کی مہر تھی
یہ ایک مجانب گھر ہے۔ اس کی صدا کا سانیہ مجھے ملا ہے
ارمانوں کا نقشہ جس کی کوئی سرحد نہیں۔

(۴)

میں نے پڑھے عاشقوں کے خط، مجنونوں کے خط
اور اس کو لکھے گئے میرے وہ خط، جن کا کوئی جواب نہیں

میں نے دیے جلائے، جواب بھیجے، اذانیں دیں
تنہا غلطوں کی بہری دنیا کے لیے
اور میرا نوحہ آہوں سے بھرا ہے، لاپتہ خط جیسی آہ جو میں نے
بھیجی ہے اس دنیا کو، جو جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔
میرے لفظ بارشوں کے بڑے پارسلوں میں بھیجے گئے ہیں۔
یہاں وہاں، کئی ہتوں پر، کئی سمندروں کے پار

بارش کی بوچھار میں، میں لکھنے بیٹھا ہوں
میری کوئی بھی دعا نہیں، میری دعا تو اک رکی ہوئی چیخ ہے۔
"وہ ابہم ہیں، وہ بہم ہیں۔
جس کے غلطوں کے بدن زندانوں میں توڑے جا رہے ہیں۔

اب ہر شب میں خود مینار پر چڑھتا ہوں
میں خود ہی اپنا رہبر، دیوانہ رکھوالا
اور سیڑھیوں سے بادا موں کی بوچھار بادلوں تک پھینکتا ہوں۔
گمراہ ایسے ہوتے ہیں
طلوعِ آفتاب کے لیے وہ ہواؤں کو رشوت دیتے ہیں۔
یہی ان کی زندگی کا مخفی مقصد ہے۔
پر یہاں کوئی آفتاب نہیں
یہاں کوئی آفتاب نہیں

بارش کی بوچھار میں میں لکھنے بیٹھا ہوں۔ دیوانے دل دلیر بن! میں لازوال رہنا چاہتا ہوں۔
اور اس سے زیادہ کیا کہوں
یہ رہا ایک قیدی کا خط اس کے عاشق کو جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔
"یہ لفظ تم تک کبھی نہیں پہنچیں گے۔۔
دوسرے خط کے آخری الفاظ تھے۔
"تمہارے لمس کے بغیر میرا بدن شبنم میں پگھل رہا ہے۔۔
جب میں نے جواب دینا چاہا
"اپنے اشک مجھے بھیجو" جیسے، بس اسی طرح بے رحم رہو
گم شدہ خط جن کو میں بچا نہیں سکا۔

***

اکبر حیدرآبادی

استفسار

کل سقراط نے
خواب کے کالے دروازے سے
اپنی چھب دکھلائی
آنکھیں رنگِ جلال سے آتش خانہ تھیں
رات نہ تھی۔۔ افسانہ تھی

شاگردوں کا ایک ہجوم
تہہ کر کے زانوئے ادب
اس کے سخن کی حکمت اور دانائی پر
کان لگائے بیٹھا تھا

اتنے میں اک رہ گم کردہ ننھی چڑیا آئی
اور سقراط کی پیشانی پر اتری
تھرائی آواز میں پھر یوں نالہ سنج ہوئی:

معنی اور الفاظ کے خالق
سچائی کے طالب
خیر کو علم اور شر کو جہل سمجھنے والے
تیرے نطق کا جوہر تجھ سے پوچھ رہا ہے
تیری منطق کیا ہے؟
کیا تیرے الفاظ کا لشکر ہار گیا؟
تیرے استدلال کا شہپر ٹوٹ گیا؟
کیا تیری تلوار کی دھار میں اگلی سی وہ کاٹ نہیں
کیا تیرے دریا کا کوئی گھاٹ نہیں
کیا وہ پیالہ
تھا جو تری حق گوئی کی پاداش کبھی
تیرے لبوں تک آتے آتے
ہاتھ سے تیرے چھوٹ گیا؟

معنی بنتے کیا وہ سارے خواب ترے
کوری آنکھوں کی مانند
رنگ، روشنی کے دھاروں سے عاری ہو کر
عجز، ندامت اور خجلت سے عرق عرق ہیں؟!

دروازہ تو کب سے کھلا تھا
شب کا لبادہ اوڑھ کے تو جو آیا ہے
گم صم تاروں، دنگ نظاروں کو کیا الجھن ہے
دن کے خزانے خالی ہوتے جاتے ہیں
زخمی لفظ۔۔ معانی بیکل
چھلنی چھلنی امیدوں کی چھاگل
پیاسی آنکھیں پیاسے ہونٹ
سوالی ہوتے جاتے ہیں
سارے خزانے خالی ہوتے جاتے ہیں!

وقت کی اس انگڑائی پر تو کا پہیہ کون گھمائے گا؟
بے مقصد، بے چہرہ رات کے مرگھٹ سے
خواب تری سچائی کا
کب زندہ ہو کر آئے گا؟ ▲

اکبر حیدرآبادی

○

ہو دل زندہ تو غم کے مرحلے آسان بہت ہیں
کہ جینے کے لیے یاں اور بھی ساماں بہت ہیں

درونِ جاں کی تنہائی کا منظر کس نے دیکھا
کہ ہنستے بولتے یہ شہر بھی ویراں بہت ہیں

اگر وہ اجنبی حیرت سے ہم کو تک رہا ہے
تو ہم بھی آئینے کو دیکھ کر حیراں بہت ہیں

یہ قیدِ عمر تو اک سلسلہ ہے بندشوں کا
کہ اس زنداں کے اندر اور بھی زنداں بہت ہیں

برہنہ کر نہ دے اس شہر کی تہذیب ہم کو
کہ جیسے بھی ہیں اپنے حال پہ نازاں بہت ہیں

یہی خوش فہمیاں اکبر کو لے ڈوبیں کہ خود کو
وہ دانشور سمجھتے ہیں، مگر ناداں بہت ہیں

○

○

ذہن میں بھی اب نہیں، دل میں کبھی رہتا تھا
تشنہ لب تھا میں تو اک بہتا ہوا دریا تھا

منہمک تھے لوگ یوں میرے بیانِ درد مے
خود ان ہی کے روز و شب کا جیسے اک قصّہ تھا

ہجر کے سنسان افق پر کھل گئی تھی اک دھنَ
روح کے گمبھیر سنّاٹے میں ہول اٹھا تھا

وہ مہ و سالِ تمنّا، وہ زمانہ عشق
سوچ کر حیراں ہوں، میری عمر کا حصّہ تھا

شعلگی سے جس کی جل اٹھی خلا کی ت
وقت کی تاریخ کا اک جاوداں لمحہ تھا

سوچ کی آنکھوں سے اکبر میں نے دیکھا آج :
تھا مری محفل میں اور میری طرح تنہا تھ

○

قمر ساحری

(۵ سلیبلز میں)

بدلیں گے حالات پکّی ہے یہ بات
بنیا ہے مشہور بستی میں بد ذات
میری سچّی راہ دنیا میرے ساتھ
اپنا ہی پرچم لہراؤ دن رات
جادوگر کا کھیل بن بادل برسات
وہ کیا دیں گے سکھ ان کی کیا اوقات
شاید بھاری ہو آنے والی رات
ڈرنا ورنا کیا آؤ دو دو ہاتھ
اردو میں مقبول
جاپانی سوغات

O

(۷ سیلیبلز میں)

سنچل کیا ہے آہٹ کیا
چلنا ہے گھبراہٹ کیا
اک دن آخر مرنا ہے
جینے سے اکتاہٹ کیا
سچّے ہوں تو کہتے جاؤ
باتوں میں ہکلاہٹ کیا
باتیں ہوں تو میٹھی ہوں
ایسی بھی کڑواہٹ کیا
جو کرنا ہے کر ڈالیں
روزانہ کی کھٹ پٹ کیا
آگے دیکھا جائے گا
رستے میں گھبراہٹ کیا

O

(۷ سیلیبلز)

دل کا سکھ ہے کاموں میں
رکھا کیا ہے ناموں میں
دل کی سننا مشکل ہے
دنیا کے ہنگاموں میں
کیوں پھنستے ہو نادانو
الٹے سیدھے کاموں میں
دل میں سورج پگھلے ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی شاموں میں
بنیا کیسے آوے گا
بستی کے کہراموں میں
انجانوں کی کچھ باتیں بھی
شامل ہیں الزاموں میں
ساحل پر آجاتا ہوں
فرصت پاکر شاموں میں
مل جاتی ہیں خوشیاں بھی
مہنگے سستے داموں میں
دکھ سکھ ساری بستی کے
بنیے کے گوداموں میں

جیلانی بانو

گوشت کے بیوپاری

آج پھر ہسپتال کی سب سے اونچی چھت پر وہ گدھ بیٹھا تھا۔ ممّو نے درد سے ہانپتے ہوئے ادھر دیکھا تو خوف کے مارے چپ ہوگیا۔ اس کے دل میں یہ وہم تھا کہ یہی گدھ اس کی بوٹیاں نوچے گا۔ یہ گدھ ہی لوگوں کو بتانے گا کہ ممّو بھکاری مرچکا ہے اور اب اس کے تکّے بوٹیاں بانٹ دینا چاہیے۔

ممّو بچپن سے اس ہسپتال کے ایسے کھیل دیکھ رہا تھا۔ یا دو سرجن، ڈاکٹر، نرسیں، وارڈبوائے، جسے دیکھو مریضوں کو لوٹنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ مریض صحت پا کر جاتے تب بھی سب کو انعام ملتا اور Mortuary سے لاش اٹھانا ہے تو بھی مانگنے والوں کی قطار لگ جاتی تھی۔

یہ ہسپتال ایک بہت بڑا میڈیکل ریسرچ سنٹر ہے۔ جانے کہاں کہاں سے مریض آتے ہیں۔ اور پھر ان مریضوں کی بوٹیاں نوچنے کے لیے گدھوں کی صورت والے ڈاکٹر انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔۔۔۔ ؟ شرم سے، یا پھر اس خیال سے کہ مرنے والا قیامت کے دن انھیں پہچان لے گا؟

ممّو کی ساری زندگی اسی ہسپتال کے سامنے گزری تھی۔۔۔۔ لوگ کہتے تھے اس کی ماں ایک اندھی بھکارن تھی۔ وہ کسی کار تلے دب کر مرگئی۔ پھر ممّو کوڑے کے ڈھیر میں سے روٹی کے ٹکڑے اور موسمی کے چھلکے چوس کر بڑا ہوگیا۔ سارا دن ہاسپٹل کے سامنے بھیک مانگتا اور رات کو مارچری کے سامنے کوریڈور میں سوجاتا تھا۔ مارچری کا چوکیدار خان اسے روز رات کو لاتیں مار کر اٹھاتا تھا حالاں کہ دو روپے روز اس جگہ کا کرایہ بھی ممّو سے لیتا۔ دو تین اور اپاہج بھکاری بھی یہیں رات گزارتے تھے۔ بارش اور جاڑے میں کہاں پناہ ملتی۔

اب ممّو کا سارا بدن پھوڑوں سے سڑ رہا تھا۔ درد کے مارے اسے کسی کل چین نہیں تھا۔ اسے یقین تھا اب موت آگئی ہے۔ اچھا ہے اس درد سے نجات تو ملے گی۔ اگر جنت میں پہنچ گیا تو خوب میوہ مٹھائیاں ملیں گی۔ شہد اور دودھ کی نہروں میں نہایا کروں گا۔ مگر جنت میں تو بچے لوگ جاتے ہیں۔ خیر خیرات کرنے والے، چوری نہ کرنے والے۔ وہ تو صرف نام کا مسلمان تھا۔ اس نے مسجد سے نمازیوں کی جوتیاں چرائیں۔ جھوٹ بول کر بھیک مانگی۔ ہاسپٹل کے اندھیرے کونوں میں بیمار بھکارنوں کے پاس گیا۔ ان میں حرامہ عورتوں کے چکر میں یہ بیماری لگ گئی۔ اب رات ہوگئی۔۔۔

نیند بڑھنے لگی۔۔۔۔ سارے ہسپتال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نو بجتے ہی سب طرف کی لائٹ بند ہوگئی۔ صرف کوریڈور میں دھیمے سے بلب جل رہے تھے۔ اسٹاف روم میں ڈیوٹی والے ڈاکٹر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ابھی ان کا ملازم شراب کی بوتلیں اور مٹن لے کر اندر گیا تھا۔

اوپر والے جنرل وارڈ میں کسی عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کوئی مریض مرگیا ہوگا۔۔۔ مارچری کے گیٹ

پر خان کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ مگر اس کی بنچ خالی پڑی تھی۔ وہ شام ہوتے ہی شراب خانے کو چلا جاتا تھا۔ کئی بار لاش لینے لے لوگ آتے اور اسے ڈھونڈ کر چلے جاتے تھے۔ مجو کا درد اور بڑھ گیا۔ اتنی ٹھنڈ میں بھی بدن میں آگ لگی تھی۔ پیاس مارے حلق سوکھ گیا تھا۔ کئی بار اس نے نرسی کو پکارا۔ نرسی پر فالج کا حملہ ہوا تھا اس لیے وہ گم سم پڑا رہتا تھا۔

دو کاریں ایک ساتھ اندر آئیں۔ ایک کار ڈیالوجی انٹنسیو کیر یونٹ کی طرف چلی گئی دوسری پولیس کی دیان تھی۔ وہ چری کے پاس آکر رک گئی۔

ایک پولیس انسپکٹر اترا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پولیس والے کو دیکھتے ہی مجو کو ڈر لگتا تھا پولیس والوں نے اسے یشہ بے قصور مارا تھا۔ کیا پتہ اس وقت بھی یہاں لیٹنے پر وہ لاتیں مارنا شروع کر دے۔

"یہاں کوئی چوکیدار نہیں ہے ----؟" پولیس انسپکٹر بہت گھبرایا ہوا تھا۔ "خان صاحب ادھر ہوٹل میں ہوں گا ب-" مجو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

خان نے انسپکٹر کو دیکھ لیا تھا اور وہ دوڑتا ہوا آرہا تھا۔

انسپکٹر اس کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں ادھر گھسیٹتا ہوا لے آیا، جہاں مجو پڑا تھا۔ وہ بے بسی سے پاؤں ہلک رہا ا۔ اس کے بھاری بوٹ کسی بھی وقت مجو کو کچل سکتے تھے۔

"کل رات مارچری میں کچھ لاشیں آئی ہیں کیا----؟"

"جی ہاں---- ایک لاری کے نیچے کچلا گیا سولہ کا ہے۔ ایک عورت کو نالے میں مار کے ڈال دیے تھے اور ایک دنا بچہ کچرے میں پڑا تھا----"

"بس ٹھیک ہے----" انسپکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"وہ نوجوان کی ڈیڈ باڈی میرے کو دے دو۔ میں جیپ ادھر لے کر آتا ہوں--"

"نکو صاب" خان نے گھبرا کر کہا---- "وہ ڈیڈ باڈی آج صبح کو آئی ہے کوئی لینے کو آگیا تو----"

"ارے کون آتا ہے اب۔ کوئی ہوتا تو مرنے کو سڑک پر چھوڑ دیتے۔"

"نکو صاحب۔ آر۔ ایم۔ او صاب اب ڈیوٹی پر آنے ہوں گے۔" خان نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"دیکھو---- میرا دماغ نکو چاٹ۔" انسپکٹر نے اپنے ڈنڈے کو اپنے ہی ہاتھ پر مار کر کہا---- "وہ نکسلائیٹ لیڈر کو ہم ث کر دیے پولس کے رپورٹ کر دیے تھے۔ ہماری پروموشن رکی ہوئی تھی۔ ابھی فون آیا کہ ڈی۔ ایس۔ پی صاب ڈیڈ باڈی لینے کو آرہے ہیں۔" انسپکٹر نے جیب میں سے ایک سو کا نوٹ نکال کر خان کی مٹھی میں دبا دیا۔

"مگر صاحب اتنی جلدی لاش کاں چلی گئی۔ آر۔ ایم۔ او صاحب مجھ سے پوچھیں گے۔"

"ابے چپ----" انسپکٹر نے ایک فحش گالی خان کو دی اور غصے میں اپنا بھاری بوٹ مجو کے زخمی ہاتھ پر رکھ دیا۔ رایک سو کا نوٹ نکال کر خان کی طرف بڑھایا۔

"یہ اس کو دے دینا۔"

نوٹ جلدی سے لے کر خان [illegible] کی جیب میں [illegible] مارچری کی [illegible] ڈھونڈنے لگا۔ مجو [illegible]

والے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے یہاں سے لاشیں لے جاتے تھے۔ خان کو سو دو سو روپے کی آمدنی ہو جاتی۔ آر۔ ایم۔ او بھی اس میں شریک ہوتا۔ بلکہ کیس بڑا ہو تو ڈیوٹی آفیسر کو بھی اس کا حصہ دینا پڑتا تھا۔ لاشوں کی گنتی ہوتی تو خان گلی سڑی لاشوں کے ٹکڑے پلاسٹک کے تھیلوں میں بھر کے ان پر نمبر لگا دیتا تھا۔ ویسے بھی لاشوں کی گنتی کرنے کی کسے ضرورت تھی۔ دو مہینے تک لاش کا کوئی وارث نہ آنے تو اسے میڈیکل کالج کے ڈسکشن ڈپارٹمنٹ کو بھیج دیا جاتا تھا۔

خان نے ڈھیرے سے دروازہ کھولا تو اندر سڑنے والی لاشوں کی بو چاروں طرف پھیل گئی۔ پھر وہ پلاسٹک کے تھیلے میں بندھی ہوئی لاش کو اٹھا کر باہر لایا تو ٹھنڈے پانی کی بوندیں مجو پر گریں اور اس کے زخموں پر جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا۔ جاتے وقت خان نے پھر ہاتھ پھیلایا تو انسپکٹر نے دس روپے کا ایک نوٹ پھر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ---- ہاسپٹل کے گیٹ پر جیپ رکی ---- چوکیدار کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر انسپکٹر نے پھر کچھ رکھا اور تیزی سے باہر چلا گیا ----

مارچری کا دروازہ بند کرنے کے بعد خان نے ادھر ادھر دیکھا ---- اسٹاف روم سے ابھی تک شراب میں ڈوبے قہقہے اچھل رہے تھے ---- مجو کو پیاس لگی تھی ---- مگر وہ دم سادھے پڑا رہا۔ اگر خان کو پتہ چل جانے کہ وہ جاگ رہا ہے تو دو چار لاتیں ضرور مارے گا۔

سالا ---- حرام خور ---- پولیس والوں کو لاشیں دے کر روز خوب کمائی کرتا ہے۔ اور ہم سے دو روپے لے کر سونے کو جگہ بھی نہیں دیتا۔ جاتے وقت روز ٹھوکر مار کے کہتا ہے باہر جاؤ ----

اب شراب خانے کی طرف جانے گا۔ یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر ---- مجو درد سے کراہنے لگا۔

ایمرجنسی وارڈ کی طرف ایک رکشا گئی۔ کئی لوگ ایک عورت کو تھامے بیٹھے تھے جو بری طرح چلا رہی تھی۔ سالے جہیز کے لالچ میں عورت کو جلا دیتے ہیں۔ پھر اسے اٹھا کر ہسپتال لے آتے ہیں۔

مجو تو اندر آنے والے لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ کونسا کیس ہے ---- لان کے شارٹ کٹ راستے کو کاٹتے ہوئے دو نوجوان ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہے انگ وارڈ کی طرف جا رہے تھے۔

"روز ڈاکٹر کہتا ہے کہ اب دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ آج تین دن سے چھٹی لیے بیٹھا ہوں۔"

یار! اس نے تم سے اسی دن کہہ دیا تھا کہ اب آکسیجن نکالو اور گھر لے جاؤ۔ مگر تمہیں تو اپنی محبت کا شو کرنا تھا ----

مجو درد اور پیاس سے نڈھال ہو کر اونگھنے لگا۔ پھر لوگوں کی چیخ پکار سے چونک پڑا ---- آر۔ ایم۔ او کے ساتھ دو نوجوان لڑکے مارچری کے سامنے کھڑے تھے اور خوب چلا رہے تھے۔ آر۔ ایم۔ او گھبرایا ہوا تھا اور بار بار خوشامد بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"معاف کر دیجیے صاحب۔ چوکیدار کہیں چلا گیا ہے۔ آپ صبح آ کر ڈیڈ باڈی لے جا سکتے ہیں۔"

مجو نے دیکھا ---- خان دور کینٹین کے سامنے کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کے پچھواڑے کی طرف بھاگ گیا۔

مجو کا جی چاہا کہ وہ ان لوگوں کو بتا دے خان کہاں ہے۔

وہ لوگ خوب لڑے۔ رونے چلانے۔ صبح سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی دھمکی دی اور چلے گئے۔

سالے نے وہ لاش تو انسپکٹر کو دے دی ہے۔ اب صبح ان لوگوں کو کس کی لاش دے گا ----؟

مجو درد سے تڑپتے ہوئے جانے کب سو گیا۔

آنکھ کھلی تو گھپ اندھیاری میں کسی نے اسے ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا اور جانے کہاں لیے جا رہا تھا۔

"ارے کون ہے رے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرے کو نکو مارو۔۔۔۔ وہ سمجھ گیا کوئی بھکاری اس کے پیسے کے لیے آیا ہے۔

مگر اس کے پیسوں کی تھیلی چھن سے زمین پر گر چکی۔ اسے کوئی اٹھا کر جلدی جلدی بھاگ رہا تھا۔ پھر اچانک ی ہوا آئی اور کسی نے اسے دھپ سے زمین پر پٹک دیا۔

گرنے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔ اسے پٹک کر جانے والے کو زور کی ٹھوکر لگی اور بدبو یارے وہ کھانسنے لگا۔۔۔۔ یہ خان ہے۔ اس کی کھانسی کو وہ پہچانتا ہے۔

اس کا دم گھٹنے لگا۔۔۔۔ موت آگئی۔۔۔۔ یہ جنت ہے یا دوزخ۔۔۔۔ ہو نہ ہو۔۔۔۔ غریبوں کی جنت میں پیاسوں کے لیے پانی نہیں صرف ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھنڈ تھی لو۔۔۔۔ قیامت کا دن آگیا۔۔۔۔ لوگ زور زور سے چلا رہے تھے۔۔۔ چاروں طرف چیخ پکار مچی۔۔۔۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ وہی کل والے دو نوجوان اس پر جھکے ہوئے تھے۔

"یہ ہمارا بھائی نہیں ہے۔ کسی اور کی لاش ہے۔۔

"ارے۔۔۔۔ یہ تو زندہ ہے۔۔۔۔؟"

"سالو۔۔۔۔؟ بد معاشو۔۔۔۔ زندہ مریضوں کو مردہ خانے میں ڈال دیتے ہو؟"

"پولیس کو بلاؤ۔۔۔۔ منسٹر کو فون کرو۔۔۔۔ ڈاکٹروں کو پھانسی پہ چڑھا دو۔ انہیں بھی مردہ خانے میں ڈال دو۔۔۔۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جانے کہاں سے اخبار والے بھی آگئے اور مجو کی آنکھوں پر بار بار کیمرہ کی روشنی چمکنے لگی۔۔۔۔

"ارے یہ زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔۔۔۔؟" خان نے جھک کر بڑے غور سے اسے دیکھا۔۔۔۔

"جانے دیجیے۔ معاف کیجئے صاب آپ کے بھائی کی ڈیڈ باڈی غلطی سے کوئی اور لے گیا ہے۔۔۔ کیا بولنا صاب۔ لوگ ے کے بعد اپنے بھائی کا منہ بھی نہیں دیکھتے۔ بس گلا دینے سے کام۔۔۔۔

آر۔ ایم۔ او ان لوگوں کی خوشامد کر رہا تھا۔

مجو نے چکراتے ہوئے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کل والا انسپکٹر بھی اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ شاید اسے ایک اور ی کی ضرورت تھی۔

"ہمارے بھائی کی لاش تم لوگوں نے غائب کر دی ہے۔ اور ایک زندہ آدمی کو مردہ خانے میں ڈال دیا ہے۔۔ ایک ن چیخ رہا تھا۔

"یہ تو بھکاری ہے صاب۔۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب اخبار والوں سے کہہ رہے تھے۔

"جانے کیسے مردہ خانے میں گھس گیا۔ بہت پریشان کرتے ہیں یہ بھکاری۔۔۔

سارے ڈاکٹر بھاگے بھاگے آگئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا۔

جلدی سے اس آدمی کو ایمرجنسی میں لے جاؤ۔ فوراً اس کا علاج شروع کرو۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں اس بھکاری

کو کسی مینٹل ایڈ چاہیے۔۔

خان بھاگ کر اسٹریچر لے آیا۔ چاروں طرف سے ڈاکٹروں اور نرسوں نے اسے گھیر لیا۔۔ پھر خان مُو کا اسٹریچر دھکیلتا ہوا کوریڈور سے آگے چلا گیا۔ مجمع ابھی تک ہسپتال کے لان میں کھڑا ڈاکٹروں کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ ایمرجنسی وارڈ گزر گیا۔ خان کے ساتھ وہی انسپکٹر بھی اسٹریچر کو تھامے چل رہا تھا۔ اب وہ ہسپتال کے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔

میں کیا بولا تھا آپ کو؟۔۔۔۔ پبلک بھوت بدمعاش ہو گئی۔ کتنا بڑا لفڑا کھڑا کر دیا۔؟"

خان بے حد غصہ میں تھا اور زیادہ زور سے اسٹریچر کو ڈھکیل رہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ سالے بول رہے ہیں زندہ آدمی کو مارچری میں کیوں ڈالے۔۔۔۔؟

ٹھیک ہے۔۔۔ زندہ آدمی کو کوڑے میں تو پھینک سکتے ہیں نا۔۔۔؟

"اب آپ کل آؤ صاب اس لاش کو یہاں سے اٹھا کر لے جانا۔۔۔ مگر پیسے ابھی دے دو۔۔۔"

پھر اس نے لات مار کر اسٹریچر کو کانٹوں بھری جھاڑی میں الٹ دیا۔۔۔۔

***

(سلسلہ ص ۹۰)

پیام

***

دھرو شکل

(ترجمہ: قاسم ندیم)

مکڑی

(دھرو شکل ہندی کہانی کا جانا پہچانا نام ہے جن کی کہانیوں پر ہندی نقادوں نے بحث و مباحثے بھی کیے ہیں۔ "اسی شہر میں" نامی ناول بے حد مقبول ہوا۔ "کھوجو تو بیٹی پاپا کہاں ہے" کے عنوان سے ہندی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اور کہانیوں کا مجموعہ "ہچکی" قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے)

"تو نے مجھ سے میرا لڑکا چھین لیا۔" یہ کہتی ہوئی وہ کمرے سے چلی گئی۔ گھر میں ساری چیزیں الٹ پلٹ ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں ایک جگہ رکھ دیا جاتا ہے تو وہ دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر کبھی نہیں رہتیں۔ جگہ جگہ چھوٹی موٹی چیزوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ یہاں کی نہیں بلکہ وہاں کی ہیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دی جاتی ہیں پر ان کی جگہ کبھی طے نہیں ہو پاتی۔ کھنڈروں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کی جگہ طے ہو چکی ہے، اب وہ کہیں نہیں جائیں گے۔

گھر میں بھی ایک ایسا کمرہ ہے جس میں چیزیں کئی سال سے جوں کی توں رکھی ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر ہلی تک نہیں۔ وہ انھیں دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ اس کمرے میں وہ روز نہیں آتی۔ اسے جب غصہ آتا ہے تو سیدھے اسی کمرے میں دوڑی چلی آتی ہے۔ یہاں ٹیبل پر رکھی ہاتھ کی گھڑی کسی گزرے ہوئے زمانے کا وقت بتا رہی ہے۔ وہ گھڑی دیکھتے ہی رک گئی، جیسے اسی کمرے کی کوئی چیز ہو۔ "رام چرت مانس" پڑھتے پڑھتے رکھا ہوا چشمہ "مانس" پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔

اس نے چشمے کو ہاتھ میں اٹھایا تاکہ اس میں سکوت بھرا لفظ نظر نہ پیدا ہو جائے۔ اس کے ہاتھ اور جی کی طرح کانپنے لگے۔ ادھ دھیا کاغذ میں دبی لال ڈوری چپ چاپ باہر لٹک رہی تھی۔ وہ اسی صفحے کو کھول کر پڑھنے لگی۔ اگلا صفحہ وہ کبھی نہیں پڑھتی۔ اس نے ڈور کو وہیں دبا دیا۔

وہ اپنی ساڑی کے پلو سے چشمے کے شیشوں پر جمی دھول صاف کرنے لگی۔ چشمے کی کانچ میں اس کا چہرہ دور دکھائی دیا۔ چشمہ صاف کر کے اس نے اسی طرح رکھ دیا، جیسے وہ پہلے رکھا تھا اور کمرے میں رکھی چیزوں کی گرد صاف کرنے لگی۔ وہ پورے گھر میں جھاڑو لگاتی ہے پر اس کمرے کو جھاڑو سے نہیں جھاڑتی۔ ہمیشہ ساڑی کے پلو سے صاف کرتی ہے۔ چیزیں ایسے چمکنے لگیں، جیسے نئی نئی آئی ہوں۔ وہ ان میں دیکھتے دیکھتے کھو گئی۔

میں نے پہلی مرتبہ ساڑی پہنی تھی، جب مجھے دیکھنے والے آنے تھے۔ اس کے پہلے تو میں چھینٹ کا لہنگا اور فراک پہنتی تھی۔ پانچ گز کی ساڑی میں میں ایسے سما گئی جیسے گڑیا ہو۔ میں ساڑی کو جتنا لپٹتی، ساڑی اتنی ہی بڑی لگتی۔ اپنے پلو کو کندھے پر لیتی تو وہ کندھے سے پھسل کر زمین پر لٹکنے لگتا۔ میں نے اپنے چاروں طرف لپیٹ کر کمر میں کھونس لی۔

پیچھے میں پاؤں میں نے کر لڑکے والوں کے سامنے گئی تھی۔ آٹھ دس لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ کچھ

عورتیں بھی تھیں۔ ان میں ایک ایسا تھا جسے دیکھ کر مجھے لگا کہ اگر وہ ساڑی پہنے ہوتا تو شرم کے مارے گھونگھٹ نکال لیتا میں اسے دیکھتے ہی شرما گئی۔ ایک بزرگ نے سامنے آکر میرے ہاتھوں میں پھیلے ہوئے پلو میں بیسن کے لڈو رکھ دیے۔ نتھ رکھتے ہی مجھے لگا جیسے لڈو بھی سونے کے ہوگئے۔

لڈو لے کر میں ماں کے کمرے میں آگئی۔ اب میرے ہاتھوں میں ایک پوٹلی تھی۔ جس کے اندر لڈو پھوٹ رہے تھے۔ انھیں چھو کر سونے کی نتھ بھی میٹھی ہوگئی۔ میں نے جلدی سے ایک تھال میں اپنی پوٹلی کھولی، کہ کیسے لوگ ہیں میرا پلو گندہ کر دیا۔ پھر بھی میٹھا اس پلو سے چپکی رہی۔ میں اسے خالی نہ کر سکی۔ ماں نے پاس آکر موٹی سی چین اور نتھ مجھے پہنادی۔

اس دن میں پہلی مرتبہ کھڑکی میں آکر بیٹھی۔ ماں مجھے کھڑکی سے کبھی جھانکنے تک نہیں دیتی تھی۔ لیکن آج ماں نے کچھ نہیں کہا۔ میں کھڑکی میں بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ راہ چلتے لوگ مجھے دیکھ کر جارہے تھے۔ جو مجھے دیکھنے آئے تھے وہ بھی وہاں سے گزرے۔ میں ان کی پیٹھ ہی دیکھ پارہی تھی۔ وہ سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں ہنسنے لگی۔

ماں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں ہنس رہی ہے؟"

میں بولی "ماں اگر کسی کی آنکھیں پیچھے بھی ہوں تو وہ کیسا لگے گا؟"

ماں نے کہا "پیچھے تو بھوتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، وہ بھوت لگے گا۔ بھوتوں کے تو پاؤں بھی الٹے ہوتے ہیں، ایڑیاں آگے انگلیاں پیچھے۔"

میں اسے دیکھتی رہی، مگر اس نے مجھے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ جیسے وہ پہلی ملاقات میں ہی روٹھ گیا ہو۔ مجھے لگا جیسے پورے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ سچ مچ چیونٹیاں ہی تو تھیں۔ زمین پر لٹکے ہوئے پلو کے سہارے اوپر چڑھ کر وہ تمام جسم پر پھیلتی جارہی تھیں۔ میں نے جلدی میں اپنی پوری ساڑی اتار پھینکی۔ پیٹی کوٹ اور بلاؤز ہی رہ گیا۔ میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو دیکھ کر سہم گئی جیسے کوئی میرے کپڑے اتارنے کی کوشش کر رہا ہو، میں نے دوسری ساڑی پہن لی اور آنگن میں آگئی۔

اچانک چیونٹیوں کی لمبی قطار آنگن کے سوکھے کونے میں چلتی دکھائی دی۔ لال چیونٹیوں کی فوج بڑھتی چلی آرہی تھی میں نے سوچا میں تو روز آنگن میں جھاڑو لگاتی ہوں، اسے پانی سے دھوتی ہوں، پھر یہ چیونٹیاں کہاں سے آرہی ہیں۔ جھاڑو لگانے کے بعد بھی کچرا کونوں میں چپکا رہتا ہے۔ موقع پاکر چیونٹی بن کر رینگنے لگتا ہے۔ آنگن میں بکھر جاتا ہے۔ میں چیونٹیوں کا پیچھا کرنے لگی۔ پیچھا کرتے کرتے وہ کونا دکھائی دیا جہاں ایک مری ہوئی چڑیا پڑی تھی۔ چیونٹیاں اسے کھا رہی تھیں اور کھا کھا کر آگے بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے لگا میرے جسم میں کروڑوں چیونٹیاں بھری ہیں، جو اندر ہی اندر رینگ رہی ہیں۔ ایک دن سبھی باہر نکل جائیں گی۔ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا، چیونٹیاں ہی جسم سے باہر نکلتی ہیں اور اسے ہی کھانے لگتی ہیں۔ چیونٹیوں سے بچنے کے لیے لوگ جلد از جلد جل جانا چاہتے ہیں۔

شاید کوئی چیونٹی کاٹ رہی تھی۔ سامنے چائے کا پیالہ لیے بہو کھڑی تھی۔ سامنے کپ کے کنارے رینگتی ہوئی ایک چیونٹی دکھائی دی۔ وہ جھلا اٹھی، بہو تم کپ پلیٹ بھی ٹھیک سے نہیں دھو سکتیں، ان میں جھوٹن لگی رہتی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا یہ چیونٹیاں گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتیں۔ جب میں ٹھنڈی ہو جاؤں گی تب ہی یہ یہاں سے نکلیں گی۔

بہو نے زور سے سارے چیونٹی کو پکڑا تو وہ مر گئی۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر [illegible] بی پر گر پڑی۔ وہ پھر غصہ ہوا

"تمھیں یہ کمرہ چھوٹا کرنے کا حق نہیں ہے۔ تمھارا کمرہ الگ ہے۔ جاکر اپنی جھونٹن میں رہو۔ اس کمرے میں تمھیں جھانکنے کی بھی ضرورت نہیں۔۔

بہو چائے کا پیالہ ٹیبل پر رکھ کر چلی گئی اور وہ فرش پر پڑی چائے کو اپنے پلو سے پونچھنے لگی۔ صاف کرتے کرتے اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے تھمنے لگا۔ جیسے نیند میں کھو گیا ہو۔ میں اسی پلو کا گھونگھٹ نکال کر گھر میں آئی تھی۔ سہاگ رات کو وہ میرے کمرے میں جب داخل ہوئے تو میں بستر کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی۔ کمرے میں ان سے پردہ کرنے کی کہیں جگہ نہ تھی۔ چھوٹا سا بستر چاروں طرف پھیلے میلوں لمبے میدان کی طرح لگ رہا تھا۔ میں اپنے پلو کو چاروں طرف سے کھینچنے لگی۔ اپنے اندر سکڑنے لگی۔ گھونگھٹ اتنا نیچا کر لیا کہ وہ بگلے کی چونچ سا دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بگلا مچھلی کی تلاش میں کنول کے پتے پر بیٹھا ہو۔ وہ دور کھڑے کھڑے مجھے ایک ٹک نہارتے رہے اور میں پانی میں تیرتی رنگین مچھلی کی طرح اپنے آپ کو بہت دیر تک چھپائے رہی۔ پھر دھیرے سے گھونگھٹ کو میں نے اس طرح ہٹایا جیسے کوئی مچھلی پانی کی سطح پر آکر سانس لیتی ہے اور جھٹ پانی میں کھو جاتی ہے۔ وہ میری طرف بڑھے، میں سہم گئی۔ مجھے اپنے ہی اندر ایک سرسراہٹ سنائی دی، جیسے کوئی کتاب تیز ہوا آنے پر پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ وہ میرے پاس آگئے۔ جیسے ہی انھوں نے میرا گھونگھٹ اٹھایا میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

ہوا کتنی ہی ٹھنڈی کیوں نہ ہو آنکھوں میں بھرتے ہی جلنے لگتی ہے۔ اس میں چھپے دھول کے ذرے نشتر بن کر چبھنے لگتے ہیں۔ آنکھیں کھلتی ہیں تو دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ ہم اڑ کر کسی اور دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ مگر ان کی طرف دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ میں ٹیبل پر رکھے جار میں تیرتی مچھلی کو دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی مچھلی تیرتے تیرتے جار کے کسی کونے میں چھپ جاتی پھر دکھائی دینے لگتی۔ وہ دیر تک آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ اچانک بگلے نے مچھلی کو اپنی چونچ میں دبا لیا۔

بہو نے باہر سے ہی آواز دی۔ "ماں جی آپ دن بھر سے اسی کمرے میں بیٹھی ہیں۔ اندھیرا ہونے لگا ہے۔ کمرے کی بتی جلا دوں۔۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ بہو نے بتی جلا دی اور لوٹ گئی۔ سامنے رکھے کانچ کے جار میں نہ پانی تھا نہ مچھلی۔ مچھلی کے تیل کی شیشی لیے نائن آ رہی تھی۔

اس کا پورا شریر درد سے دکھتا رہتا ہے۔ پنڈلیوں اور پیٹ میں بھی چبھن ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ بات کی شکایت ہے۔ مچھلی کے تیل کی مالش سے ٹھیک ہو جائے گی۔ نائن ہر ہفتے اس کی مالش کرتی ہے۔ وہ سیدھی لیٹ گئی۔ نائن مچھلی کا تیل لگا کر اس کی پنڈلیوں کو دبانے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جب پنڈلیوں کا درد کم ہوا تو نائن اس کا پیٹ سونتنے لگی۔ مچھلی کے تیل میں ڈوبے نائن کے ہاتھ اس کے پیٹ پر پھسلنے لگے۔ نائن نے پوچھا؟ "کیا آج کچھ بھی نہیں کھایا"۔ وہ بولی "کوئی مجھے کھانے کو دے تب نا۔ دن بھر سے بھوکی کتیا کی طرح اسی کمرے میں پڑی ہوں۔ کسی نے ٹکڑے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔۔

بغل والے کمرے سے بہو کی آواز آئی۔ "ماں جی کیوں بدنام کرتی ہیں۔ آپ کو غرّانے سے فرصت ملے تب نا۔ پورے گھر میں دم اٹھائے پھرتی ہیں۔ میں دم تو سیدھی کر نہیں سکتی۔۔

نائن بولی "ساس سے ایسی باتیں نہیں کرتے بہو۔

بہو بولی "میں کبھی نہیں بولتی۔ آج پہلی بار بولی ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے، جو یہ مجھ پر

(آگے ص ۹۰ پر)

سید جلیل الدین

(مرتب)

اشاریہ ماہ نامہ "سب رس"، حیدرآباد

جنوری تا ڈسمبر 1993ء

مقالے

جواد رضوی	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	نومبر۔ ص ۷
جیلانی بانو	عابد علی خاں۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو۔	جنوری تا مارچ۔ ص ۵۵
حمید الماس	۱۔ ناصر بغدادی کی تخلیقی نہاط	اپریل۔ ص ۲۱
	۲۔ کنٹر ادب، عہد جدید میں	مئی۔ ص ۱۰
حیات اللہ، محمد	عابد علی خان صاحب، ہمارے لیے ایک سائبان۔	جنوری تا مارچ۔ ص ۵۹
خالد، محمد	مولانا ابوالکلام آزاد اور قلم	اگست۔ ص ۲۱
خالد عرفان	شناخت "بے شناخت"۔	اپریل۔ ص ۱۲
خان، ایم۔ ٹی	اوم پرکاش زرمل، "اتر آئی شام اور ختم ہوا ایک سفر"۔	جولائی۔ ص ۲۶
داؤد اشرف، سید، ڈاکٹر	۱۔ نایاب فارسی مخطوط "حکم نامہ"۔	اگست۔ ص ۱۳
	۲۔ پچاس سال قبل حیدرآباد میں اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سیشن	ستمبر۔ ص ۹
ذکی شاداب	پرم آنند سنگھی، ایک شخصیت۔ ایک تہذیب	اگست۔ ص ۷
• راحت عزمی	نواب عنایت جنگ بہادر (جیسا دیکھا ویسا پایا)	اکتوبر۔ ص ۱۱
رادفر، ابوالقاسم، ڈاکٹر (مترجم: پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم)	سودی لبنوی (سعدی و حافظ کا یورپین شارح)	ڈسمبر۔ ص ۲۸
راشد آذر	شاخ تازہ (قمری ساحری کا تیسرا شعری مجموعہ)	اگست۔ ص ۱۷
رضوان احمد	اردو صحافت کی آبرو تھے عابد بھائی۔	جنوری تا مارچ۔ ص ۸۲
زینب حیدر، ڈاکٹر	حیدرآباد کے تعلیمی امور کے بارے میں سلطان العلوم کے چند فرامین۔	نومبر۔ ص ۲۲
سراج الدین علی خان، میر	عابد علی خان اور ادارہ ادبیات اردو	جنوری تا مارچ۔ ص ۱۰۱
سرور، سرور عالم راز	چند تصویر بتاں	ستمبر۔ ص ۲۴
سکینہ، رمن راج	یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا مقصد	
	روایات کے تحفظ کا عہد (افتتاحی اجلاس میں تقریر)	اپریل۔ ص ۱۴
سکینہ، منوہر راج	اردو گھر اور عابد علی خان	جنوری تا مارچ۔ ص ۹۱
سلیمان اطہر جاوید	عابد علی خان	ڈسمبر۔ ص ۶
سواد حسین	اب صرف باقی یادیں	جولائی۔ ص ۴۹

افسانے

ڈرامے

تعارف

نظمیں

غزلیں

شاعر	مصرع	ماہ۔ صفحہ
	۳۔ اس کا کیا ہے وہ تو نسی [illegible] کتنے روپ بنالے گا	ستمبر۔ ص ۳۸
	۴۔ شاطر تھا وہ شوخی محفل بہت بڑا بیوپاری تھا	دسمبر۔ ص ۳۶
	۵۔ وہ مجھ کو کھو کے زمانے میں خود ہی رسوا تھا	دسمبر۔ ص ۳۶
بے حس الہ آبادی	بھیڑ سے خود کو یوں بچا کے چلو	نومبر۔ ص ۳۷
جمیل نظام آبادی	۱۔ خودداریوں کو بھول گئے خوار ہو گئے	جولائی۔ ص ۴۲
	۲۔ بول جو میٹھے بول رہا ہوں	جولائی۔ ص ۴۲
حامدی کاشمیری	۱۔ ہر گل تر آتشیں ہو جائے گا	دسمبر۔ ص ۳۴
	۲۔ بس اتنی یاد، اب اس رات کی ہے	دسمبر۔ ص ۳۴
حسن رضا	کچھ فکر کچھ احساس سوا کر دیا گیا	جون۔ ص ۲۴
حمید الماس	راہ کتنی ہی نہیں جذب سفر کیسا ہے	نومبر۔ ص ۳۶
خواہ مخواہ حیدرآبادی	۱۔ لڑا ڈیبر کسی سے یوں نہ تم سب سے سامنے آنکھیں	جون۔ ص ۲۸
	۲۔ سیاست میں کبھی فرقہ پرستی چل نہیں سکتی	جون۔ ص ۲۸
ذکی بلگرامی	۱۔ کیسے جاناں تھیں کیسی شرابوں کے تھے	دسمبر۔ ص ۳۷
	۲۔ کوئی سیرا عالم بے خبری دیکھنا	دسمبر۔ ص ۳۷
ذکی شاداب	۱۔ سوز غم میں کوئی ڈوبا ہو تو ہو	اگست۔ ص ۳۲
	۲۔ جب جشن بہاراں ہو نکل آتے ہیں آنسو	اگست۔ ص ۳۲
راہی قریشی، ڈاکٹر	۱۔ رنگ خوں کیسا سیاہ سرخ رو میں زندہ ہے	اپریل۔ ص ۴۰
	۲۔ تو کون سی امید پہ مسرور ہے بابا	ستمبر۔ ص ۳۸
رضا وصفی	۱۔ بے معنی و مفہوم کی زنبیل ہوا میں	مئی۔ ص ۲۹
	۲۔ عشق خوشبو سے ہے پھولوں سے شناسائی ہے	مئی۔ ص ۲۹
ریاض مسیح	۱۔ الاؤ سرد ہے، قصے کوئی سناتا نہیں	جولائی۔ ص ۴۳
	۲۔ نئی رہیں نیا منظر نیا جہاں نہ ملا	جولائی۔ ص ۴۳
ساجد حمید	۱۔ صدف میں گوہر چھپا ہوا ہے	جون۔ ص ۲۵
	۲۔ جب سرا میں ہوا مجھ [illegible]	جون۔ ص ۲۵
	۳۔ حرف حق بعد تصور [illegible] جاں	نومبر۔ ص [illegible]
ستار صدیقی	رہنے دے اسے یہ سر پیکار سمندر	اگست۔ ص [illegible]
سلمان عباسی، ڈاکٹر	۱۔ تو [illegible] کے چہرے سے غم عیاں نہیں ہوتا	مئی۔ ص ۳۰
	۲۔ میں [illegible] کو حرف شناسا کر رہا ہوں	مئی۔ ص ۳۰
[illegible] پروفیسر	۱۔ مجھ کو دیکھا تو مری آنکھ سے دیکھا مجھ کو	اگست۔ ص ۳۱

قطعات

اشاریہ

تبصرے

روئیدادیں

اردو کا خراج عقیدت — اکتوبر - ص ۴۳

۵ - یوم نذر کا ادبی اجلاس — اکتوبر - ص ۵۵

اداریے

مغنی تبسم، پروفیسر

۱ - پہلی بات (عابد علی خاں نمبر) — جنوری تا مارچ - ص ۴

۲ - پہلی بات — اگست - ص ۶

۳ - پہلی بات — ستمبر - ص ۵

۴ - پہلی بات — اکتوبر - ص ۵

خطوط

مشاہیر ادب کے نام عابد علی خاں کے خطوط

۱ - کیفی اعظمی کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۰۶

۲ - ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۰۷

۳ - قتیل شفائی کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۰۸

۴ - مجروح سلطان پوری کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۰۹

۵ - ممنون حسن خاں کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۱۰

۶ - مقصود الٰہی شیخ - ایڈیٹر "راوی" لندن کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۱۱

۷ - پروفیسر آل احمد سرور کے نام — جنوری تا مارچ - ص ۱۱۲

مشاہیر کے خطوط عابد علی خاں کے نام:

قاضی عبد الغفار - پی رام کشن راؤ - جگر مراد آبادی - ڈاکٹر زور - فراق گورکھپوری - حبیب الرحمن - علی سردار جعفری - رشید احمد صدیقی - کرشن چندر - پروفیسر مسعود حسین - ظ - انصاری - پروفیسر ہارون خاں شیروانی - پروفیسر خواجہ احمد فاروقی - شکیل عظیم آبادی - ساحر لدھیانوی - ظفر الحسن - سید شہاب الدین (ایم پی) - عابد حسین - سکندر علی وجد - ڈاکٹر جمیل جالبی - عزیز قیسی - [illegible] - [illegible] - رئیس امروہی - ملال آبادی - گر ڈل یی سنگھ - پروفیسر آل احمد سرور - [illegible] - مجروح سلطان پوری - کیفی اعظمی — عابد علی خاں نمبر - جنوری تا مارچ ص ۶۳ تا ص [illegible]

سنِ اجرا: ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون: 0469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۶ ○ مئی ۱۹۹۴ء ○ شمارہ: ۵

فی پرچہ: ۷ روپے
زرِ سالانہ: ۷۵ روپے
کتب خانوں سے: ۱۰۰ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ: ۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون: ۱۵ ڈالر
انگلستان: ۱۲ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

حسینی شاہد پرنٹر پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس عابد روڈ میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع کیا

اس شمارے میں

کتاب: غالب

شخصیات

یادداشت

تنقید

نظمیں

غزلیں

افسانے

نتالیا پری گارنا　　کتاب: **غالب** (باب اوّل)
ترجمہ: اسامہ فاروقی

تیرِ شکستہ نیاگاں

"آباء و اجداد کی نام وری پر فخر نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ ان کی نام وری کی قدر نہ کرنا شرمناک فرومائگی ہے۔"

(ا۔ س۔ پوشکن)

شاید ہی کوئی ایسا بڑا شاعر ہو جس نے اپنی خداداد شاعرانہ قابلیت کے سرچشموں کے بارے میں غور و خوض نہ کیا ہو اور اس کو اپنی نسل اور خاندان کی گہری جڑوں میں نہ تلاش کیا ہو۔ ایسے عظیم شاعروں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے عہدِ قدیم کی س دنیا میں گم ہو کر اپنی اصل کے بارے میں عمداً یا غیر ارادی طور پر ایک اسطور کی تخلیق نہ کی ہو اور اس مفہوم میں رزا غالب کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتے۔ بلند پرواز تخیل انھیں شاعرانہ "انا" کی تلاش میں اس عہد میں پہنچا دیتا ہے جب اریخ کے ڈانڈے قصہ کہانی اور داستانوں سے ملے ہوئے تھے اور خود ان داستانوں میں گویا کہ ابھی ابھی جنم لینے والی دنیا کی ازگی محسوس ہوتی ہے، "لفظ نو مولود سے ابھی تک دودھ کی بو آتی ہے۔"

اس دیو مالا میں جسے شاعر جنم دیتا، تراشتا اور سینے سے لگائے رہتا تھا، حقیقت اور افسانہ وجود کے تسلسل، زندگی کے راز اور مفہوم، انسانی بھائی چارے کے رشتوں کی پائیداری اور دنیا میں انسان کے لیے مقدر اعلیٰ و ارفع مقام کے اعرانہ پیکر میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کی کوئی حد نہیں، یہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے۔ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے حقیقت ن کے تنزل یا ظہور کے چھ درجوں کے نظریے (تنزلاتِ ستہ) کے مطابق صوفی توضیح کرتے ہیں: کائنات کی تخلیق سے قبل شئے اور ہر عمل کا پیکر خالقِ کائنات کے ارادے میں اس شئے یا عمل کے عینِ ثابتہ یعنی جوہرِ مستقل کی شکل میں "عالم ان ثابتہ" کے درجے میں معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر قبل اس کے کہ زید اس دنیا میں معرضِ وجود میں ہ وہ ارادۂ ربانی میں معرضِ وجود میں آیا۔ مشیتِ الٰہی تھی کہ زید کے باپ کا نطفہ رحمِ مادر میں پہنچے اور زید وہاں نو ماہ سے۔ اور جب نو ماہ پورے ہونے تو زید اس دنیا میں پیدا ہوا اور ماں کی چھاتی لی۔ اور جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس نے سے میں صرف و نحو اور ہندسہ اور دوسرے ضروری مضامین سیکھے اور زندگی کے سمندر میں سفر کے لیے نکل کھڑا ہوا پھر عمر سے ملاقات ہونے پر اس پر ہاتھ چلایا۔ اور جب وقت آیا تو اللہ کے حکم سے زید اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس جسدِ خاکی کو قبر کے سپرد کیا گیا اور اس کی یہ قبر خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ اور اس کے ارادوں کی عظمت کی شہادت ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

کون بتا سکتا ہے کہ زید اس دنیا میں کیوں آیا، کیا صرف اس لیے کہ عمر پر ہاتھ اٹھانے کیوں کہ جملے "زید نے عمر کو مارا"
عرب ماہرین صرف و نحو نے زید کے اسی عمل کو لازوال شہرت بخشی ہے، تاکہ کسی کو شبہ نہ رہے اس شخص کو جس سے
فعل سرزد ہوتا ہے فاعلی حالت میں ہونا چاہیے، جب کہ اس کے برخلاف اس شخص کو جس کی طرف فعل کا رخ یا خطاب
، جملے میں ضمیر فاعلی یعنی مفعولی حالت میں ہونا چاہیے۔

اور یہاں خالق کائنات کے ارادوں کی باریکی کو سمجھنا مناسب ہوگا، جس نے زید کی مزید نام وری کے لیے عمر کو صرف و
کے اعتبار سے مفعول بنایا۔ لیکن اس دور اندیشی اور مقصد کے حصول میں مستقل مزاجی کا کیا کہنا ہی کے ساتھ ناقابل
یم وجود کے درجے یعنی مرتبہ واحدیت پر مرزا غالب کے عین ثابتہ یعنی جوہر مستقل کی تخلیق کے بعد خالق کائنات نے اس
ن کا خیال رکھا کہ اس کے ارادے کی صحیح طور سے اور بلا کم و کاست تکمیل ہو اور عالم ممکنات سے وہ بالا تر اس دنیائے فانی
، منتقل ہو۔ اور تخلیق کائنات کے بالکل ابتدائی دنوں سے ہی خالق کائنات نے اس کا خاص خیال رکھا جس کا ثبوت غالب
۔ شجرہ نسب ہے جو نسل انسانی کے جد امجد حضرت آدم سے شروع ہوتا ہے۔ (ان پر ہمیشہ خدا کی رحمتیں نازل ہوں اور خدا
ہے ان کے باغ یانے جنت ان کے حقیقی وارث مرزا اسد اللہ خاں غالب کو ملیں!)۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیا بیم
دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ من کہ مے بود اینک بہ من سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

(ساقی میں پشنگ اور افراسیاب کی نسل سے ہوں اور تو جانتا ہے میرے گوہر کی اصل خانوادۂ جم سے ہے ۔
میری میراث شراب ہے اور باغ بہشت، یہ تو آدم کا ورثہ ہے۔ جو مجھے ملنا ہی چاہیئے)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی مشاہیر اور بادشاہوں کا آدم سے کیا تعلق ہے؟ قدیم ایرانیوں کا بہرحال
خیال تھا کہ دنیا کا پہلا آدمی کا ئیومرتان یعنی انسان فانی تھا اور نام ور ایرانی بادشاہ پیش دادی یعنی وہ جو لوگوں کو بالکل ابتدا
ں دیے گئے، اسی کی اولاد میں سے تھے۔ وہ ایران، توران، سیستان، زابل اور کابل پر اپنے اپنے زمانے میں حکومت کرتے
ہ۔ نام ور بادشاہ جم کے خلف فریدوں کا عہد حکومت پر امن اور پانچ سو سال طویل تھا اور پھر اس نے اپنے ملک کو اپنے
ں بیٹوں سلم، تور اور ایرج میں بانٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ تاج اور اس کے ساتھ تختِ شاہی اور ایران ایرج کو ملے، روم اور
ربی علاقے سلم کو اور گرم مزاج اور سادہ لوح تور کو توران ملا۔

تور کے دو بیٹے تھے، پشنگ اور زادشم۔ بہتیرے تورانی سورما انھیں کی اولاد سے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ زور
، شیر دل افراسیاب تھا۔ اپنے دادا تور سے ورثے میں اس کو آتش مزاجی، دلاوری اور دغا بازی ملی تھی۔ افراسیاب ہاتھی
سا طاقت ور اور شیر ببر جیسا سینہ زور تھا۔ قد میں اتنا لمبا تھا کہ اس کا سایہ زمین پر کئی فرسنگ تک پڑتا تھا۔ اپنی گھڑسوار
ج کے ساتھ اس نے منوچہر کے عہد حکومت ہی میں ایران پر چڑھائی کی تھی اور اس کے دھاوے تین سو سال تک ایران
ں" کے کاؤس" کی تخت نشینی تک جاری رہے، جس کے ہاتھوں ہلاک ہونا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔

دشت توران کے علاوہ شاہان ایران سے معاہدوں کے مطابق افراسیاب کو مختلف اوقات میں دریائے جیحوں کے اس
بچانغ، سغد، سمرقند، بخارا اور سپی جند کے علاقے دے دیے گئے تھے۔ چناں چہ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ سمرقند اور اس

کے مضافات کے باشندے اپنا شمار تورانیوں میں کر سکتے تھے۔

اس امر کا ذکر کہ افراسیاب ایرانی خانہ بدوش قبیلوں کا سردار تھا قدیم ایرانیوں کی مقدس کتاب "اوستا" میں بھی ملتا ہے اور ہر عہد میں صف عالی حوصلہ رستم، کاشت کار ایرانیوں کا نام ور حامی و ناصر، ہی اس سے عہدہ برا ہو سکتا تھا۔

رستم بہادر اور کریم النفس تھا اور افراسیاب بے رحم، دغا باز اور غیر منصف تھا، اس کے باوجود "شاہ نامہ" میں رستم کی مدح سرائی کرنے ہونے شاعر اعظم فردوسی افراسیاب کے جنگی کارناموں کی داد دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔

مگر پھر بھی اس رزمیہ عہد کے سورماؤں اور خود آدم میں کیا بات مشترک ہے؟ غالب کو بھی اس سوال کے جواب کی تلاش تھی اور یہ جواب ایک حدیث یعنی پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے ایک قول میں ملتا ہے۔

غالب "مہر نیم روز" میں لکھتے ہیں: "دریافت کرنے پر کہ دنیا میں پہلا انسان کون تھا، آپ نے (یعنی رسول اسلام نے) جواب دیا: آدم۔ اور آدم سے پہلے؟ "آدم"۔ اور اس سے بھی پہلے۔ "آدم"۔ یہاں غالباً بحث کی گنجائش بھی نہیں ہے، خصوصاً جب کہ "آدم" کے معنی "انسان" ہوتے ہیں۔

اس طرح سے افراسیاب اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے قدیم ایرانی مشاہیر پشنگ اور زادشم کی اصل ایک طرح سے منکشف ہو جاتی ہے۔ بس اس امر کی تحقیق باقی رہ جاتی ہے کہ خود غالب کا قدیم ایرانیوں، ایرانی رزمیہ شاعری کے سورماؤں سے کیا تعلق ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ خود اپنے ترک النسل ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا اپنا بیان تو انھیں روایتی جام جہاں نما والے ایران کے دیو مالائی بادشاہ جمشید سے دور ہی لے جاتا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست
مرزبان زادۂ سمرقندیم

(غالب ہم توران کی خاک پاک سے ہیں۔ بلاشبہ بہ اعتبار نسب ہم نہایت خوش بخت ہیں۔ ہم ترک زاد ہیں اور بزرگان قوم سے نسبت رکھتے ہیں۔ ترکوں کے ایبک قبیلے سے ہمارا تعلق ہے اور کمال میں چاند سے بھی دس گنا بڑھ کر ہیں۔ ہمارے آبا کا پیشہ کاشت کاری تھا۔ ہم سمرقند کے مرزباں زادہ ہیں۔)

اپنی ترک جڑوں کی مدح سرائی میں کچھ ایک باتیں ایسی ہیں جن کو تمام و کمال غیر مشروط طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کمال کے لیے ماہ تمام کی تشبیہ کی معقولیت سے انکار مشکل ہے کیوں کہ اسم "ایبک" میں لفظ "اے" بہ معنی ماہ تمام شامل ہے اور ماہ تمام دنیا کی سبھی زبانوں کی شاعری میں کمال کی علامت ہے۔

اسی طرح سبھی کو معلوم ہے کہ قدیم جغرافیائی نظریات کے مطابق سمرقند اور بخارا کا تعلق توران سے تھا۔ بس انیت اور کشاورزی (زمین داری یا کاشت کاری) کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے۔ زمانہ قدیم میں سرحدوں کی پاسبانی اور حفاظت

کرنے والے مرزبان کہلاتے تھے۔ یعنی یہ ایک سپہ گروں کا طبقہ تھا یا بار تھولڈ کے الفاظ میں یہ عہد وسطیٰ کے مشرقی کے مارگریو یعنی سرحد کے گورنر تھے۔ زمین داروں اور کاشت کاروں کا تعلق دہقانوں کے طبقے سے تھا۔ مگر ایسا ہوتا تھا کہ سرحدوں کی پاسبانی کرنے والے قبائل کے لیے کاشت کاری کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا تھا: جاگیر دارانہ خانہ جنگیوں کے زمانے میں سرحد ان علاقوں سے جہاں اس کی پاسبانی کرنے والے مرزبانوں کی سکونت تھی دور دراز فاصلے پر ہٹ بھی سکتی تھی۔ تو اس طرح غالب کے نسب نامے کی دو روایتیں ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن فی الحال واضح نہیں ہے کہ ان کا باہم دگر کیا تعلق ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں پھر توران اور افراسیاب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ساکا اور ختن کے خانہ بدوش قبائل یعنی وہی تورانی جن کا "اوستا" اور پھر "شاہ نامے" میں ذکر ہے زمانہ قدیم سے خانہ بدوش ترکوں کے پڑوسی تھے۔ "شاہ نامے" کی تخلیق کے وقت تک نہ صرف قدیم ایرانی القاب "دہقان" اور "مرزبان" کے مفہوم میں تبدیلی آگئی تھی (اول الذکر کاشت کار اور کسان کے اور موخر الذکر محض سرحدی علاقے کے باشندوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا تھا) بلکہ لفظ "تورانی" کے معنی بھی بدل گئے تھے۔ تجنیس صوتی کی وجہ سے یہ لفظ بسا اوقات "ترک" اور "ترکی" کے مفہوم سے مربوط ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ فردوسی بھی افراسیاب کو ترکوں کے سر خیل کے نام سے یاد کرتا ہے۔

کم و بیش اسی وقت دریائے سیحوں کے نشیبی خطے کے شمال سے لے کر بحر خزر کے جنوب مشرقی ساحل تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض بنجر میدانی علاقے میں یہاں آنے والے بے شمار ترکی قبائل اور مختلف ایرانی الاصل گروہوں کے اختلاط سے اغوز ترکوں کی ایک نسل معرض وجود میں آتی ہے، جو دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ شمالی گروہ اپنے کو اغوز کے نام سے یاد کرتا ہے اور جنوبی گروہ خود کو ترکمان سلجوقی کا نام دیتا ہے۔

ان قبائل کی تمام روایات اور رزمیہ قصے رفتہ رفتہ ایک مشترک گرہ میں بندھ جاتے ہیں۔ سور ماؤں کے بارے میں ایرانی داستانیں، خواہ وہ پڑوسی ایرانیوں سے مستعار لی گئی ہوں، خواہ وہ ان ایرانی قبائل کے ساتھ آئی ہوں جنھوں نے اغوز قومیت کی تشکیل میں حصہ لیا، اسی گرہ میں گندھ گئیں۔ ترکمان اور اغوز قبائل کے قبول اسلام سے ان قوموں کے وقائع نویسوں اور مورخوں کو اسلامی روایات، یعنی خود حضرت آدم سے ان قبائل کے استوار رشتوں کے قیام کی کوششوں کو تحریک ملی۔ بھی "پتہ لگا" کہ اغوزوں کے مورث اعلیٰ اغوز خان حضرت نوح، یعنی عہد نامہ قدیم کی بزرگ اور نیک نفس شخصیت نوح کے پوتے تھے اور کچھ ہی عرصہ بعد عہد وسطیٰ کے مصنف ابوالغازی نے "نسب نامہ ترکمانان" میں قراخانیوں کے بعد سلجوقیوں کو افراسیاب کی نسل سے قرار دیا کہ یہ افراسیاب کے بیٹے کی اولاد ہیں یا بہ الفاظ دیگر اس سور ما کے پوتے ہیں ابوالغازی کے الفاظ میں واقعہ اس طرح سے پیش آیا: "افراسیاب کا بیٹا" کے خسرو، سے بچ کر بھاگا اور ترکمانوں کی بستی تک پہنچا، وہاں وہ بڑا ہوا اور اس نے ہمیشہ کے لیے وہیں کی سکونت اختیار کرلی۔ ہم افراسیاب کی نسل سے، اسی کی اولاد ہیں۔" آگے چل کر یوسف خاص حاجب بالا ساگونی اور محمود کاشغری، اغوز رزمیہ ہیرو الپ ارتنگ اور افراسیاب کو بالکل ایک ہی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ یوسف بالا ساگونی لکھتے ہیں: "ترک سرداروں میں الپ ارتنگ بہت دانش مند اور ہوش یار تھا .... تاجک لوگ الپ ارتنگ کو افراسیاب کے نام سے جانتے ہیں۔" اسی مصنف کے الفاظ میں یہ افراسیاب یا الپ ارتنگ یافث کا بیٹا اور حضرت نوح کا پوتا تھا اور "ترک اسی کی اولاد ہیں۔" اس طرح سے اغوز بھی اس سور ما کے "پوتے" نہیں بلکہ "لڑکے بالے" ہیں!! اس طرح سے افراسیاب، ایرانی رزمیہ شاعری کا حریف بمقابل تورانی رزمیہ شاعری کا میر افسانہ یا ہیرو بن گیا۔ اس طرح سے آخر کار نہ صرف آدم اور افراسیاب بلکہ ایبکوں کی نسل کے سمرقندی مرزبانوں اور اغوز کے بیٹے آئی خان کے اخلاف کا رشتہ

بھی واضح ہوگیا۔ مزید برآں افراسیاب کے "اخلاف" کو عہد وسطیٰ کے طاقت ور سلجوقی خانوادے سے جس کی ۱۰۳۸ء میں طغرل نے بنیاد رکھی، مربوط کرنے والا حقیقی تاریخی سلسلۂ نسب بھی اپنی مناسب جگہ پالیتا ہے۔

غالب "مہر نیم روز" میں لکھتے ہیں: راقم الحروف کے اجداد افراسیاب اور پشنگ کی نسل سے اور صاحب فرو جاہ و جلال فرماں روا تھے۔ "کے فرو" کے دامن بغض و عناد کی ہوا نے جب تور کے چشم و چراغ (افراسیاب) کی شمع وجود کو گل کر دیا تو پشنگ کے اخلاف کے برے دن آگئے۔ جو پہلے صاحب تخت و تاج تھے ان کے پاس ان کی آبائی ملکیت سے سوائے بدی کا قلع قمع کرنے والی شمشیر کے اور کچھ نہ بچا۔ اور پھر وہ پرانی سرحدوں کی پاسبانی پر مامور ہوگئے اور سپہ گری کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ دامنِ کوہ کے پاس واقع انھیں نرکل کی جھاڑیوں (یعنی دلدلوں) میں رہنے والے سلجوقیوں نے پھر اپنے سروں کو تاج سے اور تاج کو ذر شہوار سے آراستہ کیا۔۔ اور وہ برکیارخ خاں سلجوقی کو سمرقندی ایبک خانوادے کا حقیقی بانی بتاتے ہیں۔

لیکن قسمت نے ان زور آور حکم رانوں کو بھی نہیں بخشا۔ ان عہد گزشتہ کے واقعات کی آواز باز گشت مغلیہ خانوادے کی تاریخ "مہر نیم روز" کے صفحات پر نوائے تلخ کی طرح سنائی دیتی ہے۔ غالب کو ایسا لگتا تھا کہ آٹھ صدیاں گزرنے کے بعد بھی علت و معلول کا یہ واحد سلسلہ سلجوقیوں کے زوال اور خود ان کے تنگ دستی کے شکار خاندان کی آزمائشوں اور مصیبتوں کو باہم دگر مربوط کرتا ہے۔

در مشرب ما خواہش فردوس مجوئی
در مجمع ما طالعِ مسعود نہ یابی
در بادۂ اندیشہ ما دُرد نہ بینی
در آتش ہنگامۂ ما دود نہ یابی

(ہمارے مشرب میں فردوس کی خواہش تلاش نہ کر۔ تو ہمارے گروہ میں طالعِ مسعود نہیں پانے گا۔
ہمارے فکر کی شراب مصفا ہے۔ ہماری آتشِ ہنگامہ اتنی تیز ہے کہ اس میں سے دھواں نہیں اٹھتا۔)

ایران، ماوراء النہر، خراسان اور دوسرے فارسی بولنے والوں کی اکثریت کے علاقوں میں کئی صدیوں سے یہی دستور تھا کہ لشکر کا بیشتر حصہ جنگ جو ترکوں پر مشتمل ہوتا تھا، اکثر وہ فوجوں یا مختلف دستوں کی سرداری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور مختلف سلطنتوں کے چھوٹے بڑے حکم رانوں کے دربار میں نوکری بھی کرتے تھے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں بہت سے قسمت کے دھنی ترک سپہ سالار وسیع و عریض قلم رووں کے فرماں روا اور طاقت ور شاہی نسلوں کے بانی بھی بن جاتے تھے۔ غزنوی سلطنت کا بانی "ان گھڑ ترک"۔ محمود غزنوی بھی انھیں میں سے ایک تھا اور تیمور لنگ بھی انھیں میں سے ایک تھا، وہ تیمور لنگ جس کے اخلاف یعنی دہلی کے مغل بادشاہوں کی اس زمانے میں بھی ہندوستان میں فرماں روائی تھی جب مشیت الٰہی کے مطابق مرزا اسد اللہ خاں کا عین ثابتہ عالمِ مثال سے ان کے جسد فانی میں منتقل ہوا۔

غالب کے خاندان میں، اگر پشنگ اور افراسیاب سے شروع کریں اور اغوز اور سلجوقیوں تک پہنچیں، جن میں خاص شہرت سلطان سنجر کو حاصل ہوئی اور تذکرے کو اٹھارویں صدی عیسوی کی زیر مشاہدہ حدود پر ختم کریں، سبھی جنگ آزمودہ سپاہی تھے۔

وہ آخری نام جو مرزا غالب کو توران سے جوڑتا ہے ترسم بیگ کا ہے۔ یہ شاعر کے پرداوا تھے۔ سمرقندی مرزبانوں کا یہ

خلف غالباً تند مزاج واقع ہوا تھا، جس کی بہ دولت ہمارے اس تذکرے کا محل وقوع ماوراء النہر سے شمالی ہند منتقل ہے۔ ترسم بیگ سے ان کے بیٹے مرزا قوقان بیگ کی ان بن ہو گئی، جس کے بعد انھوں نے اپنے ہی جیسے معدودے دلیروں کو اکٹھا کیا اور جیسا کہ غالب لکھتے ہیں "فراز سے نشیب کی طرف تیز رفتاری سے بہنے والے سیل کی مانند وہ سمرقند سے ہندوستان وارد ہوئے۔"

ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کو پار کر کے یہ قسمت آزما لاہور پہنچے۔ بھاڑے کے سپاہیوں کی خدمات سے تامل استفادہ کرنے والا اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کا ہندوستان تمام و کمال مرکز گریز طاقتوں کے زیر اقتدار تھا۔ مغلیہ سلطنت کے علاقے یکے بعد دیگرے اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے اور ان کی بنیاد پر نئی ریاستیں معرض وجود میں آ رہی تھیں، جن کی تشکیل ان مقاصد کے تحت ہو رہی تھی جن میں باہم دگر کوئی تال میل نہیں تھا۔ مرہٹے، ہندوستان کی دوسری قوموں سے پیش تر اپنی قومی وحدت کا پورا اندازہ ہو گیا تھا اپنی قومی ریاست کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ سکھ ایک نئے مذہب کی بنیاد پر خود کو منظم کر رہے تھے، روہیلوں نے ایسی ریاست بنائی جس کی تشکیل فوجی مقاصد کے تحت ہوئی تھی، اور جاٹوں نے ایسی، جس کی بنیاد اس کاشت کار قوم کے مشترک مفادات تھے۔ ان نئی ریاستوں میں سے ہر ایک کے پاس مرکزی سلطنت سے علاحدہ ہونے کے اپنے وجوہ تھے۔ تاہم اس عہد کے ہندوستان کا بے تعصبی سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ساری تبدیلیاں اور اتھل پتھل سارے ملک کے لیے مشترک گہرے معاشی عوامل کا نتیجہ تھا۔ مورخین کی نظر میں ان عوامل میں زیادہ اہم زمین کی ملکیت اور استعمال کے طریقوں میں تبدیلی تھی جو مغلوں کی زرعی حکمت عملی کا زرعی اصلاحات کا اور اسلامی نمونے کے مطابق تشخیص محاصل، استعمال زمین اور وراثت کے اصول کے نفاذ کا نتیجہ تھی۔

مغلیہ سلطنت، جو سترھویں صدی عیسوی ہی میں انتہائی جنوب کے ایک مختصر علاقے کو چھوڑ کر تقریباً پورے برصغیر ہندوستان پر محیط تھی، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک دکن کے تمام اہم علاقوں سے محروم ہو چکی تھی۔ احمد شاہ درانی کی سرکردگی میں افغانوں کے حملوں کے وقت سے شمالی علاقے بھی اس کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔

جب غالب کے دادا قوقان بیگ لاہور مقامی حاکم کے دربار میں پہنچے، پنجاب پر افغانوں کے حملے تقریباً مسلسل ہو رہے تھے اور ۱۷۵۷ء میں پنجاب پر بھی افغانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مگر اس اثنا میں مرزا قوقان بیگ وہاں سے نکل چکے تھے اور تقریباً بیس سال تک ہمیں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بیس سال گزرنے کے بعد ہی ہماری ان سے پھر ملاقات ہوتی ہے۔ ان کا نام مغل بادشاہ شاہ عالم کے فوجی رجسٹر میں درج ملتا ہے۔ اس وقت سلطنت کے تمام امور کی باگ ڈور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں فوجی امور بھی شامل تھے۔ نجف خاں کے بارے میں انگریز مورخ پرسی وال اسپیر لکھتا ہے "وہ جتنا کار آزمودہ سپاہی تھا اتنا ہی باکمال حکمت عملی سے کام لینے والا بھی تھا۔ اس کے پاس افغانوں کی طاقت اور بے رحمی نہیں تھی، اس کے عوض اسے قدرت کی طرف سے ایرانی شائستگی، ذہانت اور دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت ملی تھی۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر قسمت کے ستارے اس کا ساتھ دیتے تو وہ مغل سلطنت کا نجات دہندہ ثابت ہوتا۔"

اس کے خطابوں کی شان و شوکت متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی: رستم دوراں، رستم ہند، ذوالفقار الملک، فتح جنگ (رستم سے مراد ظاہر ہے شاہ نامے کا میر افسانہ وہی رستم ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے)۔

ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مغل سلطنت میں دیے جانے والے خطابوں کی لمبائی چوڑائی کو سلطنت کی بچی کھچی عظمت سے
ـ نسبت معکوس ہے۔ یہ خطاب پر تکلف وردی کے کاندھے پر ٹنکے ان ملمع کیے ہوئے جھنبوں کی یاد دلاتے ہیں جو فوجی
س کے ایک ضروری جز کی بجائے اس کی ایک بے معنی لیکن شان دار سجاوٹ کی حیثیت اختیار کر چکے ہوں۔

مرزا نجف خاں، بہادر اور کام یاب سپہ سالار تھا۔ وہ ہمیشہ کبھی مرہٹوں، کبھی جاٹوں تو کبھی سکھوں کے خلاف مہم کی
ربراہی کرتا رہتا تھا۔ انگریزوں سے متحد ہو کر اس نے افغانی الاصل روہیلہ قبائل کو شکست دی۔ ۱۷۷۴ء میں اس نے
لیہ سلطنت کے سابقہ دارالحکومت آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے اس تذکرے میں اس شہر کا ذکر آگے بھی اکثر ہوتا رہے گا
لو قت صرف اتنا اضافہ کرنا ضروری ہے کہ ان مسلسل جاری رہنے والی جنگی کارروائیوں میں قوقان بیگ کبھی بے کار نہیں
ہے۔ بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پچاس گھوڑ سواروں کا رسالہ فوجی ناموری حاصل کرنے میں بھی کامیاب
۔ رسالے کے لیے بھتہ اور اسباب سرکاری خزانے سے مل جاتے تھے اور سپاہیوں کو تنخواہ سیر حاصل پرگنے پہاسو کی
رنی سے ملتی تھی۔ غالب کے دوست، شاگرد اور پہلے سوانح نگار الطاف حسین حالی شاعر کے اپنے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ یہ
ب ان اونچے منصبوں کے علاوہ تھا، جو قوقان بیگ کو مرزا نجف خاں نے عطا کیے تھے۔ لیکن رسالے کی جنگی کامیابیوں کا
نح ترین ثبوت وہ نشانات اعزاز، بنجوق اور نقارہ تھے جو رسالے کو مرحمت ہوئے تھے۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ خود شاعر نے
سالے کو ایک ہزار گھوڑ سواروں کی جمعیت کے برابر قرار دے کر کافی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور یہاں اس امر کا اعتراف
ناضروری ہے کہ جب بھی غالب کے اجداد کی عظمت کا ذکر آجاتا ہے اس طرح کی مبالغہ آرائی سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔

اس خانہ بدوشی کی زندگی کے باوجود قوقان بیگ نے گھر بسانے کے لیے بھی وقت نکال ہی لیا۔ ان کے دو بیٹے،
راللہ بیگ اور نصراللہ بیگ اور تین بیٹیاں تھیں۔ ۱۷۸۰ء سے ان کے گھر والوں کی مستقل سکونت آگرے میں تھی۔

مرزا نجف خاں کی وفات کے بعد پندرہ سال کا عرصہ خوں ریز لڑائیوں اور چھاپہ مار جنگوں کا آتا ہے جن کے سامنے
ں کے جانشین بھی اتنے ہی بے بس تھے جتنے کہ مرہٹے، جنھوں نے مغل سلطنت کے باقی ماندہ علاقوں کو اپنے زیر حمایت
ے لیا تھا۔ خود مرزا قوقان بیگ اپنے سرپرست کی وفات کے بعد زیادہ دن نہیں جیے۔

۱۷۸۷ء میں افغانی الاصل روہیلوں نے غلام قادر روہیلہ کی سرکردگی میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ وہی غلام قادر روہیلہ جو
ں بے رحم زمانے میں بھی اپنی خوں خواری کے لیے بدنام تھا۔ روہیلے، شاہ عالم کے محل میں درآئے، مال و دولت کے
یروں اور جواہرات کا مطالبہ شروع کیا لیکن کسی زمانے میں زر و جواہر سے لب ریز مغل بادشاہوں کے خزانے میں اس
ت تک تقریباً کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ طیش میں افغانوں نے محل کو تہس نہس کر دیا، محرمات کو بے حرمتی کے ساتھ
ہر نکال دیا اور شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ پرسیوال اسپیر اپنے تاریخی مقالے "دہلی" میں بیان کرتا ہے "شاہ عالم نے اس
ت بے مثال وقار و تمکنت کا مظاہرہ کیا جب روہیلے نے ازراہ تضحیک اس سے پوچھا کہ اندھا ہونے کے بعد تجھے کیا دکھائی
تا ہے اور شاہ عالم نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں سوائے قرآن کے جو میرے اور تیرے درمیان ہے"۔

تاہم جلد ہی شاہ عالم پر کیے گئے اس ظلم کا بدلہ چکا دیا گیا: غلام قادر گرفتار ہوا اور اسے ایک ایسے تنگ پنجرے میں
ید کیا گیا جس میں نہ وہ بیٹھ سکتا تھا، نہ لیٹ سکتا تھا نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور اسے اسی جھکی ہوئی حالت میں بے عزتی
کے ساتھ دہلی میں گھمایا گیا، ذلیل کیا گیا اور پھر قتل کیا گیا۔

قدیم دستور کے مطابق نابینا بادشاہ ملک پر فرماں روائی کے حق سے محروم ہو گیا تھا تاہم، مرہٹوں نے، جو سلطنت

کے علاقوں پر قابض تھے، شاہ عالم کو معزول نہیں کیا بلکہ اس "اندھے چلے" کے نام سے، جیسا کہ وہ اسے حقارت کرتے تھے، تمام امورِ سلطنت سرانجام دیتے تھے۔

اور اس دوران ہندوستان میں انگریزوں کی حیثیت رفتہ رفتہ لیکن باقاعدہ مستحکم ہوتی جارہی تھی۔ بیسویں ممتاز قومی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ہندوستان میں برطانوی اقتدار میں اضافہ ملک پر فوج کشی قبضے سے نہیں بلکہ ملک کی زندگی کے ہر شعبے میں آہستہ آہستہ لیکن بڑے اعتماد کے ساتھ دخیل ہونے سے ہو ساتھ اتفاق کچھ ایسا پیش آتا تھا کہ "ملک کے باشندے خود ہی بن بلائے مہمانوں کی مدد کرتے تھے"۔ آزاد تصنیف "ہماری آزادی" میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ کسی ملک پر قابض ہونے کا یہ طریقہ "تاریخ میں اپنی نظیر نہیں ر شاید واقعتہ ایسا نہیں ہے اور دوسری نوآبادیوں میں اپنے نفوذ کے لیے بھی انگریزوں نے یکے بعد دیگرے برسرپیکار علاقوں کو رفتہ رفتہ ہتھیانے کا یہی طریقہ اپنایا تھا۔

ہندوستان میں ترک سپہ گروں کی دوسری پشت یعنی مرزا غالب کے باپ اور چچا اور ان کے ہم سن رفیقو اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا کے عرصے سے جڑی ہوئی ہے۔

مرزا قوقان بیگ کے بیٹوں نے بھی باپ ہی کا پیشہ، سپہ گری اختیار کیا۔ چناں چہ سنہ ۱۸۰۲ء کے کسی ا عبداللہ بیگ کو الور سے آگرے کے راستے پر اپنے دستے کی رہ نمائی کرتا ہوا پاتے ہیں۔

راستے کی خوب صورتی سے آنکھوں کو طراوت محسوس ہوتی تھی۔ بائیں جانب حدِ نظر تک پہاڑیوں کا منظ تھا۔ شام کو ان کی ڈھلانوں پر جا بجا سبھی مسافروں کے دست گیر، ہاتھی کے سر والے ہندو دیوتا گنیش کے جھلملاتے ہوئے چراغوں کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ دیول اور راج پوتوں کی پہرے کی برجیاں یکے بعد دیگر تھیں۔ میدانی علاقے سے راجپوتانے کے ریگستانوں کی گرم ہوا آرہی تھی۔ وقتاً فوقتاً تاڑ کے درختوں کے جھرمٹ گھری ہوئی بستیاں اور اونٹوں کے کاروان دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں کے کچے گھروں سے شوخ رنگین کپڑوں عورتیں پانی کے لیے تیزی سے باہر جاتی دکھائی دیتی تھیں ان کے سروں پر صاف مجھی ہوئی گاگروں کے چمکتے ہو اور ان کے لہنگوں کے کناروں پر ٹنکے ہوئے آئینے کے ٹکڑوں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں ایسا لگتا ت چنگاریاں پھوٹنے لگی ہیں۔

شام کے راستے کی پرسکون خاموشی مسافروں کے خیالات کو راجپوتانے میں ان کا پیچھا کرنے والی نا ہموار ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جنگجو راجپوتوں ہی کے اس دیس میں نوکری کے متلاشی ان سپاہیوں کو جنگ آزمودہ قدردان مہاراجہ آسانی سے مل سکتا تھا۔ جے پور کے راجہ کے "فوجی رنگ میں رنگے ہوئے۔ حرم کے قصے سنے تھے کہ کس طرح وہ اپنے وسیع و عریض مورچہ بند محل میں ایک مربع کی شکل میں صف بند اپنی رانیوں اور خواصو معائنہ کرتے تھے۔ محل کے وسط میں خاص طور سے اس غرض سے کھمبوں کی قطار سے گھرا ہوا ایک چبوترہ تھ جس کا ان کھمبوں کے متوازی غلام گردش کے صرف ایک مقام سے پوری طرح مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اپنی ساری دل فریبی کے ساتھ صرف ان حسیناؤں کے کھور فرماں روا کی دسترس میں تھا۔

اور راجپوتوں کے ہتھیار کیا فوجی سازو سامان اور شائستہ خوش تدبیری کے کسی معجزے سے کم نہ بندوقیں، تبر، نیزے، دودھاری تلواریں جن کے دستوں سے اچھی خاصی بڑی کترنیاں جڑی رہتی تھیں، خنجر، جن

کے پاس ضمنی طور سے چاقوؤں یا پستولوں کا انتظام رہتا تھا۔ اس مال و متاع کی تزئین و آرائش کے لیے جواہرات، مرصع کاری اور مینا کاری پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔

عبداللہ بیگ اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے پہلے پہل لکھنؤ میں نوکری کی جو حضرت علی اور ان کے ناکردہ گناہ مقتول بیٹوں حسن اور حسین کی یاد میں شیعہ مسلک کے مطابق منائے جانے والے عقیدت مندی کے مظاہروں کے لیے مشہور ہے۔ ہر سال محرم کے دنوں میں ان کی شہادت کا سوگ منایا جاتا تھا اور ان کی موت پر ان واقعات کے بارے میں لکھے گئے رقت انگیز مرثیوں میں ماتم کیا جاتا تھا۔

لکھنؤ شیعوں کا گڑھ تھا جب کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کا تعلق مسلمانوں کے سنّی فرقے سے تھا۔ حیدرآباد میں، جہاں لکھنؤ کے بعد عبداللہ بیگ منتقل ہوئے سنّی مسلمان باشندوں پر شیعہ نظام اور ان کے معدودے چند حاشیہ نشینوں کی حکومت تھی اور خود حیدرآباد ہاتھی کے سر والے دیوتا گنیش کے بھائی اور لڑائی کے دیوتا اسکند یا مرگن کی پرستش کرنے والے دراوڑی زبان بولنے والے آندھرا کے سیاہ فام شیو پنتھی باشندوں کے وسیع و عریض سمندر میں مسلمانوں کے ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس علاقے کے مسلمان اپنی اردو کے بڑے حامی تھے، جو شمال کی بولی سے مختلف تھی اور دکھنی کہلاتی تھی۔ نظام اور مقامی امرا کے دربار میں نہ صرف دکھنی بلکہ فارسی شاعری کی بھی سرپرستی کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے کتب خانے اور کتابوں کے ذخیرے قیمتی تصویروں سے مزین قدیم مخطوطات سے بھرے ہوئے تھے۔ حیدرآباد کے وسط میں سولھویں صدی کے آخر میں چیچک کی وبا (طاعون کی وبا: مترجم) کے خاتمے کی خوشی میں تعمیر شدہ مسجد و مکتب، چار مینار کے سڈول مینار آسمان سے باتیں کرتے تھے۔

عبداللہ بیگ کی نظام کے دربار میں پذیرائی ہوئی اور تین سو گھوڑسواروں کا ایک رسالہ ان کی تحویل میں دیا گیا جس کو تنخواہ اور اسباب نظام کے خزانے سے ملتا تھا۔ پھر بھی ان کا گھر بار آگرے ہی میں رہا۔ وہ وہاں وقفے وقفے سے جاتے تھے اور وہیں ان کی شادی ان کے اپنے خاندان سے بھی زیادہ نام ور گھرانے میں ہوگئی۔ ان کی بیوی عزت النسا کے والد کا تعلق بھی مرزا قوقان بیگ کی طرح افراسیاب کی ماقبل تاریخی قلم رو سے تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں خواجہ غلام حسین بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ فوجی ملازمت کے اختتام تک وہ انگریزوں سے "کمیدان" یعنی کمانڈنٹ کا خطاب حاصل کرچکے تھے۔ آگرے میں ان کے گھرانے کا شمار متمول ترین گھرانوں میں تھا۔ وہیں ان کے دو نواسوں مرزا اسداللہ خاں اور مرزا یوسف خاں اور نواسی چھوٹی بیگم کا بچپن گزرا۔

عبداللہ بیگ کو حیدرآباد درباری سازشوں کی وجہ سے چھوڑنا پڑا بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔ سازشوں سے سمرقندی ایبکوں کے اس صاف دل خلف کو ایک گونہ نفرت تھی۔ جس کا نمک خود اور ان کے ماتحت سپاہیوں نے کھایا ہو اس سے وفاداری عبداللہ بیگ کا پیشہ تھا اور سازشوں کے پھندے میں پھنس کر اپنی منشا کے برخلاف نمک حرامی کر بیٹھنے کے مستقل خطرے سے ان کو ڈر لگتا تھا۔

انھوں نے طے کیا کہ آگرے کے آس پاس ہی کہیں قسمت آزمائی کریں گے، تب ان کی نگاہ راجپوتانے پر جا کر ٹھہری تاہم الور کے راجہ بختاور سنگھ کو، جن کے پاس فوجی خدمت کے حصول کے ارادے سے وہ حاضر ہوئے تھے، فی الوقت عبداللہ بیگ کی خدمات کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں کہیے قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کے باوجود وہ دوستوں کی طرح ایک

دوسرے سے جدا ہونے اور راجہ نے ان کو ان کے مرتبے کے شایانِ شان اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔
مگر عبداللہ بیگ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اچانک گولی چلنے کی آوازیں اس مختصر سے دستے تک پہنچیں۔ گھوڑو سرپٹ دوڑاتے ہوئے موقعہ واردات تک پہنچنے میں اور صورت حال کا اندازہ لگانے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ ایک زمین دار کے ہتھیار بند آدمی راجہ بختاور سنگھ کے سپاہیوں کے ایک دستے پر دباؤ ڈال رہے تھے جو وہاں زمین دار اور اس آدمیوں کو پٹے پر دی گئی زمین سے بے دخل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ زمین دار شیر کی طرح مزاحمت کر رہا تھا اور لگ تھا کہ کچھ ہی دیر میں وہ پوری طرح سے جیت جائے گا۔ حالاں کہ راجہ کی طرف سے جواب مل چکا تھا، تاہم ظاہراً عبداللہ اب بھی بختاور سنگھ کے پاس ملازمت کے خیال سے بالکل کنارہ کش نہیں ہوئے تھے یا پھر ہو سکتا ہے وہ تلوار کی جھنکار اور بندوق چلنے کی آواز پر دوڑ پڑنے کی عادت سے مجبور ہو گئے، بہر حال وہ راجہ کے دستے کی طرف سے لڑائی میں حصہ کے لیے جھپٹے اور دشمن کی پہلی ہی گولی کھا کر اسی جگہ دم توڑ دیا۔

اس ناگہانی موت نے مرزا اسداللہ خاں غالب کو اس وقت جب ان کی عمر پانچ سال تھی اور ان کے بھائی یوسف اور بہن چھوٹی بیگم کو یتیم اور عزت النسا کو بیوہ بنا دیا۔

اس واقعے سے راجہ بختاور سنگھ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مرحوم کے خاندان کے نام تالرا گاؤں کی آمدنی لگا انھوں نے اس شخص کی وفاداری کی قدر کی جو ان کا فوجی افسر تو نہیں لیکن اس خدمت کا امیدوار ضرور تھا۔ اب اس بار علم نہیں کہ یہ آمدنی کتنی تھی اور کب تک مرحوم کے کنبے کو ملی۔ اس کے بجائے خاندان کی روایات میں جنگی فرض نباہنے یہ کہانی البتہ محفوظ رہ گئی۔

بعد میں جب غالب اپنی زندگی کے سفر پر غور کریں گے وہ کہیں گے کہ یہ سانحہ ان کے سر پر پڑنے والی مصیبتوں سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اپنے دوست سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں:

"اب تم سے کیا چھپاؤں کہ میرا ایک ایسے خانوادے سے تعلق ہے جس کے عروج کے دن کب کے گزر گئے، ایسے قسمت کے مارے خاندان سے جس کا نصیب اجڑ گیا اور خوش حالی نے آنکھیں چرالیں، خود مجھ میں بس اتنی صلاحیت ہے کہ عبارت کی تزئین و آرائش کر لیتا ہوں۔ نسلاً میں ترک ہوں، میرا شجرۂ نسب پشنگ اور افراسیاب تک پہنچتا ہے۔ میرے اجداد اور سلاجقہ کی نسل ایک ہی ہے اور اپنے عروج کے زمانے میں وہ فوجی افسر بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ مگر خو حالی کے دن گزر گئے، بدبختی اور مصیبتوں کا دور شروع ہوا، وہ لوٹ کھسوٹ اور غارت گری بھول گئے اور قبیلے نے کا کاری کا پیشہ اختیار کیا۔ میرے اجداد کے لیے توران کی سرزمین میں سمرقند ٹھکانہ بنا۔۔۔ میری پیدائش کے بعد پانچ بھی نہیں گزرے تھے کہ باپ کا سایہ بھی میرے سر سے اٹھ گیا۔"

باپ کی موت کم سن بچوں کے لیے ایک گہری چوٹ تھی اور جوان بیوہ کی حالت دردناک تھی جس کا کوئی اپنا ٹھکا تھا اور جو بچوں کے ساتھ زندگی کے دن والدین کی سرپرستی میں کاٹنے پر مجبور تھی۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ایک کرائے سپاہی کے لیے، میدانِ کارزار میں جان دینا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں تھی۔

کم سن مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ متوفی بھائی کے کنبے کے سرپرست تھے۔ بھائی کے مقابلے میں نصراللہ زیادہ خوش قسمت نکلے۔ اپنے ایک خط میں غالب ملازمت میں اپنے چچا کی ترقیوں کی تصویر عادت کے مطابق کچھ رنگ آمیزی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ وہ نصراللہ بیگ کو مرہٹوں کی ملازمت میں آگرے کا حاکم بتاتے ہیں۔ نصراللہ بیگ کی ماہانہ

ستره سو روپے تھی، اس کے علاوہ ان کو ایک جاگیر بھی ملی تھی جس سے ہزار، ڈیڑھ ہزار روپے کی آمدنی ہوجاتی تھی۔ چچا کے انتقال کے بعد زمین کی ملکیت کی جگہ مشاہرے نے لے لی۔ اپنے انتقال سے صرف دو سال قبل غالب لکھتے ہیں کہ مجھے یہ رقم اب تک ملتی ہے۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نصراللہ بیگ کے نام سے ان کے بھتیجے کو تاحیات وظیفہ ملتا رہا۔

نصراللہ بیگ ابتدا میں واقعی مرہٹوں کی ملازمت میں تھے۔ تاہم انھوں نے بروقت نئے آقا تلاش کر لیے۔ مرہٹوں کے لشکر میں بڑھتے ہوئے تنازعوں سے انگریزوں نے بڑی ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا۔ آکسفورڈ کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی درسی کتاب "تاریخ ہند" میں اس کے مصنف دل کو چھو لینے والی سادہ دلی کے ساتھ لکھتے ہیں: "حریف مرہٹہ سرداروں کی آپس کی لڑائیوں نے برطانیہ کو دخل اندازی کے لیے موقعہ فراہم کیا بلکہ اس کو ناگزیر بنا دیا۔"

۱۸۰۳ء میں انگریزوں اور مرہٹوں کی جنگ کے دوران انگریزوں کی شمالی افواج کے کمانڈر جنرل لیک نے مرہٹہ لشکر کو، جس کی سرکردگی فرانسیسی جنرل پیروں اور برکن کر رہے تھے، شکست دی اور مغلیہ سلطنت میں، یا یوں کہیے کہ اس کے بچے کچے علاقوں میں، شاہ عالم کا اقتدار بحال کر دیا۔ دہلی سے مرہٹوں کے انخلاء کے بعد وہاں کے لال قلعے کے اس محل میں جو کسی زمانے میں اپنی شان و شوکت کے لیے مشہور اور "دیوانِ خاص" کے نام سے موسوم تھا انگریز جنرل اور نابینا بادشاہ کی ملاقات کا منظر دیکھنے والوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہا۔ ان واقعات کا شاہد عینی میجر تورن جس کے مشاہدات کا، پیرس اپنی تصنیف "وائکاونٹ لیک کی حیات اور فوجی خدمات" میں حوالہ دیتا ہے، لکھتا ہے "لگتا ہے کہ "دیوانِ خاص" کی آرائش و زیبائش اور رنگوں کی خوبصورتی کو کسی طرح گھٹانا ممکن نہیں لیکن نابینا، خستہ حال و کہن سال، اقتدار اور باپ دادا کی دولت سے محروم، اکبر اعظم اور منصور و مظفر اورنگ زیب کا وارث جو ایک پھٹے پرانے شامیانے کے نیچے بیٹھا تھا، ایک دردناک منظر پیش کر رہا تھا۔ شاہانہ عظمت کا کھنڈر اور انسانی حب جاہ کے لیے سامانِ عبرت!"

اسی سال اکتوبر میں جنرل لیک نے جس کو اس وقت تک صمصام الدولہ، رستم دوراں، صاحب زماں، فتح جنگ جیسے پرشوکت، اسلامی خطابات سے نوازا جا چکا تھا اپنی فوجیں آگرے کی طرف روانہ کیں۔ کڑی فوجی کارروائیوں اور گولہ باری کے بعد قلعہ حوالہ کرنے کی بات چیت شروع ہوئی۔ قلعے کی محافظ فوج نے بالآخر لیک کی شرائط منظور کر لیں اور ہتھیار ڈال دیے۔ گو کہ غالب کے الفاظ میں جنرل پیروں ہی نے نصراللہ بیگ کو آگرے کے صوبے دار یا ایک دوسری روایت کے مطابق قلعہ دار کی خدمت پر مامور کیا تھا پھر بھی زیادہ تر سوانح نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غالب کے چچا قلعہ کی محافظ فوج کے محض ایک چھوٹے افسر تھے۔ حالی البتہ غالب کے بیان سے متفق ہیں۔

نصراللہ بیگ کی بیوی ایک زور آور فوجی اشرافیہ خاندان کی بیٹی تھیں، جس نے مغلیہ سلطنت میں ایک قابل رشک مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کے چار بھائیوں یعنی نصراللہ بیگ کے برادرانِ نسبتی نے اپنے فوجی کارناموں سے کافی ناموری حاصل کی تھی۔ سب خطابی نواب تھے۔ سبھی تمول اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ لفظ "نواب" بجا طور پر مغربی ادب میں نہ صرف مسلمان طبقہ امرا بلکہ نوآبادیاتی رئیسانہ ٹھاٹھ کے انگریزوں کی علامت کے طور سے استعمال ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سبھی انگریز ملازمین نوابوں جیسی زندگی گزارنے کے خواب دیکھا کرتے تھے!

نصراللہ بیگ ملازمت میں اپنی مزید ترقی کے لیے اپنے انھیں برادرانِ نسبتی میں سے ایک نواب احمد بخش کے مرہونِ منت تھے۔ حالی کے الفاظ میں احمد بخش لارڈ لیک کی افواج میں شامل ہو گئے اور انھوں نے نصراللہ بیگ کو وہیں رسالے کے افسر کی خدمت پر مامور کروا دیا۔ بھی اپنی قابل تعریف خدمات اور لیک کے فوجی دھاووں میں شرکت کے

صلے میں ان کو آگرے کے مضافات میں سونک اور سونسہ کی جاگیریں ملیں۔

یہ اچھی خاصی بڑی کامیابی تھی: جاگیر سے وصول ہونے والی رقم، محاصل اور رسالے کی تنخواہ، سوار فوج، اسباب اور جنگی ہاتھی کی خوراک پر ہونے والے اخراجات کو منہا کرنے کے بعد بھی اتنی بچ جاتی تھی کہ عزت النسا بیگم کے بچے اور خود لاولد نصراللہ بیگ کے افراد خاندان خوش حالی کی زندگی گزار سکیں اور ان کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔

جاگیر حاصل کرنا یعنی گاؤں، پرگنوں اور کبھی کبھی ہندوستان کے پورے پورے علاقوں کی آمدنی کا مالک بن جانا ان لوگوں کے لیے زیادہ آسان تھا جنھوں نے آپس میں برسرپیکار فرماں رواؤں، راجاؤں، بادشاہوں اور پیشواؤں کی ملازمت میں جنگی خدمات انجام دی ہوں۔

یہ اتفاق کی بات نہیں کہ مرزا قوقان بیگ کے دونوں بیٹوں نے کل ملا کر پانچ آقاؤں کی ملازمت کی، جن میں سے ہر ایک انفرادی طور پر امکاناً یا واقعتہً باقی چار کا حریف اور دشمن تھا۔

کرایے کے یہ سپاہی اپنی نسل، مذہب یا مفادات کے اعتبار سے کسی بھی گروہ میں نہ شامل ہوتے ہوئے بس قسمت کی کرنی سے، سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے زیادہ سے زیادہ زور آور آقاؤں کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں واقعہ یہ تھا کہ اس طرح کے آقا آخری مغل بادشاہوں کے نام کی آڑ میں حکومت کرنے والے انگریز تھے اور ان کا مقصد ہندوستان پر قبضہ تھا جس کا بظاہر الثا نتیجہ ملک کا اتحاد تھا۔

یہی مغل امراء اور ان کے قریبی حلقوں کی زندگی میں بے شمار اختلافات کا باعث تھا اور اسی سے غالب کی زندگی کے بہت سے معاملات کی توضیح ہوتی ہے، جن کے قریبی رشتے داروں کا انھیں حلقوں سے تعلق تھا اور جو بہ خوشی انگریزوں کی ملازمت میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کی مادی کامیابی کا راست انحصار انگریزوں کے حق میں ان کی خدمات کی اہمیت پر تھا جیسا کہ پشنگ اور زادشم کے زمانے سے ہوتا چلا آیا ہے جب تر نوالہ جھپٹنا ضروری ہو، چاہے اس سے اپنے ہی رشتے دار کا گھاٹا کیوں نہ ہوتا ہو، اس نئے زمانے کے افراسیاب غور مکر کی زحمت بالکل گوارا نہیں کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ قصے کہانیوں کے افراسیاب کے بیش تر وارث افتادِ طبع کے اعتبار سے ایک "ترک سادہ دل" کے مقابلے میں اپنے جدِ امجد سے کہیں زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔ اور پھر یہ ترک دوسروں کے نقش قدم پر چلا بھی نہیں، حالانکہ اس دستور کے مطابق جس کی اس سماجی ماحول میں پابندی کی جاتی تھی، باپ کی تلوار ہمیشہ بیٹے کے ہاتھوں میں جاتی تھی۔

غالب بہ گہر ز دودہ زادشمم　　زاں روبہ صفائے دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر　　شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

(غالب میں خانوادہ زادشم کا چشم و چراغ ہوں۔ جہاں تک صفائے دم کا تعلق ہے میری باتیں تیغ کی مانند ہیں۔ جب سپہ سالاری چلی گئی تو میں نے چنگ پر شعر کی زد لگائی۔ اجداد کا تیر شکستہ میرا قلم بن گیا۔)

شفق کے نام خط میں غالب شاعری کو اپنا مقدر بتاتے ہیں اور اتفاق ایسا کہ یہی "تیر شکستۂ نیاگاں"۔ ان کو اور ان کے اجداد کو باہم دگر مربوط کرنے والی واحد کڑی قرار پاتی ہے: "آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بہ آئین نیاگاں خویش سلطان سنجر وار کلاہ وکری ونہ بہ فرہنگ فرزنگان پیش بوعلی آسا علم و ہنری۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازل آورد بود رہ زنی کرد و مرا بداں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سر لشکری و دانش وری خود نیست۔ صوفی گری بگزار و بہ سخن گستری رو می آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم۔ قلم

م فدو تیرہائے شکستہ آبا قلم۔۔

(اب اس کا کیا علاج کہ میری تخلیق خسارے اور نقصان ہی کے لئے ہوئی ہے ! میں سلطان سنجر کی طرح جنگی
رناموں کے لیے کمر بستہ اپنے ٹیڑھی ٹوپی والے اجداد پر نہیں گیا۔ میں عہد قدیم کے حکما کے نقش قدم پر، بو علی سینا کی
ح، علوم و فنون میں یگانۂ روزگار بننے کے لائق نہ ہوا۔ تب میں نے خود سے کہا: درویشی اختیار کروں اور آزاد زندگی !
.دں لیکن ازل سے میرے ہم سفر، ذوقِ سخن نے رہ زنی کی۔ مجھے باور کرایا کہ سرلشکری اور دانش وری ہی نہیں آئینۂ الفاظ کو
یقل کرنا اور اس میں دنیا کو معنی کا چہرۂ زیبا دکھانا بھی کارِ نمایاں ہے۔ تصوف کو چھوڑو اور شاعری کے بندے ہو جاؤ!۔
یل کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اور میں نے اپنی کشتی شاعری کے سمندر میں ڈال دی، جس کی حقیقت جیسا
سب کو معلوم ہے سراب کے علاوہ کچھ نہیں۔ میرا قلم علم بن گیا اور "تیرِ شکستۂ آبا، قلم بن گیا۔۔۔۔)

شاعری کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستان کی سرزمین پر غالب کے خاندان کی تاریخ کو شطرنج کی بازی سے تشبیہ دی
سکتی ہے جس میں شطرنج کی بساطِ وجود سے سپہ گری کی علامت سب مہروں کو پیٹ کر داؤ لگانے والے چرخِ ستم پیشہ کو اس
ندان کے اس واحد فرد کے سامنے شرمندگی اٹھانے کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ لگا جس نے سپہ گری کے برعکس ایک امن پسند
شے کو اپنایا تھا اور جسے شاعری کی الفت نے غالب بنا دیا۔ آخر غالب کا مطلب فتح مند ہی تو ہوتا ہے۔

* * *

مغنی تبسم

سید نقی بلگرامی

حیدرآباد کی سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی کو پروان چڑھانے اور توانائی بخشنے میں بلگرامی خاندان کا اہم حصہ رہا ہے
ں کے سربراہ سید حسین بلگرامی (نواب عمادالملک) تھے۔ ۱۸۷۲ء میں وہ سر سالار جنگ اعظم مدارالمہام دولت آصفیہ کی
وت پر حیدرآباد آئے۔ انھیں مدارالمہام کے پرائیویٹ سکریٹری کے عہدے پر مامور کیا گیا بعد ازاں وہ محکمہ تعلیمات کی
امت اور معتمدی پر فائز ہوئے۔ انھوں نے ریاست میں تعلیمی اصلاحات کیں۔ کئی نئے مدرسے قائم کیے۔ عورتوں کی
لیم اور صنعتی تعلیم کا انتظام کیا۔ کتب خانہ آصفیہ اور دائرۃ المعارف کا قیام بھی انھیں کی دل چسپی کی وجہ سے عمل میں آیا۔
ب عمادالملک بلند پایہ عالم، ادیب، شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

عمادالملک نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ ان کے افرادِ خاندان میں بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں جن میں سے
ٹں تر ریاست میں اور بیرون ریاست، اعلی عہدوں پر فائز رہیں۔ ریاستی اور ملکی نظم و نسق میں ان کا بڑا حصہ رہا۔ انھیں میں
غں مشہور سیاست داں، ماہرین تعلیم، ادیب اور عالم بھی تھے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے ناموں
فہرست اور کارناموں کی تفصیل پیش کی جائے۔ سید نقی بلگرامی اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ عمادالملک کے
زند سر عقیل جنگ کے صاحب زادے تھے۔ سر عقیل جنگ نظام کی حکومت میں نائب صدرالمہام تھے۔

سید نقی بلگرامی کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ اعلی تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ شیفیلڈ کی یونیورسٹی
سے انجینیرنگ کی ڈگری لی۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی میں دو سال تحقیقی کام کیا۔ حیدرآباد لوٹنے پر نظامس اسٹیٹ ریلوے میں
سسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ بعد ازاں جنرل منیجر کے اسپیشل سکرٹری، ریلویز کے ایر ڈپارٹمنٹ
کے سپرنٹنڈنٹ اور ریلوے بورڈ حکومت حیدرآباد کے سکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۶ء میں وہ کامرس اور
نڈسٹریز ڈپارٹمنٹ کے سکرٹری بنائے گئے اور ۱۹۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس زمانے میں کئی سرکاری
صنعتیں بشمول سنگارینی کالریز، سرپور پیپر ملز لمیٹڈ، سرسلک لمیٹڈ، پراگاٹولس لمیٹڈ، ہٹی گولڈ مائنس، اعظم جاہی اور عثمان
شاہی ٹکسٹائیل ملز انھیں کے ڈپارٹمنٹ کے کنٹرول میں تھیں۔ چند سال انھوں نے ریاست حیدرآباد کے فینانس کے
وزیر جناب غلام محمد کے تحت بھی کام کیا (جو بعد میں حکومتِ پاکستان کے گورنر جنرل بنائے گئے)۔ وہ اس وقت سرپور پیپر
ملز کے ڈائرکٹروں کے بورڈ میں شامل تھے۔

سید نقی بلگرامی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۹ء تک حکومت ہند میں امپورٹس اینڈ اکسپورٹس کے چیف کنٹرولر رہے۔
۱۹۵۹-۶۰ء میں نیشنل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۲ء اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائرکٹر
رہے۔ پھر وزارت کامرس اینڈ انڈسٹریز حکومت ہند میں جوائنٹ سکرٹری بنائے گئے۔ وہ انٹر اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کمیشن اور
نیشنل مینرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیرمن رہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک بھارت ہیوی پلیٹس اینڈ ویسلز کے علاوہ ام
اے ام سی کے چیرمن اور برٹش انڈیا کارپوریشن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ سید نقی بلگرامی ایک اچھے ہوا باز بھی
تھے اور اے کلاس پرواز کا لائسنس رکھتے تھے۔

وہ ایسکرٹس لمیٹڈ، ترویعنی انجینیر نگ ورکس لمیٹڈ، سری رام انجینیر نگ لمیٹڈ، یونائیٹڈ شیرس اور ذریڈ گرس لمیٹڈ کے ڈائرکٹر بھی تھے۔

وہ ۱۹۷۵ء سے مسلسل سرپور پیپر ملز لمیٹڈ کے ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتے اور کئی برس سے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے اجلاسوں کی صدارت کرتے رہے تھے۔ مرکز اور ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں، انھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کام اور مقصد کی لگن، جذبۂ خدمت اور دیانت داری میں سید نقی بلگرامی کی شخصیت بے مثال تھی۔ وہ مالیاتی، صنعتی اور تجارتی امور میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اور ان شعبوں میں جدید تر رجحانات پر ان کی گہری نظر تھی۔

ان بظاہر خشک مصروفیات میں گھرے رہنے کے باوجود شاعری اور فنونِ لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کی تسکین کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیتے تھے۔ ان کا ادب کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ فارسی اور اردو کے اساتذۂ سخن کا بہت سا کلام انھیں ازبر تھا۔ ان کے جمالیاتی ذوق کو پروان چڑھانے اور تازہ رکھنے میں ان کی بیگم مریم بلگرامی مرحومہ کا خاص حصہ رہا۔ مرحومہ ان کے تایا سر مہدی یار جنگ کی بیٹی تھیں۔ انھیں شاعری، موسیقی اور مصوری سے گہرا لگاؤ تھا۔ شاعری کا ذوق پڑھنے اور سننے تک محدود تھا۔ موسیقی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ اس فن میں وہ انل لبواس کی شاگرد رہیں۔ وہ باغ بانی سے بھی شغف رکھتی تھیں اور بڑی مہمان نواز خاتون تھیں۔

دہلی کے طویل قیام کے زمانے میں سید نقی بلگرامی کی قیام گاہ ایک ادبی اور تہذیبی مرکز بن گئی تھی۔ جہاں دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں اور بیرونی ملکوں کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو، جب بھی وہ دہلی آتے مدعو کیا جاتا تھا۔ ان کے اعزاز میں محفلیں منعقد کی جاتی تھیں۔ سید نقی بلگرامی کی صدارت میں ایک بزم کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کوکب دُری معتمد تھے۔ بزم کے ماہانہ جلسے بالعموم سید نقی بلگرامی کے گھر پر منعقد ہوتے تھے۔ اساتذۂ سخن میں سے کسی ایک شاعر کو منتخب کیا جاتا اور اس کی شام منائی جاتی۔ پہلے شاعر کی حیات اور شخصیت کے بارے میں مضمون پڑھا جاتا۔ اس کے بعد موسیقار اس کا کلام ساز پر پیش کرتے۔ بیگم مریم بلگرامی غزلوں کا انتخاب کرتیں۔ جلسے سے کئی دن پہلے کسی اچھے موسیقار کو غزلیں دے دی جاتیں تاکہ وہ ان کی دھنیں ترتیب دے۔ ریہرسل کے وقت بیگم مریم بلگرامی موجود رہتیں۔ گانے والے کو الفاظ کے صحیح تلفظ سے واقف کراتیں اور اس بات کا خاص خیال رکھتیں کہ الفاظ کی ادائیگی اس انداز سے ہو کہ شعر کی معنویت نکھر آئے۔ وہ موسیقار کو سمجھاتیں کہ کن لفظوں پر زور دینا چاہیے۔ دہلی میں سید نقی بلگرامی اور ان کی بیگم نے تیناد یوی کے موسیقی کے ادارے راگ رنگ اور سمتراجی کے آرٹ کے ادارے بھارتیہ کلا کیندر میں خاص دلچسپی لی اور ان کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔

حیدرآباد لوٹنے کے بعد یہاں کی علمی، ادبی محفلوں میں وہ شریک ہوتے رہے۔ آخری زمانے میں ان کا زیادہ تر وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ایلڈرس کونسل آف انڈیا کے چیرمن تھے۔ ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیوں سے بھی دل چسپی لیتے تھے۔

سید نقی بلگرامی کا ذوق شعری شاعری کے مطالعے اور مشاعروں اور محفلوں میں شعراء کا کلام سننے تک محدود نہیں تھا کبھی کبھار تفریح طبع کے طور پر وہ خود بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ انھوں نے نہ تو کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنایا نہ کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ ذیل میں ان کی بیاض سے منتخب کلام پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ اگر انھوں نے باضابطہ شاعری کی ہوتی تو اس فن میں بھی کمال حاصل کرتے اور نام پیدا کرتے۔

شب سے ہوائیں آتی ہیں
گھنگھور گھٹائیں لاتی ہیں

یہ کالے بادل دل کے دل
کیوں جی کو کرتے ہیں بے کل

کیا پی کا سندیسہ لاتے ہیں
جو اپنے تئیں اتراتے ہیں

اے کاش کہ ہوتے میرے پر
یہ پوچھتی میں ان سے جاکر

کیا خاک وہاں کی لاتے ہو
لو دے دو کیوں ترساتے ہو

میں پلکوں سے اس کو چن لوں گی
امید کا دامن بھرلوں گی

O

روح عالم پہ زر نگار ہوئی
لوحِ دل پر کشیدہ کار ہوئی

تیری ہستی ہمارا مایۂ ناز
نسلِ انسان باوقار ہوئی

O

ہے خمیدہ جبینِ خود داری
مٹ گئی راہ و رسمِ دل داری

جو جنون خیز ہو نہ عشق افروز
باعثِ ننگ ایسی مے خواری

جلوہ ریزی کی تھی نہ کوتاہی
یوں کبھو آئینہ تھا زنگاری

O

ہو کی ویران فضاؤں میں نظام مہ و ...
کائنات آپ میں گم دیدۂ حیرانی ہے

O

صبح دم ٹوٹے ہوئے جام و سبو، شمع خموش
سب ہیں مے خانے میں خاکستر پروانہ نہیں

O

تلاشِ حسنِ ازل کو ہے درد دل درکار
پتا تو دینے کو دیتے ہیں لاکھ نقش و نگار

ادائے نیم نگاہی کمال راز و نیاز
صراطِ عشق کی قندیلِ رہ نگہ کا خمار

O

حریم راز تھا اور جلوہ گاہِ محشرِ ناز
وہ آئینہ جسے ٹھکرا کے تم نے توڑ دیا

O

کہاں کا چین، کدھر کا سکوں، تسلی کیا
ہنسی ہے لب پہ مرے پاس خاطرِ غم خوار

O

ملک کی اس ملیۂ ناز ہستی اور یاد گارِ زمانہ شخصیت نے جس پر حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد کو بجا طور پر فخر تھا ۱۲ مئی ۱۹۶۴ء
یا اجل کو لبیک کہا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

•●•

طیبہ بیگم

ابوالفضل سید شاہ رحمت اللہ قادری حسن الحسینی

دکن میں یوں تو بے شمار اولیا اور مشائخ گزرے ہیں جن کے فیوض و کرامات آج بھی عوام کے زبان زد ہیں اور جن کے مزارات اور مقابر دکن کے ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں لیکن قادری سلسلے کے تین خانوادے گلبرگہ، بیدر اور بیجاپور میں بہت مقبول اور مشہور ہیں۔ ان میں پہلا خانوادہ سبعہ قادریہ ہے۔ دوسرا خانوادہ شاہ نورالدین نعمت اللہ ولی کرمانی اور تیسرا خانوادہ ابراہیم تمانی کا ہے۔

مورخین کی رائے کے مطابق سبعہ قادریہ یعنی سات قادری صوفیا، سید رکن الدین ابویوسف حاجی الحرمین کے خاندان سے ہیں۔ سید رکن الدین جنھیں دکن میں حضرت رکن الدین تولہ کے نام سے پکارا جاتا تھا، بغداد سے ہندوستان آئے اور بھرائچ (اترپردیش) میں مقیم ہوئے۔ یہ ناصرالدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کا عہد تھا۔ ناصرالدین اترپردیش میں گورنر تھا اور سید رکن الدین نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ جلد بادشاہ بنے گا۔ ان کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی اور اسی سال ناصرالدین محمود نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

اترپردیش سے حضرت سید رکن الدین دکن آئے اور گلبرگے میں قیام کیا جہاں ہندو راجہ حکومت کر رہے تھے اور اسلام کا نور ابھی نہیں پھیلا تھا۔ آپ کے فرزندوں میں سید یونس، سید عبدالرحمن، سید اشرف جہانگیر، سید یونس ثانی، سید شمس بہاء الدین عارف باللہ، سید عبدالقادر یوسف ثانی اور سید بدرالدین بدر عالم حبیب اللہ قادری تھے۔ سید بدرالدین سبعہ قادری بزرگوں میں سے ساتویں بزرگ تھے۔

بیجاپور کے عادل شاہی دور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے زمانے میں صاحب فضائل و کمالات مشائخ گلبرگے اور بیدر سے بیجاپور رونق افروز ہوئے جن کی خود سلطان اور ان کے جانشین محمد عادل شاہ بہت تعظیم کرتے تھے ان میں تین اہم قادری صوفیا اور ان کے خانوادے بہت مشہور اور مقبول رہے۔

۱۔ خانوادہ گچی محل۔ فاطمی سادات کی وہ شاخ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی اور سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتی ہے۔

۲۔ دوسرا خانوادہ حضرت سید شاہ امین الدین علی اعلی کا ہے۔ اس خاندان سے گچی محل کے گہرے اور جینی روابط کے تعلقات تھے۔ حضرت امین الدین علی اعلی کی والدہ بی بی میمونہ عرف چاند صاحب کا نکاح گچی محل کے حضرت برہان الدین جانم ابن حضرت میراں جی شمس العشاق سے ہوا تھا۔ اس لحاظ سے گچی محل امین الدین علی اعلی کا ننھیال تھا۔

۳۔ تیسرا خانوادہ ہاشم پیراں کا تھا جو سادات علوی سے تعلق رکھتے تھے۔

گچی محل کے سلسلہ عالیہ خانوادہ قادریہ کے مرشد حضرت سید بدرالدین بدر عالم حبیب اللہ قادری سبعہ قادریہ کے ساتویں بزرگ تھے جن کے تین صاحب زادے تین اہم قادری صوفیا مانے جاتے تھے۔

حضرت سید رکن الدین ابو یوسف حاجی الحرمین

حضرت سید بدر الدین بدر عالم حبیب اللہ قادری

میراں شاہ سید مصطفیٰ قادری معشوق الٰہی　　　میراں سید شاہ قاسم قادری شاہ محمد قادری

میراں سید شاہ ابوالحسن قادری
(سید موسیٰ قادری کا خاندان ان سے تعلق رکھتا ہے)

محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی بدرالدین بدر عالم سید شاہ حبیب اللہ قادری کے جدِ امجد تھے۔
میرے والد محترم سید شاہ رحمت اللہ قادری کا تعلق میراں شاہ سید مصطفیٰ قادری سے تھا جو سادات چی محل کے سلسلہ عالیہ خانوادہ قادریہ اور فاطمی سادات کے اہم صوفی تھے۔
والدِ محترم کو ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ میں چی محل کے محمد بدرالدین حسین قادری ولد مولانا قادر محی الدین قادری نے جو سید رحمت اللہ قادری کے نانا ہوتے تھے، اجازت خلافت سلسلۂ قادریہ عطائی اور سبز جامہ اجازہ اور کلاہ ارادت عنایت کی۔

نقلِ اجازت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم
اجازت خلافت سلسلۂ قادریہ بہ برخوردار عزیز سید شاہ رحمت اللہ قادری دام توفیقہ دارم ہم چناں کہ ایں فقیر را از ابی و شیخ حضرت حاجی مولوی سید محمد قادر محی الدین صاحب قادری قدس سرہٗ اجازت رسیدہ ہر کرا اہل دانند درین سلسلہ مرید و فقیر کنند، کتبہ الفقیر۔

سید　محمد　بدرالدین　حسین　قادری
کان　اللہ　لہ　ولا　بوید　مرقوم

۲۲/ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ
روزِ چہار شنبہ

سید شاہ رحمت اللہ قادری نے اپنی زندگی ہی میں اپنے صاحب زادے ابوظفر سید بدرالدین حیدر حسن الحسینی کو اپنا جانشین مقرر کرکے یہ کلاہ ارادت اور سبز جامہ اجازہ انھیں عنایت کیا۔ محمد بدرالدین حسین قادری کا مزار شریف آج بھی مدراس میں مرجع خلائق ہے۔

اوصاف حمیدہ اور باطنی پاکیزگی کے حامل سید شاہ رحمت اللہ قادری نے اللہ کی رحمتوں کے سائے میں سید احمد قادری سابق محاسب سرکار عالی اور فاطمہ بیگم کی گود میں ۶/ آذر ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۴ء میں آنکھیں کھولیں۔ سید رحمت اللہ قادری نام رکھا گیا اور افضل پادشاہ عرفیت پائی۔ آپ سید محمد قادری کے چھوٹے بھائی تھے اور حیدرآباد دکن کے معزز گھرانے کے رکن۔ ابتدائی تعلیم سینٹ جارجس گرامر اسکول اور مدرسہ عالیہ میں حاصل کی۔ ۲۰/ فروری ۱۹۱۱ء میں نظام

کالج سے اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد ۱۳-۱۹۱۲ء میں پونا کے اگریکلچرل کالج سے زراعتی ڈگری حاصل کی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ اڈنبرا یونیورسٹی سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کی سند حاصل کر کے ۱۹۱۶ء میں Grand Lodge of Ancient Free and accepted wasons of Scotland سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ اکتوبر ۱۹۱۹ میں Public Law اور Education اور پھر Economic History میں ایم۔ اے کیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں Council Of Legal Education High Court of Justice Bench Division اور Middle Temple نے Roll of Barristors میں آپ کا نام شامل کر کے Honourable Society of the Middle Temple سے بار ایٹ لا کی سند دی اور ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء میں Degree of Utter Bar حاصل کی۔

ان معروف ڈگریوں کو حاصل کر کے آپ وطن لوٹے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر ابتدا میں ضلع بیڑ میں منصف مجسٹریٹ اور پھر زائد ناظم ضلع مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ہائی کورٹ میں قانون میں پراکٹس شروع کی اور ۱۹۲۳ء میں محکمۂ عدالت سرکار عالی میں منصف قندہار کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ پھر اسی عہدے پر اندول پر آپ کا تقرر ہوا۔

۳۱ فروری ۱۹۲۴ء کو جاگیر دار کالج، جہاں حیدرآباد کے امرا کے لڑکے تعلیم پاتے تھے، منصرم مددگار مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۲۸ء میں مددگار پرنسپل اور اس کے بعد نائب پرنسپل کے منصب تک پہنچ گئے۔ ان کی انگریزی کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں انگریزی کا پروفیسر بھی مقرر کیا گیا۔ وہ بچوں میں ڈسپلن کا سختی سے خیال رکھتے تھے حیدرآبادی تہذیب و معاشرت، اخلاق اور آداب اور نشست و برخواست کی تعلیم کو اہمیت دیتے تھے۔ جاگیر دار کالج ایک Residential College تھا۔ دن میں پڑھائی اور ہوم ورک کے بعد شام میں کھیل کود کے اوقات مقرر تھے۔ رات میں کھانے کے لیے لڑکوں سے امید کی جاتی تھی کہ وہ کالی شیروانیوں میں وقت مقررہ پر ڈائننگ ہال میں موجود رہیں اور ساتھ مل کر شائستگی سے کھانا کھائیں۔ جو لڑکے کالج کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے انھیں مناسب سزا بھی ملتی تھی۔ مختلف اسپورٹس کے ساتھ تیراکی کا بھی انتظام تھا اور بہترین Coaches کی نگرانی میں جاگیر دار کالج کے لڑکے اپنی خداداد قابلیتوں کو اجاگر کر سکتے تھے۔

کالج میں وہ ڈسپلن کی سختی سے پابندی کرواتے تھے لیکن کالج کے باہر وہ ایک ہمدرد دوست اور شفیق باپ بن جاتے تھے۔ جس تہذیب و شائستگی کا سبق انھوں نے لڑکوں کو دیا اسی تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ لڑکوں نے ان کے ساتھ بھی کیا۔ آپ کے شاگرد جہاں بھی ملتے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے اور گلے لگتے۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب ان شاگردوں کی شادیاں ہو گئیں۔ جھک جھک کر سلام کرتے اور ہاتھ باندھے احتراماً کھڑے رہتے مگر یہاں کلاس روم ڈسپلن نہیں ہوتا بلکہ ایک دوستانہ فضا ہوتی۔

۱۹۹۲ء میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی نواسی اور محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی اور ڈاکٹر خدیو جنگ کی منجھلی صاحبزادی سکینہ بیگم سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

۱۰ فروری ۱۹۳۸ء میں آپ نے انڈر سکریٹری کا عہدہ سنبھالا اور ۱۹۴۱ء میں نائب معتمدی کا جائزہ لینے کے بعد اپنی انتظامی قابلیت اور فطری صلاحیت سے محکمے کے ہر شعبے کی اصلاح و ترقی کی طرف توجہ دے کر سررشتہ کو منظم کیا۔ نرم زبان اور کم گو تھے۔ اپنے فرائض خاموشی سے انجام دیتے رہے۔ اپنی فرض شناسی، حسن سلوک، خداداد قابلیت، راست بازی اور صاف گوئی اور شائستگی کے سبب حیدرآباد کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اور ملک کے ہر طبقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ صاف گوئی اور صداقت ان کی بہترین صفت تھی اور عمل پیہم، خلوص و لگن نے ہمیشہ ان کے قدموں کو کامیابی کے راستوں پر گامزن رکھا۔ ۱۹۴۳ء میں فرمان خسروی کے ذریعے ان کا تقرر انسپکٹر جنرل

رجسٹریشن واسٹامپ کے عہدے پر ہوا جہاں آٹھ سالہ ملازمت کے دوران اپنے اعلیٰ کردار اور نیک عمل، منصف مزاجی اور دیانت داری سے انھوں نے ایک ایسا مقام پیدا کرلیا کہ محکمے کا ہر فرد ان کی حق پسندی، اصول و صداقت کا معترف ہوگیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وظیفے پر علاحدہ ہونے تو ماتحتین اسی طرح ادب و محبت سے ملتے رہے اور ملاقاتوں کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔

سید رحمت اللہ قادری شریعت اسلامی کے پابند اور اسلامی اصولوں کے پیرو تھے۔ مذہبی تعصب سے دور تھے۔ بلا تخصیص مذہب و ملت وہ ہر ایک کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ دامے، درمے اور سخنے انھوں نے حیدرآباد کے مختلف اداروں اور ضرورت مندوں کی مدد کی اور اس طرح کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ وہ ہر حالت میں قانع اور شکر گذار تھے۔

ایک علم دوست اور صاحب اوصاف تعلیم یافتہ روشن خیال بیرسٹر جب میری والدہ محترمہ سکینہ بیگم کے شریک حیات بنے تو حیدرآباد کے سنی شیعہ معزز حلقوں میں کافی چرچے رہے۔ سید حسین بلگرامی کا باوقار خاندان شیعہ تھا اور سید احمد قادری کا محترم باعزت گھرانا شیخ عبدالقادری جیلانی کا پیرو تھا اور سنی تھا۔ کافی چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن مذہبی تعصب سے بالا اس مونس و ہمدم رفیق زندگی نے اپنے علم و عمل سے شہر کے بس بھرے ماحول میں وہ مثال قائم کی کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور ان کی نظریں جھک گئیں۔ شادی کے موقع پر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت اور نظام ہفتم کے وزیر اعظم نے جو قطعۂ تہنیت عقد پڑھا اس کے چند بند پیش ہیں۔

سنی شیعہ میں ہے شادی	یارب ہو خانہ آبادی
ایسی مبارک ان کی ہے شادی	رسم دوئی آپس سے مٹادی
دونوں ہیں اپنے دیں پر	ایک خدا ہے ایک پیمبر
ایک ہے قبلہ اک قرآں ہے	ان میں دوئی للہ کہاں ہے
جھگڑا دوئی کا خوب مٹایا	یکتائی کا جلوہ دکھایا
دونوں کا دل آئینہ ہے	دل میں کپٹ نہ ہی کچھ کینہ ہے
سچ ہے تعصب ہے ناکارہ	سن رکھیو یہ قول ہمارا

نا تہنیت عقد میں ایک جگہ لکھا ہے۔

تہنیت اب ہے سب کی زباں پر	چھائی مسرت سارے جہاں پر
نام دلھن کا بی بی سکینہ	چاند سا منہ، روشن آئینہ
دولھا ہے اللہ کی رحمت	روشن دل اور چاند سی صورت
ہے یہ دلھن بھی لائق لڑکی	دولھا کی بھی ہے اعلیٰ ڈگری
دونوں کی رضا ہے سودا	کیسا اچھا کتنا زیبا
دل سے دعا دیتا ہوں بے شک	شادی ہو دونوں کو مبارک

مغربی تعلیم کی آزاد خیالی اور مشرقی روایات اور طرز معاشرت کا یہ ایک ایسا سنگم اور دو تمدنوں کا ایسا نچوڑ تھا کہ ان کا گھر سربلندی، خودداری، تہذیب و شائستگی، صداقت و حق گوئی اور خلوص و محبت کا مسکن بن گیا جہاں مذہب صرف اسلام تھا نہ سنی نہ شیعہ۔ جہاں کی تعلیم، روشن خیالی اور وسیع النظری کی بنیادوں پر رکھی گئی تو وہاں فرقوں کے تعصب کا گزر کیسے ممکن تھا۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کا نظارہ کرنا ہوتا تو لوگ یہاں آجاتے۔ مذہبی رواداری دیکھنی ہوتی تو ان کے گھر کی مثال دی جاتی۔ نفاست و پاکیزگی کا نمونہ تھا ان کا گھر جس کی چار دیواری میں صرف محبتیں پلی تھیں اور ایمان کی روشنی چمکتی تھی۔

سید شاہ محمد بدرالدین حسین قادری سے خلافت ملنے کے بعد سلسلہ قادریہ کے مسلک اور اصولوں کا احترام ان کا شیوہ تھا۔ غریب غربا اپنی مصیبتیں لے کر والد کے پاس آتے اور ان کی دعاؤں کے طلب گار ہوتے۔ آپ خبیث روحوں اور جنوں کی سلطنت پر اپنی روحانی قوت سے قابو پالیتے تھے۔ صوفیانہ مسلک اور تصوف کے رازہائے سربستہ پر جب مذاکرے ہوتے تو لگتا جیسے ہمارے اطراف نور ہی نور بکھر گیا ہو۔ ہم سبک ہو کر بلندیوں کو چھونے لگے ہوں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ رسول اللہ اور اہل بیت رسول سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ کلام پاک کی تفسیر سناتے ہوئے کہتے تھے کہ قرآن پاک ایک ایسا نظام زندگی ہے کہ جس کو اپنانے اور اس پر چلنے والا دونوں جہاں میں سرخ رو ہو سکتا ہے۔

دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنے والا خدا کا یہ بندہ کھیلوں کے میدان میں بھی سربلند رہا۔ زمانہ طالب علمی میں اسپورٹس میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ نظام کلب میں بلیرڈز اور ٹینس کے مقابلوں میں تمغے اور کپ حاصل کرتے رہے۔

جاگیردار کالج میں ملازمت کے دوران، پاس ہی آپ کو ایک حویلی ملی تھی۔ مجھے یاد ہے حویلی کے سامنے قریب ہی ایک بہت بڑا تالاب تھا جس کی لمبائی تقریباً 1/2 فرلانگ تھی۔ جب پانی بھرا ہوتا تو آبشار کا خوبصورت سماں دیکھنے کے قابل ہوتا۔ آبشار کا شور مچاتا پانی نیچے چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹکھیلیاں کرتا، مختلف سمتوں سے مل کر ایک ندی کی صورت میں بہتا تھا۔ دور تک بہتی ہوئی اس ندی کی مختلف شاخیں ادھر ادھر اپنا راستہ بناتی، بل کھاتی، ایک بڑے حصے کو سیراب کرتی کھجور کے پیڑوں سے شوخیاں کرتی، ہریالی کو چومتی بیگم پیٹ کے پل کے نیچے سے جانے کس طرف کو بہہ جاتی تھیں۔

اس حویلی میں ہمارا بچپن گزرا۔ ماں باپ کے پیار اور قدرت کے حسین نظاروں نے ہمیں مسحور رکھا۔ بے فکری کے دن رات ہم نے یہاں ایک پرسکون ماحول اور پرکیف بہاروں میں گزارے۔ فرصت کے اوقات میں پانی کھیلتے، پتھروں پر سے چھلانگیں مارتے، ندی کے اس پار جانے کی کوشش میں بار بار بھیگتے، مچھلیاں پکڑتے، پکنک مناتے، کھلی اور تازہ ہوا میں سانس لیتے، چرکی بلا، لون پارٹ اور آنکھ مچولی کھیلتے۔ اور جب ان سب سے جی بھر جاتا تو آبشار پر بنی ریلنگ کو پکڑے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چاندی جیسی چادر کے سینے کو چیرتے نکل جاتے۔ تالاب کے دوسری جانب ریلوے لائن تھی جہاں سے ہو کر ٹرینیں بیگم پیٹ اسٹیشن پر سیٹی بجاتی آتیں اور گزر جاتیں۔ کھجور کے پیڑ تھے جن کے پکے پکے سیندولوں کو توڑ توڑ کر کھاتے اور پھر اسی راستے گھر لوٹ آتے۔

اسی حویلی میں والدہ نے جاگیردار کالج کے ملازموں کی عورتوں اور بچیوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کے سبق دیے۔ ایک چھوٹا سا اسکول چلایا۔ سوشل ورک کے سلسلے میں میٹنگیں ہوتیں۔ موسیقار مرحوم عبدالرؤف صاحب کی محفلیں سجتیں۔ ٹینس، بیڈمنٹن کے مقابلے ہوتے۔ فینسی ڈریس کی دعوتیں ہوتیں اور اسی جگہ سے ہم ماڈل پرائمری اسکول اور محبوبیہ گرلز اسکول اور مدرسہ عالیہ تعلیم کی غرض سے آتے جاتے رہے۔ ہمارے بچپن کی بہت سی حسین یادیں اسی حویلی سے وابستہ ہیں۔

ابا کے وظیفے پر علاحدہ ہونے کے بعد ہم نے اس حویلی کو خیرباد کہا اور بنجارہ ہلز پر اپنے نئے مکان "کوہ نور" میں سکونت اختیار کی جو والدہ کے نفیس آرکیٹکچر کا خوبصورت نمونہ تھا۔ اور آج بھی اسی تمکنت سے کھڑا نظر آتا ہے گو اس کے مکیں اب وہاں نہیں رہے۔

جب والد انسپکٹر جنرل تھے، حیدرآباد کے ضلعوں کا دورہ کرنا اور انسپکشن کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔

چناں چہ نظام اسٹیٹ ریلوے کی خصوصی ریل میں دورے پر جاتے تو والدہ اور ہم بچے بھی ان کے ہم راہ ہوتے۔ اپنے سفر کے دوران اضلاع اور دیہاتوں اور وہاں کی زندگی کے بارے میں اتنا کچھ جانا کہ یہ معلومات ہم کو کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

دور تک پھیلی ہوئی دھرتی پر کسانوں کے ہل اس کے سینے کو چیرتے جاتے، کھیتوں میں سبزہ لہلہاتا۔ کہیں سرسوں، کہیں گنا، کہیں ارنڈی، کپاس، دھان اور گیہوں کی فصلیں کھڑی ہوتیں۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر رنگ برنگی ساڑیوں میں عورتیں گیت گاتی، بعض گاگروں میں پانی لیے اور کچھ اپنے مردوں کے لیے کھانوں کی پوٹلیاں لیے محو خرام نظر آتیں۔ ان کی سیدھی سادی زندگی نے ہمیشہ ہمیں متاثر کیا تھا۔ گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی میں کس قدر فرق تھا۔ ان ضلعوں کے تاریخی آثار بھی ہم نے دیکھے۔ اورنگ آباد میں ایلورا، اجنتا، دولت آباد کا قلعہ، رابعہ دورانی کا مقبرہ، پن چکی، محبوب نگر کا قدیم بڑ کا درخت جس کی شاخوں پر چڑھ کر جھولتے۔ بیڑ اور سوتاڑہ، ورنگل، وقار آباد کے امرائیوں میں آموں کے پیڑوں پر چڑھ کر میٹھے میٹھے آم کھاتے۔ گھر پر ہمارا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کی غذا بس آم ہی آم ہوتے۔ والد کے ساتھ ہم نے ریاست حیدرآباد کے سبھی ضلع دیکھ ڈالے۔

ایک بار "کوہ نور" میں شادی تھی۔ ہمارے گڈے اور گڑیا کی۔ ہم نے علاوہ خاندان والوں کے اپنی سہیلیوں اور دوستوں کو بھی مدعو کیا۔ انیس الغربا کے یتیم بچوں نے بینڈ بجایا۔ دولھا ہماری چھوٹی موٹر میں اس جگہ سے جہاں آج "بھاسکرا پیلیس"، بنجارہ ہلز پر کھڑا ہے، برات لے کر ہمارے گھر بینڈ باجے کے ساتھ آیا۔ ہمارے گڈے کا نام ہمایوں فر تھا۔ دو فٹ لمبا، بڑا بانکا اور خوبصورت تھا۔ سہرے سے اس کا چہرہ ڈھنکا تھا۔ کمخواب کی شیروانی بڑی سج رہی تھی۔ جب وہ "کوہ نور" کی گیٹ پر آیا دولھن والوں نے دھنگانے کی رسم کے لیے گیٹ بند کر دی۔ دولھا میاں کو رقم دینی پڑی۔ مہمانوں کا جم غفیر تھا۔ لگتا تھا جیسے یہ گڈا گڈی کی شادی نہیں سچ مچ کی شادی تھی۔ غرض دولھا اندر آیا اور نکاح کا وقت آیا جس نے نکاح پڑھایا وہ میرے والد تھے۔ اس کے بعد سہرا پڑھا گیا۔ مصری بادام وارے گئے۔ جلوہ ہوا اور ہماری شاہ تاج، ہمایوں فر کے ساتھ رخصت ہوئی۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے کپڑے سی کر اس کا جہیز تیار کیا تھا۔ وہ کپڑے اور وہ دولھا دولھن آج بھی ہمارے پاس ہیں اور وہ تحفے بھی جو مہمانوں نے ان کو دیے تھے۔ اس شادی کا تذکرہ بہت دن تک ہوتا رہا۔

اس مکان میں ہم نے اپنے ہنستے کھیلتے بچپن کو بھی رخصت کیا۔ نئے آفاق تلے نئے موسموں اور نئی رنگینیوں کو گلے لگایا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں قدم رکھا اور یہیں سے باجوں او شہنائیوں کے سرگم میں اپنے بابل کا گھر چھوڑ کر نئے ساتھیوں کے ساتھ نئے گھر بسانے چلے اور اسی مکان میں ۱۶ نومبر ۱۹۷۲ء کو میرے والد نے دل ناتواں کا مقابلہ کرتے کرتے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ ان کی کتابوں کی لائبریری، ان کا چمن سوگوار ہو گیا۔ ایک شفیق باپ بچوں سے جدا ہوا اور ایک چاہنے والا شوہر اپنی بیوی کے چہرے پر نظریں جمائے خاموش ہو گیا۔

سید رحمت اللہ قادری اللہ کو پیارے ہو گئے۔

•●•

۲۸

اقبال متین

باتیں ہماریاں

میں نے یادوں کو بے مہار چھوڑ دیا۔ جو رہ گئیں سو میری جو نہ رہیں سو اللہ میاں کی بھی نہیں۔۔۔۔۔۔

جب میں نہ رہوں گا تو لوگ کہیں گے اللہ کو پیارا ہو گیا وہ۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اللہ کو پیارا نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے لیے یا اپنے لیے کیا لے جاؤں گا۔ ایک وقت کی نماز نہیں۔ ایک دن کا روزہ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے مجھے بہت کچھ دیا۔ عزت دی، سب سے بڑی چیز مجھے میرا قلم دیا۔ ساتھ ہی مجھ سے میری عزیز ترین ہستیاں بھی چھین لیں۔ میں ان کی جدائی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھا۔ کبھی کچھ اسباب فراہم کرتے۔۔ کچھ سوچ کے پنکھ پکھیرو نے اس طرح شل کر دیتے کہ موت کے تصور کو میں گیلی آنکھوں سے اپنا لیتا۔ کچھ بھی تو نہیں کیا۔ کوئی ہنستے بولتے جدا ہوا۔ کوئی کھیلتے کودتے جدا ہوا۔ کسی نے صبح ملنے کا حتمی وعدہ لیا۔ میں پہنچا تو سفید چادر تانے ایسی نیند سو رہا تھا جیسے دبکی مار کر پڑا ہو اور میری ماں کو آزما رہا ہو۔ لیکن نہیں وہ واقعی سو گیا تھا۔۔۔ وہ کون تھا۔ یہ بات تفصیل چاہتی ہے۔ اس بات کو اب۔ یہیں چھوڑتا ہوں۔ پھر بتاؤں گا۔۔ لیکن بتاؤں گا ضرور۔ مجھے بعد میں سمجھ میں آیا تھا کہ اس کے اس طرح سب کو حیرت میں ڈال کر جانے کی وجہ کیا تھی۔ یہ سب کے سب کچھ اسی طرح گئے۔ ایک کے لیے میں نے گھر صاف کیا، سنوارا کہ اس کو دواخانے سے گھر لے جانے والا تھا۔ وہ یکایک چل دیا۔ دواخانہ بھی چھوڑ گیا گھر بھی نہیں آیا۔ ایک نے پیشانی کے پیار دیے۔ ٹرین میں سوار ہوا۔ جا چکا تو میں پٹریاں تکتا رہ گیا۔ اب یہ پٹریاں جو حیدرآباد میں بچھی ہوئی تھیں، جہاں بھی میں جاؤں بچھی جاتی ہیں اور میں انھیں اٹھا اٹھا کر اپنے میں چھپا لیتا ہوں۔ کہ وہ انھیں راہوں سے گیا ہے تو آنے گا بھی انھیں راہوں سے۔ اب اسی طرح انتظار بن کر جینے کا سلیقہ مجھے آگیا ہے۔

اس کے باوجود وہ مجھے اچھے لگتے ہیں جن کا اللہ میاں ہے۔ کیوں اچھے لگتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔ کوئی وجہ جواز بھی تو نہیں۔ جتنا اس سے کم بھی نہیں لیا۔

دیکھیے نا میں نے وھسکی کا چسکا لگا لیا۔ یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ انھوں نے وھسکی کا چسکا لگا دیا۔ میرا کیا ان پر کیوں ڈالوں۔ لیکن انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ اس چسکے کو چسکی بنا کر رکھ دیا۔ اتنا نوازا ہی نہیں مجھے کہ میں اپنی چھیتی سے انصاف کر سکتا۔ پیار کر سکتا۔ میں نے بھی پینے کے آداب وضع کیے۔ وھسکی کا احترام کیا۔ جھک کر ملا۔ بس اس ایک سے جھک کر ملنا تھا کہ۔ یہی میرا مزاج بن گیا۔ موانست یہاں تک رکھی کہ کچھ دور رہا، کچھ قریب ہوا۔ ہونٹوں سے نہ لگا سکا تو دیکھ کر خوش ہو لیا۔ آپ ہی بتائیے شراب کی دوکان سے زیادہ آنکھوں کو کونسی دوکان پیاری لگتی ہے۔ بار سے زیادہ اچھی محفلیں کہیں سجتی ہیں؟ یعنی انتظار کی گھڑیاں بی بی وھسکی سے بھی وابستہ کر دیں۔ لیکن یاران ما بے پر کی اڑانے میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ مجھے بدنام کیا، اپنی نیک نامی کے بخیے سی لینے کے لیے۔ کوئی جب یہ کہتا ہے کہ دوسرا چور ہے تو دراصل وہ یہ کہتا ہے کہ وہ چور نہیں ہے۔ بس جھوٹ۔ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کیسی کیسی علتوں میں بھی لوگ کالر کے ہک لگانے رکھتے ہیں۔ ان کے لیے صرف اور صرف شراب حرام ہے باقی سب اسلام میں جائز۔ اب اگر میں باقی سب کی تفصیلات میں جاؤں تو باور کیجیے کہ شراب منہ چھپاتی پھرے گی۔ میں اپنے پینے کا جواز نہیں فراہم کر رہا ہوں۔ شراب کی طہارت کا اعتراف کر رہا ہوں۔

اب یہاں سے شروع ہوتی ہیں جنت اور دوزخ کی ملی جلی سرحدیں۔ آپ کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ ساتویں آسمان کا

جغرافیہ ایسا نہیں ہے۔ یہ سرحدیں ملی جلی نہیں ہیں۔ نہیں ہوں گی لیکن میں نے ان کو زمین پر برابر برابر دھری ہوئی دیکھا ہے۔ جنت لوہے کی تھی اور دوزخ کانچ کی۔ سیر کرانے والے میرے چچا صاحب ایسے ابا جن کی انسان دوستی کی قسم کھا سکتا ہوں۔ ایسے ابا جو خاندان بھر کو محبتوں سے نوازنے میں بے مثال تھے۔ آج ان کی آل اولاد ایسی ٹوٹی ہے، ایسی ٹوٹی ہے کہ سوچتا ہوں اچھا ہوا، جو ابا نہ رہے۔ اگر رہتے تو کیسا رس رس کر مرتے، زخم کی طرح۔

اب آیئے آپ کو کو بھی جنت اور دوزخ کی سیر کرادوں۔ سال یا برس مجھے یاد نہیں۔ وہ یاد نہیں رہتے، میں یاد نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ میرا یوم ولادت آتا ہے گزر جاتا ہے۔ گزرتا ہے پھر آجاتا ہے۔ مجھے اس کا خیال کبھی آیا ہی نہیں۔ اب عمر کی اس منزل میں اس کا خیال آتا بھی ہے تو بروقت نہیں آتا۔ عمر کا خیال ویسے بھی بروقت نہیں آنا چاہیے۔ کھانا ہوتا ہے۔۔ اتنا کہوں کہ یہ بات اس وقت کی ہے جب میں جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوچکا تھا۔

میرے ابا جنھیں میں بابا پکارتا تھا پانے گاہ آسمان جاہی میں تعلقہ چیتاپور کے تحصیل دار تھے۔ جیتا شاہ ولی کی درگاہ تھی وہاں۔ نام اس تعلقے کا جیتاپور کبھی ہوگا۔ ہمارا بچپن جاتے جاتے ج سے جیتا اب چ سے چیتا بن گیا تھا۔ لوگ جب کسی درگاہ کے عقیدت مند ہوجاتے ہیں تو شیر، ببر، چیتے جیسے درندوں کو درگاہ کے فرش پر دم سے جھاڑو لگانے پر مامور کردیتے ہیں۔ چناں چہ ہم نے سنا کہ روزانہ راتوں کو ٹھیک دو اور اڑھائی بجے کے درمیان ایک بہت بڑا چیتا درگاہ کے اطراف اپنی دم سے جھاڑو لگا جاتا ہے جس کو عقیدت مند جاروب کشی کی سعادت حاصل کرنا کہتے تھے۔ جھاڑو لگانا کہنا بے ادبی بھی جاتی تھی۔ پڑھے لکھے ہندو، بھی بہت آسانی سے ان الفاظ کو ادا کردیتے تھے کہ ان دنوں فارسی کا چلن تھا۔ "دھیز مانگ۔ بھی "جروکشی۔ کہتے تھے اور عرس کے زمانے میں برتنے کے پانی بھرن کو خوشی خوشی انجام دیتے تھے کہ بابا نے اس کام کے لیے ان کی ممانعت کو ناروا قرار دیا تھا اور ان کی حسرتوں کو مسرتوں سے بدل دیا تھا۔ وہ خوش تھے کہ وہ اس کام کے اہل ہیں۔

ہر سال درگاہ شریف کا عرس ہوتا تھا۔ رنگ برنگی کھلونوں اور بتاشوں کی دکانیں سجتی تھیں۔ مشروبات اور قلفیاں، فالودے کی کٹوریاں، ٹھیلوں پر بکتی تھیں۔ درگاہ کی داہنی جانب بازار بھرتا تھا اور بائیں جانب خیمے، ڈیرے، شامیانے، راوٹھیاں۔ دن کو ہو کہ سرشام قہقہوں کی کمندیں پھینکی جاتیں اور رات کو روشنیاں اس طرح بکھرتیں کہ گھنے درختوں کے سائے، روشنیوں سے چھپتے پھرتے اور جنگل کے سناٹوں کا پیچھے تعاقب کرتے۔ اور یہ اہتمام، شعر و سخن ادب و ثقافت کی پذیرائی کے لیے ہوتا۔ سرخیل رنداں ہوتے میرے چچا تمکین سرمست۔ شعر و سخن کی تہذیب و ثقافت ہی رندی کی مرہون منت رہی ہے۔ اب اس کو میں کیا کہوں۔ پردہ ڈالتا ہوں تو سچائی چھپتی ہی نہیں مسخ ہوتی ہے۔ نہ بابا نہ چچا کوئی بھی اللہ کے لیے یہ نہیں کرتے تھے۔ اور ویسے بھی کسی عرس کا اللہ سے تعلق نہیں ہوتا۔ بندوں کی ہو حق، سیر تفریح، منتوں مرادوں کے لیے دھکا پیل، منچلوں کے لیے نظر بازی، قوالوں کے لیے اللہ ہو، حال لانے والوں کے لیے لوٹن کبوترے۔ ظاہرے، اتارن جھاڑن کرتب بازی کہ درگاہ سے مور چھل اٹھایا اور اچھی بھلی لڑکی پر پیشانی سے پاؤں کی پوروں تک اتارا اور وہ لگی جھومنے۔ نہ جھومے تو اس کا مان ختم ہوجائے۔ نہ صاحب آنگ پر آئیں نہ آن کر کھرا کھوٹا بتائیں۔

چچا باوا حضرت تمکین سرمست مشاعرے کا اہتمام بابا کے مشورے سے کرتے۔ میلے کا کاروبار حق پرست اور خداترس ہستیاں متولی اور مجاور کی مدد سے سرانجام دیتی تھیں۔ بحث دونوں کا الگ الگ تھا۔ درمیان میں درگاہ تھی۔ مشاعرے کی محفلیں اتنی مقبول ہوئیں کہ قوالی کے لوگ بھی کھسک کر ادھر آجاتے۔ چنانچہ جس شب مشاعرہ ہوتا قوالی نہ ہوتی۔ مگر عرس کی یہ رات سب سے قیمتی رات ہوتی۔ حیدرآباد کے سارے نامی گرامی شعرا مدعو کیے جاتے۔ ان کی آؤ بھگت ان کی مزاج داریوں کو ملحوظ رکھ کر کی جاتی۔

ایک بار چچا تمکین صاحب نے اپنی رواداری کا کمال دکھایا۔ حضرت صفی اورنگ آبادی اور حضرت علی اختر دونوں کو ایک ساتھ مدعو کرلیا۔ صبح صبح تحصیل دار وقت کے اہتمام سے فراہم کی ہوئی، سیندھی تاڑی ایک چھوٹے سے شامیانے میں

سارے لوازمات کے ساتھ فراہم کردی جاتی۔ رکھے تو جاتے کانچ کے گلاس بھی کہ شاعر کو کسی چیز کی کمی نہ رہے۔ لیکن حضرت صفی مٹی کے آب خوروں کو ترجیح دیتے۔ حسینی شاہد پر جان چھڑکتے۔ کہتے کس سوندھی مٹی کا آب خورہ ہے تو۔ میں، لطیف ساجد اور حسینی شاہد اس راز کو بھانپ گئے تھے۔ حسینی شاہد بلا تھا۔ ہم تینوں میں زیادہ ذہین، زیادہ شریف۔ صفی صاحب اساتذہ میں تھے۔ شاہد نے نہ کبھی ان سے کوئی گستاخی کی نہ صفی صاحب نے اپنے احساس جمال کو ابتذال کی صورت دی۔ بس دم بھرتے اور لیے دیے رہتے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم صفی صاحب کے شامیانے میں برابر حاضری دیتے۔ تاکتے رہتے کہ چچا ابا نہیں ہیں۔ وہ نہیں ہوتے تو ہم تینوں پہنچ جاتے۔ لطیف ساجد ایطائے جلی اور ایطائے خفی کے فرق کو اشعار کے حوالوں کے ساتھ سمجھانے کی خواہش کرتا۔ کبھی پوچھ بیٹھتا یہ شانیگاں قوافی کیا ہیں۔ شاہد اور میں کلام سنانے کی گزارش کرتے اور شاہد چن چن کر معاملہ بندی کے شوخ اشعار کی داد دیتا۔ صفی تڑپ تڑپ کر سناتے۔ ہم باہر آکر خوب ہنستے اور شاہد استاد فن کی باریک بینی پر بلغمی کھانسی کی آواز میں تبصرہ کرتا۔ شاہد ان دنوں نام کا شاہد نہیں تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر پندرہ بیس قدم ادھر ادھر ایک اور شامیانہ نصب ہوا۔ گھڑونچیوں میں وضو کے لیے پانی۔ وضو کرنے کے لیے زمین سے ذرا سی اونچی چوبی چوکی۔ سارے شامیانے کے اندر بچھی ہوئی نرم نرم پرال کی گھانس اور پوال پر بچھی دریاں۔ ان پر فرش لیکن ایک گوشہ اسی خیمے میں صاف ستھری زمین پر بچھی جانماز کے لیے مختص، کہ بہ وقت نماز گھٹنے گدیلے کی نرمی سے محروم رہیں۔ جانماز کا ایک کونا الٹا ہوا۔ اس پر تسبیح دھری ہوئی۔

وہ حضرت صفی اورنگ آبادی کا شامیانہ تھا اور یہ حضرت علی اختر کا۔ بابا کے حسن انتظام نے درمیان میں ایک گھنے املی کے درخت کو چن لیا تھا جو دونوں شامیانوں کی ماحولیاتی تنظیم میں جتا رہتا کہ ادھر کی بو ادھر نہ جانے اور ادھر کی آواز ادھر نہ آنے۔ علی اختر صاحب اگزیما میں بھرے پیروں کے اوپری حصے کو بھی وضو کے وقت پانی سے تر کرکے احتیاط سے صاف کرتے۔ وضو کے آگے اپنی بیماری کا خیال انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ وضو کرتے، تسبیح خوانی کرتے۔ وقت پر نماز ادا کرتے۔ اور جی لگے تو لگتا شعر موزوں کر رہے ہیں۔ بات چلی تھی برابر دھری ہوئی جنت اور دوزخ کی سرحدوں کی، اور ڈر تھا کہ آپ معترض ہوں گے۔ میں گناہ گار ساتویں آسمان کا جغرافیہ کیا جانوں۔ ہو سکتا ہے کہ دوزخ اور جنت کی سرحدیں اتنی دور دور ہوں گی کہ یہاں کی جھلسنے والی لو کے جھونکے وہاں نہیں پہنچ سکتے ہوں گے۔ وہاں کی ٹھنڈی سکون بخش پروائیاں یہاں کا رخ کرتے ہی جھلس جاتی ہوں گی۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے حساب سے میں نے املی کے پیڑ کے سائے میں جنت بھی دیکھی، دوزخ بھی۔

یہ اللہ میاں کا کاروبار بھی انسانی سمجھ سے باہر ہے۔ جب نوازنے پر آتے ہیں تو نہ اپنا دیکھتے ہیں نہ پرایا۔ صفی اورنگ آبادی کو نواز دیا، علی اختر کو محروم کر دیا۔ اب ہم کیا کریں۔ سر پیٹ لیں۔

لطیف ساجد املی کے گھنے پیڑ کی طرف اشارہ کرکے کہتا یہ حضرت صفی ہیں ان کا سایہ حضرت علی اختر کو جھلس نہ دے کہیں۔ لیکن صفی صاحب جتنے چنچل تھے، اتنے ہی موقع محل سے وضع داری نبھانے میں یکتا تھے۔ انھوں نے احتساب نفس کو چھوٹ نہیں دی۔ جب بھی علی اختر صاحب سے سامنا ہوتا بہت احترام سے ملتے۔ کچھ اس طرح جیسے اپنے اطوار کا محاسبہ کر رہے ہوں۔ عالم مدہوشی میں یہ التزام حواس بھی تو خدا ترس ہونے کی احسنت کی دلیل ہے۔ ہم تو اسی دوزخی کے گرویدہ تھے۔

اب رہی علی اختر صاحب کی پاکیزہ سرشت کے باوصف ان کی محرومیاں، سو یہ داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ نیاز فتح پوری کی شخصیت اپنے زمانے کی جید شخصیت تھی جو کسی بھی دستار فضیلت کو چھین سکتی تھی اور کسی بھی پگڑی پر جیغہ باندھ سکتی تھی۔

سوچتا ہوں جینیئس (GENIUS) بعض وقت جڑواں بھائی کی طرح کس حد تک مماثل ہو جاتی ہے۔ ایک تھے نیاز فتح پوری

دوسرے ہیں شمس الرحمن فاروقی، دونوں ذہین، فطین، فریس۔ دونوں بہت پڑھے لکھے عالم فاضل، ایک نے نگار کو اپنا ہتھیار بنایا، دوسرے نے شب خون کو۔ تخلیقی ارج کے بے پناہ سوتے دونوں کے شاداب ذہنوں سے جھر جھر پھوٹنے اور جو بھی روانی کی زد میں آیا بہالے گئے۔ اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دونوں نے اپنے اپنے ادبی نظریات کا بہ بانگ دہل پرچار کیا۔ نیاز فتح پوری نے مذہب کے ٹھیکے داروں کی عبا کھینچی، ہاتھ میں لہراکھاتی تسبیح پر جھپٹے اور ان کی آہ و بکا کو زمین سے اٹھا اٹھاکر عرش کی طرف جھٹکایا اور سیٹی بجاتے رہے۔ گویا اللہ کے خاص بندوں کو اللہ کے حوالے کر دیا اور چین کی بنسی بجائی۔ لیکن نگار نے ان کو وہاں لے جاکر متمکن کیا جہاں اس نردبان کے بغیر ان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ اس میں کمال نگار کا نہیں نیاز کا ہے کہ دامن میں پگھلتی ہوئی برف اور چیز ہے ایورسٹ کی چوٹی اور۔ شمس الرحمن فاروقی نے جن دنوں ترقی پسندوں پر شب خون مارا تو ادب کو چاشنی کے طور پر چاٹنے والوں کا ایک قبیلہ چٹخارے لینے لگا ان میں بعض ایسے بگڑے دل بھی تھے جو پڑھنے لکھنے والے جواں سال مسلمانوں کی اللہ میاں سے دوریوں کا جواز پہلے نیاز فتح پوری کی تحریروں کو سمجھتے تھے اور اب ترقی پسندوں کے شعر و ادب کو سمجھنے لگے تھے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ان سارے جواں سال ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں کو جو کبھی ترقی پسندوں کے زمرے میں اپنی شمولیت کو صباحت سمجھتے تھے پکڑ پکڑ کر اس بری طرح اپنی اپنی ذات کے خول میں بند کیا کہ وہ ترقی پسندوں پر تبرا بھیجنے لگے۔ رد و قدح کی یہ سرگرمیاں تخلیق کاروں کے اذہان کی تحلیل و تصدیق نہیں تھیں اس لیے جدیدیوں کی پوری ایک نسل ایک ذہن رسا کے پیچھے دوڑ پڑی۔ اپنا تو کچھ تھا نہیں۔ زندگی کو زندگی کے تجربوں کے بغیر تخلیق کا سہارا بنالینے سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ فیشن زدہ نقالی ہاتھ آسکتی تھی سو آئی اور شمس الرحمن فاروقی شعر شورانگیز کی طرف رجوع ہوگئے۔ علم کا زور کچھ بھی کروا سکتا ہے صرف اتنا ہو کہ عملی خلاقیت بے مہار چھوڑ دی جائے۔ فراق گورکھپوری، فاروقی کے قلم سے تیسرے درجے کے شاعر ہوئے۔ ان کے کسی نے بہتر نشتر بھی نہیں چھاپے تھے کہ پکی ہوئی کھچڑی کے چند دانے مسل کر کئی دیکھنے کے کام آتے۔ رہ گیا حجم اور ضخامت تو اس اعتبار سے فراق کے پاس وہ سب کچھ تھا جو میر کے پاس تھا۔ چاہتے تو فاروقی فراق کے پاس سے 72 سے زیادہ نشتر نکال سکتے تھے لیکن قلم اٹھایا گیا ہی کسی اور کام کے لیے تھا۔ یہاں میر و فراق کا موازنہ مقصود نہیں۔ میر بہرحال میر تھے اور پھر فاروقی نے تو میر کی ساری شاعری کو حسن کاری اور معنی آفرینی کا آخری افق بناکر سمجھا اور سمجھایا ہے۔ میر سے لطف و انبساط کے حصول اور ان کی غم زدگی اور الم کوشی کو حرز جاں بنالینے کا پندار حاصل کرنے کے لیے فاروقی کا قلم چوم کر آگے بڑھنا پڑے گا۔ میں فاروقی کی فضیلت کا معترف ہوں لیکن مداح نہیں ہوں اس لیے کہ بعض وقت فاروقی پہچانے نہیں جاتے۔ ان کا علم کبھی کبھی ان سے ان کا انکسار چھین لیتا ہے۔ اور وہ بزعم خود قلم سے تیغ زنی کا کام لیتے ہیں اس سے علمی و ادبی دیانت مجروح ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی کو فراق کا خوشہ چیں قرار دے کر فاروقی نے پھر اپنی رائے بدل لی۔ نہ وہ صحیح تھا نہ یہ صحیح ہے۔ فراق اور ناصر کاظمی اپنی اپنی جگہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ فراق اور ناصر کے تعلق سے فاروقی کی ادعائیت اتنا ضرور ہے کہ زیر لب مسکراہٹ کا موقع تو فراہم کرتی ہے۔

ایسی ذہانت جو تخلیقی میزان میں پاسنگ بھی پیدا کرتی ہے اور ذہنی بھی مارتی ہے اس کے لیے جواز کی ضرورت [illegible] لی۔ چناں چہ شمس الرحمن فاروقی نے یہی کیا۔ ایک طرف تو انھوں نے فراق کو سکنڈ ریٹ شاعروں سے بھی کم درجے پر رکھ کر طاق میں بٹھا دیا اور پھر اردو غزل کی محراب میں مکڑی کے جال تان دیے۔ جب فراق کا یہ حشر ہوا تو کیا ناصر کاظمی اس لیے رہ گئے کہ فراق جیسے تقریباً تھرڈ ریٹ شاعر کی خوشہ چینی کریں۔

یہی ساری حرکتیں کبھی نیاز فتح پوری نے بھی کی تھیں۔ علی اختر کے "قول فیصل" کو جوش ملیح آبادی کے "حرف آخر" پر فوقیت دی، بھی تو اس طرح دی کہ علی اختر کے بعد ان کے فرزند نظر حیدرآبادی دھائیں دھائیں روتے تھے کہ نیاز فتح پوری نے میرے بابا کو دفن کرکے رکھ دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جس زمانے میں نیاز نے تقابلی حیثیت میں "حرف آخر" کو کم درجے کی شاعری اور قول فیصل کو اعلیٰ درجے کی شاعری قرار دیا ان دنوں جوش کی ہر دل عزیزی نوجوانوں کے ذہن و دل میں اس

درجہ سرایت کر گئی تھی کہ وہ جوش کے خلاف ایک لفظ بھی سننے یا پڑھنے کے روادار نہیں تھے۔
یہ تو بیٹے نے باپ کی آبرو رکھنے کے لیے خیال آرائی کا یہ پیرایہ نکال لیا تھا ورنہ جوش بہرحال جوش تھے۔ یہ باتیں لکھ رہا ہوں تو نظر یاد آرہا ہے۔ اس کا چہرہ آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ مرنے سے ایک ڈیڑھ سال پہلے وہ حیدرآباد آیا تھا۔ میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کچا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہسٹری پڑھتا تھا تو سارے واقعات جنھیں میرے ساتھ ہو جانا چاہیے تھا ہو جاتے تھے۔ جو بات ذہن میں راہ پانے والی ہو، پا جاتی تھی۔ ذہن کو جھٹکا لگانے والی، سوچ کے دھارے بدل دینے والی، راستہ روک کر کھڑی ہو جانے والی، سب ہی باتیں کم زیادہ ذہن کا حصہ خود ہی بن جاتی تھیں لیکن ان وقوع پذیری اپنی تاریخی و سنہ واری جابری کو ذہن پر مسلط ہونے نہ دیتی۔ لیکن اب میں نظر کا سنہ وفات۔ سب رس کراچی میں شاہ بلیغ الدین کے مضمون کے حوالے سے لکھ رہا ہوں جو ۱۹۶۱ء تھا۔ تاریخ انھوں نے نہیں دی۔
مجھے یاد آیا تو میں نے ایک بک شلف سے نظر کی مولفہ کتاب "اقبال اور حیدرآباد" نکالی ہے۔
"بعد خلوص و محبت، متین کے لیے۔"
نظر۔ یکم مئی ۱۹۶۱ء

ظاہر ہوا کہ وہ مئی ۱۹۶۱ء میں حیدرآباد میں تھا۔ پاکستان جانے کے بعد وہ پہلی اور آخری بار حیدرآباد آیا تھا۔ اس کے چاہنے والے دوستوں میں جس نے بھی بہ اصرار اسے اپنے گھر مہمان رکھا اس نے مختصر مختصر قیام کیا۔ چناں چہ میرے پاس بھی چراغ علی گلی میں تین چار دن وہ مقیم رہا۔
ایک شام دوسرے احباب کے جمع ہونے سے پہلے ہی نظر نے بقول خود "پیروی سنت خیام" کا آغاز کر دیا تھا۔ میرے چچا تمکین سرمست صاحب کی باتیں چھڑیں۔ نظر، تمکین صاحب کا معترف تھا۔ علی اختر صاحب اور تمکین صاحب کے مراسم و تعلق خاطر کی بات رہی۔ ہوتے ہوتے جب میں نے نیاز فتح پوری کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ان کے جانب دارانہ رویے کی بات کی اور کہا کہ تمکین صاحب بھی نیاز کے صرف معترف و مداح ہی نہیں مرعوب بھی ہیں۔ ویسے نیاز فتح پوری نے نگار میں ان کو بالالتزام اہمیت دے کر چھاپا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے نظر سے کہا کہ حسرت ترمذی (جو ان دنوں حیدرآباد میں رہتے تھے) نے نو یا گیارہ اشعار کی ایک غزل نگار کو بھجوائی تھی اور نیاز نے صرف تین شعر چھاپے تھے لیکن حسرت ترمذی اس پر بھی خوش تھے تو شاہد صدیقی نے کہا تھا کہ ان سے بازپرس کرنی چاہیے، آپ تو خوش ہیں۔
نظر یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ کہا گیا باتیں یاد دلا دیں تو نے۔ میرے والد کو بہ حیثیت شاعر نیاز فتح پوری نے دفن کر کے رکھ دیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
بڑے دکھ سے اس نے "حرفِ آخر" اور "قول فیصل" کے تقابلی موازنے کی بات سنائی۔ یہاں جوش ملیح آبادی سے اپنے والد علی اختر کا مقابلہ نظر کا مقصود نظر نہیں تھا۔ وہ تو دل گرفتہ تھا کہ نیاز صاحب نے اپنی ادبی رقابتوں کو کیسے رنگ دیے اور علمی تبحر کی دیانت کو مجروح کیا۔
نیاز فتح پوری کے تعلق سے شاید کوئی اور نہیں ہو گا جس نے شاہد احمد دہلوی کے انداز میں باتیں کی ہوں۔ ان ساری باتوں کے باوجود نیاز کی علمی فضیلت اسی طرح مسلم ہے جس طرح آج شمس الرحمن فاروقی کی۔ حیرت تو یہ ہے کہ آج فاروقی اور نارنگ ایک نہیں رہے اور ایک پوری نسل واویلا مچا رہی ہے جس کو نہ "شعر شور انگیز" سے واسطہ ہے نہ "ساختیات اور پس ساختیات" سے علاقہ۔
ادب میں نظریاتی اختلاف بھی اگر رفاقت و عداوت کا اس حد تک تشخص کر سکتا ہے تو علم کیا ہے، اس کی فضیلت کیا ہے، اس کا انکسار کیا ہے۔
۱۹۶۱ء میں جب وہ آیا تھا، اس نے حیدرآباد کے وہ سارے گلی کوچے چھان مارے جہاں اس کی یادیں کنڈلی

مارے بیٹھی تھیں۔ اپنے ان گھروں کا طواف کرآیا جہاں اس کے والد صاحب، وہ اور اس کا خاندان کبھی رہتا تھا۔ وہ علی اخ
صاحب کا ذکر اکثر درد بھرے لہجے میں کرنے لگا تھا۔ اس کو احساس تھا کہ وہ سب کچھ علی اختر صاحب نے اس کے ساتھ
ہے جو اس کو علی اختر صاحب کے لیے کرنا چاہیے تھا۔

اتحاد المسلمین سے وابستگی کے بعد پاکستان منتقل ہونے سے کچھ پہلے نظر بھی نظریاتی سیاسی اختلافات کی بنیاد پر
سے بہت ٹوٹ گیا تھا۔۔ برابر سے گزر رہے ہوں تو منہ پھیر لیتا۔ مخدوم کا ذکر آتا تو کہتا۔ " بال زیادہ شاعر کم۔ اس کے ماں
حالات بھی بہتر ہوگئے تھے۔

لیکن آج بھی مجھے وہ نظر یاد آتا ہے جو سیکل پر اڑتے ہوئے کندھے سے کندھا ملا کر اپنی رسیلی پاٹ دار آواز سے مسحور
کرکے راستے کو سہل کر دیتا۔ اس کی شگفتہ مزاجی کے ساتھ اس کی وارفتہ نگاہی کی یادیں آج بھی کبھی ساتھ ہو جاتی ہیں۔

" آؤ مے خانے میں چھپ جانے کا موسم آگیا۔
بابا خیال زلف پریشاں تو کیجیے

اپنی بھری جوانی کے اس مصرع تر میں وہ اپنے والد محترم ہی سے مخاطب ہے۔ اس تلمیح طلب مصرع کی وضاحت ان دنوں
تحسین سروری کر سکتے تھے جو نظر کے رشتے کے ماموں تھے۔ لیکن اپنے بھانجے کا لحاظ رکھتے تھے۔

اقبال اور حیدرآباد کے مطالعے سے اس خصوصیت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ نثر پر بھی نظر کی گرفت مثالی تھی۔
اس کتاب کو اس نے علی اختر صاحب کی پدرانہ شفقت اور اس کی ذہنی تربیت کے اعتراف کے ساتھ ان کے اسم گرامی سے
معنون کیا ہے۔

اس کے بعد نظر پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ جب وہ یہاں تھا تو اردو ہال میں اس کے اعزاز میں ایک محفل منعقد ہوئی
تھی۔ تازہ کلام کے ساتھ فرمائش پر اس نے اپنے پہلے شعری مجموعے "خرمن" سے بھی ایک نظم سنائی تھی جو حیرت ہوئی کہ
اس کو اس وقت بھی ازبر تھی۔

کراچی کے سب رس میں جسے بھائی خواجہ شاہد نے ایوان اردو حیدرآباد اور استاد محترم جناب ڈاکٹر محی الدین قادری
زور کی یاد میں بڑی قربانیوں کے بعد بھی آج تک زندہ رکھا ہے، ڈسمبر ۹۳ء کے شمارے میں نظر پر شاہ بلیغ الدین کا جو
مضمون ہے اس میں تین چار جگہ نظر کے پہلے شعری مجموعی کا نام بجائے "خرمن" کے حزیں۔ چھپا ہے۔ تحقیق و تصحیح
ضروری ہے۔

اس زمانے سے ہی نظر کی صحت قابل بھروسہ نہ رہی تھی۔ جب وہ کلام سنا رہا تھا اس کا تنفس اس کے بس میں
نہیں تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ گلے کا جادو اور آواز کی کھنک کسی مجبوری کے مظہر تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب اس
وقت میرے برابر ہی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے :

" متین بھائی۔ یہ تو برے آثار ہیں۔۔

ڈیڑھ پونے دو سال ہی میں شاید اس نے دنیا چھوڑ دی۔

استاد صفی اورنگ آبادی کو ہندوستان گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب ان کی قلندری تھی۔ حیدرآباد کے باہر
صفی کا نام لیجیے تو لوگ صفی لکھنوی کو یاد کرتے ہیں۔ ورنہ صفی اورنگ آبادی بھی ہندوستان بھر میں ان استادان سخن میں
تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

اسی قلندری اور تساہل کے سبب حیدرآباد ہند و پاک کے ادبی افق سے آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ حیدرآباد میں
شعر و نثر کے میدان میں ہنروروں کی کمی نہیں۔ نابغہ و نایاب ہستیاں اپنی اپنی مسجد میں سر بسجود ہوتیں تو بھی اللہ میاں حرکت
کے بغیر برکت نہیں دیتے۔۔ علی اختر کی مثال سامنے ہے۔ استادان فن میں شامل تھے لیکن ہند و پاک تو کیا انھیں، حیدرآباد
بھی نہ ملا۔

•●•

۳۱

پروفیسر گیان چند جین

محمد نسیم الدین فریس کی تحقیقات

"تحقیقات" میرے شاگرد رشید محمد نسیم الدین کی پہلی کتاب ہے جو دکنیات سے متعلق ان کے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس پر سنہ اشاعت ۱۹۹۳ء درج ہے لیکن چوں کہ انھوں نے مجھے یہ کتاب فروری ۱۹۹۴ء میں بھیجی ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اوائل ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہوگی۔ انھیں معلوم نہ ہوگا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ایک مشہور مجموعہ مضامین کا نام بھی "تحقیقات" ہے۔ نسیم الدین نے (145) صفحوں کی یہ مختصر کتاب خود شائع کی ہے۔

جس طرح نئی زمانہ نسلوں کی خلیج چوڑی ہوتی جارہی ہے اسی طرح قدیم ترین اردو ادب (دکنی ادب) اور جدید ترین ادب کا زمانی و جذباتی فاصلہ بھی روز افزوں ہے۔ ماضی کی اہمیت اظہر من الشمس ہے لیکن دور حاضر کے ادیب اور قاری دکنی ادب سے ایسی مغائرت محسوس کرتے ہیں کہ دکن سے متعلق کسی کتاب یا مضمون کو پڑھنے والے شمال میں تو درکنار دکن میں بھی معدودے چند ہیں۔ دکنی محققین کم ہوتے جارہے ہیں۔ معتبر محققین اور بھی کم۔ ضرورت ہے کہ بزرگوں کے اٹھتے جانے کے ساتھ خوردوں کی نئی نسل ان کی جگہ لینے کے لیے آگے آئے لیکن خلا زیادہ ہے پر کرنے والے کم۔ صوفیا کے دکنی رسالوں ہی کو لیجیے ان میں غضب کی ملاوٹ ملتی ہے۔ ماضی میں احمد خاں درویش، ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر حسینی شاہد ان میں گہری نظر رکھتے تھے۔ اب ان رسالوں کا ماہر خصوصی کوئی نہیں۔ دکن کے نوجوان ماہرین میں سب سے نمایاں اور معتبر شخصیت نسیم الدین کی ہے جن کی تحقیق اتنی ٹھوس اور جامع ہوتی ہے کہ اس سے ان کے بزرگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

نسیم الدین اپنا تحقیقی مواد محض مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے نہیں فراہم کرتے، وہ کتب خانوں میں ڈوب کر قلمی کتابوں اور بیاضوں کو کھنگالتے ہیں۔ اصل ماخذ کو دیکھ کر لکھتے ہیں۔ میرے اس حرف خیر کا ثبوت ان کا مختصر مجموعہ تحقیقات ہے جو صرف چھے مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون "فن ترقیم میں غواصی کی ایک غزل" ہے۔ میں ترقیم کی اصطلاح سے واقف نہ تھا۔ نسیم الدین کے بقول ترقیم کے معنی ہیں حروف کا کام طریقہ جمل کے ہندسوں سے لینا۔ اس معنی کے لیے سند ہے نواب عزیز جنگ ولا کی کتاب "عجائب الجمل" (حیدرآباد ۱۳۳۶ء) مجھے نہ بحر الفصاحت میں اس صنعت کا ذکر ملا نہ کسری منہاس کی کتاب "فن تاریخ گوئی (لاہور ۱۹۸۹ء) میں۔ یہ کوئی غریب اور غیر مروج صنعت ہے۔ غواصی نے ایک غزل میں اعداد لکھ کر ان کے حروف مراد لیے ہیں۔ میں، اس غزل کو دیکھتا تو اس کے معنی نہ سمجھ پاتا۔ کوئی دوسرا بھی نہیں سمجھا مگر نسیم الدین نے یہ معما حل کرلیا اور شعر کے معنی کما حقہ دریافت کرلیے۔ انھوں نے ص ۲۰ پر طریقہ جمل کی رد سے حروف کے جو اعداد لکھے ہیں ان میں اڈا کو لڑا کے برابر مان کر اس کے ۷۰۰ عدد لیے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ اڈا کو ادا کے مساوی مان کر اس کے ۲ عدد لیے جاتے ہیں۔ دیکھیے بحر الفصاحت (ص ۳-۱۰۰) اور فن تاریخ گوئی۔ (ص ۹)۔

نسیم الدین نے ایم۔ فل کے لیے میری رہبری میں دکن کی چند مخصوص اصناف پر مقالہ لکھا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ دکنی اصناف کا مطالعہ کرتے رہے جس کی وجہ سے وہ اس موضوع کے ماہر ہیں۔ "تحقیقات" کے چار مضامین دکنی اصناف ہی سے متعلق ہیں۔ مجموعے کا دوسرا مضمون "چکی ناموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" ہے۔ چکی نامہ ایک موضوعی

صنف ہے جو گیت کے فروعات میں آتی ہے۔ نسیم الدین نے چکی ناموں اور ان کے شاعروں کی تحقیق کی اور انھیں صحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس سلسلے میں بڑے بڑوں کے بعض تسامحات کی نشان دہی اور تصحیح کی۔ مضمون میں معروف و غیر معروف جملہ چکی ناموں کا جامع تعارف و تحقیق ہے۔ اس صنف کے اس مفصل بیان پر شاید ہی کچھ اضافہ کیا جاسکے۔

تیسرا مضمون " دکنی شاعری میں سی حرفی کی روایت۔ " ہے۔ اب تک اہل اردو یہ سمجھتے تھے کہ سی حرفی دکنی، پنجابی یا قدیم ہندی کی صنف ہے۔ نسیم الدین کچھ اور پیچھے جاکر یہ چونکانے والا انکشاف کرتے ہیں کہ یہ قدیم عبرانی اور عربی شاعری میں بھی پائی جاتی تھی۔ اس کے لیے وہ کیسے کیسے غیر متوقع اور غیر روایتی ماخذ سے استفادہ کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انگریزی اردو لغت میں لفظ ACROSTIC (توشیح) کی وضاحت میں لکھا ہے کہ قدیم عبرانی شاعری میں حروف تہجی سے شعر کہنے کی روایت ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید اسد علی کی کتاب " ہندی ادب کے بھکتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات۔ " سے معلوم کرتے ہیں کہ عربی فارسی کی عوامی شاعری میں حروف ابجد کی ترتیب سے شعر کہنے کا رواج تھا۔ پنجابی میں سی حرفی کے لیے ہم عام طور سے اردو کی ادبی کتابوں کے حوالے پر قناعت کرلیتے ہیں لیکن نسیم نے " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ " کی تیرھویں جلد دیکھی جو پنجابی ادب سے متعلق ہے۔ اس طرح ان کا یہ مضمون بھی چکی نامہ کی طرح مفصل اور تحقیقی ہے۔ اس میں نہ صرف دکنی سی حرفی کی تاریخ ہے بلکہ دوسروں کے بیانات کی تصحیح بھی ہے۔

چوتھا مضمون " دکنی اردو کی چند متروک اصناف ہے۔ " اس میں تین نادر آں جہانی اصناف " برہنی۔ " چار کرسی۔ " اور " کھاڑا۔ " کا ذکر کرتے ہیں۔ میں ان میں سے کسی صنف سے واقف نہ تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں برہنی کی اصطلاح دیکھی تھی۔ ممکن ہے علی عادل شاہ شاہی کی کلیات کا برہنی مخمس ہی میرے ذہن میں ہو۔ یہ کلیات میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ میں نے اپنی کتاب " ادبی اصناف۔ (گجرات اردو اکیڈیمی ۱۹۸۹ء) میں برہنی کو صنف کا درجہ نہیں دیا کیوں کہ میں اسے گیت کے ذیل میں فرض کرتا تھا۔ گیت کی موضوعی گروہ بندی کرتے ہوئے میں نے لکھا ہے۔ ". عشقیہ گیت خواہ وہ لوک گیت ہوں یا شعرا نے لکھے ہوں ان میں برہ کے گیت اہم ہیں گیتوں کا سب سے اہم موضوع یہی ہے۔ " (ادبی اصناف ص ۹۱)

نسیم الدین نے کئی شعراء کے یہاں سے اس عنوان کے گیتوں کا ذکر کیا ہے جس سے اسے ایک صنف کی، وہ کتنی مختصر سہی حیثیت مل جاتی ہے۔ برہنی کے ساتھ ساتھ وہ درسنی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ (ص ۹۷) درسنی وہ گیت ہیں جو برہ کے بعد محبوب کا درشن یعنی دیدار ہونے کی خوشی میں لکھے گئے ہوں۔ نسیم الدین کی دریافت شدہ دوسری صنف چار کرسی یا چہار کرسی ہے۔ اس کی ابتدا میں آں حضرت صلعم کا نسب نامہ چار پشت اوپر تک بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کچھ فقہی مسائل نظم کیے جاتے ہیں۔ نسیم الدین نے چار کرسی نظم نیز نثر کے کئی نمونے دریافت کیے۔ کھاڑا ایک قسم کا معما معلوم ہوتا ہے۔ نسیم الدین کو اس کے محض دو نمونوں کا پتہ چلا لیکن وہ ان میں سے کسی کو دیکھ نہ سکے۔ جب تک نمونے سامنے نہ آجائیں اس کی صنفی حیثیت کیوں کر تسلیم کی جائے۔ ممکن ہے یہ کسی قسم کا چیستاں ہی ہو۔ واضح ہو کہ محض ایک دو شاعروں کا نظم کی کوئی نوع مقرر کر دینا اسے صنف کی حیثیت دلانے کے لیے کافی نہیں۔ شعریاتی روایت میں قبول عام ملنا چاہیے۔

اگلا مضمون " ایک نایاب چرخہ نامہ ہے۔ " یہ سیدی برہان کی تصنیف ہے۔ نسیم الدین نے اس کے پانچوں بند قلم بند کرکے محفوظ کر دیا ہے۔ آخری مضمون " حضرت شاہ علی جیو گام دھنی اور ان کی جکریاں ہے۔ " اس میں وہ جکری کے بہت سے مفاہیم کا ذکر کرکے گام دھنی کی بعض جکریوں کا تنقیدی تعارف پیش کرتے ہیں۔ افسوس کہ انھیں میرے مضمون " جکری ایک قدیم صنف سخن۔ مشمولہ رسالہ روح ادب کلکتہ (پہلا شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۴ء) کا علم نہیں۔

یہ تمام مضامین بھرپور اور معتبر ہیں۔ دکنی ادب کو نسیم الدین جیسے محتاط محققوں کی سخت ضرورت ہے۔ حالاں کہ دکنیات کا مطالعہ محض خسارے کا سودا ہو کر رہ گیا ہے۔ تخلیق کاروں اور تنقید نگاروں کے مقابلے میں محققوں کو کوئی نہیں

(آگے ص ۴۴ پر)

ممتاز راشد

دو نظمیں

(۱)

تمہاری آواز
تمہارا چہرہ ہے
تمہارا مزاج ہے
تمہارا پیکر ہے
جاڑے کی چاندنی راتوں کی طرح شفاف
شبنم کی کومل بوندوں کی طرح پاکیزہ
تمہاری آواز
وقت کی جد و جہد میں
اس بڑے شہر کی
شور سے بھرپور سڑکوں پر چلتے ہوئے
جب بھی اچانک مجھے کہیں تمہاری آواز
سنائی دی ہے
ایک پل کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا
زندگی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آ گیا ہے
اور شاید اسی لیے
آج تمہارے جانے کے بعد
میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا
کہ
تم وہی ہو جو تمہاری آواز ہے
تمہاری آواز وہی ہے جو تم ہو

(۲)

میرے سارے ان کہے جملے
تمہاری سب اَن سُنی باتیں
رمی کے اُن پتوں کی طرح ہیں
جو کبھی کوئی سکوئنس (SEQUENCE) نہیں بنا سکیں

نہ جانے کیوں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے
میں نے جب بھی تم سے کچھ کہنا چاہا
میرے پاس الفاظ نہیں تھے
تم نے جب بھی کچھ سننا چاہا
تمہارے پاس وقت نہیں تھا

حامد مجاز

ریت کا دلدل

ریت میں
منظور نہیں
ٹھہر جانا مجھے
دھنستا جا رہا ہوں
اندر ـــــــ
اور سفر میں ہوں
مُسلسل

بند کتاب

تم کہ
اک بند کتاب
پڑھ نہیں سکتا
جسے میں
دوبارہ
کر سکتا ہوں محسوس
چھو کر البتہ
اپنی بے خواب آنکھوں سے

ڈزی ہائٹ

چکرا دینے والی
بلندی
پتہ نہیں
کیا اس نے دیکھا
دھیرے دھیرے
اُتر رہا ہے
کالا بادل چھتری تھامے

روز و شب

لیس کیل کانٹوں سے
رسّی تھامے سانسوں کی
نپے تلے قدم جماتا
سر کرتا ہوں
برف کی چوٹی

دن،
مجھے مہیب پہاڑ پر لے جاتا ہے
رات،
تحت الثریٰ میں

DIZZY HEIGHT ؎

مصحف اقبال توصیفی

چاہیے عرشِ بریں بھی اس کو
یاد آتی ہے زمیں بھی سر کو

لے گئے میرا نشانِ کفِ پا
کر دیا صرفِ جبیں بھی اس کو

ایک اک اینٹ شناسا نکلی
یاد تھے سارے مکیں بھی اس کو

دیکھنا آنکھ کی دیوار کے پاس
ڈھونڈنا دل کے قریں بھی اس کو

چھٹ گئی تیرگیٔ وہم و قیاس
اب عطا نورِ یقیں بھی اس کو

چھیڑنا بات سنبھل کر مصحف
کہنا آتا ہے نہیں بھی اس کو

○

صدیقہ شبنم

منزل کٹھن تھی اور نہ رستوں کا بوجھ تھا
تھے پاؤں شل کہ سر پہ گناہوں کا بوجھ تھا

خوابوں کے اژدہام سے کیسی تھکن ہوئی
چہرے پہ میرے اپنی ہی آنکھوں کا بوجھ تھا

پت جھڑ کی رت میں کتنا سبک سار ہے وہ پیڑ
جس کے بدن پہ دیر سے پتوں کا بوجھ تھا

یوں مطمئن ہے دل سبھی رشتوں کو توڑ کر
شانوں پہ جیسے سینکڑوں صدیوں کا بوجھ تھا

شبنم ملے نہ ہم کو تو فرصت کے رات دن
عمرِ رواں کے دوش پہ سوچوں کا بوجھ تھا

○

اسعد بدایونی

○

نہ میرے ہاتھوں میں دم ہے نہ نم ہے تو وہ خاک
سو کیسے ہوگا مجھے جسم و روح کا ادراک

یہ دھوپ ہے یہ بیاباں ہے یہ مسائل ہیں
مثالِ چوب تو سوکھے گا دیدۂ نم ناک

د۔ یدہ ؟ پیرہنی و رشتۂ بزرگاں ہے
سو آج پھر کیے دیتا ہوں میں گریباں چاک

بہت عجب ہے طبیعت اداس لوگوں کی
کبھی غبی و پریشان تو کبھی چالاک

ترے بدن پہ ہیں اب تک گناہ کے ذرّے
میں رو چکا ہوں مری روح ہو گئی ہے پاک

نہ لوگ مصر کی اک داستاں کو دہرائیں
اسی لیے نہیں کرتا تمھارا دامن چاک

○

طلسم خانۂ موجود وما ورا کی طرح
میں اپنے آپ میں تنہا رہا خدا کی طرح

یہاں بھی جنگ و شہادت ہیں میرے حصے میں
مگر یہ دشت نہیں دشتِ کربلا کی طرح

گزرنے والے جہازوں نے راستہ بدلا
جزیرہ ڈوب گیا نقطۂ ضیا کی طرح

وہ ایک لمحہ مگر دسترس میں کب آیا
خیال آ کے چلا بھی گیا ہوا کی طرح

تو کیوں قبول کیے جائیں بارگاہوں میں
لبوں سے لفظ نکلتے نہیں دعا کی طرح

احمد ندیم قاسمی

ایک یک لباس آدمی

تھرڈ ورلڈ ریستوران کی لمبی چوڑی کھڑکیوں میں لمبے چوڑے شیشے نصب تھے۔ ریستوان کے اندر بیٹھے ہوئے بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ریستوران کے باہر بیٹھے ہیں۔ یہاں دوسرے ریستورانوں کے مقابلے میں ایک عجیب فراخی کا احساس ہوتا تھا۔ سڑک کا سارا منظر سامنے تھا۔ دوہری کھلی سڑک پر سے گزرتا ہوا ٹریفک، چوڑے فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے ہر عمر کے لوگ، کاروں میں سے اترتے ہوئے مرد اور عورتیں اور بچے، ہر کار کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہر صنف کے بھکاری، بجلی کی رفتار سے موٹر سائیکل چلانے والے نوجوان جنھوں نے گردنوں پر اتنے بال جمع کر رکھے تھے کہ عقب سے لڑکیاں معلوم ہوتے تھے ــــ غرض سبھی کچھ نظر آتا تھا۔

ریستوران کی آخری کھڑکی کے پاس بیٹھنا میرا معمول تھا۔ چند شامیں مسلسل بیٹھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تھا کہ بیرونی منظر کے چند کردار ایسے بھی ہیں جو مجھے ہر روز، ایک ہی قسم کے معمول پر کاربند دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ نیلی نیکر والا لڑکا تھا جو بلا ناغہ، دونوں ہاتھوں میں پانی سے چھلکتی بالٹیاں لٹکائے، میرے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ وہ مجھے بالٹیوں کے بغیر کبھی نظر نہیں آیا، جیسے بعض لوگ چاندی کے ان چمچوں کے بغیر نظر نہیں آتے جو وہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک بوڑھا کنگھیاں بیچنے والا تھا جو کنگھی کم بیچتا تھا اور بھیک زیادہ مانگتا تھا۔ بھیک مانگتے مانگتے اس کی باچھیں مستقل طور پر لٹک پڑی تھیں اور انھوں نے اس کی ٹھوڑی کو جیسے قوسین میں لے لیا تھا۔ ایک روز اس نے ایک گنجے بزرگ کو، جو کار میں سے اتر رہے تھے، ان کی خواتین کے سامنے کنگھی خریدنے کو کہا تو وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ میں لپک کر باہر گیا اور بوڑھے کو ان کی زد سے کہہ کر بچایا کہ کنگھی بیچنا اس کی عادت ہے چناں چہ وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا، بس کنگھی پیش کر دیتا ہے۔

تیسرے مستقل کردار نے مجھے یوں متوجہ کیا کہ وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی لباس میں نظر آیا۔ عجیب عجیب تصویروں والی پتلون کے اوپر چوڑی چوڑی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بش شرٹ میں ہر روز اس خیال سے اس کا منتظر رہتا تھا کہ ممکن ہے آج اس نے لباس بدل رکھا ہو، مگر وہ ہر روز اسی لباس میں وارد ہوتا۔ جی چاہتی اس سے پوچھوں کہ کیا تمھارے پاس کوئی اور پتلون، کوئی اور بش شرٹ نہیں ہے؟ یا چلو شلوار قمیص سہی، دھوتی کرتا سہی ــــ مگر اس کے تیور ایسے گمبھیر اور بھرپور تھے اور وہ اتنا بہت سا سنجیدہ نظر آتا تھا کہ میں اس سے اس کی یک لباسی کا سبب نہ پوچھ سکا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں ریستوران کی کھڑکی کے پاس کرسی پر یوں ہی بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس یک لباس شخص کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کی راہ تکتے تکتے میں پریشان ہو جاتا اور چائے میرے سامنے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی۔ پھر میں اپنا تجزیہ کرنے لگتا کہ آخر میرا اس کا رشتہ ہی کیا ہے۔ وہ ایک معمولی درجے کا مزدور ہے۔ وہ دکان کے سامنے، فٹ پاتھ کے حاشیے پر رکنے والی ہر موٹر کار سے مشروبات کا آرڈر لیتا ہے اور انھیں بوتلیں تھما کر ان کے خالی ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ پھر جب وہ خالی بوتلیں سمیٹتا ہے اور ان کے دام وصول کرتا ہے تو ایک دو روپے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے کہ یہ شاید وہ بخشش ہوتی ہے جسے مہذب زبان میں ٹپ کہتے ہیں۔ کئی بار یوں بھی ہوا ہے کہ رقم وصول کرنے کے بعد کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف نہیں بڑھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ٹپ کی رقم نہیں ملی۔ تب وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سکتے میں گزارہ جاتا ہے اور پیچھے ہٹتی اور پھر تیزی سے مڑ کر غائب ہوتی کار کی طرف یوں دیکھتا رہ جاتا ہے جیسے وہ ابھی پلٹ کر آئے گی اور اسے اس کا حق ادا کر جائے گی۔ مگر پھر وہ دکان پر جا کر خالی بوتلیں اور ان کے دام مالک کے حوالے کرنے کے لیے فٹ پاتھ کی چوڑائی طے کر جاتا ہے۔

۴۱

کھڑکی میں سے جب بھی کسی کار کو اس طرف کا رخ کرتے دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ وہ پان سگریٹ اور مشروبات کی اسی دکان کے سامنے رکے جہاں یہ سرخ اور نیلی دھاریوں والی بش شرٹ میں ملبوس شخص مزدوری کرتا ہے۔ اور جب کوئی کار وہاں رکے بغیر آگے نکل جاتی تو مجھے یوں کوفت محسوس ہوتی جیسے خود میری حق تلفی ہوگئی ہے۔ اس شخص کے ساتھ میں نے جو تعلق خاطر پیدا کرلیا تھا وہ ایک طرح کی رشتہ داری میں بدلا جارہا تھا۔ بظاہر عجیب سی بات ہے کہ ایک ریستوران کی کھڑکی سے جو شخص مجھے عموماً نظر آتا ہے، اس کے ساتھ اتنی قربت پیدا ہوجانے مگر یہ قربت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مجھے کئی باریوں بھی لگا کہ مشروبات کی بوتلیں گاہکوں کو دیتے یا واپس لیتے وقت، وہ ایک نظر مجھ پر بھی ڈال لیتا ہے مگر پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ اس رخ پر تو ریستوران کی آٹھ کھڑکیاں ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا ہو۔

ایک روز میں ریستوران میں پورے دو گھنٹے بیٹھا اس کے دکھائی دینے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ دکھائی نہ دیا۔ جو کاریں فٹ پاتھ کے حاشیے کے پاس رکتی تھیں، ان سے ایک ٹھنگنا سا نوجوان آرڈر لے رہا تھا۔ میں سارا وقت بے چین رہا کہ آخر وہ یک لباس شخص کہاں گیا۔ میں جب ریستوران سے نکلا تو سیدھا مشروبات کی اس دکان پر پہنچا اور اس نوجوان سے پوچھا۔ ”یہاں جو شخص روزانہ کام پر آتا تھا وہ جس کی جگہ آج تم کام کررہے ہو، وہ کیوں نہیں آیا؟“

نوجوان بولا۔ ”آپ چاچا کریم بخش کا پوچھ رہے ہیں نا؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے نام معلوم نہیں۔ وہ جو ہمیشہ بڑی بڑی لال اور نیلی دھاریوں والی بش شرٹ پہنتا ہے۔

نوجوان بولا۔ ”جی ہاں۔ چاچا کریم بخش۔ کبھی کبھی اسے کوئی ضروری کام پڑجانے یا وہ بیمار ہوجانے تو نہیں آتا۔ آج بھی کوئی ایسی ہی بات ہوگی ورنہ یہی تو چاچے کا روزگار ہے۔“

جی چاہا کریم بخش کا اتا پتا پوچھوں، مگر نوجوان رکی ہوئی ایک کار کی طرف بڑھ گیا اور میں گھر چلا آیا۔

وہ رات میں نے خاصی پریشانی میں گزاری، جیسے میری زندگی کے معمول میں ایک غیر معمولی رخنہ پڑگیا ہو۔ میں نے طے کرلیا کہ کل مشروبات کی دکان کے مالک سے کریم بخش کے بارے میں تفصیل معلوم کروں گا اور اس کے گھر جاکر اس کے کسی کام آنے کی کوشش کروں گا۔ مگر دوسرے روز ابھی میں ریستوران میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک کار کے پاس کھڑا، خالی بوتلیں سمیٹتا اور بل وصول کرتا نظر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور ریستوران کے اندر، کھڑکی کے شیشے میں سے کریم بخش کو اپنے روزانہ کے کام میں معروف دیکھتا رہا۔ ایک دو بار اس نے جیسے میری طرف بھی دیکھا، مگر میرے قریب والی کھڑکی کے پاس بھی تو لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ممکن ہے کہ کریم بخش نے انھیں دیکھا ہو جب کہ ان میں دو ایسی چنک دار سی لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کی طرف پارسا سے پارسا آدمی کی نظریں بھی بے ساختہ اٹھ جاتی ہیں۔

دوسرے روز صبح صبح ہی مجھے راولپنڈی سے فون پر اطلاع ملی کہ اباجی کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں منتقل کردیے گئے ہیں۔ میں نے فوراً راولپنڈی کا رخ کیا اور اباجی کی دیکھ بھال اور پھر ان کی صحت کی بحالی کے انتظار میں مجھے وہاں ڈیڑھ پونے دو ماہ رکنا پڑا۔

واپس آتے ہی شام کو میں تھرڈ ورلڈ ریستوران کی راہ لی۔ میری خاص کھڑکی کے پاس ایک صاحب اور ایک خاتون چائے پینے کے بعد بل ادا کررہے تھے۔ میں ریستوران کے اندر چلا گیا مجھے دیکھتے ہی کاؤنٹر کے پاس بیٹھا منیجر اٹھا، مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ”ہم تو پریشان ہوگئے تھے کہ صاحب کہاں گئے سب کو تشویش تھی مگر یہ باہر پان سگریٹ اور مشروبات کی دکان پر کام کرنے والا چاچا کریم بخش ہے نا، اس نے تو آپ کے بارے میں پوچھ پوچھ کر جان عذاب میں کردی۔ نہ جانے اسے آپ سے کیا کام ہے۔

”باہر ملاقات ہوئی آپ سے؟“

میں نے کہا۔ ”وہاں تو وہ مجھے نظر نہیں آیا۔“

منیجر بولا [illegible]

جب تک میری نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب بل ادا کرنے کے بعد اٹھتے، میں سوچتا رہا کہ اسے مجھ سے ایسا کون سا ضروری کام ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے کوئی سفارش درکار ہو۔ شاید اسے اپنا لباس بدلنے کی سوجھی ہو اور اس سلسلے میں اسے کچھ رقم کی ضرورت ہو۔ شاید وہ کسی بہتر روزگار کا متمنی ہو اور اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کر رکھی ہوں۔

نشست کے خالی ہوتے ہی میں کرسی پر جا بیٹھا اور باہر نظر ڈالی تو وہی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بش شرٹ پہنے کریم بخش ایک کار والوں سے خالی بوتلیں اور ان کے دام لے کر پلٹا۔ پلٹتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ دونوں ہاتھوں میں تھامی ہوئی بوتلوں سمیت کھڑکی کی طرف یوں لپکا جیسے شیشہ توڑ کر اندر چلا آئے گا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر، دریا میں آنے والے سیلاب کی طرح،۔ اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے ارادہ بدلا، پلٹا اور زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر اسی ہمہ جہت مسکراہٹ کے ساتھ ریستوران کے اندر آکر میری طرف تپاک سے بڑھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے قریب آکر مصافحے کا وقفہ بھی برداشت نہیں کیا اور بولا۔۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے صاحب جی؟ آپ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئے تھے؟ کوئی ضروری سفر کرنا پڑ گیا تھا؟ کیا ہوا تھا صاحب جی؟ آپ کو کیا ہوا تھا؟“ سارے چہرے پر آئے ہوئے مسکراہٹ کے سیلاب کے باوجود اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔۔۔ ”میں نے تو ان دنوں جب بھی یہاں آپ کی کرسی پر کسی اور کو بیٹھے دیکھا تو جی چاہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا جی چاہا صاحب جی، کہ اس سے کہوں کہ آپ ہوتے کون ہیں یہاں بیٹھنے والے؟ یہاں تو صرف ہمارے صاحب جی بیٹھتے ہیں۔ صاحب جی آپ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ ٹھیک ٹھاک ہیں نا آپ؟“ میں سوچ رہا تھا کہ اس اپنائیت اور محبت کی تمہید کے بعد کریم بخش مجھے وہ کام بتانے گا جس کے لیے اسے میرا اتنی شدت سے انتظار تھا، مگر وہ بولا۔۔۔۔ ”یہاں آدمی تو دن میں سینکڑوں ملتے ہیں صاحب جی، پر پیار سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے اس کھڑکی میں سے ہی دکھائی دیتی تھیں۔۔۔ اور آج کل کون کسی سے پیار کرتا ہے صاحب جی!“

OoO

(سلسلہ ص ۲۵۱)

پوچھتا۔ ان کے لیے کوئی غلغلہ برپا نہیں ہوتا۔ دکن کی تحقیق کرنے والا ایک علاقائی قلم کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اردو ادب کا محسن ہے لیکن قاری اسے آثار قدیمہ کی گرہ میں باندھ دیتے ہیں۔ دکنی سے متعلق تحریر صرف وہی پڑھتے ہیں جو اس موضوع پر لکھتے رہتے ہیں۔ علم کی خاطر نسیم الدین کو یہ قربانی دینی ہی پڑے گی یعنی بے شہرتی کے حجرے میں قیام کرنا ہو گا۔ بے چاری دکنی اور بے چارے دکنی محققین۔

-- o O o--

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی
شکاگو (امریکہ)

مہر

شکاگو کی تاریخ میں ایسی شدید برف باری شاید کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس دن صبح ہی سے چھوٹے موٹے گالے اٹکھیلیاں کرتے اور ہچکولے کھاتے ہوئے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ جب میں آفس جا رہا تھا تو اس وقت چند باہمت گالے اڑتے ہوئے آئے اور ونڈ اسکرین پر بیٹھ گئے۔ وائپر چلا کر میں انھیں موت سے ہم کنار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ موسم خاصا معتدل تھا۔ وہ خود ہی پگھل پگھل کر اپنے جراءت آمیز سفر کی بھینٹ چڑھ جاتے لیکن میں نے دیکھا کہ وہ گالے کافی دیر تک وہاں بیٹھ کر مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"تو کہو دوستو! درجۂ حرارت کہیں نقطۂ انجماد کے نیچے تو نہیں پہنچ گیا۔"

"ہاں" ایک گالے نے چیخ کر کہا اور کھانسی کر دم توڑ دیا۔ میں نے کہا۔ "کیوں چیخ کر برباد ہونے جا رہے ہو۔ ایسے موسم میں برف باری کم ہی ہوتی ہے۔ تم کیسے ادھر نکل پڑے۔ وہ شاید جواب دینا چاہتے تھے پر منہ کھولتے ہی ان کا ننھا سا وجود آنسو بن کر ڈھل گیا۔ اس وقت کار کے ریڈیو سے موسم کا حال نشر ہونے لگا۔ اچھا ہوا ورنہ یہ سفید شیاطین مجھے کافی دیر تک بے وقوف بناتے رہتے۔ "درجۂ حرارت ۲۹ یعنی نقطۂ انجماد سے ۳ درجے نیچے۔ دوپہر تک ۳۵ یا ۳۶ ہو جائے گا۔ جنوب مشرق سے تیز ہوائیں گلف آف میکسیکو سے رطوبت لیے ہوئے ادھر آئیں گی۔ اگلے ۲۴ گھنٹوں میں ۱۲ سے ۱۵ انچ برف باری کا اندیشہ ہے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

۱۱ بجے کے قریب روڈوے کمپنی کے سیلز مین آگئے اور میں کام ختم کر کے لنچ کے لیے نکل گیا۔ جب ہم رسٹوران سے نکل رہے تھے تو کوئی ایک بجا ہوگا لیکن ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ کالے کالے گھنے بادل گھر آئے تھے اور برف تیزی سے گر رہی تھی۔ آسمان سے زمین تک صرف سفید دھاریاں ہی دھاریاں دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے جیری سے کہا۔

"جلدی نکل چلو جیری! ورنہ ہم اس برف میں پھنس جائیں گے۔"

آفس پہنچ کر میں نے گھر فون کر دیا اور شازاں سے کہا کہ وہ اسکول جائے اور مہ پارہ کو فوری گھر لے آئے۔ اس کے بعد چند ضروری کام کر کے میں بھی ۳ بجے کے قریب آفس سے نکل گیا لیکن گھر پہنچنے تک ۶ بج چکے تھے جب کہ عام حالت میں آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ ڈنر ٹیبل سجا ہوا ہے۔ اور کچن سے شازاں کے زور زور سے احکامات صادر کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کپڑے تبدیل کر کے ڈنر کے لیے تیار ہو گیا۔ جب ہم ٹیبل پر بیٹھ رہے تھے تو اس وقت شازاں نے کہا کہ کھانا ذرا جلد کھا لیا جائے کیوں کہ اسے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ میں نے کہا:

"پہلے ہی کیوں نہیں بتایا۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔"

"ٹھیک ہے کھانے کے بعد پھر بدل لینا۔ کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

جب شازاں کو کسی کام سے باہر جانا ہو تو پھر سمجھ لو کہ باہر جانا لازمی ہے۔ برف باری ہو رہی ہو یا طوفان آنے والا ہو۔

لہٰذا بحث میں الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں اطمینان سے ڈنر ٹیبل پر جم گیا۔ ڈنر کے بعد شازاں نے جو بات بتائی اسے سن کر مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی کہ شازاں کے تعلق سے میں ہر وقت غلط بات ہی کیوں سوچتا ہوں لیکن شرمندگی کا اظہار کر کے اس کو سر پر چڑھالیا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لہٰذا شرمندگی کے باوجود میں نے ذرا غصے سے کہا:

"تم نے ڈنر سے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کھانے پر اتنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ فوری چلے چلتے۔"

شازاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ میں غصے کا اظہار کیوں کر رہا ہوں۔ اسے معلوم ہے میں ڈنر سے پہلے چاہے کام کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو باہر نہیں نکلتا۔ خیر۔ تو شازاں نے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں کپڑے بدلنے جا رہی ہوں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔ اب دیر کرنے کا کوئی بہانہ باقی نہیں ہے۔"

یہ سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اس وقت تک میرا دماغ شازاں کی بتائی ہوئی بات میں الجھ پڑا تھا۔ یہ خبر میرے اعصاب پر بجلی بن کر گرنی چاہیے تھی اور گری۔ ایک لمحے کے لیے زلزلے کی سی کیفیت رہی۔ اور پھر جسم و جان کا رشتہ منقطع ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ دماغ نے شاید لمحات طیش کے عالم میں وقتی بغاوت کر ڈالی تھی۔ اگر بغاوت مکمل ہو تو کیا ہوتا۔ وہی جو خلیق کے ساتھ ہوا ہو گا۔ خلیق پر یہ تیسرا حملہ تھا۔ جب پہلا حملہ ہوا تھا تو ڈاکٹروں نے کچھ کر کرا کے دماغ کو وہیں روک دیا تھا۔ دوسرے حملے کے بعد بھی ڈاکٹروں نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ لیکن اب تیسری بار خلیق کا جو حشر ہونا تھا وہ تو ہوا ہو گا لیکن۔ مہر۔ پتہ نہیں اب وہ کس حال میں ہے۔ کہتے ہیں محبت کا بت جب دل میں بیٹھ جائے تو پھر وہاں کسی اور بت کے لیے جگہ نہیں ہوتا۔ چناں چہ مہر کی ساری زندگی ایک ہی محور پر گھومتی رہی۔ شوہر نے ہجرت کی ٹھانی تو اس نے نہ چاہنے کے باوجود دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بوڑھے باپ کو الوداع کہا اور وطن چھوڑ دیا۔ اجنبی سرزمین پر گھر بسانے میں پوری طرح خلیق کا ساتھ دیا۔ تنگی کے کٹھن ایام میں اور خوش حالی کی خوش گوار گھڑیوں میں۔ اور اب بیچ راستے چلتے چلتے پاؤں کٹ گئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا قدرت اتنی بے رحم ہو سکتی ہے۔ اتنی اندھی کہ بے ضرر اور معصوم انسانوں کو ہی آزمائش میں ڈالے۔ لیکن اس بھٹی سے گزر کر انسان کیا سے کیا بن جاتا ہے اس کا عرفان بہت ہی کم لوگوں کو ہو سکتا ہے۔

خلیق کے لیے کٹھن اور مہر کے لیے آزمائش کا دور امریکہ آتے ہی شروع ہو گیا۔ شادی کے چار سال بعد اس نے مجھے لکھا تھا کہ وہ اس کی بیگم اور دو جڑواں بچے امریکہ آنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں نے خط شازاں کو دکھایا تھا اور کہا تھا کہ دیکھو تو ان بچوں نے اس خط پر دستخط ہی نہیں کیے ہیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ بھی خلیق کے ہم خیال ہوں گے! قہقہہ لگانے کے بجائے شازاں نے غصے سے میری طرف دیکھا تھا۔ بعض خوب صورت بلیات ہنسنے ہنسانے کے معاملے میں بہت ہی کنجوس ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ ایسے موقعوں پر غصیلی آنکھوں کی آنچ سے سینے کے اندر والے کو جلا کر بھسم کر ڈالتی ہیں لیکن اس وقت مجھے سینے کے اندر والے کی فکر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کڑک کر شازاں کو حکم دیا تھا کہ وہ ٹیلیفون کر کے اسپانسرشپ کے کاغذات منگوا لے تاکہ خلیق کے لیے کچھ کیا جا سکے۔ میں نے کیا چکر چلایا ہو گا۔ اب ان تفصیلات میں جانے سے کیا فائدہ یا پھر وہ کوئی راز کی بات ہو جو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ میاں خلیق سلمہ، اپنی بیگم مہر اور دو ننھوں کے ساتھ ایک سال کے اندر امریکہ پہنچ گئے۔ ۷۰ء کے ابتدائی سالوں میں ویزا تو آسانی سے مل گیا لیکن امریکہ کی معاشی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ خصوصاً انجینیرنگ اور پبلک ہیلتھ میں نئے لوگوں کو نوکری ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ خلیق کو ایک ریل اسٹیٹ (Real Estate) یعنی مکانات فروخت کرنے والی کمپنی میں آفس ورک مل گیا اور مہر نے فاسٹ فوڈ (Fast Food) ریستوران میں جز وقتی کام شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی کالج میں بھی داخلہ لے لیا تھا۔ جیسے تیسے کر کے انھوں نے پانچ سال پورے کر لیے۔ خلیق نے امریکن شہریت حاصل کر لی اور ریل اسٹیٹ کا کورس مکمل کر کے سیلز مین کا سرٹیفیکیٹ حاصل کر لیا۔ اب اس کے دن پھرنے والے تھے۔۔۔ دن پھرنے والے تھے۔۔۔ لیکن بیڈروم

سے شازاں کی دھاڑ سنائی دی اور خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔
کیا ڈنر ٹیبل پر ہی براجمان ہو؟ وہاں جلد پہنچنا بھی ہے۔۔
"جانا کہاں ہے۔ یہ تو بتایا ہی نہیں۔۔
"اور کہاں! سینٹ فرانسس ہاسپٹل۔ پہلے بھی وہیں علاج ہوا تھا نا۔۔
"ہوا ہو گا۔ مگر میں وہاں تک پہنچ ہی نہ پایا تھا کہ تم نے چیخ کر چونکا دیا۔ چلو چلتے ہیں۔ برف رک گئی ہے لیکن سڑکیں کافی خراب ہیں۔ پہلے مہر کے گھر فون کیوں نہ کر لیا جائے۔۔
"مہر گھر پر نہیں ہے۔ وہاں اس کے بوڑھے باپ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو گا۔ بچے پڑوس میں ہوں گے۔۔
"اچھا چلو! میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔ جب تک چائے بنوالو۔ ورنہ ہاسپٹل کی کڑوی کسیلی کافی پینی پڑے گی۔۔
پھر شازاں نے چیخ کر مہ پارہ کو چائے کے لیے کہا۔ میں جب کپڑے بدل کر آیا تو چائے ڈنر ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اس کو حلق میں انڈیل لیا اور حسب دستور شازاں کی پیالی ٹیبل پر ہی رکھی رہی۔ وہ بیڈ روم سے دندناتی ہوئی نکلی اور سیدھے گیراج میں پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی بھاگا۔ اور ہم دونوں ایک ساتھ کار میں داخل ہوئے پھر میں نے کار اسٹارٹ کر کے گیراج سے باہر نکال لی۔ ڈرائیو وے پر آدھا راستہ طے کر کے کار نے چلنے سے انکار کر دیا۔ گیس پیڈل کو زور سے دبایا تو پہیے آہستہ آہستہ گھومنے لگے لیکن ڈرائیو وے کے آخری سرے پر پہنچ کر پھر رک گئے۔ میں نے گیس پیڈل کو پوری طرح دبایا تو انجن غرایا اور غراتا رہا۔ پہیے آہستہ آہستہ گھومے اور سڑک پر پہنچ گئے۔ پھر گاڑی لہرا کر گھومی، گھوم کر پلٹی اور پلٹ کر اس سمت میں مڑ گئی جدھر ہمیں جانا نہیں تھا۔ یہ جان کر کہ اتنی برف میں گاڑی کو دوسری سمت میں موڑنا مشکل ہو گا میں نے گاڑی اسی سمت میں آگے بڑھالی۔ شازاں نے کہا:
"ادھر کدھر جا رہے ہو، تو میں نے طنز یہ کہا۔ "کیا اب بیگم کو بھی صحیح سمت کا اندازہ ہونے لگا ہے۔" اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی ہو۔ کیوں کہ ایسے موسم میں کار چلاتے ہوئے میری زبان الٹی تلوار کی کاٹ کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ خدا نے یہ موسم اس لیے دیا ہے کہ جب بھاگ دوڑ سے تھک جائیں اور اکتا جائیں تو پھر گھر بیٹھ رہیں۔ گرم اور آرام دہ فیملی روم میں بیٹھے بیٹھے برف باری کا نظارہ کرتے رہیں۔ چائے نوشی کریں۔ بیگم کی جلی کٹی سنتے رہیں۔ یا پھر مخملی لحاف اوڑھے نرم نرم بستروں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے سڑکوں پر مارا مارا پھرنا پڑے تو پھر زبان بیگم کی شان میں گستاخی نہ کرے تو کیا کرے۔ ایسے ہی موقعوں پر میں نے بیگم کو کئی بار کہا تھا کہ ۲۰، ۲۲ سال سے امریکہ میں رہتی آئی ہو تو یہاں کی پوری عورت کیوں نہیں بن جاتیں اور آزادی کا مزہ چکھ لیتیں۔ نوکری کی تلاش آفس کے چکر بڑے بڑے بریف کیس، گھومنے والی کرسیاں، کڑوی کسیلی کافی کے کپ کے کپ، دھکا پیل بس یا ٹرین۔ دروازوں پر مسٹنڈے جوان راستہ روکے کھڑے ہوں تو ان کے بیچ رگڑے کھاتی ہوئی گھس پڑو اور جب جسم پر چیونٹیوں کے کاٹنے والی جلن کا احساس ہو تو کولڈ کریم کی مالش سے ٹھنڈک حاصل کرو۔ بیگم بھی چپ رہنے والی نہیں تھیں۔ کہا تھا، لبرٹ ہونا ہماری پہچان کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر کوئی حریم ذات سے در آنے اور دانت نکال کر کہے۔ یو آر سو اٹریکٹو ہنی (You are so attractive Honey) اور پھر یہی جملہ دوسری کے منہ پر بھی اچھال دے۔ اس وقت بات گمبھیر ہو گئی تھی۔ اس لیے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن اس وقت یہ گاڑی آگے تو بڑھ رہی تھی لیکن کافی گمبھیر ہو کر جھومتی، بل کھاتی اور پھسلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سینٹ فرانسس ہاسپٹل قریب آ رہا تھا جہاں خلیق موت سے دو دو ہاتھ کر رہا ہو گا اور مہر کی کیا حالت ہو گی۔ ان معصوموں کی کیا حالت ہو گی جنھوں نے امریکہ آنے کے لیے کسی بھی خط پر دستخط نہیں کیے تھے۔ مکانوں کے کاروبار میں خلیق کی مالی حالت بہت تیزی سے ٹھیک ہوئی تھی۔ دو سال کے اندر اندر اس نے ایک ایسا مکان لے لیا۔ ایسا مکان جس کا میں ۲۰، ۲۲ سال کی معقول نوکری کے بعد بھی تصور تک نہیں کر سکا تھا۔ مہر نے بھی

ڈی میں داخلہ لے لیا اور اپنے پسندیدہ مضمون سیکالوجی میں تھیسس لکھنا شروع کر دیا۔ تب اس نے اپنے باپ کو لائل پور سے بلوالیا۔ ۹۰ سال کی عمر میں وہ وہاں اکیلے رہ گئے تھے۔ ۹۰ سال ہونے کے بعد آدمی اکیلا ہی ہو جاتا ہے۔ ساتھ دینے والے ایک ایک کر کے جاچکے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کو مالک سے ملاپ کی تمنا تیزی سے بھگانے لے جاتی ہے۔ کچھ لوگ ملاپ کی گھڑی کو ٹالتے رہتے ہیں۔ مہر کے والد بھی کچھ ایسے ہی انسان تھے۔ مالک نے انھیں کئی بار وارننگ دی۔ ایک ایک کر کے کئی صلاحیتیں چھین لیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے نور آنکھوں سے ہر شئے کو تکتے رہتے یا پھر بار بار کھلتی اور بند ہوتی ہوئی پلکوں کی پروا کیے بغیر کسی انجانے وجود سے باتیں کرتے رہتے۔ تو مہر نے والد کو اس حالت میں لائل پور میں اکیلا چھوڑنے کے بجائے امریکہ بلوالیا اور جمیل و شکیل کو گھر بیٹھے بیٹھے ایک اچھا ساتھی مل گیا۔

پھر ایک دن جو نہ ہونا تھا وہ ہوا۔ اسی چھونے سے خاندان کی پر سکون زندگی میں ایک طوفان آگیا۔ دو سال پہلے خلیق کو پہلا اسٹروک ہوا۔ وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ پھر 9 مہینے بعد دوسرا حملہ ہوا اور وہ اپاہج ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ اب گھر میں دو اپاہج، ۷، ۷ سال کے دو نونہال اور ایک پی ایچ۔ ڈی کی طالبہ۔ پردیس میں اس سے بڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے۔ مہر نے سب سے پہلے گھر ٹھکانے لگا کر قرضے سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کو لپیٹ کر طاق میں رکھ دیا اور ایک مقامی کالج میں نوکری کر لی۔ پھر اس کے اندر کی تخلیقی آگ بھڑک اٹھی اس نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری شروع کر دی۔ ایک سال کے اندر انگریزی نظمیں کتابی صورت میں چھپ کر آگئیں۔ مشرقی دل و دماغ نے مغرب کو اچھی طرح دیکھا اور محسوس کیا۔ یہ پرچھائیاں جمالیات کے حصار سے نکل کر لاشعور میں دبی ہوئی آتش شوق کی بھٹی سے گزریں تو سانس لینے والے زندہ اجسام کی صورت نظموں کے قالب میں ڈھل گئیں۔ مغرب کا مادیت میں ڈوبا ہوا ذہن چونک پڑا۔ امریکن لٹریری سرکل نے کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت جلد دوسرا ایڈیشن چھپ گیا۔ جو احساسات مہر کی شاعری میں الجھے وہ خود اس کا عملی نمونہ بھی تھی۔ امریکہ میں کئی ویلفیر ادارے مہر کے والد کو سہارا دے سکتے تھے اور خود خلیق کے لیے اچھے سے اچھا نرسنگ ہوم موجود تھا۔ ہر دو اپاہجوں کو ان کے صحیح مقام پر پہنچا کر اپنے جوان بازوؤں سے نئی پود کو سہارا دیتی ہوئی سکون سے زندگی گزار سکتی تھی۔ خود مہر کے سہارے کے لیے کئی ہاتھ بڑھ سکتے تھے۔ امریکہ میں یہی تو ہوتا ہے۔ ذات کو بے مقصد جان جوکھم میں ڈالنا۔ بدن کی تمناؤں کا گلا گھونٹنا یہاں قربانی نہیں، نادانی کی علامت تصور کیا جاتا ہے محرومیت کے کرب کو روحانی نشاط کا ذریعہ بنانا غیر متوازن شخصیت کا غیر فطری عمل سمجھا جاتا ہے۔ تو مہر نے یہ قوت کہاں سے حاصل کی۔ غم ذات اور محرومیت کے کرب کو روحانی نشاط کا ذریعہ بنانے کا تصور کب اور کیسے جنم لیتا ہے۔ کیا یہ داعیہ انسان کے اندر موجود ہے جس کو مشینی زندگی اور مادی آسائش کی تمنا نے گلا گھونٹ کر ختم کر دیا ہو۔ یا پھر یہ کوئی مصنوعی خول ہے جو ذات اپنے اوپر چڑھا لیتی ہے کہ اس کی چمک دمک سے ہم جنسوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اور انھیں اپنی خود نمائی کے سہارے اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو چھپا لے۔ لیکن مہر کے نہاں خانۂ دل کے آتش کدے سے بلند ہونے والے شرارے دوسرے تصور کو جھٹلاتے ہیں۔ مہر نے مہر کے اشعار کہے ہیں۔ میں شعر کو اس کی اصلی شکل میں یاد نہیں رکھ سکتا۔ ایسے اشعار جنھیں میں یاد رکھنا چاہتا ہوں انھیں نثری قالب میں ڈھال لیتا ہوں اور گنگناتا رہتا ہوں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو شاعر کی ذات درمیان سے نکل جاتی ہے اور تخلیق خود اپنی محسوس ہوتی ہے جس میں حسب ضرورت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مہر کے چند اشعار جو میں اکثر گنگناتا ہوں یوں ہیں۔

-- جب بستیاں جل جاتی ہیں، جھلسے ہوئے ملبے سے نئے مسکن نہیں بنتے۔ جب جنگل جل جاتے ہیں تو اداس پیڑوں کی کوکھ سے نئی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔

-- بہکتے بدن کی مانگ بڑی جان لیوا ہے۔ پورے چاند کی رات ڈھلے جب مد کی اٹھان میں سانس ڈوبنے لگتی ہے تو کیا حذر کا سکوں اسے واپس لا سکتا ہے۔

۔۔ خواہشات کے جلو میں مصائب اور مصائب کے ساتھ مایوسی در آتی ہے۔ ان لمحات میں رگ جاں کے قریب کی دھڑکن کو سنو تو پھر آتش تخلیق نہال کر دے گی۔ جب سارا وجود تپ کر کندن بن جائے تو پھر مٹی کا کھلونا ٹوٹنے نہیں پاتا۔
۔۔ غم جاناں کو آواز دے دے کر میں تھک بھی گیا۔ غم دنیا اور غم ذات کی ایذا رسانی تو کم نہ ہوئی پر بے التفاتی کے زخم سے نہاں خانہ دل چمک اٹھا۔ اس قندیل کو روشن رکھو تو تاریکی میں دم نہیں گھٹے گا۔

میں یہاں تک ہی سوچ پایا تھا کہ گاڑی سینٹ فرانسس ہاسپٹل کے کمپاونڈ میں داخل ہونے لگی۔ پورا پارکنگ لاٹ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ جیسے تیسے گاڑی پارک کر کے ہم لوگ بھاگے بھاگے اندر پہنچے، جمیل اور شکیل لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر فوری ہماری طرف دوڑے۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میں نے انھیں قریب لے لیا اور اکڑوں بیٹھ کر دونوں کو سینے سے لگالیا۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔ میں نے کہا:

"صبر کرو میرے بچو! اب ٹھیک ہو جائے گا۔ بتاؤ تمہاری امی اور ابو کہاں ہیں۔۔
"ابھی تک ایمرجنسی روم میں ہیں۔ امی ابھی ابھی یہیں تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہاں گئی ہیں۔۔
گھر میں تمہارے نانا اکیلے ہوں گے نا۔۔
"نہیں! آنٹی مہ جبیں اور انکل فاروق وہاں ہیں۔۔
"اچھا! تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں تمہاری امی سے بات کر کے واپس آتا ہوں۔۔

پھر ہم لوگ ایمرجنسی روم کی طرف چل پڑے۔ ویٹنگ روم میں مہر خاموش بیٹھی ہوئی کسی انجانے نقطے کو تک رہی تھی۔ ہمارے داخل ہونے پر بھی اس نے پلٹ کر ہماری طرف نہیں دیکھا۔ شازاں اس کے قریب پہنچ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ کوئی آیا ہے۔ گردن اٹھا کر اس نے شازاں کو دیکھا۔ میں شازاں کے بالکل پیچھے تھا۔ ان آنکھوں میں کوئی تڑپ، بے چینی یا امید کی کوئی روشنی نہیں تھی۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ زندہ اور بے نور آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایسی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی۔ تب ہی لوگ دم نکلنے کے بعد سب سے پہلے مرنے والے کی آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا لمحہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اسی طوالت کو ختم کرنے کے لیے میں نے زبان کھولی۔

"کیا خلیق ابھی تک ایمرجنسی روم میں ہے مہر۔۔
مہر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور گڑبڑا ہو گئی۔ میری بات کے جواب میں شازاں نے کہا:
"تم اندر آجاؤ آفاق! اور ڈاکٹر سے بات کر کے خود پتہ کر لو۔۔

دروازہ کھول کر میں ایمرجنسی روم میں داخل ہوا۔ سامنے ہی ڈاکٹر اسمتھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر فوری میری طرف آئے اور کہا:۔

"بہت خراب کیس ہے آفاق، بہت ہی خراب بیری اینوریزم (Berry Aneurysm)!
اور وہ کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ فوری سرجری کرنا پڑے گا۔ ورنہ قصہ ختم سمجھو!"
"ابھی تک یہ ایمرجنسی روم میں کیوں ہے ڈاکٹر۔۔
"بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔ ہم اسے کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ڈاکٹر ایڈمسن (Adamson) کا انتظار ہے۔ جیسے ہی بلڈ پریشر کم ہو جائے سرجری کرنا پڑے گا۔۔
"اور اگر سرجری نہ ہو تو کیا ہو گا؟"
"اگر اینوریزم پھٹ گیا تو۔ یوں۔۔ اسمتھ نے چٹکی بجائی۔ قصہ ختم سمجھو۔۔

پھر مہر کیا کہتی ہے۔۔

" مہر! وہ نذر فل گرل۔ کہتی ہے کسی بھی قیمت پر بچالو۔ تم سمجھتے ہو نا یہ تیسرا حملہ ہے۔ اگر سرجری کر دی جائے تو بھی کیا بچے گا۔ صرف بات چیت۔ باقی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔۔

" اب آگے کچھ مت کہو ڈاکٹر۔ اگر مہر کہتی ہے بچالو۔ تو پھر بچالو۔ وہ تو آواز کے سہارے ہی زندہ تھی اور زندہ رہے گی"

ٹھیک ہے آفاق! میں مشرق میں ۱۰ سال رہ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم لوگ اندر سے کیسے ہوتے ہو۔ ہم کوشش کریں گے لیکن اب تم لوگ جاؤ۔ ڈاکٹر ایڈمسن کے آتے ہی ہم اسے سرجیکل وارڈ میں لے جائیں گے۔۔

" کیا میں اسے ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟"

" جاؤ وہاں اس کمرے میں۔ مگر میں کہتا ہوں نہ دیکھو تو اچھا ہے۔ کچھ نظر نہیں آئے گا۔

واقعی وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ خلیق کا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا اور چہرے پر آکسیجن ماسک تھا۔ ایک ہاتھ جو نکلا ہوا تھا اس میں پلاسٹک ٹیوب سے جڑی ہوئی دو سوئیاں دھنسی ہوئی تھیں اور ٹیوب کا دوسرا سرا اوپر سے لگا ہوا تھا۔ سب دیکھ کر میں ویٹنگ روم میں واپس آیا تو اس وقت تک مہر اور شازاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

" کیا دیکھ آئے آفاق بھائی۔۔ مہر کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

" ہاں مہر۔ مگر ڈاکٹر بہت ہوپ فل ہیں۔۔

" اب سب کچھ ڈاکٹر ایڈمسن کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ دماغی آپریشن کا ماہر ہے۔۔

" ہاں! ساری دنیا میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔۔

" آفاق بھائی! ڈنکا بجنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر کیس کی اپنی خود ایک قسمت ہوتی ہے۔۔

" وہ تو ٹھیک ہے مہر! مگر اب بحث سے کیا فائدہ۔ اب تم یہاں سے چلو۔ پہلے بچوں کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔ شازاں ان کے ساتھ رہے گی پھر ہم سرجری کے وقت تک یہاں پہنچ جائیں گے۔۔

مہر ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور لابی سے بچوں کو لے کر ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں ایک دوسرا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ نانا جان کسی وجہ سے وھیل چیر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چند قدم چل کر گر پڑے۔ منہ میں دانت نہیں تھے ورنہ زبان کٹ جاتی۔ صرف مسوڑے پھٹ گئے۔ فاروق کے گھر پہنچنے تک وہ فرش پر پڑے تھے اور منہ سے خون جاری تھا۔ فاروق انھیں لے کر قریب کے ہاسپٹل چلے گئے۔ مہ جبین نے فرش صاف کر کے کھانے اور چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ مہر کے گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد وہاں فاروق پہنچ گئے تھے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے فاروق کو وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ورنہ۔۔۔۔ خیر یہ سب تو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، میں نے سوال کسی کو مخاطب کیے بغیر ہی کر دیا۔" کہ نانا جان کو کرسی سے اٹھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔۔ مہ جبین نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔" اصل میں نانا جان اپنی حالت پر سخت غصہ ہو رہے تھے۔ خلیق بھائی اس کرسی پر کافی دیر تک بے ہوش پڑے رہے اور نانا جان کو پتہ ہی نہ چلا۔ اب میں کیا بتاؤں وہ وھیل چیر چھوڑ کر کچن کی طرف جا رہے تھے کہ گر پڑے۔ پتہ نہیں کیا ارادہ تھا۔

یعنی نانا جان کا ارادہ کچھ کرنے کا تھا۔۔۔۔ ارادہ کچھ کرنے کا تھا۔۔۔۔ اچھا ہوا وہ صرف دو قدم ہی چل سکے۔۔۔۔۔ ان حالات میں کون قدم جما کر چل سکتا ہے۔ تیسرے دن آفس جاتے ہوئے یہی خیال میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ زمین پر قدم جما کر چلنا کتنا مشکل کام ہے۔ آفس پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ قدم جما کر چلنے کے لیے لوگ کیسے کیسے جذبات کر دیتے ہیں۔ اب میرے باس کا ہی قصہ لے لیجئے۔ وہ کوئی ۶۸ سال کا ہے۔ صحت بہت اچھی ہے اور اس کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ وظیفے کے فنڈ میں کچھ نہیں تو ایک ملین کے اوپر رقم جمع ہوگی۔ وظیفہ اس لیے نہیں لیتا کہ جمع شدہ

سے خرچ کرنا پڑے گا۔ اس لیے ابھی تک کرسی سے چمٹا ہوا ہے۔ جب میں آفس پہنچا تو ہر طرف وحشت طاری تھی۔ ہر ایک سہما سہما سا تھا۔ معلوم ہوا کہ باس کا موڈ بہت بگڑا ہوا ہے۔ دو دن کی غیر حاضری کی وجہ سے میرے ٹیبل پر خطوط کا انبار لگ گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کو نمٹالیا اور ۹ بجے کے قریب لاونج میں جاکر بہت ساری گرم گرم کافی زہر مار کرلی اور باس سے ملاقات کے لیے خود کو تیار کرلیا۔ جب اس کے آفس میں داخل ہوا تو موصوف کا عجیب حلیہ تھا۔ قمیص ایک رنگ کی تھی تو ٹائی کچھ اوٹ پٹانگ سی اور گرہ بھی ڈھیلی ڈھالی۔ کوٹ مونڈھوں سے ڈھلا ہوا۔ یعنی کوئی جوڑ نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پچھلی رات کوئی بڑا سانحہ ہوا ہوگا ورنہ پھر یہ گھر کیوں نہیں بیٹھ رہا۔ ایک دن آرام کرلیتا تو کیا جاتا۔ اب نوکری جانے کا تو اسے غم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر چلی بھی گئی تو کیا قیامت آجائے گی۔ لوگ ۱۵، میں وظیفہ لے لیتے ہیں۔ یہ تو ۳ سال سے دوسروں کا حق مار رہا ہے۔ اس کی جگہ کوئی معقول آدمی آجاتا۔ شاید میں ہی وہاں پہنچ جاتا لیکن پیسہ۔۔۔ پیسے کی چاہت۔۔۔۔ شاید پیسے کا ہی کوئی چکر ہو۔ کل کے اسٹاک مارکیٹ میں ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہوگی۔ لہٰذا میں نے اسی تعلق سے سوال کر ڈالا۔

"سر! کل کے اسٹاک مارکیٹ میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے کیا؟"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اس اعلانیہ چوٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"یو! آفاک! تم تو ایسی بات مجھ سے مت کرو۔ اب اسٹاک مارکٹ میرا کیا بگاڑ لے گی میرا پیسہ تو منی مارکٹ اکاؤنٹ میں ہے۔۔"

"تو پھر آپ یوں پریشان کیوں ہیں سر۔ آپ کی پریشانی کو بھانپ کر سارے لوگ سہمے سہمے سے ہیں۔۔"

"رہنے دو! مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ مگر تم کہاں تھے۔ دو دنوں سے۔؟"

سر! میرے دوست خلیق کو تیسرا اسٹروک ہوا تھا۔ ڈاکٹر ایڈمسن نے سرجری کی ہے وہ بچ گیا ہے۔۔

"تو جاؤ! اس کی دیکھ بھال کرو اور چھٹی لے لو۔۔

"جاؤں گا سر! آج جلدی چلا جاؤں گا۔ من ڈے کو ایک اہم پراجکٹ شروع کیا تھا۔ آج اس کو ختم کرکے چلا جاؤں گا۔

"ہاں روڈوے کمپنی کے کام کا کیا بنا۔۔

"وہی کام تو من ڈے کو شروع کیا تھا۔ اس کی فائنل تیار ہے۔ بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔ یہ سب تو ہوتا رہے گا مگر آپ نے اپنی پریشانی کا ریزن (Reason) ابھی تک نہیں بتایا۔۔

"ریزن! ریزن تو تم جانتے ہو۔ میرے ۸۰ سالہ فادر ان لا آج کل آئے ہوئے ہیں۔ اور میری بیوی ان کی بے بی سیٹنگ کرتی ہے۔ کل رات ہمیں ڈنر اور میوزک فیسٹول میں جانا تھا۔ چھ مہینے پہلے میں نے ٹکٹ لے رکھے تھے۔ مگر میری بیوی کل میرے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے کہا تھا کہ کسی بے بی سٹر کو ہائیر کرلو مگر وہ مانی نہیں۔ اپنے فادر کے ساتھ رہ گئی اور مجھے اکیلا ہی جانا پڑا۔ ٹکٹ الگ بے کار ہوا اور دوست مجھ پر ہنسنے لگے۔ کہنے لگے کہ گرل فرینڈ کو ہی ساتھ کیوں نہیں لائے۔ ڈیوڈ کے ساتھ ایک اسمارٹ گرل فرینڈ تھی۔ وہ بار بار اس کو کس کر رہا تھا اور پکار رہا تھا۔ میاں ایسی ایک چیز پال لو۔ یہ فادر کی زیادہ پروا نہیں کرتیں۔ خیر اب میں اس عمر میں گرل فرینڈ پال کر پیسہ برباد نہیں کر سکتا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو۔۔۔۔۔

پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا جیسے اس کی کیتھارسس (Catharsis) ہوگئی ہو۔ اب مجھے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آفس سے باہر نکلا تو باس کی سکریٹری کان لگا کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی اور منہ دبا کر ہنس رہی تھی۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ پتہ نہیں اس کی صرف ایک آنکھ کیوں بند ہوئی۔

***

سن اجرا : ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون : 0469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۶ ○ جولائی ۱۹۹۴ء ○ شمارہ : ۶

فی پرچہ : ۷ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ : ۲۵ ڈالر
زر سالانہ : ۷۵ روپے	پاکستان، برما، سیلون : ۱۵ ”
کتب خانوں سے : ۱۰۰ روپے	انگلستان : ۱۲ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس چادر گھاٹ میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع کیا

سرورق : عزیز

اس شمارے میں

پہلی بات

ابتدائی جماعتوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث نئی نسلیں اپنی زبان سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے خانگی مدرسوں میں اردو بالعموم نہیں پڑھائی جاتی۔ ریاست میں اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس بہت کم ہیں۔ اکثر مدرسوں میں تعلیم کا معیار اتنا پست ہے کہ طلبہ کے والدین اور سرپرست بچوں کو ان مدرسوں میں شریک کروانا پسند نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگلی جماعتوں میں اردو کو زبان دوم کی حیثیت سے پڑھنے والے طلبہ بھی مہیا نہیں ہوتے۔

تعلیم اور نظم و نسق میں اردو کو اس کا مستحقہ مقام دلانے کے لیے اردو کی تنظیمیں گزشتہ کئی دہوں سے جدوجہد کرتی چلی آرہی ہیں لیکن کوئی ٹھوس نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں حکومت قوانین بناتی بھی ہے تو ان پر عمل آوری نہیں ہوتی۔

اردو کی موجودہ زبوں حالی اور بے وقعتی کے ذمہ دار خود اردو والے بھی ہیں۔ وہ مادری زبان میں بچے کی ابتدائی تعلیم کی نفسیاتی اہمیت اور تہذیبی ضرورت کا شعور نہیں رکھتے یا قصداً اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے اس صورتِ حال کا جائزہ لے کر بچوں اور بالغوں کو اردو سکھانے کا ایک انقلابی منصوبہ بنایا اور گرما کی چھٹیوں میں مختلف مراکز پر اردو تعلیمی کلاسس قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتداء میں اس منصوبے کے تحت شہر میں دس مراکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن اس کے اعلان کے ساتھ ہی بہت سے مدارس اور ادارے آگے آئے اور قیام مرکز کی خواہش ظاہر کی اس طرح مراکز کی تعداد ۴۹ ہوگئی۔ ٹرسٹ نے ان مراکز کے پانچ ہزار سے زائد طلبہ کے لیے کتابیں اور تدریسی سامان مفت فراہم کیا اور معلمین کو نذرانے پیش کیے۔ اردو تعلیمی کلاسوں کے قیام کے سلسلے میں جناب رضی الرحمٰن صاحب سکریٹری ڈان ایجوکیشن سوسائٹی سے بھی مشاورت کی گئی اور ان کے مرتب کردہ قاعدے کو شریکِ نصاب کیا گیا۔ ادارۂ ادبیات اردو نے بھی دستِ تعاون بڑھایا۔ طے کیا گیا کہ نصاب کی تکمیل کے بعد طلبہ اور طالبات کو ادارۂ ادبیات اردو کے امتحان اردو دانی میں شریک کیا جائے گا اور ان سے کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ شرکت کے فارم، جوابی بیاض وغیرہ ٹرسٹ کی جانب سے فراہم کی جائیں گی۔ ۲۵/ اپریل ۹۳ء سے اردو تعلیمی کلاسوں کا آغاز ہوا اور ڈیڑھ ماہ بعد اردو دانی کا امتحان منعقد کیا گیا جس میں تین ہزار دو سو اکیاون امیدواروں نے شرکت کی۔

اردو تعلیمی کلاسوں کے قیام اور اردو دانی کے امتحان کے انعقاد سے اردو والوں میں بڑا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ہر طرف سے خواہش کی جانے لگی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ ٹرسٹ نے طے کیا کہ اردو دانی کے بعد ادارۂ ادبیات اردو کے اردو زبان دانی کے امتحان کے لیے طلبہ کو تیار کیا جائے تاکہ حروف شناسی کے بعد انھیں زبان پر عبور حاصل ہو۔ اردو زبان دانی کے موجودہ نصاب میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نئے نصاب کی تدوین کے لیے مندرجۂ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ (۱) پروفیسر مغنی تبسم (۲) پروفیسر اکبر علی بیگ (۳) ڈاکٹر مصطفٰی کمال (۴) ڈاکٹر انور الدین (۵) ڈاکٹر رحمت یوسف زئی (۶) ڈاکٹر بیگ احساس (۷) جناب رضی الرحمٰن (۸) محترمہ عالیہ خاں (۹) جناب جلیل الدین۔ کمیٹی نے نصابی کتاب مرتب کردی ہے اور وہ زیرِ طبع ہے۔ اگسٹ میں اردو زبان دانی کی کلاسس شروع کردی جائیں گی۔

اردو تعلیمی کلاسوں کا یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ یہ سلسلہ جاری رہے اور اضلاع میں بھی اس تحریک کو فروغ دیا جائے۔ تو چند ہی برسوں میں اردو کا موقف مضبوط ہوجائے گا۔ آندھرا پردیش میں اردو کی رضاکارانہ تعلیم و ترویج ایک ایسا اقدام ہے جو دوسری ریاستوں کے اردو بولنے والوں اور اردو کی تنظیموں کے لیے مثالی نمونہ بن سکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ دہلی اردو اکیڈیمی نے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے خطوط پر اردو حروف شناسی کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

مغنی تبسم

RAOU/Advt.No.14/9 Tel. No: 244728.

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، روڈ نمبر 46 ، جوبلی ہلز، حیدر آباد۔ 033

مسلسل تعلیمی پروگرام

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار اردو میں ایک کورس کا آ

"غذا اور تغذیہ سرٹیفکیٹ پروگرام"

کورس کا مقصد، اس کورس کا آغاز اردو میں پہلی بار عوام کو صحیح غذا اور تغذیہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے کیا جارہا ہے۔ گھریلو کام کاج کرنے والی عورتیں اور ان تمام خواتین اور مردوں کے لیے جو تندرستی اور تغذیہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ازحد مفید۔

مدت، اس کورس کی مدت چھ (6) ماہ ہے آپ اس کی تکمیل دو سال کے اندر بھی کرسکتے ہیں۔

قابلیت، اس کورس میں داخلہ کے لیے صرف اردو لکھنا اور پڑھنا جاننا ضروری ہے۔ مزید کسی تعلیمی قابلیت کی قید نہیں۔

عمر، اس کورس میں داخلہ کے لیے آپ کی عمر یکم جولائی 94 کو کم از کم 20 سال کی ہونی چاہیے۔ زائد عمر کی کوئی قید نہیں۔ اس کو خواتین اور مرد دونوں داخلہ لے سکتے ہیں۔

فیس: 210/- روپیہ بشمول رجسٹریشن فیس، نصابی مواد (Course Material) اور امتحان کی فیس۔ SC / ST طلباء و طالبا لیے فیس میں رعایت یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق دی جائے گی۔

تجویز کردہ تعلیمی مراکز، اس کورس کا آغاز مندرجہ ذیل اداروں میں قائم کردہ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے تعلیمی مراکز (Study Centres) میں عارضی طور پر کیا جارہا ہے۔ ان تعلیمی مراکز میں یہ کورس اسی وقت شروع کیا جائے گا جب کہ طلبا کی معق داخلہ لے۔ ان تعلیمی مراکز میں اتوار کو صبح 9 تا دوپہر 2 بجے کے درمیان کلاسس ہوں گے۔ ان کلاسس کے لیے حاضری ضرو ہے اپ چاہیں تو اپنے طور پر خود مطالعہ کرسکتے ہیں۔

1) پرنسس شکار ویمنس ڈگری کالج، پرانی حویلی حیدرآباد۔ 2) گورنمنٹ سٹی کالج، نزد ہائی کورٹ حیدرآباد۔ 3) گورنمنٹ جونئر ماہیلا، حیدرآباد۔ 4) نیو گورنمنٹ ڈگری کالج، چنچل بستی، خیریت آباد، حیدرآباد۔ 5) ایم۔ وی۔ ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج، محبو (6) آرٹس اینڈ سائنس کالج، صوبے داری، ورنگل۔ 7) گری راجہ گورنمنٹ کالج، نظام آباد۔ 8) ایس۔ آر۔ آر۔ گورنمنٹ کالج (9) ہندو کالج، گنٹور۔ (10) سلور جوبلی گورنمنٹ ڈگری کالج، کرنول۔ 11) گورنمنٹ کالج، کڑپہ۔ 12) گورنمنٹ کالج، اننت پور۔

نوٹ، ایسے طلباء و طالبات جو مندرجہ بالا تعلیمی مراکز سے دور ہیں یا کسی وجہ سے تعلیمی مراکز میں اتوار کے دن کلاسس حاضر ہونا نہ وہ راست طور پر ڈائرکٹر، اسٹوڈنٹ سروس برانچ، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، روڈ نمبر 46، جوبلی ہلز، حیدرآباد سے ربط قائم کر اور اپنا تعلیمی مواد حاصل کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرنی ہوگی اور نزدیک کے تعلیمی مرکز میں امتحان دینا ہوگا۔

درخواستیں حاصل کرنے کا طریقہ، اس کورس میں داخلہ کے لیے درخواست براہ راست مندرجہ بالا تعلیمی مراکز سے 10/- روپے کی حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ تعلیمی مراکز جمعرات کے علاوہ ہر دن دوپہر 2 بجے تا شام 6 بجے کھلے رہتے ہیں۔ درخواستیں بذریعہ ڈاک ڈائرکٹر سروس برانچ، سے بھی منگوائی جاسکتی ہیں۔ اس کے لیے آپ 25/- روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ بنام "رجسٹرا آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد" لے کر ڈائرکٹر، اسٹوڈنٹ سروس برانچ کو روانہ کریں۔ فون نمبر 244728 ہے۔

یہ ڈیمانڈ ڈرافٹ 94-6-24 کے دن یا بعد کی تاریخ کا ہونا چاہیے۔

درخواستیں فروخت کرنے کی تاریخ کا آغاز: 24-6-94

درخواستیں داخل کرنے کی آخری تاریخ: 24-7-94 کورس کا آغاز: 21-8-94

رجسٹرار

(Centum)

گوشۂ پروفیسر جعفر نظام

جسٹس بی۔ جگن موہن ریڈی

ترجمہ: غلام جیلانی

پروفیسر جعفر نظام

پروفیسر مغنی تبسم نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں پروفیسر جعفر نظام کے بارے میں اپنے تاثرات پر مشتمل ایک مضمون ماہنامہ "سب رس" کے لیے لکھوں جس کے وہ مدیر ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کا انتخاب ادارۂ ادبیات اردو کے صدر کی حیثیت سے ہوا ہے اور "سب رس" اسی ادارے کا ماہنامہ ہے جس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۸ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس ادارے کو جناب سید محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا تھا۔ کئی نامور ہستیاں اس ادارے کی صدر رہ چکی ہیں جیسے نواب مہدی نواز جنگ بہادر، نواب زین یار جنگ بہادر، نواب لیاقت جنگ، جناب سید علی اکبر، جناب محامد علی عباسی اور جناب سید ہاشم علی اختر۔ جناب سید ہاشم علی اختر نے بطور آئی اے ایس آفیسر اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور میرے خیال میں ان کے جانشین کی حیثیت سے ادارۂ ادبیات اردو پروفیسر جعفر نظام سے بہتر شخصیت کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔

ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ۱۹۳۱ء میں عمل میں آیا تھا یعنی ہماری آزادی (۱۹۴۷ء) اور ہماری جمہوری حکومت کی تشکیل (۱۹۵۰ء) سے بہت پہلے۔ اس ادارے کا مقصد اردو ادب کی ترویج و ترغیب، ملکی سرشت برقرار رکھتے ہوئے اس میں تحقیق و جستجو اور اس کی شعری عظمت فکر و احساس کی تشہیر و اشاعت رہا ہے۔

سوائے چند بنیادی زبانوں کے، جیسے سنسکرت، لاطینی، یونانی وغیرہ بہت کم زبانیں ایسی ہیں، خاص طور پر جدید زبانیں، جو اپنے اصلی روپ میں برقرار رہنے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ انگریزی نے دوسری زبانوں سے بہت کچھ اپنایا ہے۔ یہی حال تلگو اور دوسری علاقہ واری زبانوں کا ہے۔ اردو بڑی حد تک ایک مرکب زبان ہے جس کی ترکیبی ہئیت میں فارسی، ترکی، عربی، برج بھاشا اور سنسکرت زبانیں شامل ہیں۔ اسے ریختہ کہا گیا، یعنی آمیزہ لیکن اس کی بنا اس بول چال کی زبان سے پڑی جو فوجی چھاؤنیوں میں مروج تھی۔ اسی وجہ سے اسے لشکری زبان کہا گیا۔ خود لفظ اردو ترکی زبان سے آیا ہے جس کے معنی ہیں چھاؤنی۔ شہنشاہ شاہجہاں نے اردوئے معلیٰ یعنی عسکر اعلیٰ کی زبان یا فصیح اردو کو رواج دیا۔ ایک تصور پیدا ہو گیا ہے کہ اردو صرف وہی ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہو۔ یہ درست نہیں ہے۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے بڑے بڑے شعرا نے دیوناگری رسم الخط میں شاعری کی ہے یا پھر جیسے کبیر، میرا، گرونانک اور ملک محمد جائسی نے دیوناگری کو پسند کیا اور ایک ایسی زبان میں لکھا جو اردو سے، جس کا ابتدائی نام ہندوی تھا، یا دکھنی اور برج بھاشا سے، حتیٰ کہ خود ہندی سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ یہ بات سترھویں صدی کی ہے کہ فارسی شاہی دربار کی زبان بنی اور اردو عدالت کی۔ چوں کہ اردو میں لسانی آمیزش کی لچک بہت زیادہ ہے، اس لیے وہ اعلیٰ معیار کے شعر و ادب کا ایک عظیم وسیلہ بن گئی۔ دلی اور سندھ اور گنگا کے درمیان میدانی خطے میں اس زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط مروج رہا لیکن جنوب میں تغلق کے زیر حکم دولت آباد کو جبری ہجرت کے بعد اردو کو فارسی رسم الخط میں لکھا جانے لگا اور اسے دکھنی کا نام دے دیا گیا۔

یہ ایک المیہ ہے کہ ملک کے دستور کو تشکیل دیتے وقت ہمارے نمائندوں نے مہاتما گاندھی کی اس نصیحت کو رد کر دیا کہ "ملک کی قومی زبان ہندوستانی کو قرار دیا جائے یعنی اس "اردو۔ ہندی" کو جو اس وقت بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اس کی

جانے انھوں نے صرف ایک رائے کی اکثریت پر " سنسکرت۔ ہندی، کو دیوناگری رسم الخط میں قومی زبان قرار دیا۔ اس طرح
رے ملک میں ایک مشترک زبان کا خواب آج بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ بہرحال تقسیم کے بعد یہ رجحان کہ اردو ایک
نصوص مذہبی اقلیت کی زبان ہے یا پھر خود اس اقلیت میں اس قسم کے رجحان کا پیدا ہونا، دونوں یکساں طور پر مضرت
ساں ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندوستان میں جنم لیا اور یہیں پھلی پھولی ۔ اس کا یہ عمل جاری ہے
ہو سکتا ہے کہ اسے پاکستان نے اپنالیا ہو لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک پنجابی زبان کی بالادستی موجود رہے گی، وہاں بھی اس
کے ساتھ قومی زبان کا سا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان کی حد تک ادارہ ادبیات اردو کا مقصد ہونا چاہیے کہ قومی اتحاد کو
روغ و تشہیر ملے۔

یہ ہے نوعیت اس ادارے کی جس کی صدارت کے لیے پروفیسر جعفر نظام کو منتخب کیا گیا ہے۔

جعفر نظام کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس کی جڑیں زمانۂ قدیم سے حیدرآباد کی سرزمین میں
یوست ہیں۔ ان کے والد جناب نظام الدین میرے والد کے بہت اچھے دوست تھے اور مجھے اپنی پریکٹس کے دنوں میں ان
سے بہت اچھی طرح واقف ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ ضلع کریم نگر کے ایک بڑے زمین دار تھے اور ان کی زمینیں کئی
یہاتوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے پروفیسر جعفر حسن کے بڑے بھائی بدر الحسن اور دوسرے دو بھائیوں ضیاء
لحسن اور عابد حسن کے علاوہ ممتاز الحق اور دھرما چو کاراؤ کے ساتھ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کی بنیاد رکھی اور اسے حیدرآباد کمپنی
یکٹ کے تحت ایک لمیٹڈ کمپنی کے طور پر رجسٹر کروایا۔ یہ پہلی ٹرانسپورٹ کمپنی تھی جو نظام اسٹیٹ میں قائم ہوئی تھی۔ اس
کے تحت کریم نگر میں چار شوارع پر بس سروس کا قیام عمل میں آیا جو ریلوے کے چار اہم مراکز کا احاطہ کرتی تھیں۔ کئی
وسرے زمین داروں، صنعت کاروں اور دیش مکھوں کے ساتھ میرے والد کو بھی اس کمپنی کے حصص خریدنے پر آمادہ
رلیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بورڈ آف ڈائرکٹرز میں اندرونی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے اور معاملہ عدالت تک پہنچا۔ اس نوبت پر
جھے ان سب لوگوں سے سابقہ پڑا جو اس سے متعلق تھے۔

جب ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کے فرمان پر مجھے چیف ڈرافٹس مین اور ڈویژنل اور سیشنس جج کے رتبے پر ڈپٹی
سکریٹری لا کا عہدہ پیش کیا گیا تو میں نے قبول کرلیا اور جب فروری ۱۹۴۸ء میں پولس ایکشن سے پہلے مجھے عدالت العالیہ کا جج
مقرر کیا گیا تو مجھے موٹر اینڈ آئیل کمپنی کی قانونی مشاورت کو چھوڑ دینا پڑا۔ دستور ہند کے نفاذ کے بعد میں آندھرا پردیش ہائی
کورٹ کا جج اور پھر چیف جسٹس مقرر ہوا۔ آخر میں میرا تقرر سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ہوا۔ اس طرح ایک ربع
صدی تک میں نے قانون کی خدمت انجام دی۔

اس دوران مجھے عثمانیہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ بعد ازاں شعبہ قانون کا ڈین مقرر ہوا اور کچھ عرصے کے
لیے کارگزار وائس چانسلر بھی رہا۔ ان سات برسوں میں، جب کہ میں یونیورسٹی کی سرگرمیوں سے متعلق رہا، مجھے پروفیسر
جعفر نظام سے واقف ہونے کا موقعہ ملا جو ان دنوں شعبۂ باٹنی میں لکچرر تھے۔

سپریم کورٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد جب میں جنوری ۱۹۷۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا تو
جعفر نظام باٹنی ڈپارٹمنٹ کے صدر اور پروفیسر بن چکے تھے۔

تعجب کی بات ہے کہ پروفیسر جعفر نظام نے ایک مرتبہ بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ جناب نظام الدین کے فرزند
یں جن سے میں اور میرے والد بخوبی واقف تھے۔ یہ بات نہیں کہ اس کا علم ہوجانے پر میرے انتظامی امور بہ حیثیت
وائس چانسلر پر کوئی اثر پڑتا۔ یہاں اس کا ذکر محض پروفیسر جعفر نظام کی اخلاقی اقدار کا اظہار کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ وہ
چاہتے تھے کہ وہ صرف اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر جانے اور پرکھے جائیں، علم کے میدان میں لوگ ان کی سرکی

منزلوں اور کاوشوں کے توسط سے انھیں پہچانیں اور ایک قابل استاد اور ماہر فن تعلیم کی حیثیت سے ان کا نام لیں۔ میں ایسے کئی لوگوں سے واقف رہا ہوں جو اپنے حصول مقاصد کے لیے اس قسم کے جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ مگر یہ احساس میرے لیے بڑا سکون بخش تھا کہ ایک ہستی ایسی بھی ہے جو اپنے شخصی روابط کو فرائضِ منصبی کے ساتھ شامل کرنے کی قائل ہے۔

پروفیسر جعفر نظام کا تعلیمی سفر بہت شان دار رہا ہے۔ ایم۔ ایس سی کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۶۰ء میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں ریڈر اور ۱۹۷۱ء میں پروفیسر کی حیثیت سے ترقی دی گئی۔ تحقیق و جستجو کے میدان میں ان کے مخصوص موضوع ریڈی ایشن بیالوجی (Radiation Biology)، میوٹیشن بریڈنگ (Mutation Breeding) Cytogenetics, اور Cell Biology رہے ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے در کار تحقیقی کام کی رہبری اور نگرانی کا انھیں ایک وسیع تجربہ حاصل تھا۔ ان کے تحت ریسرچ کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد (۲۲) ہے اور جو تحقیقی مقالے انھوں نے خود یا دوسرے ممتاز سائنس دانوں کے اشتراک سے شائع کیے ان کی تعداد (142) ہے

علم کی دنیا میں ان گراں قدر کارناموں سے ہٹ کر پروفیسر جعفر نظام کو انتظامی امور میں بھی وسیع تجربہ حاصل ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت ورنگل میں جب پوسٹ گریجویٹ سنٹر قائم ہوا تو پروفیسر صاحب وہاں کے کارگزار ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ خود عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ باٹنی کے صدر رہے اور ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۹ء تک بیالوجیکل سائنسس کے کوارڈینیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۶ء میں ورنگل کے پوسٹ گریجویٹ سنٹر کو ترقی دے کر کاکتیہ یونیورسٹی قائم کردی گئی۔ ۱۹۷۹ء میں پروفیسر جعفر نظام کو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا جہاں اپنے تین سالہ دور میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ میرے خیال میں اس نو عمر یونیورسٹی کی عمدہ کارکردگی کا دور صحیح معنوں میں ان ہی کے تقرر کے بعد شروع ہوا۔ اس اعلیٰ عہدے پر فائز رہنے کے دوران ہی انھوں نے یونیورسٹی کے سائنس، آرٹس اور سوشیل سائنسس کے شعبوں کی سرگرمیوں کو صحیح اور بامعنی جہتوں پر گام زن کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعبوں کی بہتر کارکردگی کو تسلیم کرتے ہوئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مالی اعانت میں اضافہ کیا۔

پروفیسر جعفر نظام کو یہ ایک نادر اعزاز حاصل ہے کہ چھ سال کے وقفے کے بعد اکتوبر ۱۹۸۸ء میں انھیں دوبارہ کاکتیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر فائز کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی۔

یہ ہمہ گیر کارنامے اور کامرانیاں نمایاں ثبوت ہیں پروفیسر جعفر نظام کی واقعیت پسندی، توانائی اور اعلیٰ تعلیم کے مشن سے ان کی لگن اور خلوص کے۔ یونیورسٹی جیسے اداروں کے علمی ماحول میں آپسی اختلافات اور پس پشت برائیاں سر اٹھاتی رہتی ہیں لیکن پروفیسر جعفر نظام نے اپنے تدبر سے کام لے کر اپنے ڈپارٹمنٹ میں ان چیزوں کو کبھی محسوس بھی ہونے نہیں دیا۔ ان کے خلوص، خوش اخلاقی اور فراخ دلی نے ان کے شاگردوں، ساتھیوں حتیٰ کہ عوام کے دلوں میں ان کے لیے نیک اور خوش آئند تمناؤں نے ایک مستقل جگہ بنالی ہے۔ ان میں جو فطری صلاحیتیں اور خوبیاں ہیں، وہ ہر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے وقت آشکار ہوجاتی ہیں جو انھیں سونپی جائے۔

اوب یک تاج ہے لطفِ خدا کا
تو رکھ سر پر جہاں چاہے چلا جا

مجھے پورا یقین ہے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی صدارت کا عہدہ سنبھال کر وہ ادارے کی رفعت اور شہرت میں اضافہ کریں گے اور اس کے عصبیت سے پاک خدوخال کے استحکام میں ان کی کوششیں شامل رہیں گی۔ میں انھیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نواب شاہ عالم خان

پروفیسر جعفر نظام

ایک گوہرِ نایاب

آج کے میکانکی تیز رفتار زمانے اور خود غرض زندگیوں میں مروت، محبت، شرافت اور علمیت کی خصوصیات کی یک جائی کسی شخصیت میں نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے۔ اس قحط الرّجال میں ایسا کوئی گوہر نایاب مل جانے تو اسے انسانیت کی خوش بختی سمجھنا چاہیے۔

میں ایک ایسی شخصیت سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اس کی دیرینہ رفاقت پر نازاں بھی ہوں۔ مروت، محبت، شرافت اور علمیت کے اس پیکر نے خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کے لیے سنجیدگی اور متانت کی چمک دار پرتوں کو، جو آئینے کی طرح شفاف ہیں، خود کو مقید کیے ہونے ہے۔ چلیے ان پرتوں کو علاحدہ کریں تاکہ صحیح خد و خال واضح ہوں۔ ذرا قریب سے دیکھیے، آنکھوں میں مطالعے کا بار، شب بیداری کا خمار ہے۔ دنیا نے دل درد مندی اور خدمتِ خلق کے جذبے سے معمور ہے۔

اس شخصیت کے مانند اس کے نام کا ہجے بھی کردار کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور نمائندہ ہے۔ حروف کو ترتیب دیجیے۔ ج سے جنید۔ ع سے عالمِ باعمل۔ ف سے فریس۔ ر سے راستباز۔ ن سے ناظم۔ ظ سے ظفر۔ الف سے استاد۔ میم سے مدبر و مخلص۔

حروف کو ترتیب دینے پر یہ مجموعۂ خوبی "جعفر نظام" ہیں۔

موصوف کی منکسر المزاجی کا یہ عالم کہ شجر ثمردار کی صورت ایسے ملیں گے کہ ملنے والے کو یہ احساس تک نہیں ہونے دیں گے کہ وہ کتنی پر عظمت شخصیت سے مل رہا ہے۔ چہرے پر سنجیدگی اس درجہ کہ کیا مجال کہ تبسم کی کوئی لہر ہونٹوں تک آنے۔ دھیما دھیما لہجہ مختصر مکالمہ۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

یہ ہیں، وہ جعفر نظام جن سے عام لوگ واقف ہیں لیکن میں اور ان کے دیگر قریبی رفیق جانتے ہیں کہ علمیت اور معرفت کا سمندر اس ظرف میں ایسا سمو دیا گیا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ انسانوں کے اس ریگستان میں بلاشبہ جعفر نظام نخلستان ہیں۔ نخلستان کے تصور کے ساتھ ہی ان کی نباتیات میں مہارت میرے اس بیان کی دلیل بنتی ہے۔

یوں تو جعفر نظام ارضِ دکن کے ایک زرخیز ضلع کریم نگر سے تعلق رکھتے ہیں اور ضلع کریم نگر نے ایسے مایۂ ناز فرزندوں کو جنم دیا ہے جن کے نام نہ صرف تاریخ کریم نگر بلکہ تاریخ ہندوستان میں سنہرے لفظوں میں تابندہ رہیں گے۔ اس زمین نے بہترین سیاست داں، سائنس داں اور قانون داں جنم دیے ہیں جو عالم گیر شہرت کے حامل بنے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کا خمیر اس مٹی سے بنا ہے، جو اپنی سیاست اور مختلف زبانوں کے ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ملک کی بگڑی تقدیر کو مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ کریم نگر کی تاریخی

خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ اس زرخیز علاقے کی چار شخصیتوں نے اپنی تعلیمی اور تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان نامو
اصحاب نے نہ صرف کریم نگر کو بلکہ ریاست آندھرا پردیش کو افتخار و اعزاز عطا کیا۔ اور یہ چار سپوت ایسے چار ستون بنے جنھو
نے جامعاتی نظام تعلیم کو سربلند کیا۔ ان میں ڈاکٹر جی۔ رام ریڈی جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر رہے اور اپنی اعلیٰ صلاحیت
اور قابلیت سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے صدر نشین بنے۔ اسی کریم نگر کی زمین نے ایک ایسے فرزند کو جنم دیا جو جامعہ
عثمانیہ کے قابلِ فخر وائس چانسلر کے معزز عہدے پر چھ سال کارگزار رہا۔ میری مراد ڈاکٹر پروفیسر نونیت راؤ سے ہے جن
شرافت، علمیت اور قابلیت مسلّمہ ہے۔ کریم نگر کی سرسبز و شاداب زمین نے تلگو زبان کے ایسے باکمال شاعر کو جنم دیا جس
نے اپنی شاعرانہ فکر سے تلگو فن شعر میں نئی جہتوں کی نشان دہی کی۔ نہ صرف یہ بلکہ شعریت سے بھرپور فلمی گیتوں کو نیا انداز د
عالمی ادب میں تلگو شعر و ادب کی اہمیت کا احساس دلایا، تلگو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، بہ حیثیت شاعر و ادیب ان
انسان دوستی نے انھیں عوام میں "سنارے" کے نام سے مقبول بنایا اور علمی و ادبی حلقوں میں اپنی خوش خلقی اور خوش
مزاجی سے ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سے معروف و مشہور ہیں۔ اس فہرست میں ایک اور نام، جو تاریخ کریم نگر ہی میں نہیں با
عالمی تاریخ میں زرین حروف میں لکھا جانے گا وہ ماہر نباتیات پروفیسر جعفر نظام کا نام ہے۔ جعفر نظام ۷/ اکتوبر ۱۹۲۶ء
حیدرآباد میں پیدا ہونے کریم نگر کے ایک اعلیٰ شریف خاندان کے فرد فرید ہیں۔ کریم نگر کی چاندی کی صنعت "فیلیگری
عالمی شہرت رکھتی ہے۔ وہاں کے فن کاروں کی ماہرانہ صلاحیتوں نے چاندی کے تاروں کی کہکشاں اس طرح روشن کی کہ اس
نازک جالیاں اور نازک ترین چاندی سے بنی ہوئی اشیا کے بیل بوٹے نظروں میں سما کر دلوں میں نقش ہو جاتے ہیں۔ ان ۔
والد محترم جناب محمد نظام الدین، ریاست حیدرآباد میں موٹر سرویس اور ٹرانسپورٹ کمپنی کے بانیوں میں ہیں۔ اس کارو
نے نشیب و فراز کی حامل سڑکوں پر ظلمت پوش دھندلکوں میں ہیڈلائیٹس کی روشنی کی لکیروں اور کریم نگر کی چاندی کی تابناک
صنعت سے منور دماغ نے ان کے دل میں وطن کی آزادی کی شمع کو فروزاں کیا۔ آزادی کے اس دستے میں جناب نظام الد
کے ساتھیوں میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو، بیرسٹر اکبر علی خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریۂ ہند تھے، جن کے دل
دماغ میں سرفروشی کی تمنا تھی۔ ان مجاہدین کے ساتھ نظام الدین نیشنلسٹ خیالات کے ساتھ ہندوستان کو بیرونی سامر
سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے۔ جناب نظام الدین جیسے نیشنلسٹ خیالات کے حامی جنگِ آزادی کے مجاہد
جو ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے میں پیش پیش تھے، ہم ہندوستانیوں نے اپنی فطرت کے مطا
فراموش کر دیا۔ آزادی کے لیے اپنی زندگیوں اور جانوں کو وقف اور نثار کرنے والوں کے ایسے کئی محسنوں کو مورخین ۔
نظرانداز کر کے نئی نسل کو امتیاز قوم و ملت کے تعصب میں مبتلا کر دیا۔ کاش کہ بیدار مغز، صداقت پسند مؤرخین ہندوستا
کی صحیح تاریخ لکھیں تو ہندوستان میں بسنے والوں کو حقیقی صورتِ حال کا علم ہو سکے گا۔ مذہبی و قومی تعصب اور منافرت
دیواریں خود بخود ٹوٹ جائیں گی۔

جناب نظام الدین کی کانگریس سے وابستگی اس درجہ بڑھی کہ اپنے فرزند دل بند کو جامعۂ ملّیہ دہلی کا طالب علم بنا
تاکہ وہ کانگریسی ذہن کے ساتھ مجاہدین آزادی کی صف میں آ کھڑے ہوں۔ جعفر نظام نے جامعۂ ملیہ کی فضاؤں میں رہ کر
محسوس کیا کہ آزادی کا جوش، جنون کی حدوں سے تجاوز کر رہا ہے اور ہوش مندی کا فقدان ہے۔ انھیں سیاسی آزادی سے زیا
فکری آزادی اور ذہنی بیداری کی اہمیت محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ذہن و دل کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جامعۂ
کے ہنگامہ پرور ماحول سے اس متین، سنجیدہ طالب علم نے اپنا رشتہ توڑا اور کھلی فضا میں سانس لینے اور اپنے علمی ذوق
شوق کی تکمیل کے لیے حیدرآباد پہنچ کر میٹرک کا امتحان امتیاز سے کامیاب کیا۔ شفیق اساتذہ نے اس ہونہار

لمیذالرحمن۔ سمجھا اور اپنی بھرپور توجہ سے ان کی دماغی اور فکری صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ جامعۂ عثمانیہ سے ۱۹۴۷ء میں بی۔
ں سی اور ۱۹۴۹ء میں یم۔ یس سی (باٹنی) کی سند حاصل کی۔ جامعۂ عثمانیہ کے ذمہ داروں نے اس نوجوان سائنس دان کی
ماغی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا اور ۱۹۴۹ء ہی میں ان کی خدمات بہ حیثیت لکچرر باٹنی حاصل کیں۔ جعفر نظام نے نباتیات کے
ضمون کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔ CYTOLOGY AND RADIATION BOTANY پر اپنا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی آف لندن
ں قابل ترین سائنس دان استاد کی زیر نگرانی تیار کیا۔ اس اچھوتے موضوع نے ماہرین نباتیات کو چونکادیا اور انھیں اس
تالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ دکن کی زمین کا بہتا پانی، اپنی مٹھاس اور اثرانگیزی اس درجہ رکھتا
ہے کہ دیارِ غیر کے رہنے والے ایسے متاثر ہوتے ہیں کہ وہ ارض دکن اور خصوصاً حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیتے ہیں۔ تلنگانہ کا یہ
زند اپنے وطن اور اپنی مادرِ علمیہ جامعۂ عثمانیہ کی مقناطیسی کشش سے کھنچا کھنچا حیدرآباد واپس ہوا اور جامعۂ عثمانیہ میں
مدر شعبۂ نباتیات بن کر اس شعبے کو اتنی ترقی دی کہ ہند اور بیرونِ ہند، جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ نباتیات کے چرچے ہونے لگے
ں شغف اور تحقیقی شوق کے ساتھ غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں سے بھرپور شخصیت نے اپنا لوہا منوایا۔ ڈین آف فیکلٹی، پھر
الکیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدۂ جلیلہ پر چھ سال تک فائز رہے۔ ان تمام مصروفیتوں کے باوجود بھی محاورہ نہیں
ر حقیقتاً ان کا اپنا پسندیدہ مضمون نباتیات ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ (۳۵) سال سے زیادہ معلم بنے رہے۔ ان کے تلامذہ
ں سے (۲۲) طالب علموں میں انھوں نے وہ آتشِ شوق بھڑکائی کہ وہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر کے نہ صرف اپنے
تاد محترم کا نام روشن کیا بلکہ اپنے مستقبل کو کامیاب و کامران اور تابناک بنالیا۔ علم نباتیات کے مختلف موضوعات پر ۱۴۲
مغز مقالہ جات ان کی فکرِ رسا کا نتیجہ رہے اور دنیائے سائنس میں، خصوصاً نباتیات میں نئے نئے گوشوں کے اضافے کا
ب بنے۔ یہ مقالہ جات لندن اور امریکہ میں اس درجہ مقبول ہوئے کہ جعفر نظام نے تمام جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اور
لی شہرت کے حامل ہوئے۔ جعفر نظام کو اس مقامِ عالیہ پر پہنچانے میں ان کی بیگم عالیہ کا بہت عظیم رول رہا ہے، کیوں
بیگم عالیہ نظام نے صحیح معنوں میں پروفیسر جعفر نظام کو آٹے دال کا بھاؤ تک معلوم کرنے کی زحمت نہیں دی۔ نصف
بہتری نہیں بلکہ مکمل بہتر ہونے کا ثبوت دے کر اس قول کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کردی کہ ہر مرد کی کامیابی،
اشعار خدمت گزار رفیقِ حیات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جعفر نظام کے علمی مشاغل بیگم عالیہ نظام کی وجہ
ری و ساری ہیں۔

نباتیات کے اس ماہر نے انوارالعلوم کالج کی مجلسِ انتظامیہ کو مجبور کیا کہ انوارالعلوم میں باٹنی میں پوسٹ گریجویشن
ر ریسرچ کا شعبہ قائم کیا جائے۔ اپنے دیرینہ تجربے اور قیمتی مشوروں سے انوارالعلوم میں اس شعبے کے قیام اور عصری
ت سے لیس لیبارٹری کے قیام میں غیر معمولی دل چسپی لی۔ اب انوارالعلوم کالج کے بورڈ آف مینیجمنٹ کے معزز رکن ہیں
ر کئی دیگر ادارہ جات کے ذمہ داروں میں شامل ہیں۔

اردو زبان کی بقا اور ترویج میں یہ غیر معمولی دل چسپی رکھتے ہیں۔ ان کے اس شوق و شغف کو دیکھ کر انھیں ادارۂ
بیات اردو حیدرآباد کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ وہ اپنی کاوشوں سے دن رات حکومتی سطح پر اردو مسائل کو نہ صرف پیش
ر رہے ہیں بلکہ ان کے حل کرنے کی تجاویز کے ساتھ ساتھ ادارۂ ادبیات اردو کے لیے حکومتی گرانٹ میں اضافہ کے ساتھ
ے مستقل باضابطہ طریقے پر جاری رکھنے کے لیے ممکنہ کوشش کر رہے ہیں۔ اس ادارے کی تزئین نو اور جدید تعمیر کی
نصوبہ بندی کر رکھی ہے۔

جعفر نظام علمی مشاغل میں لگن رکھتے ہیں اور اس میں مگن رہ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ۱۳/ اور ۱۴/ فبروری ۱۹۹۴ء کوانوارالعلوم کے زیرِاہتمام پانچ نیشنل سمپوزیم ہوا۔ا
سمپوزیم کے مہمان خصوصی، عالمی شہرت۔ کے ہندوستانی سائنس داں ڈاکٹر یم۔ یس سوامی ناتھن نے کلیدی خطبہ دیا۔ا
دو روزہ سمپوزیم میں ہندوستان کی تمام جامعات کے چارسو سائنس دانوں نے شرکت کی اور اس سمپوزیم میں مختل
موضوعات پر کئی اجلاس ہوئے ۔ سائنس دانوں اور شہریان حیدرآباد کا مرکزِ نظر و فکر اس سمپوزیم کی مثالی نمائش تھی
میں نایاب ترین پھولوں کی سجاوٹ،لاقیمت نایاب پودوں، ماڈرن ٹشو کلچر کی ٹیکنک اوراس سے متعلقہ کئی ایک پودوں کو
سلیقہ مندی اور خوب صورتی سے پیش کیا گیا اور ناظرین کی معلومات میں اضافے کے لیے متعلقہ سائنس دان معلوما
فراہم کررہے تھے ۔اس سمپوزیم کی مکمل ذمہ داری پروفیسر جعفر نظام نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ مسلسل مصروفیت
تھکن کے باوجود ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں، صبر واستقلال کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ مسلسل صروف رہنے کے باو
بھی وہ اپنی طبعی شرافت سے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے رہے اور اپنے حسن عمل سے اپنی بزرگانہ شفقت اور رہنم
سے چار سو نوجوان سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کرکے انھیں اس طرح اپنا بنالیا کہ سمپوزیم کے دوران جعفر نظام کو ان
پرستاروں کے ہجوم سے نکالنا دشوار ہوگیا تھا۔

پروفیسر جعفر نظام کی شرافت، متانت اور علمیت نے تو مجھے ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے ۔ بعض مرتبہ مجھے ایک عج
وغریب احساس ہوتا ہے کہ میں جو کہ پھولوں کا شیدائی، پودوں کا شوقین، پتوں کا شائق ہو، جن کی حفاظت اور نگہداشت اپنی
جان سے شب و روز کرتا رہتا ہو، جس سے ہر کوئی واقف ہے تو پھر پروفیسر جعفر نظام سے جو پھولوں کی پتیوں کو نوچ نوچ
الگ کردیتا ہے، نازک پتوں کے رگ و ریشوں کو چیرتا پھاڑتا ہے پودوں کو بے دریغ مسل کر تاراج کردیتا ہے تو پھر
ایسے شخص کی دوستی پر کیوں اور کیسے ناز کرتا ہوں تو میرا دل مجھے سمجھاتا ہے کہ میرا یہ ذوق و شوق جعفر نظام کی تحقیق کا مر
منت ہے اور میں اس استدلال سے مطمئن ہوجاتا ہوں کہ یہی تو وہ قدرِ مشترک ہے جو باہمی محبت، خلوص اور ربط وا
رکھے ہوئے ہے ۔ شگفتہ کلیوں، حسین پھولوں کی رنگین پتیوں اور نازک پتوں کے رگ و ریشوں پر ان کا دست جراحت
کارانہ انداز میں چلتا ہے ۔اس ماہرِ فن کے کردار کا ایک وصف خاص ہے کہ ان کی زبان قلم سے یا نوک زبان سے کسی
دل پر کبھی کوئی خراش نہ آئی۔ کسی کے احساسات کبھی مجروح نہیں ہوئے نہ ہی کبھی کسی کی دل شکنی ہوئی۔اس کے علاوہ ا
دل نواز شخصیت کا یہ انتہائی حیرت ناک پہلو ہے کہ پروفیسر جعفر نظام کا آج کی اس دنیا میں نہ تو کوئی مخالف ہے اور نہ
حاسد اور نہ کوئی دشمن جسے دیکھیے وہ ان کے گن گاتا ملتا ہے ۔ جعفر نظام جب کسی کے کسی اچھے کام سے یا اپنے ہی
کارنامے پر خوش ہوتے ہیں تو ان کے سراپا میں جگنوؤں کی روشنی نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے ۔ اس وقت ان کی رنگر
سانولا پن سنہرا ہو کر بہت دلکش ہوجاتا ہے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے صاحبانِ اقتدار ایسی قابل فعّال شخصیت کی غیر معمولی صلاحیتوں
بہرہ ور ہونے کے بجائے اپنی بے حسی، کم علمی کا نہ صرف ثبوت دے رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی علمی دنیا سے مجرمانہ غف
کا مظاہرہ کرکے ملک اور قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ کاش! ان ذمہ داروں میں جذبۂ جوہر شناس
ہو اور باکمالوں کے کمال سے استفادہ کرکے ملک کی ترقی کی راہیں ہموار کریں۔

مجھے بار بار یہی خیال ہوتا ہے کہ اس دنیا میں، اس قحط الرّجال میں اس دل نواز و مہمان نواز اور متواضع شخصیت
وجہ انسانیت، شرافت، علمیت اور اخلاق کا معیار باقی اور برقرار ہے ۔خدا کرے کہ یہ تادیر برقرار رہے چراغ سے چراغ ر
ہوتے رہیں۔ چمن دنیا میں گلہائے رنگارنگ کی بہار باقی رہے۔ نکہت و نور کا قافلہ یوں ہی رواں دواں رہے ۔(آمین)۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

پروفیسر جعفر نظام

(آندھرا پردیش کے ایک ممتاز ماہر تعلیم)

آندھرا پردیش کے ضلع کریم نگر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کی چار ممتاز شخصیتیں وائس چانسلر جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز رہیں۔ ان چار ممتاز شخصیتوں میں پروفیسر جی۔ رام ریڈی (سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور اوپن یونیورسٹی) موجودہ چیرمن یو۔ جی۔ سی (یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دہلی)، پروفیسر نونیت راؤ (سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی)، پروفیسر سی۔ نارائن ریڈی (سابق وائس چانسلر اوپن یونیورسٹی) اور پروفیسر جعفر نظام (سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی، ورنگل) شامل ہیں۔

پروفیسر جعفر نظام مادرِ جامعہ عثمانیہ کے ممتاز سپوت ہیں جن پر ارضِ دکن بجاطور پر فخر کر سکتی ہے پروفیسر جعفر نظام کے جدِّ اعلیٰ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے ساتھ ترکِ وطن کر کے حیدرآباد آئے تھے۔ ان کو حکومتِ آصفیہ کی جانب سے ضلع کریم نگر میں جاگیر عطا کی گئی۔ یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل چلتا رہا۔ پروفیسر جعفر نظام کے دادا یوسف الدین مرحوم کا شمار کورٹلہ ضلع کریم نگر کے ممتاز زمین داروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اس علاقے کے لوگ بلالحاظ مذہب و ملت ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی یاد میں ان کے نام سے ایک موضع یوسف نگر بسایا گیا جو کورٹلے کے قریب واقع ہے۔ کورٹلے میں یوسف الدین مرحوم کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے اور زائرین بلالحاظ مذہب و ملت مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

پروفیسر جعفر نظام کے والد محترم نظام الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے پہلے بیاچ کے گریجویٹ تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لینے سے قبل ان کی تعلیم علی گڈھ میں ہوئی۔ علی گڈھ میں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) بھی شامل تھے۔ ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں بیرسٹر اکبر علی خاں (سابق گورنر یوپی اور اڑیسہ) رہے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد نظام الدین صاحب کو حیدرآباد منتقل ہونا پڑا۔ چچا شریف الدین صاحب نے نظام الدین صاحب کی پرورش و سرپرستی کی۔ شریف الدین صاحب راجہ شیوراج بہادر کے اسٹیٹ میں سشن جج کے عہدے پر فائز تھے۔ نظام الدین صاحب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے مانے ہوئے کھلاڑی اور کپتان بھی تھے اس لیے ان کو عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہاں وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور سودیشی تحریک سے متاثر تھے چناں چہ گریجویشن کی تکمیل کے بعد انھیں آسانی سے سرکاری ملازمت مل سکتی تھی مگر انھوں نے آزاد پیشہ اختیار کرنے کو ترجیح دی اور حیدرآباد میں جہاں عابڈس پر حاجی قربان حسین کی دکان ہے وہاں ایک پٹرول پمپ اور آٹو پارٹس کی دکان قائم کی اور بدرالحسن صاحب کی شراکت میں حیدرآباد بک ڈپو (موجودہ جان اینڈ کمپنی سے متصل عمارت) قائم کیا۔ اس کے علاوہ نظام الدین صاحب نے نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم (سابق گورنر گجرات) کی شراکت سے کاٹیج انڈسٹریز کی مصنوعات کی نکاسی کا ایک "شوروم" قائم کیا جہاں اس وقت لیپاکشی کی عمارت ہے۔ اسی اثنا میں انھوں نے تعلقہ مٹ پلی کریم نگر میں کھادی کی، سوتی اور ریشمی کپڑوں کی تیاری کا مرکز قائم کیا۔ ا

کے ساتھ ساتھ کورٹلے میں دستی کاغذ سازی کی صنعت کو بڑھاوا دیا۔ نظام الدین صاحب کو ریاست کی جانب سے ضلع کر
نگر کے لیے پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کی MONOPOLY (حق تجارت بلاشرکت غیرے) دی گئی جس کا مستقر کریم نگر میں
گیا اور وہاں سے مختلف ریلوے ہڈس پر بسیں چلائی جاتی تھیں۔ مثلاً کریم نگر تا قاضی پیٹ، کریم نگر تا پداپلی، کریم نگ
کا ماریڈی وغیرہ۔ اس پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کا نام "حیدرآباد موٹر اینڈ آئیل کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ" رکھا گیا۔ جس کو 150
میں گورنمنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیا اور آر۔ ٹی۔ سی کے تفویض کیا۔ زمینات کا کاروبار دیکھنے کے علاوہ نظام ال
صاحب پولیس ایکشن سے کچھ ہی عرصہ قبل آبکاری اور برگ آبنوس کے مستاجر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۴/ اپریل ۱۶۸
حیدرآباد میں ہوا۔ نظام الدین صاحب کی شریک حیات حفیظ النسا بیگم صاحبہ تھیں۔ ۲۱/ ڈسمبر ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد ہی
وفات پائیں۔ خداوند کریم نے نظام الدین صاحب کو اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ انھوں نے پانچ لڑکے اور دو لڑ
اپنی یادگار چھوڑیں۔ لڑکوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ جعفر نظام، انور نظام، اصغر نظام، اکبر نظام اور اطہر نظام۔ لڑکیاں اق
جہاں اور قمر جہاں۔ نظام الدین صاحب کے دوسرے صاحبزادے انور نظام عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ انھوں
اپنے والد محترم کے ساتھ مختلف کاروبار میں ہاتھ بٹایا۔ اس وقت بھی وہ تجارت سے وابستہ ہیں۔ تیسرے صاحبزاد
اصغر نظام جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی کی تکمیل کی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے اور وہاں کلی
کورس کی تکمیل کی۔ ۱۹۶۵ء سے وہ شکاگو ہی میں مقیم ہیں۔ وہاں انھوں نے دو پیتھالوجیکل لیبارٹریز قائم کی ہیں۔ چو
صاحبزادے اکبر نظام نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد امریکہ میں بی۔ ایس (کمپیوٹر انجینئرنگ) کیا۔
میں ایم ایس (کمپیوٹر انجینیرنگ) کی ڈگری حاصل کی۔ تقریباً بیس سال تک وہ ملازمت کرتے رہے اور ترقی کرتے ہوئے آ
ایم (INTERNATIONAL BUSINESS MACHINES) کے چیرمن ہوئے۔ اس کے بعد ہڈسن بے HUDSON BAY
کناڈا کا سب سے بڑا تجارتی گھرانہ ہے) کے وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ اب وہ امریکہ منتقل ہوگئے ہیں اور ایک بڑ
گروپ کے وائس چیرمن ہیں۔ اس کے علاوہ سانڈیگو (SANDEIGO) کیلی فورنیا میں بزنس کنسلٹنٹ ہیں۔ پانچ
صاحبزادے ڈاکٹر اطہر نظام، عثمانیہ یونیورسٹی ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد ۱۹۷۲ء میں امریکہ بغرض اعلیٰ تعلیم روانہ ہو
ان کی شریک حیات بھی ڈاکٹر ہیں ۱۹۷۵ء سے وہ شکاگو میں مقیم ہیں۔ وہ اور ان کی اہلیہ دونوں نے کارڈیالوجی
SPECIALIZATION کیا ہے۔ مختلف دواخانوں میں خدمات انجام دینے کے علاوہ فیملی پریکٹیس بھی کرتے ہیں۔

نظام الدین مرحوم کی صاحبزادیوں میں بڑی صاحبزادی اقبال جہاں صاحبہ ابو سلطان وحیدالدین مرحوم کی شریک حی
ہیں۔ ابو سلطان وحیدالدین عثمانیہ یونیورسٹی کے مشہور و معروف ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ بحیثیت وکیل بھی انھوں نے اچھا
کمایا۔ ابو سلطان وحیدالدین صاحب کا ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا۔ نظام الدین مرحوم کی دوسری صاحبزادی قمر جہاں صاحبہ ڈا
سید اطہر حسین کی اہلیہ ہیں۔ ڈاکٹر اطہر حسین بحیثیت جوائنٹ ڈائرکٹر، آندھراپردیش میڈیکل سرویسس ۱۹۹۱ء میں سبک دو
ہوئے۔ اس وقت وہ بحیثیت سرجن حیدرآباد کے ممتاز خانگی نرسنگ ہومس میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر جعفر نظام، نظام الدین مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ان کی پیدائش ۷/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ہو
ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ سے شروع ہوئی۔ مدرسۂ عالیہ کا شمار ان دنوں حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی ممتاز درس گاہوں میں
تھا جس میں زیادہ تر امراء و روسا کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ اس کا معیار نہایت اونچا تھا۔ جعفر نظام جس وقت اس اسک
میں زیر تعلیم تھے یہاں کے پرنسپل ایک انگریز مسٹر ٹرنر تھے۔ چوتھی جماعت تک وہ اس اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ ا
کے بعد چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا جہاں مترجم قرآن سر مارماڈیوک پکتھال پرنسپل تھے۔ جب وہ ساتویں جماع
میں زیر تعلیم تھے والد نے انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں شریک کرادیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مر

سابق صدر جمہوریہ ہند) شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تھے اور پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے عالم و فاضل اساتذہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی فیکلٹی آف آرٹس میں موجود تھے۔ جب جعفر نظام دسویں جماعت میں پہنچے ان کو اس بات کا علم ہوا کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا الحاق ہندوستان میں کسی کالج یا یونیورسٹی سے نہیں ہے جس کی وجہ سے وہاں کے طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد یا تو کسی کاروبار میں لگ جاتے ہیں یا وکالت جیسے پیشے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں یا پھر لیڈر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کا نصب العین شروع ہی سے سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے جامعۂ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا اور حیدرآباد واپس ہوئے۔ چوں کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کو حیدرآباد کے محکمۂ تعلیمات نے تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے حیدرآباد کے کسی مدرسے میں انھیں داخلہ نہیں مل سکتا تھا لیکن ان کے عمدہ تعلیمی ریکارڈ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسپیشل کیس بنا کر جعفر نظام کو جماعت دہم میں داخلہ دیا گیا۔ داخلے سے پہلے ان کا تمام مضامین میں ٹسٹ لیا گیا۔ معیار پر پورا اترنے پر ہی ان کو داخلے کا اہل قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جعفر نظام نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نشانات سے کامیاب کیا۔ انٹرمیڈیٹ سائنس گروپ کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی میں انھوں نے داخلہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ نباتیات ان کا خاص مضمون رہا۔ اسی سال جعفر نظام نے ایم۔ ایس سی باٹنی میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی (باٹنی) کی ڈگری حاصل کی۔ نتیجہ شائع ہونے کے فوری بعد ان کا تقرر بحیثیت لکچرر باٹنی، گورنمنٹ کالج گلبرگہ عمل میں آیا۔ اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت گورنمنٹ سٹی کالج کے علاوہ ورنگل، اورنگ آباد اور گلبرگہ (جو ریاست حیدرآباد کے صوبہ جات تھے) میں انٹرمیڈیٹ کالج قائم تھے تین سال تک گلبرگہ میں کارگزار رہنے کے بعد ان کا تبادلہ ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں ہوا۔ یہاں پر وہ ۱۹۵۷ء تک کارگزار رہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کا تبادلہ نظام کالج میں ہو گیا۔ اسی سال وہ پی ایچ۔ ڈی کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے پروفیسر ایم۔ بی۔ ای گاڈورڈ (Prof. M.B.E. Godward) کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "پودوں پر مختلف شعاعوں کے اثرات۔

Effect of Irradiation on plants with particular reference to water plants تحریر کیا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

لندن سے واپسی کے چند ہی دنوں بعد ڈاکٹر جعفر نظام کو کالج آف سائنس میں پوسٹنگ دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں ان کو بحیثیت ریڈر ترقی دی گئی اور ۱۹۷۱ء میں وہ پروفیسر آف باٹنی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی دوران ورنگل میں پوسٹ گریجویشن سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر جعفر نظام کا تبادلہ ورنگل پی جی سنٹر پر کر دیا گیا جہاں پر وہ ۷ سال تک صدر شعبۂ نباتیات کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ ۱۹۷۴ء میں پروفیسر مہندر راج سکسینہ وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے اور ان کی جگہ پروفیسر جعفر نظام نے صدر شعبۂ نباتیات عثمانیہ یونیورسٹی کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۷۴ء ہی میں ان کو کوارڈینیٹر برائے بیالوجیکل سائنسس (CO-ORDINATOR FOR BIOLOGICAL SCIENCES) مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب مقتدر نے یو۔ جی۔ سی کی ایما پر پروفیسر جعفر نظام کو ڈین، کالج آف ڈیولپمنٹ کونسل مقرر کیا۔ اس کے تین ماہ بعد ہی ان کا تقرر بحیثیت وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل ہوا۔ یقیناً یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس جلیل القدر عہدہ پر موصوف ۱۸ اگسٹ ۱۹۷۹ء تا ۱۸/ اگسٹ ۱۹۸۲ء (یعنی تین سال) تک فائز رہے۔ اپنی میعاد کی تکمیل کے بعد پروفیسر جعفر نظام دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی واپس ہوئے۔ یہاں پر انھیں ڈین، فیکلٹی آف سائنسس عثمانیہ یونیورسٹی مقرر کیا گیا۔ ۳۷ سال کی طویل ملازمت کے بعد ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو وہ وظیفۂ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ بعد ازاں انھیں کئی ممتاز عہدوں پر فائز کیا گیا جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ وائس چیرمن، آندھراپردیش کمشنریٹ آف ہائر ایجوکیشن ۲۔ ممبر آف اسپیشل رکروٹمنٹ بورڈ آف سی۔ ایس۔ آئی۔ آر
انتخاب عہدہ داران۔ ۳۔ ممبر آندھراپردیش کالج سروس کمیشن ۴۔ ڈائرکٹر جنرل، ہمدرد ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۵۔
آندھراپردیش کالج سروس کمیشن ۶۔ ممبر آف دی کورٹ آف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۷۔ ممبر آف دی نیشنل کون
ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، گورنمنٹ آف انڈیا ۸۔ چیرمن آف اسٹانڈنگ کمیٹی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔ ۹۔ سائنٹس
آف گورننگ باڈی آف انٹر یونیورسٹی سنٹر فار ایسٹرانومی۔ ۱۰۔ ممبر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، گورنمنٹ آف انڈیا۔ ۱۱۔ کو
سائنس اور ٹکنالوجی یونیورسٹی کے سینٹ، سنڈیکیٹ اور اکاڈیمک کونسل کے ممبر۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور کاکتیہ یونیورسٹ
بھی وہ اعزازی طور پر مختلف عہدوں پر فائز رہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ رکن اکاڈیمک کونسل، عثمانیہ یونیورسٹی۔ ۲۔ رکن سینیٹ، عثمانیہ یونیورسٹی ۳۔ رکن افیلیلڈ کالجس، عثمانیہ یونیور
چیرمن بورڈ آف اسٹڈیز برائے باٹنی عثمانیہ یونیورسٹی۔ ۵۔ چیرمن آف دی اڈہاک کمیٹی فار بیالوجیکل سائنس، عثمانیہ یو
۶۔ رکن ڈیولپمنٹ کونسل، عثمانیہ یونیورسٹی۔ ۷۔ رکن کاکتیہ یونیورسٹی اکاڈیمک سینیٹ۔

علاوہ ازیں وہ یونین پبلک سروس کمیشن، آندھراپردیش پبلک سروس کمیشن، بہار پبلک سروس کمیشن، یو
گرانٹس کمیشن، کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے رکن اور چیرمن آف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (وزیٹنگ
بھی رہے ہیں۔

دوران ملازمت پروفیسر جعفر نظام نے متعدد قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی اور اپنے گر
تحقیقی مقالوں سے ان سمیناروں کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ نباتیات کا کوئی سمینار ان کی شرکت کے بغیر ادھورا رہ جا
پروفیسر جعفر نظام کی اعلیٰ علمی قابلیت اور انتظامی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت ہند اور ریاست آندھراپرد
مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں ان کی خدمات سے استفادہ کرتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ وظیفے پر سبک دوش
کے بعد انھیں ۲۴ / اکتوبر ۱۹۸۸ء کو دوبارہ کاکتیہ یونیورسٹی، ورنگل کے وائس چانسلر بنایا گیا۔ انھوں نے یونیور
حالات کو سدھارا اور اس کی ہمہ جہتی ترقی کی راہیں ہموار کیں اور اپنی میعاد کی تکمیل (۲۴ / اکتوبر ۱۹۹۱ء) تک نہایت خوش
کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیے۔ بحیثیت وائس چانسلر آپ کے دونوں ادوار نہایت درخشاں رہے۔ پہلی بار
کاکتیہ یونیورسٹی بحیثیت وائس چانسلر تشریف لے گئے انھوں نے محسوس کیا کہ بہت سے طلبہ غیر سماجی سرگرم
ملوث ہیں جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا ڈسپلن بگڑ گیا ہے۔ انھوں نے گفت و شنید کے ذریعہ طلبہ اور اساتذہ دونوں
حاصل کیا اور نہایت تدبر اور دانش مندی کے ساتھ یونیورسٹی کے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک
رہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی وائس چانسلری کے دور میں کاکتیہ یونیورسٹی ایک بار بھی بند نہیں
پروفیسر جعفر نظام نہ صرف طلبہ میں مقبول تھے بلکہ اساتذہ اور غیر تدریسی ملازمین میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت

ہر بڑے انسان کی زندگی میں اس کی نصف بہتر کا اہم رول رہتا ہے۔ پروفیسر جعفر نظام کی زندگی میں
شریک حیات نے زندگی کو کامیاب اور بامعنی بنانے میں نہایت خوش گوار فریضہ انجام دیا ہے۔ پروفیسر جعفر نظام
۳۰ / مئی ۱۹۵۲ء میں ان کی حقیقی چچازاد بہن عالیہ بانو سے ہوئی جن کے والد محمد محی الدین مرحوم جاگیر دار اور زمین د
انھوں نے پونا یونیورسٹی سے زراعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ محترمہ عالیہ بانو کے نانا حیدرآباد کے مشہور طبیب
محمود علی مرحوم تھے جن کو صدر جمہوریہ ہند آں جہانی راجندر پرشاد کے طبیب ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔

پروفیسر جعفر نظام کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ بڑے صاحبزادے محمود جعفر نظام نے
یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔ اس کے بعد کناڈا جاکر انھوں نے ECFMG اور فلیکس (FLEX) کے ا

امتیاز سے کامیاب کیے اور اب بحیثیت فزیشن EDMONTON (CANADA) میں گروپ پریکٹیس کرتے ہیں۔ بڑی صاحب زادی سعدیہ جعفر نظام کی شادی عتیق احمد صدیقی سے ہوئی۔ عتیق احمد صدیقی لندن میں اسٹرکچرل انجینیر تھے اور اب CANADA اٹاوہ OTTAWA میں انجینیر کے عہدے پر فائز ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کے دوسرے صاحبزادے ارشد جعفر نظام، پونا یونیورسٹی سے ایم بی اے کی تکمیل کے بعد نیویارک (امریکہ) میں بہ حیثیت مارکٹنگ مینیجر کارگزار ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کی چھوٹی صاحبزادی شیریں جعفر نظام کی شادی ڈاکٹر سعید ظفر سے ہوئی جو مسقط (عمان) میں میڈیکل آفیسر ہیں۔

پروفیسر جعفر نظام کو ان کی علمی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات عطا کیے گئے جن کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے خود ان اعزازات کی وقعت میں اضافہ ہوا۔ حکومت آندھرا پردیش نے ۱۹۸۳ میں "بسٹ ٹیچر ایوارڈ" عطا کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ایف این اے ایس (فیلو نیشنل اکاڈیمی آف سائنسس) وی پوری میڈل، انڈین بوٹانیکل سوسائٹی سے ۱۹۸۵ء میں عطا کیا گیا۔ سینٹ مشیم ایوارڈ سائنسی اور ٹکنالوجیکل خدمات پر ۱۹۸۶ء میں دیا گیا اور یونٹی ایوارڈ برائے یونائیٹڈ ہندو مسلم فرنٹ حیدرآباد ۱۹۹۰ء میں دیا گیا تھا۔ وہ پچیس برس ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالوں کے نگران رہے ہیں۔ ان کی نگرانی میں ۲۲ طلبہ اور طالبات نے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے لکھے جس پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اس کے علاوہ ایم۔ فل کے تین ریسرچ اسکالروں نے پروفیسر جعفر نظام کی نگرانی میں اپنے تحقیقی مقالے لکھے جن پر ان کو عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈگری عطا کی۔ پروفیسر نظام نے ۱۲۰ تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ سائنسی مضامین کے (۴) مجموعے مرتب کیے ہیں جو کتابی شکل میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئے ہیں۔ وہ ایک شفیق و محترم استاد ہونے کے علاوہ ایک اچھے پابند وقت نگران کار بھی ہیں۔ طلبہ اور طالبات کو وہ لائحۂ عمل کے مطابق وقت دیتے ہیں۔ ہیرے کی پہچان جوہری سے اور سونے کی پہچان کسوٹی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے استاد کی قابلیت کی پہچان اس کے شاگردوں سے ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے پروفیسر جعفر نظام کے شاگردوں سے انٹرویو لیے جن میں سے دو کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر جعفر نظام کی نگرانی میں پروفیسر جوگیندر سنگھ کور بھلا نے اپنی تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ پروفیسر بھلا صاحبہ کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ پروفیسر جعفر نظام کی زیر نگرانی عثمانیہ یونیورسٹی میں عطا کردہ پی ایچ۔ ڈی کا پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ اولادِ اوّل ہمیشہ زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ شاگرد بھی معنوی اولاد ہوتے ہیں۔ میرے استفسار پر اپنے انٹرویو میں پروفیسر جوگیندر کور بھلا صاحبہ نے اس بات کا انکشاف کیا کہ روایتی اساتذہ کے بارے میں ہم نے سنا تھا یا پھر پڑھا تھا مگر پروفیسر جعفر نظام کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ روایات کے حامل استاد ہیں۔ سکیولر ذہن کے انسان ہیں۔ وہ تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں متعصب بالکل نہیں ہیں۔ میں اپنے والدِ محترم کے بعد اگر کسی کی اتنی ہی عزت کرتی ہوں تو وہ میرے شفیق و محترم استاد پروفیسر جعفر نظام ہیں۔ میں نے ڈاکٹر فاروق سے بھی انٹرویو لیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق شعبۂ نباتیات میں ریڈر ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی ہاسٹل کے ایڈیشنل چیف وارڈن ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کے بارے میں موصوف نے کہا کہ وہ ایک مشفق استاد ہیں۔ ایک شجر سایہ دار کی طرح ہیں جس کی گھنی چھاؤں میں ہم نے سکون کے ساتھ اپنے خشک تحقیقی مقالے لکھے۔ وقت کی پابندی کوئی ان سے سیکھے۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مئے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بہ تو صد حساب باقیست

اب بھی پروفیسر جعفر نظام کے شاگرد ان کی ویسی ہی عزت کرتے ہیں جیسا کہ وہ زمانہ طالب علمی میں کرتے تھے۔ ان میں بعض اب بھی ان کے سرکاری عہدے کی وجہ سے نہیں بلکہ شاگرد ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں اور انکی کبری

نیازمندی و سعادت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

پروفیسر جیا ناظر (موجودہ وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی، ورنگل) نے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ پروفیسر جعفر نظام کے وائس چانسلر شپ کے دور میں بحیثیت رجسٹرار کاکتیہ یونیورسٹی کارگزار تھے۔ پروفیسر جعفر نظام کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ ان میں انتظامی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ عصری مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

جب میں پروفیسر جعفر نظام سے ان کے لائق اساتذہ کے بارے میں استفسارات کیے اور بحیثیت ایک شاگرد ان کے تاثرات دریافت کیے۔ پروفیسر جعفر نظام نے یادوں کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جگتیال ہائی اسکول میں وہ اپنے محترم استاد جناب ابو الفتح نصر اللہ صاحب سے بہت متاثر ہوئے تھے جو ریاضی کے نامور استاد تھے۔ وہ برج کے شعبہ کھلاڑی بھی رہے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ میں پروفیسر جعفر نظام کو انگریزی کے اساتذہ مسٹر کے۔ این۔ اچاریہ، جناب اکبر علی خاں، نباتیات کے استاد جناب عبد الباری نے بہت متاثر کیا۔ بی۔ ایس سی میں پروفیسر دوراسوامی اور پروفیسر حسین علی خان جیسے لائق اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ شعبۂ حیوانیات کے ڈاکٹر عمر خاں، نباتیات کے پروفیسر مہندر راج سکسینہ اور پروفیسر سعید الدین سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب نے بحیثیت استاد جعفر نظام صاحب کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں بطور خاص دل چسپی لی اور ان کا برتاؤ ہمیشہ ایک فرد خاندان کی طرح رہا اور اب بھی جعفر نظام صاحب اپنے علمی اور نجی کاموں میں پروفیسر صاحب سے مشورہ کرتے ہیں اور ان کے دل میں پروفیسر صاحب کی بہت زیادہ قدر و منزلت ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

پروفیسر جعفر نظام کی پی ایچ۔ ڈی کی گائیڈ پروفیسر ایم۔ بی۔ ای۔ گاڈورڈ (Prof. M.B.E. Godward) غیر معمولی شخصیت کی حامل خاتون ہیں جس وقت وہ تحقیق کر رہے تھے پروفیسر گاڈورڈ ۵۲ سال کی تھیں۔ انھوں نے تحقیق کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں میں ۱۶ تا ۱۸ گھنٹے وہ تحقیق میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کی غیر معمولی قابلیت، جانفشانی اور پہلودار شخصیت کے نقوش پروفیسر جعفر نظام کے ذہن پر اس طرح مرتسم ہوئے ہیں کہ کبھی مٹائے نہیں جا سکتے۔ اس وقت وہ ۹۴ سال کی ہیں۔ اب بھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور وہ ان کو وظیفے پر سبک دوش ہو جانے کے بعد بھی کام کرنے کا حوصلہ دیتی رہتی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر جی۔ رام ریڈی سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی (موجودہ چیرمن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دہلی) سے بہت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر ان کی فعال شخصیت سے پروفیسر جعفر نظام نے بہت کچھ سیکھا۔ پروفیسر جی رام ریڈی سے ان کے ہمیشہ برادرانہ تعلقات رہے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے نائب صدر پر ماشری نواب عابد علی خان صاحب مرحوم ایڈیٹر روزنامہ سیاست کی رحلت اور جناب سید ہاشم علی اختر صاحب (سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی و نیز وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی امریکہ کو ہجرت کے بعد ایک خلا سا ادارے میں پیدا ہو گیا تھا۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں پروفیسر جعفر نظام کا بحیثیت کارگزار صدر اور سید ہاشم علی اختر صاحب کے امریکہ جانے کے بعد ادارے کے مستقل صدر کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ اردو سے والہانہ محبت کی وجہ سے انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور اس ادارے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے اور نشو و نما دینے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو میں جب کوئی ادبی جلسہ منعقد ہوتا ہے پروفیسر جعفر نظام اس میں ضرور شرکت فرماتے ہیں۔ وضع داری ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ انسانی قدروں کا وہ بہت احترام کرتے ہیں۔ ہم اہل حیدرآباد اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ پروفیسر جعفر نظام جیسی باکمال، بے مثال اور قدیم تہذیب کی علم بردار شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد شاہ علی

پروفیسر جعفر نظام

(۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۴ء تک)

کسی شخص کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنے کے لیے لازمی شرط ہے کہ یا تو وہ شخصی پڑوسی رہا ہو یا اس سے کوئی معاملہ کیا ہو یا ہم سفر رہا ہو۔ جعفر نظام صاحب اور میرے درمیان ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۴ء تک کے وسیع عرصے پر پھیلے تعلقات روابط کے دوران ان تینوں شرطوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ میری اور جعفر نظام صاحب کی ملازمت کم و بیش ایک ساتھ، ایک مقام اور ایک شعبے سے ہی شروع ہوئی۔ پولیس ایکشن کے نتیجے میں مجھے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بیس سال سے کم عمری میں ملازمت کا جوا اپنے کندھے میں لینا پڑا تھا۔ بحیثیت مددگار تجربہ خانہ شعبہ نباتیات عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ میں مارچ ۱۹۴۹ء سے میں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ان ہی دنوں اکتوبر ۱۹۴۹ء میں جعفر نظام صاحب بحیثیت لکچرار شعبۂ نباتیات اسی کالج میں خدمت پر مامور ہوئے۔ اس طرح ہم آغاز ملازمت ہی سے ہم سفر رہے۔

پولیس ایکشن کی تباہ کاری کو گزر کر چند مہینے ہوئے تھے سابق ریاست حیدرآباد ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ شکست خوردہ، تذبذب کے شکار عوام معاشی و اخلاقی پستی کی طرف تیزی سے رواں تھے۔ ایک فرد کا چہرہ دوسرے کے لیے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ خوف و دہشت کے ڈراونے خواب عوام کے دماغوں کو پراگندہ کیے ہوئے تھے۔ اس عمومی نفسیاتی پس منظر والے معاشرے کو ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو ان کو اس ذہنی پراگندگی سے باہر نکال لائے۔ تاریخ کے ایسے نازک لمحوں میں ایک ایسے استاد کا کام اور کارنامہ تاریخ کا ورق بن جاتے ہیں۔ گرتے ہوئے حوصلوں کو سنبھالنا، بکھری ہوئی قومی یک جہتی کی دوبارہ شیرازہ بندی کرنا اور مضمحل دلوں سے قنوطیت کو ہٹا کر ترقی کی منزل کی طرف خاموش رہنمائی کرنا، ایک عہد ساز استاد کا ہی خاصہ ہوتا ہے۔ درد مند دل رکھنے والا استاد ایک طرف معاشرے کی تعمیر کی فکر میں لگا رہتا ہے تو دوسری طرف خود اس کے اندر ایسی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں جو اس کی ذات کے ارتقا کا سبب بنتی ہیں اور تدریجاً ترقی کے ایسے منازل کی طرف لے جاتی ہیں۔ جہاں سے بنی نوع انسان کی مسلسل فیض رسانی ہوتی رہے۔ یہی سب کچھ جعفر نظام صاحب کے ساتھ قیام گلبرگہ کے دوران ہوا۔ ۲۳ سال کی کم عمری میں ملازمت شروع کی اور جون ۱۹۵۲ء تک گلبرگہ میں رہے۔ اس قلیل عرصے میں بندہ نواز کی سرزمین نے جعفر نظام صاحب کو وہ سب کچھ دیا جو مستقبل میں بندوں پر نوازشوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے درکار اور اپنے علمی عہد کی نسل نو کو فیض پہنچانے کے لیے ضروری ہو۔ ایسے افراد کی ترقی اپنی ذات کی منفعت کے لیے محدود نہیں ہوتی بلکہ غیروں کو نفع رسانی کے لیے ہوتی ہے۔ قدرت کا یہ انتخاب بس یوں ہی نہیں ہوتا، جب تک اس فرد کے اندر ان اوصاف کا مخفی ذخیرہ موجود نہ ہو جن سے قدرت کے منشا کی تکمیل ہوتی ہو۔ پاکیزہ ذہنیت اور اعلیٰ ذہانت کسی فرد میں جمع ہوں تو جو شخصیت تشکیل پاتی ہے وہ صوفی منش سائنس داں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

پولیس ایکشن کے فوری بعد کا پرآشوب دور تھا۔ گلبرگہ، ورنگل اور اورنگ آباد کے کالجوں میں شعبۂ نباتیات کے

لکچراروں کی جائیدادیں خالی تھیں اور ان کو پر کرنے کی ذمہ داری پروفیسر سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جام
تھی۔ لہٰذا پروفیسر صاحب کو باہمت پر اعتماد حوصلہ مند شاگردوں کی تلاش تھی۔ حسن اتفاق سے گلبرگہ کالج کے
نگاہ انتخاب جعفر نظام صاحب پر پڑی۔ ان کو طلب کرکے گلبرگہ کے لیے روانگی کا حکم دیا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ لوگوا
پر خوف و دہشت کی حکمرانی عروج پر تھی۔ اکثر لوگ اضلاع اور دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کر حیدرآباد شہر کی پرا
پناہ پاکر اطمینان کا سانس لیتے۔ اکثر ملازمین سرکار اپنی ملازمتوں سے بے نیاز ہوکر جان و عزت کی خیر منا
حیدرآباد میں سر چھپانے ہوئے تھے۔ شاید لوگوں کی اس ذہنی کیفیت کو نکالنے کے لیے حکومت کو ایسے اح
کرنے پڑے تھے کہ تمام ملازمین سرکار ایک مقررہ تاریخ تک (وہ تاریخ یاد نہیں ہے) لازماً اپنے اپنے مستقر
رجوع بکار ہوجائیں بصورت دیگر وہ ملازمت سے برطرف متصور ہوں گے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں جعفر نظا
حیدرآباد چھوڑ کر گلبرگہ روانہ ہونے کا حکم ملا تھا۔ وقت کی پکار اور طبیعت کی موزونیت کا لحاظ کرکے گلبرگہ
پڑے اور منور حسین صاحب ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر کے ہاں مقیم ہوئے۔ صوبہ داری برخواست کردی گئی تھی اور
کی پر فضا اور پر شکوہ عمارت میں کالج کو منتقل کردیا گیا تھا۔ جعفر نظام صاحب نے اسی عمارت میں اپنے عہدے
جعفر نظام صاحب کے رجوع بکار ہوتے ہی کالج کا اندرونی ماحول بھی بیرونی ماحول کی طرح باغ و بہار بن
مسحور کن شخصیت نے پہلی ملاقات میں سب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ نظروں سے ذہانت، چہرے سے شرافت، گفتگو
چال ڈھال سے متانت، دوستوں سے مروت، شاگردوں سے شفقت، کردار میں عظمت نے جعفر نظام صاحب کو
سب کی آنکھوں کا تارا بنادیا۔ جو بھی ایک مرتبہ آپ سے ملتا وہ اپنی ملاقات کی یاد کو قیمتی سرمایہ کے طور پر اپنے
محفوظ کرلیتا۔ ریاست کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے باہمی اعتماد کی فضا بگڑ گئی تھی اور قومی یک جہتی کے جذبے م
تھی، دوبارہ اعتماد کو بحال کرنا اور تعلقات کو استوار کرنا دلوں میں کشیدگی کی جگہ کشادگی پیدا کرنا ایسا عظیم مقصد
لیے جعفر نظام صاحب کی شخصیت ہی موزوں تھی۔ کالج کے احباب جن میں ہر فرقے، ہر طبقے اور ہر مکتب خیال
تھے سبھی جعفر نظام صاحب کی شخصیت کی سحر انگیزی سے متاثر تھے جس کی وجہ سے نہایت خوش گوار ماحول وج
مولوی عبدالمنان صاحب، عبدالکریم کاظمی صاحب، محسن علی حاجی صاحب، پی مادھوراؤ صاحب، بھگونت راؤ د
جے تیر تھ ساستور کر صاحب، مولوی حسن محی الدین صدیقی صاحب، مولوی علی بن غالب صاحب اور مسٹر پی۔ ایس
کے حلقے میں شامل تھے جن میں سے اکثر مجرد تھے۔ ان کے علاوہ آپ کو مقامی عہدہ داروں میں کافی مقبولیت
جناب پی۔ ین۔ رامن آئی۔ اے۔ ایس، جناب غلام حقانی انصاری جج۔ سی۔ ایس، جناب کے۔ ایس۔ شفیق لیبر آ
خیر الدین احمد انصاری جوائنٹ لیبر کمشنر، جناب یم اے باقی سیلز ٹیکس آفیسر، مسٹر آنند نارائن ماتھر منیجر اسٹی
حیدرآباد قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام احباب آپس میں ایک خوب صورت گل دستے کی شکل میں گندھے ہوئے تھے
صاحب ان میں گل سرسبد کے مانند تھے۔

جعفر نظام کے پڑھانے کا طریقہ بہت ہی واضح اور دل نشین ہوتا تھا۔ گو کہ ہونے والا مضمون نباتیات، ا
غیر مانوس ادق اصطلاحات کے بوجھ سے طالب علموں میں غیر مقبول بنا ہوا تھا۔ جعفر نظام صاحب کے لکچر کے ب
مضمون کلاس روم کے اندر ہی طالب علموں کو ازبر ہوجاتا۔ کلاس روم گل و گلزار بن جاتا۔ کلاس کب ختم ہوا
چلتا۔ پراکٹیکل کی کلاسس بھی اس پیار و محبت، دل جوئی اور دل جمعی سے منعقد کرتے کہ ہر طالب علم کی خواہش
کے کام کا معائنہ ان کے ہر دل عزیز استاد جعفر نظام صاحب ہی کریں اور ان کی رائے اور خوش نودی پاکر اپنا حوصا

طرح طالب علموں میں پڑھنے اور محنت کرنے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا۔ طلبہ کے ساتھ سلوک میں ذات پات، امیر غریب
امتیاز کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آپ کے مشفقانہ و مربیانہ برتاؤ کے سبب طلبہ آپ کے پاس بلا تکلف پہنچ کر اپنی اپنی
بانیوں اور مشکلات کا اظہار کرتے اور نہ صرف ان کا حل پاتے بلکہ قلبی راحت و تسکین محسوس کرتے۔ ایسے خوش گوار
ی ماحول میں پروان چڑھنے والے طالب علم یقیناً کمال و شہرت کی بلندیوں پر بھی چڑھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں
ایک ایسے ہی شاگرد کا ذکر کروں گا۔ بشیر آباد ناوندگی کا ایک نادار، شرمیلا، کم سخن طالب علم چندر پار لیشمی اپنے شفیق
د جعفر نظام صاحب کی مربیانہ توجہ اور حوصلہ افزائی کے طفیل اس وقت نیویارک میں عالمی شہرت یافتہ صفِ اول کا
المولوجسٹ (ماہر امراض چشم) ہے اور اس ڈاکٹر چندر پار لیشمی کو دلائی لاما، صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ، چیف
سٹر آندھرا پردیش وجے بھاسکر ریڈی اور مسٹر جے آر ڈی ٹاٹا جیسی اہم شخصیتوں کی آنکھوں کی جراحی کرنے کا اعزاز حاصل
۔ انھوں نے لاتعداد آنکھوں کے انوکھے آپریشن کا ریکارڈ قائم کیا ہے اور اپنی تحقیقی و اختراعی صلاحیتوں کو بروئے کار
آنکھ کی اندرونی نازک پرت" کارنیا" کی پیوند کاری کے لیے نئے طریقے ایجاد کیے جن کو آنکھوں کے معالجے میں عالمی طور پر
یم کر لیا گیا ہے۔ اب ذرا اس شاگرد رشید کی سعادت مندی بھی دیکھیے کس طرح اپنے مربی و محسن استاد کا احترام و اکرام کرتا
۔ جعفر نظام صاحب جب پینس برگ (امریکہ) میں اپنے شاگرد سے ملنے اس کے گھر گئے تو یہ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر اپنے
د کو سامنے پا کر وفور جذبات میں ٹھیٹ ہندوستانی روایت کے مطابق جھک کر مؤدبانہ اظہار عقیدت کرتا اور آشیرباد کا
ب گار ہوتا ہے۔ آج بھی یہ ڈاکٹر ہر سال بین الاقوامی کانفرنس کو مخاطب کرنے حیدرآباد آتے ہیں تو پہلے اپنے استاد کو اپنے
کرام سے مطلع کرتے اور گھر پر حاضر ہو کر دعائیں لیتے ہیں۔ چالیس سال پہلے کا شاگرد کانفرنس میں اپنے ایڈریس کے
ان کھلے طور پر اپنے استاد کی طرف اشارہ کر کے فخریہ انداز میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ آج جس مقام و مرتبہ پر پہنچا
سب کچھ ان ہی استاد کی شفقت آمیز تربیت کا نتیجہ ہے۔ اسی دور کے دیگر شاگردوں میں بیرونی ممالک میں خوب شہرت
، ڈاکٹر صمصام الدین (ڈاکٹر فخر الدین اڈمنسٹریٹر دُرِ شہوار ہاسپٹل کے والد) اور ڈاکٹر سید غوث ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ریسرچ
سلسلے میں اپنے قیام دوران میں نے خود دیکھا ہے کہ ریسرچ اسکالر مسز لکشمی نرسماں اپنی دیگر ساتھیوں کے ساتھ
فیسر جعفر نظام صاحب کے اجلاس کے سامنے سے گزرتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے
چھا آپ کس کو نمسکار کر رہی ہیں؟ پروفیسر صاحب تو اجلاس میں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے بڑے جذباتی و مؤدبانہ انداز
ں جواب دیا! جی صاحب! پروفیسر صاحب دیوتا ہیں۔ ان کا اجلاس مندر ہے۔ پروفیسر صاحب رہیں تو کیا نہ رہیں تو کیا، مندر کو
ی نمسکار کر کے ہم کو شانتی ملتی ہے۔

گلبرگہ میں تین سال قیام کے بعد ۱۹۵۲ء میں سٹی کالج آنے اور پھر آپ کا تبادلہ نظام کالج ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء تک یہیں
ہے۔ اس دوران تشنگان علم کی کثیر تعداد سیراب ہوتی رہی۔ اسی کے ساتھ آپ کے اندر بھی طلب علم کی تشنگی بڑھتی گئی
ری ایچ۔ ڈی کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے اپنے شفیق استاذ پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب کے مشورے سے
مائی چھٹیوں میں کیرالا یونیورسٹی کے مشہور ماہر خلوی جینیات (Cytogenetics) پروفیسر اے ابراہام کے تجربہ خانہ جایا
تے اور مسٹر نائنن (جو اس وقت ریسرچ اسکالر تھے) کے ساتھ مل کر خلوی جینیات (Cytogenetics) کی جدید ترین
کنکس پر کامل مہارت حاصل کی اور وہاں کی لائبریری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی کے کوئین
برز کالج میں داخلہ لیا اور پروفیسر گاڈورڈ (Godword) کی نگرانی میں سائنسی تحقیقات میں مصروف رہے۔ ۱۹۶۰
لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر وطن واپس لوٹے۔ آپ کے واپس آتے ہی آپ کا تبادلہ جامعہ عثمانیہ کر دیا گیا

جہاں ریسرچ کی بہتر سہولتیں فراہم تھیں۔ پروفیسر سکسینہ صاحب کی حرکی قیادت میں شعبہ کے اندر ریسرچ کے
سے چل رہے تھے۔ ہر طرف ہما ہمی تھی۔ پروفیسر سکسینہ صاحب جو خود بھی بہت بڑے سائنسی محقق، ادیب اور ۔۔
ہیں، جعفر نظام صاحب کی تحقیقی و تجسسی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے چناں چہ انھوں نے خواہش کی کہ ریسرچ
کا نگران تسلیم کیے جانے کا انتظار کیے بغیر ریسرچ اسکالرز کے کام کی نگرانی کا کام شروع کردیں۔ اس دوران آپ
تحقیقاتی مقالے ملکی اور بین الاقوامی جریدوں میں شائع ہونے۔ جلد ہی یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق آپ کو ریسر
تسلیم کرلیا گیا اور آپ کی راست نگرانی میں کئی اسکالرز کام میں منہمک ہونے۔ مس جوگیندر بھلا کو آپ کی پہلی ریسر
ہونے کا اعزاز حاصل ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ نباتیات پر کائناتی شعاعوں کے اثرات دریافت کیے۔ آپ کی زیر نگ
بائیس ریسرچ اسکالرز نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ریاست و بیرون ریاست اور بیرون ممالک بڑے عہد
ہیں۔ ڈاکٹر پشپا سریواستو جے پور یونیورسٹی میں ڈاکٹر ولاسنی کیرالا میں پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر کے سبھاش کاکتیہ یونیور
میں ڈاکٹر ہیں۔ اسے۔ فاروق عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر ہیں اور آپ کے تمام ہی شاگردوں نے بہترین استادوں
سے خوب نام کمایا۔ ڈاکٹر بی۔ کمار جنھوں نے ورنگل میں قیام کے دوران آپ کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش ک
نیویارک یونیورسٹی میں شعبہ انسانی جینیات (Human Genetics) کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان خوش نصیب فیض یافتگان
میرا بھی شمار ہے۔

پروفیسر جعفر نظام صاحب کی علمی و انتظامی صلاحیتوں کی شہرت یونیورسٹی کی سرحدوں کو پار کرکے ایوان ا
پہنچ چکی تھی۔ بحیثیت صدر شعبۂ نباتیات، ڈین فیکلٹی آف سائنس، ڈین فیکلٹی آف کالج ڈیولپمنٹ کونسل کئی اور
عہدوں پر بے داغ و بے لوث کردار اور عمدہ صلاحیتوں کے سبھی معترف ہوچکے تھے۔ چناں چہ ۱۹۷۹ء میں کاکتیہ
ورنگل کی وائس چانسلری کے لیے حکومت کو باصلاحیت، بہترین اڈمنسٹریٹر کی تلاش تھی جو تمام طبقوں خواہ سیا
مذہبی، گروہی ہوں یا انفرادی، اساتذہ ہوں یا طلبہ سب ہی کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہو۔ کیوں کہ اس وقت تو
یونیورسٹی کی حالت ناگفتہ بہ حد تک بگڑ چکی تھی۔ اندرونی جھگڑے، بیرونی مداخلتیں، باہمی رسہ کشی، تعلیمی نظام ا
امتحان غیر موثر، معاشی بحران، ڈسپلن کا فقدان، نکسلائٹس کی دراندازیاں، یونیورسٹی ان تمام خرابیوں کے نرغے م
ان حالات کے پیش نظر ڈاکٹر چنا ریڈی چیف منسٹر کی نظرِ انتخاب جعفر نظام صاحب پڑی اور وہ یہاں وائس چانسلر ب
گئے۔ آپ نے جوں ہی یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی، کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ تعلیمی ماحول بنا، نظم و نسق سنبھلا۔
کا وقار بحال ہوا اور ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں ممتاز و منفرد مقام حاصل ہوا۔ اپنی سہ سالہ میعاد کامیابی
کرکے پھر جامعۂ عثمانیہ لوٹنے اور تعلیمی و تحقیقی سرگرمیوں میں ۱۹۸۶ء تک منہمک رہ کر اور ۳۷ برس شاندار خدم
دے کر وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہونے لیکن ملک اور قوم کو آپ کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی ضرورت
چناں چہ آپ کو بیک وقت کئی اہم اعزازی عہدوں کی پیشکش کی گئی اور ایسی سیماب صفت باصلاحیت شخصیت کا بے
رہنا بھی مشکل تھا۔ جذبۂ خدمت اور صلاحیت یک جا ہوں تو وظیفے پر علاحدگی کوئی رکاوٹ نہیں بن سکی بلکہ ذمہ داریو
اور بڑھ گیا، چناں چہ وظیفے کے بعد جو وہ بہت ہی اہم ذمہ دار عہدوں پر فائز ہونے مثلاً چیرمن کالج سروس کمیشن، پ
جی۔ سی، وزیٹنگ کمیٹی چیرمن اسٹانڈنگ کمیٹی آف یو۔ جی۔ سی آن کوچنگ کلاسس فار مائنارٹی کمیونٹیز وغیرہ۔

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ آپ کو وظیفے پر علاحدہ ہوکر دو سال اور کاکتیہ یونیورسٹی کو چھوڑے چھ سال کا
تھا کہ یونیورسٹی کے حالات پھر بگڑ گئے۔ ۱۹۸۸ء میں یونیورسٹی جھکولے کھانے لگی۔ ارباب اقتدار کو پھر کار کر

وائس چانسلر کی جستجو ہوئی۔ اس بار چیف منسٹر جناب این ٹی راما راؤ صاحب نے پروفیسر جعفر نظام صاحب سے شخصی طور پر خواہش کی کہ آپ دوبارہ وائس چانسلری کی ذمہ داری قبول کریں اور یونیورسٹی کی ڈگمگاتی نیا کو سنبھالیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ وہاں کے حالات سے خوب واقف ہیں۔ آپ کے وہاں جانے سے ہی یونیورسٹی کے حالات پھر سے معمول پر آجائیں گے۔ چنانچہ اکتوبر ۸۸ء میں یونیورسٹی کے اس پرآشوب دور میں دوبارہ وائس چانسلری کی ذمہ داری قبول اور حسب توقع یونیورسٹی کو کامیاب قیادت فراہم کی اور دوسری میعاد ختم کرکے ۱۹۹۱ء میں علاحدہ ہوئے۔ نگاہ کی بلندی، سخن کی دل نوازی اور دل کے سوز نے جعفر نظام صاحب کے اندر ایک ایسی شخصیت کو ابھارا جو میری کے فرض کو پورا کر سکے گویا جعفر نظام صاحب کی زندگی اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

...

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: نتالیا پری گارنا
ترجمہ: اسامہ فاروقی

باب ۲

آگرے کی تصویریں

اسی وجہ سے پرانے کاغذات کرید کر تلاش کرتے ہوئے میں
فرصت کے اوقات میں اس میر افسانہ کے سارے نسب نامے کی
چھان بین کرتا رہا جس کی کہانی سنانے کا میں نے تہیہ کیا ہے۔
(ا۔ س۔ پوشکن)

ہندوؤں کے مقدس علاقے برج بھومی میں واقع ہے۔ دہلی سے آگرے کی سڑک برنداون نام کی بستی کے پاس سے گزرتی ہے جہاں کرشن جی مہاراج پیدا ہوئے اور جہاں انھوں نے اپنے بچپن کے، دل موہ لینے والی شرارتوں سے بھرپور کارنامے انجام دیے۔ یہ سڑک کروکشیتر کے میدان کے پاس سے بھی گزرتی ہے جہاں قدیم ہندوستان کے دو شاہی خاندانوں پانڈوؤں اور کوروؤں کی جنگ ہوئی تھی۔ آگرے کی شہرت اس وقت پھر بحال ہوئی جب مغل بادشاہوں نے اس کو دارالحکومت بنایا اور یکے بعد دیگرے بادشاہوں نے اپنے اس پایہ تخت کی تالابوں اور باغوں کے گجروں سے تزئین و آرائش کی۔ جا بجا تنے اور محل بنوانے اور بہ کثرت مسجدیں اور مندر تعمیر کروانے۔

اکبر اعظم کا وزیر اور مشیر ابوالفضل اپنی مشہور تصنیف "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے:

" آگرہ اپنی صحت بخش آب و ہوا کے لیے مشہور ایک بڑا شہر ہے۔ شہر جمنا کے کنارے پانچ کوس تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمنا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں خوش نما مکانات اور سرائیں تعمیر کی گئی ہیں جن میں ہر نسل اور قوم کے لوگ رہائش پذیر ہیں اور جو دنیا کے سبھی ملکوں کے مال و اسباب سے بھری ہوئی ہیں۔ بادشاہ اکبر نے یہاں سنگ سرخ کا ایک ایسا قلعہ تعمیر کروایا ہے جیسا ساری دنیا میں کسی سیاح نے نہ دیکھا ہو گا۔ اندرونِ قلعہ ہی بنگالی، گجراتی اور دیگر کاریگروں نے تعمیر کی پانچ سو نہایت عمدہ عمارتیں ہیں۔ مشرقی باب الداخلہ کے پاس نہایت چابک دستی سے تراشے ہوئے پتھر کے دو ہاتھی مع اپنے مہاوتوں کے کھڑے ہیں۔ پہلے آگرہ بیانہ کے نزدیک ایک گاؤں تھا جہاں سلطان سکندر لودھی کا دربار تھا۔ اسی مقام پر جلالت الملک نے اس عالی شان شہر کی بنیاد رکھی۔ ۱۵۵۶ء میں اکبر کے عہد میں آگرے کا نام اکبر آباد رکھا گیا۔ اس زمانے میں آگرے میں باشندوں کی تعداد لندن سے زیادہ تھی۔

اکبر اور اس کے جانشین علوم و فنون، دست کاری اور فنِ تعمیر کے سرپرست تھے۔ اکبر کے پوتے شاہ جہاں نے اپنی پیاری بیوی ممتاز محل کا مقبرہ تاج محل کے نام سے بنوایا۔ اپنے باپ شاہ جہاں کو معزول کرنے کے بعد اس کے بیٹے

.رنگ زیب نے اپنا دارالحکومت شاہ جہاں کے بسائے ہوئے شہر شاہجہاں آباد کو منتقل کیا جو موجودہ دہلی کا ایک علاقہ ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں دہلی کے ساتھ ساتھ آگرہ بھی ایرانیوں، افغانوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج کا نشانہ تھا اور جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے ۱۸۰۳ء میں، ہو سکتا ہے کہ غالب کے چچا کی تھوڑی بہت اعانت کے ساتھ، بغیر و خوبی انگریز جنرل لیک کے قبضے میں چلا گیا۔ مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے مرہٹوں کا سارا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیرِ حمایت قرار پایا۔۔ سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر شاہ عالم کا خطابِ بادشاہی برقرار رہا اور جیسا کہ ا۔ م اسیوف اپنی کتاب "۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی عظیم بغاوت" میں لکھتے ہیں۔ "دہلی کا انگریز رزیڈنٹ بادشاہ سے ملاقات کے وقت دکھاوے کے لئے آقا کے حضور میں ایک تابعدار حلقہ بگوش ہونے کا ڈھونگ رچایا کرتا تھا۔۔ انیسویں صدی کے آغاز میں آگرے کی انتظامی اور سیاسی اہمیت بالکل ختم ہو گئی اور اس نے ایک معمولی شہر کی حیثیت اختیار کرلی۔

۱۸۰۳ء کی لڑائی اور محاصرے کے دنوں میں آگرے میں ایک زور دار زلزلہ آیا تھا۔ آگرے کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی (متوفی ۱۸۳۰ء) نے اس موقعہ پر لکھا تھا:

بھونچال

سن بارہ سو اٹھارہ میں یہ واردات تھی
اول جمادی بارھویں تاریخ سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدھی رات تھی
بھونچال کیا تھا قدرت خالق کی بات تھی

دریا و کوہ ، شہر و بیاباں ہلادیا
اک آن میں ہلادیا اور پھر تھمادیا

باہر کواڑ لڑگئے ، زنجیریں ہل پڑیں
کڑیاں کڑک کڑک کے چھتوں سے نکل پڑیں
تھمبے ، ستون کانپے ، منڈیریں ڈہل پڑیں
دیواریں جھوم جھوم کے پنکھا سی جھل پڑیں

دریا و کوہ شہر و بیاباں ہلادیا
اک آن میں ہلادیا اور پھر تھمادیا

گھر گھر میں شور ہوگیا اور غل گلی گلی
روئے زمیں پہ پڑگئی اک دم میں کھلبلی
کوئی اللہ اللہ کہہ اٹھا ، کوئی علی علی
کوئی یا حسین کہہ اٹھا ، کوئی رام رام جی

دریا و کوہ و شہر و بیاباں ہلادیا
اک آن میں ہلادیا اور پھر تھمادیا

سن کہولت میں لکھے ہوئے ایک مکتوب میں وہ گزرے ہوئے واقعات کا ذکر کرتے ہیں: "میرے چچا نصراللہ بیگ کی خواہش تھی کہ میری پرورش آسودگی کے ساتھ ہو، لیکن ان کی قسمت میں بھی جلد ہی اس دار فانی سے کوچ کرنا لکھا تھا۔ میرے والد کی وفات کے کم و بیش پانچ سال بعد چچا نے بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح مجھے اس وادیٔ رنج و الم میں تنہا چھوڑ کر راہ عدم اختیار کی۔ ۱۸۰۶ء کے واقعے نے میرے لیے مستقل دوستوں کے سر چشمے کی حیثیت اختیار کر لی جب کہ چرخ ستم پیشہ کے لیے میرے تعلق سے یہ محض اس کی ایک معمولی شوخی تھی۔"

قلعہ ڈگ کی لڑائی میں شرکت کے صلے میں نصراللہ بیگ کو ۱۸۰۵ء میں انگریزوں کی طرف سے ایک جاگیر ملی اور اب وہ نہ صرف خود اپنے کنبے بلکہ اپنی زیر سرپرستی بھتیجوں [illegible] کے لیے [illegible] کی حیثیت رکھتے تھے تاہم بارہ ہی مہینے گزرے تھے کہ [illegible] کے دوران نصراللہ بیگ ہاتھی پر سے [illegible] گئی۔ فوراً پرانے زخم کھل گئے اور کچھ ہی دنوں میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جاگیر اچھی خاصی آمدنی والے دو گاؤں [illegible] بطور محصول پیش کی [illegible] باقی رقم زمینداروں کو ادائیگی، چار سو سپاہیوں کے گھڑ سوار رسالے [illegible] پر صرف ہوتی تھی۔ جاگیر کی سند ملکیت جنرل کے دستخط سے جاری ہوئی [illegible] نصراللہ [illegible] طور پر خدمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ جاگیر نصراللہ بیگ کو تاحین حیات [illegible] میں کمپنی کو قابل واپسی تھی اور اس کے معاوضے میں سابق مالک کے [illegible] الفاظ میں "وظیفے" کے مستحق ٹھہرتے تھے۔

اس لفظ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ یہ غالب کی زندگی کی [illegible] پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے کلید کا کام دے گا۔ "وظیفے" کے اردگرد ایک پیچیدہ اور الجھے ہوئے پلاٹ کے مختلف سین ہماری نظروں کے سامنے سے گزریں گے۔ [illegible] دھوکہ دھڑی بھی ہوگی اور قتل بھی، جعل سازی بھی ہوگی اور سزائے موت بھی، درازدستیاں [illegible] بھی ہوگا [illegible] ہو گا سوائے خاتمہ بالخیر کے۔ سب جاسوسی پلاٹ رکھنے والی اس کہانی کے اختتام پر حقیقت واضح ہوتی ہے [illegible] صنف کے [illegible] کے مطابق ایک طرح سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ شر پر خیر کی اور لاقانونیت پر قانون کی فتح ہوتی۔ بدی کو قرار واقعی سزا ملی اور نیکی کی جیت ہوئی۔

تاہم زندگی میں اکثر سب کچھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ قدرتی ناکامی، واقعات کا مضحکہ خیز اتفاق [illegible] بد قسمتی انسان کے نصیب میں علت و معلول کے ایک نامبارک سلسلے کو عرض وجود میں لا سکتی ہے، روح انسانی کی قسمت سے المناک کشمکش کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ مگر آگے نکل جانے کی بجائے واقعات کو سلسلہ وار بیان کرنا ہی مناسب ہوگا۔

اس پیچیدہ اور الجھے ہوئے پلاٹ کی ابتدا، سمرقند میں رہائش کے اسی زمانے میں ہوتی ہے جب مرزا قوقان بیگ کا اپنے باپ سے جھگڑا ہوا تھا۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا وہ اپنے ہم وطنوں کے ایک مختصر سے گروہ کی معیت میں وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ حاجی مرزا نامی ایک شخص بھی روانہ ہوا تھا جو اس دستے میں سائیس کی خدمت بجا لاتا تھا اور اس سارے جنگی سفر کو اپنے سرگروہ کے ہم عنان طے کرنے کے بعد قوقان بیگ کی سالی کی لڑکی سے شادی کر کے ان کا رشتہ دار بھی بن گیا۔ ان میاں بیوی کی ذریت حاجی خواجہ تھا جس نے اپنے رشتے کے بھائی نصراللہ بیگ کی ماتحتی میں فوج میں ترقی پائی۔ نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد ان کے رسالے کا وہ حصہ جو خدمت سے سبک دوش نہیں کیا گیا تھا باقی رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ بھی سازوسامان اور جنگی ہاتھی۔ بیک جدیوں کی شاخ ذکور میں نو سالہ مرزا اسداللہ خاں غالب سب سے مقدم وارث تھے۔ وراثت کے تمام امور کا انتظام حاجی خواجہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ابتدا میں، جیسا کہ سوانح نگار لکھتے ہیں۔ اس لے

فوجی سازوسامان پر قبضہ کر لیا۔ نواب احمد بخش کی شکل میں اس کو نئے سرپرست مل گئے اور ان کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس نے باقی ماندہ رسالہ اور جنگی ہاتھی نواب کی تحویل میں دے دیا۔

احمد بخش کی شخصیت ہماری کہانی کے لیے نہ صرف اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ "وظیفے" کے قضیے میں ان کو ایک اہم کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ مغلیہ سلطنت میں خوش حالی اور عزت کے بلند ترین مدارج پر فائز یہ شخص تمام امور میں اور ملازمت کے تعلق سے چلن میں کامیابی کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جسے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان میں مسلمان امراء اور برطانوی انتظامیہ کے تعلقات میں معیار یا نمونۂ کمال مانا جا سکتا ہے۔ یہ مغل فوجی افسر بھی نسلاً وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ فوج میں احمد بخش کی ملازمت کا آغاز گوالیار کے راجہ دولت راؤ سندھیا کے لشکر میں اتنا کارہائے نمایاں انجام دینے سے نہیں ہوتا جیسا کہ گھوڑوں کی کامیاب تجارت سے، جس میں، روایات کے مطابق، ان کو صاحب کرامات پیر خواجہ معین الدین چشتی کی مزار پر بروقت دعا کی وجہ سے بڑی مدد ملی۔ دولت مند ہو جانے کے بعد انھیں، غالب کے باپ کے برعکس، بڑی آسانی سے الور کے مہاراجہ بختاور سنگھ کے پاس فوجی ملازمت مل جاتی ہے اور فنِ سفارت میں اپنی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پہلے دولت راؤ سندھیا کے خلاف (جن کے وہ کچھ ہی عرصہ قبل ملازم رہ چکے تھے) مہاراجہ الور کی کشمکش میں انگریزوں کی اعانت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور پھر جلد ہی انگریزوں کے کہنے پر مہاراجہ پر اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو ۱۸۰۳ء میں [illegible] کے محاصرے کے موقع پر انگریزوں سے جا ملنے کے لیے راضی کر لیتے ہیں۔ کرایے کے سپاہی کے وجدانی احساس سے کام لیتے ہوئے احمد بخش نے صحیح صحیح تاڑ لیا کہ طاقت کس کی طرف ہے اور اس طاقت سے کمپنی کی خدمت وفاداری کے ساتھ بجا لاتے رہے۔ ہولکر کے خلاف لڑائی میں وہ میدان جنگ سے مہلک طور پر زخمی انگریز میجر جنرل فریزر کو اٹھا کر باہر نکال لائے۔ جاں بہ لب جنرل کو، مرنے سے پہلے احمد بخش کے کارنامے کی توصیف میں ایک خط لکھوانے کی مہلت ملی۔ بعد میں اس خط نے خاندانی تبرک کی حیثیت لے لی۔ احمد بخش، اقبال الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ بہادر جیسے شاندار خطابات سے نوازے گئے اور جنرل لیک اور مہاراجہ الور کے ہاتھوں گراں قدر انعامات کے مستحق ٹھہرے۔ انگریزوں کی طرف سے انھیں فیروزپور جھرکہ کا علاقہ اور مہاراجہ کی طرف سے لوہارو کی نوابی ملی اور موخرالذکر نام نے احمد بخش کے کنبے کے سبھی افراد کے خاندانی نام کے ایک جزو کی حیثیت اختیار کر لی۔ احمد بخش دہلی میں ٹھاٹ باٹ اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ تو یہی وہ شخص ہیں جن پر بعد میں نصراللہ بیگ کے اقربا کی بہبود موقوف تھی اور حاجی خواجہ انھیں کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جنگی ہاتھی اور گھوڑوں کی نگہداشت کے لیے اخراجات ضروری تھے۔ چناں چہ احمد بخش اس کے لیے سبیل سوچنے لگے۔ جاگیروں پر محاصل کا بار بہت تھا۔ صرف فیروزپور ہی کے معاوضے میں کمپنی پچیس تا تیس ہزار روپیے محصول لیتی تھی۔ باقی ماندہ رسالے کی نگہداشت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے احمد بخش نے کمپنی کے سامنے شرط رکھی کہ محصول کی رقم نصف کی حد تک کم کر دی جائے اور بچنے والی دس ہزار کی یہ رقم وارثوں کے لیے وظیفے پر خرچ کی جائے۔ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے تجویز منظور کی لیکن احمد بخش کے اصرار پر، ۷ جون ۱۸۰۶ء کو ہی حکم پر نظر ثانی کی گئی۔ انھیں وظیفے کی رقم کو آدھی کرنے کے معاوضے میں محصول میں مزید پانچ ہزار روپے کی چھوٹ ملی۔ وظیفے کی تقسیم خلاف توقع اس طرح سے قرار پائی:

حاجی خواجہ کو (نہ معلوم کیوں) دو ہزار روپے تاحینِ حیات ملنے قرار پائے، ڈیڑھ ہزار روپیے غالب کی والدہ عزت النسا، ان کی بیٹی چھوٹی بیگم اور نصراللہ بیگ کی بیوی کے لیے طے ہوئے اور ساڑھے سات سو روپیے فی کس مرزا اسد اللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں کے لیے مقرر ہوئے۔ پنشن وظیفے کے تعین کی یہ تفصیلات عوام الناس کے لیے یہاں تک کہ خود عزت النسا کے لیے پردۂ خفا ہی میں رہیں۔ وہ پہلے کی طرح اپنے والد کے گھر ہی میں سکونت پذیر رہیں اور ان کے یتیم بچے ان کے ساتھ گھر کے زنان خانے میں رہتے تھے۔ گھر کا بڑا نام تھا، کام ٹھاٹ باٹ سے چلتا تھا، بچوں کی کوئی فرمائش رد نہیں

کی جاتی تھی اور جیسا کہ سبھی سوانح نگار بالتواتر لکھتے ہیں ناز و نعمت نے ان کو حد درجہ بگاڑ دیا تھا۔

وہ مکان جہاں مرزا اسد اللہ خاں کی پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا آگرے میں اب بھی سلامت ہے۔

حویلی، دولت مند مسلمانوں کا مخصوص رہائشی مکان، متعدد باہم دگر مربوط عمارتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، جن کا رخ اندرونی انگنائیوں کی طرف ہوتا ہے۔ عمارت کے محیط کے ساتھ ساتھ کھلا برآمدہ یا بالفاظ دیگر ایوان ہوتا ہے جس کو ستونوں کی ایک قطار آنگن سے علاحدہ کرتی ہے۔ ایوان کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو جانے کے راستوں کی تزئین نفیس ٹیکوں پر کھڑی نیم مدور محرابوں سے کی جاتی ہے۔ نشتری کھڑکیاں، دیدہ زیب نقشیں دروازے اور رنگین لوحیں جن پر آیات قرآنی منقوش رہتی تھیں، سپاٹ، پلاسترکی ہوئی دیواروں میں جان ڈالتی تھیں۔ دوسری منزل پر بھی ایوان تھا۔ زنان خانے کا باب الداخلہ الگ تھا، جہاں مہمان خواتین پالکیوں میں بیٹھ کر آتی تھیں، جن پر بڑے اہتمام کے ساتھ پردے پڑے رہتے تھے۔ اس طرح سے مسلمان خواتین خود کو غیروں کی نگاہوں سے اوجھل رکھتی تھیں۔ پالکی میں آمدورفت اعلیٰ طبقوں کے افراد کا نہ صرف خاص حق بلکہ ان کا فرض منصبی بھی تھا۔ اگر کوئی مرد یا عورت سڑک پر پیدل چلتی دکھائی دے تو ان کا خاندانی ہونا خارج از بحث تھا۔ تقریب کے موقعوں پر امراء کی سواری کا جلوس بڑے طمطراق کا ہوتا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سیاح برنیر نے اس کا جو نقشہ کھینچا ہے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شاید ہی وہ اس سے بہت زیادہ مختلف رہا ہوگا: "سڑک پر آمدورفت کے وقت وہ لازمی طور پر عمدہ پوشاک زیب تن کیے رہتے ہیں۔ کبھی ہاتھی پر سوار رہتے ہیں تو کبھی گھوڑے پر یا پھر کبھی پالکی میں نکلتے ہیں، ان کے جلو میں عموماً سواروں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے جو ان کی حویلی پر پہرہ دینے والے سپاہیوں سے چنے جاتے ہیں اور پیادہ ملازمین بھی بڑی تعداد میں آگے آگے اور دائیں بائیں ساتھ ہوتے ہیں تاکہ سواری کے لیے راستہ صاف کریں، مور چھلوں سے اپنے آقا کو مکھیوں اور گرد سے محفوظ رکھیں، اس کی مسواک اور اگالدان لے کر چلیں، پینے کے لیے پانی اور کبھی کبھی بہی کھاتے اور دوسری دستاویزات ساتھ رکھیں۔"

شاعرانہ چہل قدمی کے لیے باغ تھے اور گلگشت کے لیے دوسری جگہیں بھی تھیں۔ "گزر گاہ" کا وجود جس کا اشعار میں اکثر نقشہ کھینچا جاتا ہے اور جہاں گرفتار محبت شاعر اور درویش حسینہ دلنواز کے گزرنے کا انتظار کیا کرتے تھے، حقیقت میں تو شاید ہی ہاں خواب و خیال کی دنیا میں رہا ہوگا۔ مزید برآں سیاہ برقعے میں ملبوس اور چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ایک مسلمان خاتون کے حلیے میں حسینہ دلنواز کو تاڑ جانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہاں چلنے کے شائستہ انداز سے، جس کی قصیدہ خوانی شعرا کرتے رہے ہیں، شاید کچھ مدد ملتی رہی ہو۔ عورتوں کے باہر نکلنے کی ممانعت اور پردے کا رواج مسلمانوں میں بہت سخت تھا۔ دوسرے مذہبی گروہوں سے تعلق رکھنے والی ہندوستانی عورتیں پردے کی پابند نہیں تھیں لیکن دستور کے مطابق اونچے طبقوں کی ہندو عورتیں بھی اس کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔

آگرے میں صدیوں سے مختلف ذاتوں، قومیتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے آئے تھے۔ پورے پورے کوچے اور محلے ہم مذہبوں، ہم وطنوں یا کسی ایک پیشے یا حرفت سے متعلق لوگوں کی بستیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ محلوں اور کوچوں کے نام بھی اکثر اس کی مطابقت سے ہوتے تھے۔ مثلاً کشمیری محلہ، گوالوں کی گلی وغیرہ۔ عہد وسطیٰ کے شہر کی بنیاد قلعہ ہوتا تھا جس کے اندر امرا کے مکانات بھی ہو سکتے تھے اور جنگ کے زمانے میں محافظ فوج کی چھاؤنی بھی ہو سکتی تھی۔ جب آگرے کا قلعہ جنرل لیک کے حوالے کیا گیا قلعے کی محافظ فوج میں چھ ہزار سپاہی تھے۔ نظم و نسق اور تشخیص محصول کے اعتبار سے شہر کی اکائی محلہ ہوتا تھا۔ ک۔ ز۔ اشرفیان اپنی تصنیف "عہد وسطیٰ کا ہندوستانی شہر" میں لکھتے ہیں کہ "محلے کا نظم و نسق میر محلہ سنبھالتا تھا جس کے مددگار دو مخبر ہوتے تھے جو تمام واردانوں واقعات، لوگوں کے ورود اور ان کی روانگی کے بارے میں اطلاعات مخصوص کتابوں میں درج کرتے تھے۔"

شہر کی ساخت کی عہد وسطیٰ میں پائی جانے والی یہ تمام خصوصیات انیسویں صدی میں بھی انگریزوں کے فنِ تعمیر کے زیر اثر وقوع پذیر ہونے والی بعض تبدیلیوں کے باوجود نہ صرف آگرے بلکہ ہندوستان کے دیگر شہروں میں بھی برقرار رہیں۔ غالب کے زمانے میں بھی محلے کے تمام باشندے ایک دوسرے کے بارے میں پوری معلومات رکھتے تھے اور حکام، جنھیں مذکورالصدر مخبروں کی خدمات اب بھی حاصل تھیں، ان باشندوں کی تمام کارروائیوں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے باشندوں کی ذات برادری کی بنیاد پر تقسیم کے نتیجے کے طور پر اونچی ذات کے افراد اچھی زمینوں پر، ترجیحاً ندی کے اونچے کنارے پر رہائش پذیر ہوتے تھے جب کہ نیچی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے کاریگر شہر کی حدود کے باہر بستیوں میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں نووارد مسلمانوں میں بھی، جن کے روایتی معاشرتی نظام اور ذات پات کے نظام میں اصولی طور پر کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی، مرور زمانہ کے ساتھ مسلمان ذاتیں معرضِ وجود میں آگئیں۔ ک۔ ز۔ اشرفیاں لکھتے ہیں: "مسلمان مغل اور پٹھان ذاتوں پر مشتمل سپہ گر اور جاگیر دار امرا میں (جو بشمول سادات اور شیوخ "اشراف ذات" کہلاتے تھے زیادہ تر وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان کے نووارد اور ان کے اخلاف شامل تھے۔ مشہور مورخ نورالحسن کے الفاظ میں مسلمان ذاتوں کا دستاویزات میں کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن ان کے وجود کا کبھی انکار نہیں کیا گیا۔

دھوبیوں، جاروب کشوں اور بھنگیوں، گویوں، چماروں اور مچھیروں کا شمار سب سے زیادہ نیچ ذاتوں میں ہوتا تھا۔" انتج۔ یا پیشے کی بنیاد پر قائم ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں میں قابل ذکر ڈوم یعنی بازاری گویے، جاروب کش یا بھنگی اور چتاؤں کے لیے سوکھی لکڑی جمع کرنے والے یعنی میم ہیں۔ بیرونی کی "کتاب الہند" میں بھی ذکر ملتا ہے کہ "ہادی (نویسندے) سب سے زیادہ معزز مانے جاتے ہیں کیوں کہ وہ ہر طرح کی آلائشوں سے برتر ہیں، ڈوموں کی ذات ان کے بعد آتی ہے کیوں کہ وہ ستار بجاتے ہیں اور لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔۔ اور یہ بالکل بجا بھی ہے کیوں کہ فنِ رقص اور فنِ موسیقی کے بغیر ہم ہندوستان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر گانے بجانے والوں اور اداکاروں یعنی بھانڈوں کا شمار سب سے زیادہ نیچی ذاتوں میں تھا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، مشرق اور مغرب میں عہد وسطیٰ کے دیگر متعدد سماجوں میں بھی صورتِ حال یہی تھی۔ مسلمانوں میں بھی ان کی ایک روایتی گانے بجانے والوں کی برادری تھی جو مراثی کے نام سے موسوم تھی۔ زنان خانے کے لیے میراثنوں کے پاس گانے بجانے کا الگ پیشہ نامہ ہوتا تھا۔

باقاعدہ اور چھاپہ مار لڑائیوں کے بعد آگرے میں اب بحالی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور شہر پھر سفید سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تاریخی یادگاروں اور بد نصیب غربا کی جھونپڑیوں کے تضادات کو اپنے دامن میں سمیٹے، معمول کے محنت و مشقت والے دنوں اور تہواروں کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہندوستانی ادیب خورشید الاسلام نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آگرے کے سربرآوردہ مسلمانوں میں سے ایک کے عالی شان مکان میں رہنے والے مرزا اسداللہ خاں، ہو سکتا ہے کہ کم حیثیت گھروں والے اور اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار محنت کش عوام والے آگرے سے، بہ الفاظ دیگر اس آگرے سے جس کی تصویر کشی نظیر اکبرآبادی نے کی ہے، واقف بھی نہ رہے ہوں لیکن پھر بھی نظیر کے نغمے جو کوچہ گرد گویے سارے شہر میں گاتے پھرتے تھے ان کے کان میں تو ضرور پڑے ہوں گے:۔

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے

جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

لوگوں میں تفریق کی متعدد وجہیں تھیں۔ دولت اور افلاس بھی ان کو جدا کرتے تھے اور اونچی اور نیچی ذاتوں سے تعلق زبان، عادات و اطوار، خوراک، مذہبی رسوم اور لباس کے اعتبار سے بھی ان میں فرق تھا، لیکن اگر ان کو کوئی شئے متحد کرتی تھی تو وہ تیوہار تھے۔ سارے ہندوستان کی طرح آگرے میں بھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کہ یہ ہندوؤں کی ہولی، دیوالی اور دسہرہ ہے، مسلمانوں کی عید اور عرس ہیں یا پھر ان دونوں مذاہب سے بالکل غیر متعلق نوروز کا تہوار ہے۔

ہولی کا تیوہار مارچ میں پڑتا تھا۔ یہ آمدِ بہار اور درختوں کے پھولنے کا تیوہار تھا۔

لوگ پہلے ہی سے طرح طرح کے پسے ہوئے رنگ تیار کرتے تھے اور تیوہار کے دن وہ پر مسرت اودھم شروع ہوتا جس کے دوران لوگ ایک دوسرے کو رنگین پانی سے شرابور کرتے اور ایک دوسرے پر گلال چھڑکتے۔ قہقہے لگاتے ہوئے اور دھنک کے سارے رنگوں میں سر سے پاؤں تک رنگے ہوئے عام لوگ اور اونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان بلا تخصیص ایک دوسرے پر پچکاریوں سے رنگ ڈالتے اور خوشی مناتے۔ آپ کسی کے پاس بھی جاکر مٹھی بھر گلال سے اس اجنبی کو رنگ دیجیے اور جواب میں سر سے پاؤں تک اپنی رنگائی کروالیجیے۔ تیوہار سے عین قبل عورتیں اپنی ہتھیلیوں پر مہندی سے نفیس گل بوٹے بناتیں۔ اس فن کی ماہر عورت اور ہر ایک قابلِ بوٹوں کا اپنا الگ نمونہ ہوتا ہے۔ ہلکی آنچ پر قبل از قبل پکایا ہوا مہندی کا گہرے ہرے رنگ کا گریرے جیسا لیپ ہتھیلی پر لگاتی اور حنا سانولی ہتھیلیوں میں سنہرے بیل بوٹے بناتی ہوئی جذب ہوجاتی اور یہ گل بوٹے ہولی کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک اس تیوہار کی یاد دلاتے۔ بڑی بڑی انگیٹھیوں پر میدے کی مٹھائیوں کے گھی میں تلے جانے کی چھن چھن کی آواز سنائی دیتی، اطراف کی ہر شئے جلتی ہوئی عود و لوبان کی خوش بو سے معطر ہوتی، ہوا نشیلی اور خوش بودار ہوتی اور گلال کے بادل اڑتے ہوتے ہولی آئی، ہولی آئی۔ شہر کی گلیوں میں اور شہر کے اطراف بستیوں میں موسیقی کی آواز سنائی دیتی، ڈھول کی گمک، شہنائی اور بانسری کی تانیں سنائی دیتیں، جشن کے جلوس نکلتے نٹ تنی ہوئی رسی پر ناچتے اور سڑکوں پر کرتب دکھاتے۔ سدھائے ہوئے جانوروں کا تماشا قابلِ دید ہوتا۔ ان میں لہنگا پہنی ہوئی اور گھنگھرو باندھی ہوئی بندریاں بھی ہوتیں اور تیوہار کی مناسبت سے نقش و نگار، جھالروں، پھندنوں اور ماتھے پر پہنائے جانے والے گہنوں سے مزین ہاتھی بھی ہوتے۔ بین بجاکر سانپ کو مست کرنے والے سپیروں کا تو پوچھنا ہی کیا، ان کے ساتھ ان کی بید کی پٹاریاں ہوتیں اور ان کے اندر ان کے وہ جان لیوا مشمولات۔ آپ نے نام لیا اور حاضر ہیں، سپیرے کی بین کی تانوں پر سانپ مست لہرا رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سبھی جان دار ہولی کا جشن منا رہے ہیں۔ نظیر اس تیوہار کا گن گان یوں کرتے ہیں

ہولی کی نظیر اب تو بہاریں ہیں اہاہا
محبوب رنگیلوں کی قطاریں ہیں اہاہا
کپڑوں پہ جمی رنگ کی دھاریں ہیں اہاہا
سب "ہولی ہے ہولی" ہی پکاریں ہیں اہاہا

کیا عیش ہے کیا رنگ ہے کیا ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

مسلمانوں کی عید اور ہندوؤں کی دیوالی یکے بعد دیگرے پڑتیں۔ ہولی اور قدیم ایرانی تیوہار نوروز کا جشن تقریباً ایک ہی وقت میں منایا جاتا، خاص طور پر اس لیے کہ دہلی کی طرح آگرے کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا کے تارکینِ وطن پر مشتمل تھا اور یہ لوگ اپنے ساتھ زمانہ اسلام سے قبل کا سالِ نو کا تیوہار بھی لائے تھے۔ غالب لکھتے ہیں

ہند در فصل خزان نیز بہارے دارد | تو نہ گوئی سبزہ حلی بند خیابان آمد
دی و بہمن کہ در اقلیم دگر یخ بندد | اندرین ملک گل و سبزہ فراوان آمد
تابرد داغ غم ہجر شقایق ز دلش | گل صد برگ بہ دل جوئی دہقان آمد
نیشکر نیز بہ صف آراست کہ بود بہ نسیم | گفت جائیست دگر سرزدہ نتوان آمد

ہندستان میں تو خزاں میں بھی بہار رہتی ہے اور سبزہ شہر کو ایسے رنگ و تاب دیتا ہے جیسے ہولی منائی جاری ہو۔ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں دیگر علاقوں میں پالا پڑتا ہے لیکن اس ملک میں کثرت سے گلاب کھلتے اور سبزہ اگتا ہے۔ باغبان کی یاد میں لالہ مغموم ہوا تو اس کی تسکین کے لیے گلاب شگفتہ ہو گئے۔ دہقان نے بادِ صبح سے کہا کہ یہاں نیشکر اس طرح صف آرا ہے تاکہ پژمردگی کا گزر بھی ہونے نہ پائے۔

غالب نے آگرے کے دور کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ آگرے کے بارے میں غالب کے خطوط اور اشعار میں معدودے چند مقامات پر علاحدہ علاحدہ ذکر ملتا ہے لیکن ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت اس نوجوان امیر زادے کے سامنے زندگی کی جلوہ سامانیوں میں خوشی و خرمی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا چناں چہ اس عہد کا ذکر ہمیشہ مسرت و انبساط کا رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے۔

هوا عبیر فشانست و ابر گوہر بار
جلوس گل بہ سریر چمن مبارک باد
رباب نغمہ نوازست و نے ترانہ فروش
خروش زمزمہ در انجمن مبارک باد
بہ بزم نغمۂ چنگ و رباب ارزانی
بہ باغ جلوۂ سرو و سمن مبارک باد
فضائے آگرہ جولاں گہ مسیح و مے ست
زمین بہ ہم نفسان وطن مبارک باد
چہ حرف ہم نفساں فرخی ز بخت من ست
ز بخت فرخ من ہم بہ من مبارک باد

یہ صحیح ہے کہ شاذ و نادر استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر اس طرح کے تذکروں میں ٹھوس تفصیلات بہت کم ہیں۔ خولہ اشعار میں بھی ان کا فقدان ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ یہ اشعار آگرے کے نئے گورنر جیمس ٹامسن کی مدح میں لکھے گئے ایک قطعے سے لیے گئے ہیں۔ تاہم اس وجہ سے انھیں اہمیت نہ دینا اور نظر انداز کرنا بھی مناسب نہ ہوگا۔ اس زمانے میں ٹھوس تفصیلات سے اجتناب اور تصنع اور تکلف غیر معمولی ادبی مہارت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔ خواہ وہ قصیدہ یا قطعہ ہو یا نثر مرصع، مدح کا چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بے تعلق کیوں نہ ہو، ایک معین عملی مقصد ہوتا ہے۔ اس کی غایت کسی اہم واقعے کا گن گان کرنا ہوتا ہے۔ ممدوح کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ادبی کاوش کا معاوضہ دے اور شاعر کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی ادبی محنت کی اجرت وصول کرے۔ ہم لوگوں کو جن کا تعلق روایات سے بیگانگی کے عہد سے ہے، ادبی اظہار نفس کی اس شکل کو ٹھیک سے سمجھنے اور اس کی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کا اعتراف کرنے کے لیے معینہ سعی و کوشش کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب ہم انیسویں صدی عیسوی کے پہلے پچاس سال کے اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں قرونِ وسطیٰ کے اصناف ادب کے نظام سے اور عہد وسطیٰ کی اس جمالیات سے سابقہ پڑتا ہے، جس کی رو سے

موضوع اظہار سے سلوک کی تعیین، اظہار کی غرض و غایت پر منحصر ہوتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات فن کار کے لیے سب سے زیادہ اہم وہ کیفیتِ مزاج ہوتی ہے جس سے وہ واقعات جن کا ذکر کیا جارہا ہے، جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب غالب کے عزیز اور قریبی دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں کسی کام سے آگرے گئے، تو غالب انھیں خط لکھتے ہیں۔ وطن کے تقریباً تیس سال بعد وہاں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ شاعر اپنے دوست سے مخاطب ہوتا ہے "برادر عزیز! غالب کی آہیں اور آنسو یعنی اکبر آباد کی آب و ہوا خدا کرے تمھیں ساز گار ہو۔ اگرچہ کہ تم مجھ سے دور ہو لیکن میرا خیال تم تک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارا تعلق قلبی اتنا قریبی ہے کہ جدائی ہمارے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی۔ یہ اچھا ہوا کہ اس دورانہ کے سبب جو مجھے تم سے ہے میری آنکھیں اور میرا دل تمھارے ہم سفر ہیں اور پردیس میں رہتے ہوئے میری ملاقات کی مسرت سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ خدا نہ کرے کہ میرا اکبر آباد کسی کو ناپسند خاطر ہو۔ خدا کرے یہ وہاں سے گزرے تو خدا سے اس کی سلامتی اور آبادی کی دعا مانگے۔ یہ اجڑا ہوا شہر اور یہ آباد خرابہ کبھی مجھ جیسے آشفتہ کا گھر تھا اور آج بھی اس درویشوں کی بستی میں زمین کے ہر چپے سے چشمۂ خوں رواں ہے۔ اور وہ بھی زمانہ تھا کہ گھاس کی ایک ایک پتی سے محبت ٹپکتی تھی اور ایک پودا بھی ایسا نہ تھا جس پر دل عاشق نہ پھلتا ہو۔ اور جب اس میں نشہ آور نسیم سحر کے جھونکے آتے تھے دل اس طرح سے دھڑکنے لگتے تھے کہ رندوں کے سر سے خمار صبح اور کافور اور پرہیز گاروں کے دل سے دعاء صبح گاہی کا خیال ہوا ہوجاتا تھا۔۔ اس گل زمین کا ہر ذرۂ خاک میرے لیے مسرت بخش کشش رکھتا تھا اور اس گلشن کی ایک ایک پنکھڑی کو میں تہ دل سے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن زمانہ تمھاری طرف نظر ڈالتے ہوئے میں دو سوال کرتا ہوں: کیا میرا دوست خط کا جواب دے گا؟ جواب نہ دینے کی کوئی وجہ ادا سے رخشِ سنگی نے میری دعائیں قبول کیں اور ندی نے زبان موج سے میرے سلام کا کیا جواب دیا؟"۔

کاش ان تذکروں میں ہمیں آگرے سے منسوب کچھ جیتے جاگتے مناظر اور طول طویل گفتگو کے بجائے تھوڑے بھی ملتے تو غالب کی جوانی کے دنوں کا نقشہ کسی وضاحت سے ہمارے سامنے آجاتا۔ یہاں تو بس آخری جملے میں آگرے کی مخصوص نشانیوں کا ذکر آیا ہے، ایک تو جمنا ندی کا اور دوسرے گلابی بھر بھرے پتھر سے تراشے ہوئے گھوڑے کے مجسمے کا جسے سپہ سالار جے سنگھ کے پسندیدہ صبا رفتار گھوڑے کے اعزاز میں اکبر بادشاہ کے حکم سے نصب کیا۔ غالب اپنے خط میں از راہِ مزاح اس مجسمے کو "شاہنامہ" کے بطل داستان رستم کے افسانوی گھوڑے رخش کی مناسبت سے "رخشِ سنگی" کا نام دیتے ہیں۔

اس عبارت کی بنیاد پر حقیقت حال کی باز تخلیق عملاً ناممکن ہے۔ اس کے باوجود خط سے اس کے لکھنے والے کی کیفیت مزاج کی تبدیلیوں کا بڑی وضاحت سے پتہ چلتا ہے، وہ تبدیلیاں جو آگرے سے مکتوب نگار کے تعلق قلبی اور اس کی صورتِ حال کے تعلق سے اداسی کے اظہار اور گذشتہ دنوں کی مسرت انگیز یادوں سے لے کر ان جذبات واحساسات بازگشت کے بے قراری سے انتظار تک پر محیط ہیں۔ خط میں تصویر کشی کی جس صلاحیت کا مظاہرہ ہوا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بیش تر پیکر خیالی مرئی ہیں، خاص طور سے دل جیسے عجیب و غریب پھلوں سے لدے ہوئے پودوں کی اپنی تمثیلیت کے لحاظ سے کم و بیش کلیتاً مصنوعی یہ چھوٹی سی دنیا شگفتہ خاطر قلب انسانی کی ایک نشانی ہے۔ الفاظ ہونوں کی سجاوٹ مکتوب نگار کی افتادہ طبع اور ہنر مندی کا ثبوت ہے اور بالکل نجی اور طرّہ یہ کہ فارسی میں لکھے گئے اس کی نزاکتیں حیرت میں ڈالتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بایں ہمہ ہم کو پتہ نہیں چلتا کہ پھولوں سے لدے ہوئے سبزہ زاروں کی بجائے شہر میں ا ویرانے کیوں دکھائی دیتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ یہاں ذکر، مجازی ویرانوں، ٹوٹے ہوئے دل اور افسردگی کی اشاریا

ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ جوانی کے گزرے ہوئے دنوں کا نوحہ ہو، بات یہ ہے کہ عمر گذشتہ کا ماتم بھی کئی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے اذکار کا مطلب کیا ہے۔ یہ اذکار قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہیں، لیکن حکایت ان میں شہرِ دل کی بیان کی جاتی ہے اور اسی لیے اپنے مخصوص رواتی و سائل سے سہی، پھر بھی وہ ایسے احساسات کو رفعت بخشتے اور ان کی تعمیم کرتے ہیں جو ہم میں سے کسی کا بھی مقدر ہو سکتے ہیں۔

جب احساسات اور کیفیتِ مزاج کی بات چلی ہے تو یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ ان کی اس طرح سے توصیف اور صراحت تو بہت مشکل ہے جیسے کسی مادی شے کی کی جاتی ہے۔ اس سے تو نثر کی وہی ترقی یافتہ روایت عہدہ برا ہو سکتی ہے جس میں نفسیاتی نثر نگاری کی کم از کم داغ بیل تو پڑ چکی ہو اور غالب کے عہد کی نثر میں اس طرح کی روایت کا وجود ابھی نہیں تھا۔ غالب کے خطوط ایسی نثر کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں جسے عہد جدید کی صنف ادب قرار دیا جا سکے لیکن غالب اس راستے کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں، اس بارے میں اتفاق رائے کا فقدان ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نظامِ ادب میں موضوع کی توصیف و صراحت کو ایک ایسا اہم شعری مقصد سمجھا جاتا تھا جس کی تکمیل کے لیے اعلیٰ درجے کی ہنرمندی درکار تھی۔ خود مرزا غالب نے موضوع کی توصیف کس طرح سے کی ہے، اس پر ہم گفتگو آگے کریں گے۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام میں تخصیص کے ساتھ آگرے، وہاں کی طرزِ زندگی، رسوم و رواج، تیوہاروں اور معمول کے محنت و مشقت والے دنوں کی توصیف و صراحت میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ شاید انھیں سے ہمیں غالب کے بچپن کے عہد کے شہر کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات مل سکیں؟ مثال کے طور پر نظیر کی مشہور نظم "آگرے کی لکڑی" ہی لیجیے۔ اشعار میں آگرے اور اس کے مضافات میں پائی جانے والی لکڑی کی ایک مخصوص لمبی اور پتلی قسم کا ذکر ہے۔

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کوئی ہے زردی مائل کوئی ہری بھری ہے
پکھراج منفعل ہے پنّے کو تھرتھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ یار و رانجھا کی بانسری ہے

دیکھیے یہاں کس طرح سے ککڑی کی توصیف کی گئی ہے۔ جہاں تک رنگ میں پکھراج، مٹھاس میں گنے اور شکل میں ریشم کی تکلی سے تشبیہ کا سوال ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ تشبیہات موضوع سخن کو قاری کی حد نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ مگر آگے جو کچھ شروع ہوتا ہے اسے تو بادی النظر میں من مانی ہی سے تعبیر کیا جانے گا: ایسی ککڑی جیسے فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں جیسے سرد آہیں اور جیسے لیلیٰ کی انگلیاں! کیا یہ سب واہیات باتیں ہیں؟ بالکل نہیں! بات یہ ہے کہ یہاں ہمارا سابقہ شاعرانہ توصیف کے ایک ایسے پیچیدہ اور نہایت دیدہ ریزی سے تکمیل کو پہنچائے ہوئے نظام سے ہے جس میں

شاعر کی تمام توجہ موضوعِ تشبیہ پر مرکوز رہتی ہے، بہ الفاظ دیگر اس شئے پر جس سے موضوعِ سخن کو تشبیہ دی جا رہی ہے، کوئی فکر کی بات نہیں اگر یہ امر ہمارے لیے ایک معمہ ہی رہا کہ آگرے کی لکڑی میں آخر کیا خاص بات ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے! آخر کار لکڑی محض ایک لکڑی ہی تو ہوتی ہے! بہر حال اتنا تو معلوم ہو گیا کہ لکڑیاں آگرے میں ہوتی تھیں اور اپنے بچپن میں غالب نے ان کا مزہ چکھا ہو گا۔ شاعری اس لیے تو نہیں کی جاتی کہ نباتیات کے تعلق سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو!

پھر بھی غالب کی زندگی کے آگرے میں گزارے ہوئے عہد کے بارے میں معلومات کی قلت کے باوجود، غالب کے خطوط اور ان کے سوانح نگاروں کی شہادتوں کی بنیاد پر ہم ایک حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالب کی بہ حیثیت ایک شخصیت تشکیل میں کون سے عوامل کار فرما رہے، ان کے بچپن اور لڑکپن میں کون سے اوامر مستقبل کے لیے اہمیت کے حامل تھے اور کون سے حالات ان کی صلاحیت کے ارتقا پر اثر انداز ہوئے۔

اس عمر میں، جسے ہمارے پاس عام طور سے لڑکپن مانا جاتا ہے، مرزا اسداللہ خاں میں سنِ بلوغ کے آثار کم و بیش نمایاں تھے۔ سرخ و سفید رنگت، ابھری ابھری بھوؤں کی ہڈیوں کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں اور واضح نقوش والے دہانے کا مالک، یہ خوب صورت لڑکا اپنی "مغلوں" والی ظاہری شکل و شباہت اور "مغلوں" والی جوشیلی طبیعت کے ساتھ ہر جگہ مرکزِ توجہ بن جاتا تھا۔ جیسا کہ غالب نے سال ہا سال بعد اپنے دوست مرزا حاتم علی مہر کو لکھا: "بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اسی کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ رئیس گھرانوں کے نوجوان ہر قسم کی بندشوں سے آزاد تھے اور یہی بات زنانے کے لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اس لڑکے پر بھی صادق آتی تھی۔ چناں چہ ابتدائی سالوں ہی میں اس نوجوان نے درسی نصاب کے علاوہ علوم و فنون کے بعض دوسرے شعبوں میں بھی کافی دست گاہ حاصل کر لی تھی جن میں، جیسا کہ بعض سوانح نگار کنایتہً ذکر کرتے ہیں۔ "عشق و محبت کے فنِ لطیف" کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں تھی۔ بہر حال، جیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے، خاندان کے بزرگوں کے تیرہ سالہ مرزا کو بیاہنے کے فیصلے کی وجہ محض رواج کی پابندی کی پرانی عادت نہیں تھی، بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ شادی کے نتیجے کے طور پر اس نوجوان کے مذکورۂ بالا میلانِ طبیعت کے لیے ایک مقررہ جہت مل جائے گی۔ بارہ سالہ لڑکی امراؤ بیگم کا مرزا اسداللہ خاں کی بیوی کی حیثیت سے انتخاب کیا گیا۔ وہ لوہارو کے نواب احمد بخش کے سگے بھائی الٰہی بخش معروف کی بیٹی تھیں۔ اس نسبت سے وہ نصراللہ بیگ کی بیوہ کی بھتیجی بھی ہوتی تھیں جو، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، الٰہی بخش اور احمد بخش کی بہن تھیں۔ اس طرح سے مرزا اس لوہارو خاندان کے رشتے دار بن گئے جس کا اس زمانے کے نامور ترین مغل خاندانوں میں شمار ہوتا تھا، اس طرح سے مرزا کے ان احمد بخش کے ساتھ اور قریبی تعلقات رشتہ داری قائم ہو گئے جن پر مرزا کی پنشن کا انحصار تھا اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، اس امر واقعہ سے مرزا کی زندگی کے اور بھی بہت سے اہم واقعات وابستہ ہوں گے۔

فی الحال ہم مرزا اسداللہ خاں کی مدرسے میں پیش رفت کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ آگرے میں انھوں نے تحصیلِ علوم کے تمام روایتی مراحل طے کیے۔ یہ درسی روایت صدیوں پرانی تھی لیکن اس میں انجماد بالکل نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ جیسا کہ ہندوستانی غالب شناس ظ۔ انصاری لکھتے ہیں اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے سمرقند و بخارا سے لے کر جنوبی ہندوستان تک نظامِ تعلیم عملی طور سے یکساں تھا۔ ادبی رجحان کی تسکین فارسی زبان و ادب کے مطالعے سے ہوتی تھی اور مذہبی علوم سے واقفیت کے لیے عربی نصاب کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔

ظ۔ انصاری کا خیال ہے کہ موخرالذکر کے مطالعے میں غالب نے بدرجہا کم دل چسپی دکھائی۔

نصابِ تعلیم میں شامل دینی علوم پر عبور کے لیے قرآن، پیغمبر اسلام کی احادیث و سیرت یعنی سنت رسو تفسیر قرآن، اسلامی علم قانون یعنی فقہ، علم اخلاق، تاریخ اور طب سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان علو "منقولات" یا "علوم نقلی" میں شمار کیا جاتا تھا کیوں کہ ان سب کا ماخذ قرآن قرار دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ گویا کہ نا کئے گئے ہیں یا پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے ذریعے لوگوں تک منتقل ہوئے ہیں (بہ الفاظ دیگر منقول ہوئے ہیں)۔ دوسر علوم یعنی منطق، صرف و نحو اور فلسفے کا شمار علومِ عقلی میں یعنی ایسے علوم میں ہوتا تھا جو عقل انسانی کے ذریعے ما وجود میں آئے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی میں سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹۔۱۵۱۷ء) نے منطق اور فلسفے کو درسی نصاب میں شا کیا اور اکبر کے عہد میں ان میں علوم قطعیہ (یعنی ریاضیات وغیرہ) کا اضافہ کیا گیا۔ درس نظامی میں ادبیات اور علوم کے علاوہ موسیقی، خوش نویسی، مصوری اور عملی فن کاری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن صدیوں پرانی روایت کے اتباع خود درس و تدریس کے طریقوں میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ اس موضوع پر سعدی شیرازی نے بھی مزاحیہ انداز میں ہے "اس سال جب سلطان محمد خوارزم شاہ نے اپنی سود مند شرائط کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کیے میں کاشغر کی ج مسجد گیا اور وہاں میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں زمخشری کی صرف و نحو کا مقدمہ تھا اور وہ پڑھ رہا تھا۔ ضرب عمر (زید عمر کو مار رہا ہے)، یہاں فعل کا رخ عمر کی طرف ہے۔۔ میں نے کہا۔ "میرے بیٹے، چین اور خوارزم میں صفائی ہو گئی مگر زید اور عمر کے مابین اختلاف پہلے کی طرح برقرار ہے۔۔ نوجوان ہنسا اور اس نے دریافت کیا کہ میری پید کہاں کی ہے۔ میں نے جواب دیا" میری زاد بوم شہرۂ آفاق سرزمین شیراز ہے"۔ اور حال آں کہ غالب اپنی اصل سے آفاق سرزمین توران والے تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی عیسوی میں بھی عربی صرف و نحو کا مطالعہ انھیں درسی کتابو مدد سے کیا جیسا کہ اس لڑکے نے جس سے تیرھویں صدی عیسوی میں سعدی کی ملاقات ہوئی تھی۔

مرزا اسد اللہ خاں نے کافی کم سنی ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ حال ہی میں ان کا سات سال کی عمر میں لکھا ہوا ایک دست یاب ہوا ہے۔ خط میں مکتوب نویسی کے تمام آداب اور حفظ مراتب کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس میں سب سے چسپ چیز اس چھوٹی سی مہر کا نقش ہے جو کمسن مرزا کے لیے خاص طور سے بنوائی گئی تھی اور جو دستخط کا کام دیتی تھی۔ چہار پہلو مہر میں صاحب مہر کا نام اور سنہ ۱۸۰۴ کندہ ہے یعنی وہ سال جب یہ مہر بنائی گئی۔ اب تک غالب کی کل پانچ مہرو پتہ چلا ہے، اور یہ پہلی ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں کا حافظہ اتنا غیر معمولی تھا کہ ایک بار پڑھی یا سنی ہوئی بات انھیں ساری زندگی یاد رہتی۔ کم سن میں ظاہر ہونے والی غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ زبانوں کے تعلق سے ان کی صلاحیت میں بھی ہوا۔ یہاں غالب کے حیات کی ایک کافی پر اسرار تفصیل کا ذکر ضروری ہے۔ ہمارا اشارہ ان کے استاد عبد الصمد والے واقعے یا قصے کی طرف۔ اس سے ایک طرف تو پھر ایک بار ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حیات غالب کے اکبر آبادی دور کے حالات کے تعلق سے معلومات کتنی کم ہیں اور دوسری طرف اس سے بہت سے سوانح نگاروں کا ذہن اس خیال کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ غالب کا یہ خیال ہیکر ایک طرح کی ابلہ فریبی کی کوشش ہے۔ اگر اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ ایک مشرقی شاعر کی ز میں ہدایت روحانی اور تلمذ باطنی کو کتنی اہمیت حاصل ہے تو اس طرح کا قیاس بے بنیاد بھی نہیں دکھائی دیتا۔ مثال کے سے معلوم ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے عظیم شاعر جلال الدین رومی، شمس تبریز نامی ایک شخص کو اپنا مرشد ر مانتے تھے۔ مرید کی روح پر شمس تبریز کے اثر کو گیلی چکنی مٹی پر نقشین مہر کے عمل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ شمس

کے خیالی پیکر کا نقش رومی کے قلب پر اتنا گہرا مرتسم ہوا کہ شاعر اپنی غزلیات کی تخلیق اسی یار باطنی کے نام سے کرتا تھا ا
انھیں شمس ہی سے منسوب کرتا تھا، بہ الفاظ دیگر مقطعے میں تخلص رومی کی بجائے شمس رہتا تھا۔

دوسری مثال غالب سے صرف ایک صدی قبل کے نامور فارسی گو ہندوستانی شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کی ہے جن
اپنے مرشد روحانی سے ملاقات اس سفر ہندوستان کے دوران ہوئی جس پر وہ زندگی کے ادراک کی غرض سے نکلے تھے۔ ان
اپنے مرشد سے ملاقاتیں پراسرار حالات میں بھری پڑی سڑکوں یا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں ہوتیں۔ اس اچانک معرض وج
میں آنے والے باہمی تعلق روحانی کو محسوس کرتے ہوئے بیدل حالتِ جذب میں اپنے مرشد کے پیچھے پیچھے چلتے اور جب
ہوش میں آتے تو پتہ چلتا کہ مرشد ان کو چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ ایسا اتفاق کئی بار ہوا۔

بہت سے شاعروں کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ ان کے پیش رو شاعروں نے خواب میں ان کو ہدایت دی اور کلام
موضوع اور اس کے پیکر خیالی ان کو عطا کیے۔

سچ پوچھیے تو مرزا اسد اللہ خاں اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے صوفی نہیں تھے، حالانکہ جس شعری روایت سے ان کا تعلق
تھا، تجربہ روحانی کی توصیف اس کا نہ صرف ایک تقاضا تھا بلکہ بعض اوقات اس کا منشا ہی یہی تھا۔ زرتشتی استاد والا قصہ اگر
متصوفانہ نہیں تو بہرحال پراسرار ضرور تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں تمام تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان فارسی سے واقف تھے تاہم یہ تو اساتذہ سے سیکھی
ہوئی زبان تھی یا پھر نام نہاد "ہندوستانی فارسی" جو ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا سے ترک وطن کرکے آنے والوں کے
گھرانوں میں بعض اوقات متعدد پیڑھیوں تک محفوظ رہی اور اس لیے اس جیتی جاگتی زبان سے مختلف تھی جو اہلِ زبان کے
فطری ماحول میں مروّج تھی۔

آگرے میں اس وقت متعدد جید مولوی اور عالم موجود تھے جنھیں اپنی فارسی دانی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل تھی
ان میں سے ایک شیخ محمد معظم بھی تھے جن سے اسد اللہ خاں نہ صرف فارسی یا بہ الفاظ دیگر دری کی تعلیم حاصل کرتے تھے
بلکہ اپنے اشعار پر "اصلاح" بھی لیتے تھے۔ اشعار کی اصلاح کو اس عمل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کے ذریعے استاد خوش
نویسی کے نمونوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے شاگرد کے خط کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ مشغلہ، شعری تعلیم
تعلم کی روایات کی پشت در پشت ترسیل کا نہ صرف ایک اہم وسیلہ تھا بلکہ بہت سے شعرا کے لیے ایک ذریعۂ معاش بھی تھا
مثال کے طور سے یہ معلوم ہے کہ "اصلاح کلام" بیدل کا، جن کا کسی دربار سے تعلق نہیں تھا، اہم وسیلہ رزق تھا۔ جب
ان سے معاوضے کی غرض سے مدح لکھنے کی فرمائش کی جاتی تو وہ انکار کر دیتے اور نتیجتاً وہ متمول ممدوح کی طرف سے انعام
اکرام کے بھروسے پر نہیں رہ سکتے تھے۔

ایک دفعہ مرزا اسد اللہ خاں نے شیخ معظم کو اپنے فارسی اشعار دکھائے جن میں ترکیب الفاظ "کہ چہ" استعمال کی گئی
تھی، جس کا ترجمہ "یعنی چہ" کیا جا سکتا ہے۔ مختلف سیاق و سباق میں اس کے معنی "بے لباس" یا "بھراوٹ کے بغیر" بھی
ہو سکتے ہیں، بہ الفاظ دیگر اس سے کسی چیز کی غیر موجودگی کا مطلب نکلتا ہے۔ شیخ معظم بے حد ناخوش ہوئے اور انھوں نے
زور دے کر کہا کہ ایسا فقرہ فارسی میں نہ تو ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حالی بیان کرتے ہیں تھوڑی دیر بعد مرزا اسد اللہ خاں
نے انھیں مشہور شاعر ظہوری کی پوری غزل دکھائی جس میں یہی ترکیب الفاظ بہ طور ردیف استعمال ہوئی ہے۔ غالب کے
حوالے سے حالی لکھتے ہیں: شیخ معظم بہت متاثر ہوئے اور کہا: تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکر شعر کیا
کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

بہرحال نتیجتاً کم سن غالب کی نظر میں استاد کا وقار بھی متاثر ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی اساتذہ سے سیکھی ہوئی

ارسی پر سے بھروسہ بھی اٹھ گیا۔ "ہندوستانی فارسی" کے تعلق سے بھی ان کا رویہ ایسا ہی ناقدانہ ہوگیا۔ ٹھیک اسی وقت
اسرار ہرمزد المعروف بہ عبدالصمد آگرے میں وارد ہونے۔ یہ ایرانی الاصل زرتشتی تھے جنھوں نے کچھ ہی عرصہ قبل مذہب
سلام اختیار کرلیا تھا اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد رکھا تھا۔ پختہ عمر کو پہنچ جانے کے بعد غالب اس واقعے کی یاد تازہ کرتے
ونے لکھتے ہیں کہ دبستان میں تعلیم کے زمانے میں میں نے مختلف علوم کی مبادیات سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے
ند میں تفریح اور آوارگی، فسق وفجور، رنگ رلیوں اور معمول کی وقت گزاری ہیں لگ گیا۔ بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان
رسی سے ایک لگاؤ تھا اور شاعری سے مناسبت۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھے ملے۔ بارے مزادآئی اور اکابر
رس میں سے ایک بزرگ جو ساسان پنجم کی اولاد سے منطق وفلسفہ میں مرحوم مولوی فضل حق کا ہم سر، حق پرست صوفی
انی تھا یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ نووارد نے فارسی اور عربی میں لڑکے کی معلومات کو جانچا
ر اسے پڑھانے کی ذمے داری قبول کرلی۔ آگے غالب لکھتے ہیں: "زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد
ر بزرجمہر عصر تھا، حقیقت اس زبان کی دل نشین اور خاطرنشان ہوگئی۔" تاہم متعدد سوانح نگار اس استاد کو شاعر کے تخیل
ا کرشمہ خیال کرتے ہیں کیوں کہ خود غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے "زرتشتی" استاد کے وجود سے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ حالی غالب کے
والے سے لکھتے ہیں "اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ "مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں
ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ "بے استادا" کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک
رضی استاد گھڑ لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ بہت سی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کو مذہبِ زرتشت
سے کافی دل چسپی تھی۔

مذہبِ زرتشت یعنی اہلِ ایران کے اسلام اختیار کرنے سے قبل کے مذہب کو ہندوستان میں بیش تر پارسی مذہب
ر اس کے پیرودں کو پارسی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زرتشتی عقیدہ فارسی شاعری اور پھر اردو شاعری میں ان بہتیرے
وضوعات کے وسیلے سے داخل ہوا جن کا تعلق بالخصوص آتش پرستی اور مذہبی رسوم کے ساتھ نشہ آور مشروب کے پینے
سے ہے۔ اس شاعری میں زرتشتی مذہبی پیشوا "پیر مغاں" اور "پیر پارسا" روحانی ہدایت کی علامت بن گئے۔ اس کی جڑیں
قیقی صورتِ حال میں بھی پیوست تھیں۔ اسلام میں شراب سازی اور شراب نوشی دونوں منع ہیں۔ شراب سازی
ممانعت کی تعمیل ایمانداری کے ساتھ ضرور کی جاتی تھی کیوں کہ کوئی بھی مذہبِ اسلام کا پیرو نہیں چاہتا تھا کہ وہ مخبروں
ر جاسوسوں کا مرکزِ توجہ بنے اور کڑی سزا کا مستوجب قرار پائے۔ جہاں تک زرتشتیوں کا تعلق ہے وہ شراب سازی کا کام نہ
رف اپنی عبادات یا جماعت کے دوران مذہبی رسوم کی انجام دہی کے لیے بلکہ ان مسلمانوں کے لیے بھی کرتے تھے جنھیں
مے نوشی سے پرہیز نہیں تھا۔

اس شاعری میں، جس کی ایک نمایاں خصوصیت عالمِ خیال میں بلند پروازی ہے، مے نوشی ایک اعلیٰ ترین مقصد
روحانی قرار پائی، خمار کو حقائق و معارف کے انکشاف کا مفہوم دیا گیا، مے فروشوں کو پیرِ مغاں، صاف دل پیرانِ پارسا اور
مغلمانِ روحانی کا درجہ عطا کیا گیا اور ویرانوں کی وہ تیرہ و تار گلیاں (خرابات) جہاں شراب سازی کا کام ہوتا تھا دانش مندی اور
شرجنونِ عشق کا مرکز کہلائیں۔ حافظ لکھتے ہیں۔

بجانِ پیرِ خرابات و حقِ صحبت او
کہ نیست در سرِ من جز ہوائے خدمت او
بہشت اگرچہ نہ جائے گناہ گاران است
بیار بادہ کہ مستظہرم بہ رحمت او
چراغِ صاعقۂ آن . شراب روشن باد

کہ زد بہ خرمنِ من آتشِ محبتِ او
برآستانہ مے خانہ گر سرے بینی
مزن بہ پائے کہ معلوم نیست نیتِ او

مذہب زرتشت سے تعلق رکھنے والے موضوعات غالب کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے ہندو
فارسی گو شعرا میں ان کا کوئی ہم سر نہیں۔ اور اگر پراسرار "ہرمزد زرتشتی۔ ثم عبدالصمد کا حقیقت میں کوئی وجود نہ تھا۔
سن مرزا کو کسی نے بھی فارسی نہیں پڑھائی تھی تو پھر ماننا ہی پڑے گا کہ فارسی سے ان کو واقعی مناسبتِ ازلی تھی اور ا
پر قدرت ان کو اس مرحلے پر عطا ہوئی تھی جس کو افلاطون نے تخلیقِ کائنات سے قبل کی ارواح کے مرحلے کا نام دیا ہے
جسے دانایان صوفی مشرب قدمِ ارواح یعنی ارواحِ ازلی کا مرحلہ کہتے ہیں اور دنیوی وجود اختیار کرنے کے مرحلے پر ان د
امور میں کمال حاصل کرنے کے لیے غالب کو کسی قسم کی سعی و کوشش کی ضرورت نہیں پڑی۔

جہاں تک زرتشتیوں یا پارسیوں کا تعلق ہے تو غالب سے ان کی جان پہچان ان حالات میں ہونے کے قرائن بھی
جن کو پارسائی و پرہیزگاری اور شرابِ معرفت کے حصول سے کوئی خاص واسطہ نہیں۔ وہ اپنے جوانی کے دوست مہر کو اگر
لکھتے ہیں "صاحب! کیسے اب بھی پہلے ہی کی طرح پارسیوں کی دکانوں میں شمپان اور فرنج درجن سے بکتی ہے اور پہلے
طرح مہاجنوں اور یہودیوں کی کوٹھیاں روپے پیسوں اور زر و جواہر سے بھری پڑی ہیں۔ مجھے وہ شراب پینے کو کب ملے گی اور
وہ دن آئے گا کہ وہ مال و زر میرے ہاتھ بھی لگے۔"

مرزا کے اولین شعری تجربات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ خود ان کا کہنا ہے کہ گیارہ سال کی عمر
وہ فارسی میں اشعار لکھنے لگے تھے (اس کی طرف اشارہ اس انوکھی ترکیب الفاظ والے واقعے میں ملتا ہے جس کی سند بعد
ظہوری کے کلام سے ملی)، تاہم جیسا کہ مجموعۂ کلام "گلِ رعنا" کے دیباچے میں مذکور ہے انھوں نے اردو میں اشعار
اس سے بھی پہلے شروع کیا۔ حالی اور ان کے تتبع میں سبھی محققین عام طور سے "پتنگ بازی" نامی مثنوی کا حوالہ دیتے
جو گویا کہ مرزا نے سات آٹھ سال کی عمر میں لکھی۔ پتنگ بازی آگرے کے نوجوانوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ لئی اور شیشے
سفوف سے بنتے ہونے مانجھے سے بندھی ہوئی پتنگ کھلی سطح چھت سے آسمان میں اڑائی جاتی تھی۔ رنگ برنگی یا
طرح سفید پتنگیں بڑی شان سے آسمان میں منڈلاتی رہتیں۔ ہر پتنگ باز یہ چاہتا کہ اپنی پتنگ کے ڈور کو ایسا نھو کا و
مخالف کی پتنگ مانجھے سے کٹ جائے۔ "فسانۂ عجائب" کے مصنف رجب علی بیگ سرور کا خیال ہے کہ عمدہ پتنگیں آگر
میں نہیں بلکہ لکھنؤ میں بنتی تھیں لیکن لکھنؤ سے ان کی بے انتہا محبت کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں! وہ لکھتے ہیں "
ایسا بنایا، ایسا لڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستر پچھتر تار ڈور کا پتنگ، خیراتی یا چھنگا کے ہاتھ کا، لڑائی کی گھات کا، ر
عافیت تنگ کرنے والا، منجھی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدہ نے ایسا لڑایا، عمداً اتنا بڑھایا کہ کروبیوں سے عبادت چھوٹی دوڑ د
ڈور لوٹی، آنکھ بچا کر پیٹا توڑا، فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔"

اس وقت جب وہ پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے غالب کی اتفاقاً آگرے کے اپنے ایک پرانے واقف کنھیالال سے ملا
ہوئی۔ کنھیالال نے انھیں یاد دلایا کہ کسی زمانے میں ان کی فرمائش پر مرزا نے پتنگ بازی پر اشعار لکھے تھے۔ مرزا ک
نہیں آرہا تھا کہ انھوں نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے۔ لیکن کنھیالال نے کہا کہ یہ اشعار محفوظ ہیں اور انھوں نے غالب ک
کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر بھی دکھائی۔ غالب بے حد مسرور ہوئے۔ مثنوی کے آخر میں فارسی کی ایک بیت ہے جو گو
پتنگ زبانِ حال سے دہراتی ہے۔

حلقہ در گردنم افگندہ دوست

می بر دہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یہ اشعار بہ ظاہر خود حالی کی دست رس میں نہیں تھے جنھوں نے یہ واقعہ غالب کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا کہ محولۂ بالا فارسی بیت دراصل سترھویں صدی عیسوی کے شاعر غنی کاشمیری کی تضمین ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں غالب کے اشعار صفدر مرزاپوری نے دریافت کیے اور رسالہ "اردو" نے "غالب کی ایک تضمین" کے عنوان کے تحت ایک نوٹ کے ذریعے قارئین کو اس نعمتِ غیر مترقبہ کے بارے میں مطلع کیا اور مثنوی کا متن شائع کیا۔

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی ۔۔۔ لے کے دل سررشتہ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا ۔۔۔ اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا اے دل، ہوائے دل براں ۔۔۔ بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں

پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار ۔۔۔ یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر ۔۔۔ کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ ۔۔۔ لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے ۔۔۔ قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے ۔۔۔ بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑادیں گے کہیں ۔۔۔ مفت میں ناحق کٹادیں گے کہیں

دل نے سن کر، کانپ کر کھا پیچ و تاب ۔۔۔ غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یہاں سب سے پہلے فن شعر کے وسائل پر شاعر کی مکمل قدرت ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مثنوی میں شروع سے آخر تک استعارے کی صنعت استعمال کی گئی ہے۔ عشق کو پتنگ بازی کے اس مقابلے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا انجام پہلے ہی سے مقدر ہے۔ دل کا جواب اپنی دانش مندی اور تصوف کے لیے مخصوص جبر عشق کے پرخلوص احساس سے ہم کو متاثر کرتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ غنی جیسے پیچیدہ شاعر سے مستعار لی ہوئی فارسی بیت، غالب کی مثنوی کے سیاق و سباق میں اس عمدگی سے پیوست ہو گئی ہے کہ غنی نے اسے جو مفہوم دیا تھا اس میں ایک شمہ برابر بھی تحریف نہیں ہونے پائی۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ آیا ایسے اشعار نو سال کی عمر کا کوئی لڑکا واقعی لکھ سکتا ہے! خصوصاً جبکہ اپنے ایک خط میں غالب آگرے میں پتنگ بازی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن خط سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر انیس سال کی تھی۔ یہ خط شیونارائن آرام کے نام ہے۔ غالب کھیل کود، تفریح اور دل خوش کرنے کے ان مشغلوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے وہ آگرے میں مکتوب الیہ کے دادا بنسی دھر کے ساتھ لطف اندوز ہوتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں۔ "میں اور وہ ہم عمر تھے، شاید منشی بنسی دھر مجھ سے دو ایک برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس، ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی،

اور پاس اس کے ایک "کھنیا والی حویلی۔ اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور "کالے محل۔ سے لگی ہوئی حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کنزہ کہ وہ "گذریوں والا۔ مشہور تھا اور ایک کنزہ کہ وہ "کشمیرن والا۔ کہلاتا تھا۔ ۱۳ کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔۔

عالمی شاعری میں نسبتاً کم عمری میں شعرگوئی کے ملکے کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ابتدائی لڑکپن ہی میں راگ صلاحیت کے بر عکس گویے کی آواز کی طرح شعرگوئی کی خداداد قابلیت کو بھی پختگی کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نو سال کے لڑکے کا مذکورہ بالا اشعار کا خالق ہونا ناقابل یقین بھی مان لیا جانے تو اٹھارہ انیس سال کے شاعر کو ان ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اس کی توثیق غالب کے محولہ بالا مکتوب بنام شیو نارائن میں مل جاتی ہے۔

مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ غالب کے وقت گزاری کے مشغلوں کے ساتھی بنسی دھر کے چھوٹے بھائی لال تھے جنھوں نے مرزا سے یہ اشعار فرمائش کر کے لکھوانے تھے۔ چناں چہ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس وقت مرزا نہیں لال آٹھ نو سال کے رہے ہوں؟

شادی کے بعد مرزا اسداللہ خاں کا وقت زیادہ تر دہلی میں گزرنے لگا، وہ آگرے بس کبھی کبھار کچھ دنوں کے انیس سال کی عمر میں وہ قطعی طور پر دہلی منتقل ہوگئے۔

محمد اکبر الدین صدیقی (مرتب)

کلامِ نصرتی منقول بہ بیاض قصیدہ در مدح علی عادل شاہ والیِ بیجاپور

(من کلامِ نصرتی)

کیوں حمد کردگار جسے نہ تھے شریک یار
گگن کوں بھرانہار زمین تے دیا قرار
نبی کا جو ہے ادھار بزان مدح چار یار
کروں جگ میں آشکار مددگار ہشت وچار
علی شاہ نامدار ہے شاگردِ بوتراب

علی بادشاہِ دیں دلت چشمۂ یقیں
خدا ناصر و معین اچھو فتح ہم قریں
شہنشاہ حق گزیں شہ افسر و نگیں
سزاوار آفریں ملک خو فلک جناب

یو نو جوان علی جہان پہلوان علی
ولی پر دلاں علی ممالک ستاں علی زمانے کا انتخاب

علی خسرو دکن گہر بخش تیغ زن
مدد بنہ صف شکن استوار رائے فن
سدا گرم انجمن اچھو تا ہے تلک گگن
فریدوں کے سب لکھن سکندر کا آب و تاب

تمارے ہر ایک وزیر عدوں پہ شیر گیر
بہ تیغ و کمند و تیر کریں دشمناں اسیر
تمیں شاہ بےنظیر مدد حضرت امیر
پناہ جوان و پیر جہاں بخش و ملک گیر سخن سنج نکتہ یاب

مغل ہندسوں نکل جب آئے دکن پہ چل
وزیراں ترے نکل چغرچیں کالے کے دل
سٹے مار کر کھندل

بھوا ماں سب مغل　　پھرا موں گئے اوڈل
خدا تج دیا ہے بل　　ارل تے نہ آج کل　　اچھو فتح ہم رکاب
تمے شاہ نام نہنگ　　زرہ باند چڑ ترنگ
لگا کہکشاں کو تنگ　　لیا ہات میں فرنگ
کریا کات یکرنگ
غنیموں پہ عرصہ تنگ　　رکت کی چلی سوگنگ
دھڑاں تس میں جوں نہنگ　　وہیں سیس سب حباب

نمک پروراں جتے　　جو جھگڑے میں یک ہتے
زرہ باندھ ہوتے　　چلا گزر کے بتے
پرو تیر میں کتے　　کچل کر کریں کباب
بہادر ترے بکٹ　　دلاور دسیں نبٹ
سلح باند گھٹ پہ گھٹ　　غنیموں کے سب کٹک
اٹھے مار تے یکت　　کریں فوج بنگ نمت　　پیویں رند جوں شراب

تمے شاہ نامدار　　ہمایوں ترنگ پہ سار
کمر کو باندے کٹار　　کیتے زین تے اتار
زمین پر سٹیا پچھاڑ　　سو لے کے غنیم پہ دھار
تمے شاہ بے مثال　　محبتِ علی و آل
تمن کن بجنے سوال　　کیا سو سوا نہال
زمانے تے پائمال　　سراسر کیا خراب
ہوا ہول منجے سنبھال　　رھیا نئیں مرے میں حال
کرو مفلسی پہ زال　　کرو رحم ہوں بےحال　　کہ پاویں نیک تم ثواب

قاضی سلیم

حمد

ثنا اُس کی جو بنیادِ جہاں ہے
خلیئے میں جو جسموں کے نہاں ہے
جو ہر اک روپ میں، ہر رنگ میں ہے
فروزاں جو شرارِ سنگ میں ہے
وہی جھرنے، ندی، دریا، سمندر
وہی ذرّے، وہی مہرِ منوّر
زمیں سے آسماں تک جسم بن کر
دھڑکتی پرتھوی اللہ اکبر
اسی کو جیو رچنا سلسلوں میں
کلی سے پھول، پھولوں سے پھلوں میں
بدل کر جب بالآخر ٹوٹ جائیں
نئے اکھوے وہیں سے پھوٹ جائیں
کئی سورج، کروڑوں ماہ و اختر
بحمداللہ سب کا ایک جوہر
کئی آفاق ہیں جوہر کے اندر
وہی گردش وہی گردش کا محور
کشش سے اپنے خالق کی رواں ہیں
سبھی محوِ طوافِ جاوداں ہیں

راشد آزر

تکمیلِ ضابطہ

چلو، اٹھاؤ جنازہ جلدی ــــ
کسی کو بھیجا، کہ قبر تیار کر کے رکھیں ــــ؛
اسے بھی مرنا تھا آج ہی
آج ایک چھٹی کا دن ملا تھا
پلنگ پر کروٹیں بدلنے کا
اور ٹی وی پہ سیریل دیکھنے کا، لیکن ــــ!
یہ فون ہی کاش آج اپنا خراب ہوتا ــــ
ارے، وہ اروِند منتظر ہوگا
لنچ پر اس کو لے کے
حامد کے پاس جانا ہے
کیا کریں اب! ــــ
چلو، اٹھاؤ جنازہ جلدی
کہ گھر میں میّت کو دیر تک مت رکھو
یہ احکام ہیں، مصلحت ہے اس میں ــــ
چلو، یہ شرکت تو ایک تکمیلِ ضابطہ ہے
جنازہ گھر سے اٹھے تو پھر
لنچ کے لیے ہم کھسک چلیں گے

○

ساجد حمید

یوں ہوا ایک دن

O

یوں ہوا ایک دن
سبز و شاداب جنگل میں صحرا اگا
اور آنکھوں میں خنجر چبھے دھوپ کے
دل میں مایوسیوں کی چلیں آندھیاں
زرد ہونے لگیں سبز پروانیاں
کھو گئے معتبر رشتہ ہائے طرب
چاند کمہلا گیا
رات بجھنے لگی
اوس کی بوند کو تک رہی تھی نظر
سو گیا تھا فلک خامشی اوڑھ کر

O

یوں ہوا ایک دن
رینگتی خواہشیں
آسمانوں میں پرواز کرنے لگیں
ابر کے سنگ پیہم بہکنے لگیں
دیکھ کر خواہشوں کی فلک بوسیاں
دل کے ایوان میں جشن برپا ہوا
رقص کرنے لگی زندگی پُر طرب
شادماں تھا حقیقت پسند بروئے شب
اصلیت سے مگر روح آگاہ تھی
خواہشوں کی اڑانوں کے انجام سے
خوب واقف تھی وہ
اس لیے روح ماتم کناں ہو گئی

O

یوں ہوا ایک دن
جو گرجتے تھے بادل برسنے لگے
کاغذی پھول گھر گھر مہکنے لگے
موسمِ سبز شعلے اگلنے لگا
آگ جل میں لگی
اس ندی میں لگی
جس میں ہر شب نہانے اترتا تھا چاند
کج روی دیکھ کر فطرتِ دہر کی
شاخِ زیتون لے کر کبوتر اڑے
بے کراں آسمانوں میں پھر کھو گئے

O

یوں ہوا ایک دن
فکر زخمی ہوئی
سرد جذبے ہوئے
مردنی چھا گئی میرے احساس پر
میرے اندر جو سورج تھا بجھنے لگا
اور میں ایک پتھر میں ڈھلنے لگا

O

یوں ہوا ایک دن قطرہ قطرہ پگھلنے لگی چا...
بام و در گھر کے پیہم سرکنے لگے
رک گئی رقص کرتی ہوئی کائنات
وحشتیں بڑھ گئیں
راستے کم ہوئے
سارا منظر نگاہوں میں دھندلا گیا
وقت ساکت ہوا
روح ہنسنے لگی
پوری قوت سے میں نے پکارا اسے
چیخ گھٹ کر مگر ذہن میں رہ گئی

جمیلہ نشاط

دو نظمیں

(۱)

مٹی اٹھانے سے
شوہر کی مار سے
طلاق طلاق سے
میں ڈرتی نہیں

جو ہے بلّی کی مانند
میاں بیوی کا رشتہ

دھوکا، لالچ
خون، غارت گری
نہیں میں ڈرتی نہیں
بالکل نہیں

ڈر ہے
مٹی میں سونے کا
احساس کھونے کا

صبح کام پہ جانے کا
پھر گھر لوٹ آنے کا
اس معمولِ روزانہ سے ڈر لگتا ہے
ڈر لگتا ہے

خوابوں کی قربانی
کیسی پشیمانی

نہیں، میں نہیں مانتی

مجھے ڈر لگتا ہے
اس سنہری آنکھ سے
حلقۂ قمر سے
جو
چاہے مسجد گرے
یا زلزلہ آجائے
ہزاروں جائیں
ڈھیر ہو جائیں
پھر بھی خاموش تکتا
شانت مسکراتا
آنند دیتا ہے

قدرتی اپنائیت سے
مجھ کو
ڈر لگتا ہے

(۲)

وجود میں
اُٹھتے طوفاں سے
رگوں میں بہتی موجوں سے
ایک آواز آتی ہے
بدن کے کنارے پر
چہرے کی ڈھلی مٹی پر
سپنوں کے پھول گنتی
چمکتی
تکتی
دو آنکھیں

انھیں خاموش سنتی ہیں
اور ریت پر نقش کر دیتی ہیں

ساحل پر چلنے والے
موجوں اور طوفانوں سے دور
بے پروا
بے خبر
ریت پر بنے
ہر نقش کو
روند دیتے ہیں

مضطر مجاز

O

یہ بات آپ سے کہنا بہت ضروری ہے
یہی کہ چپ بھی نہ رہنا بہت ضروری ہے

ملمع سازیِ لفظ و بیاں سے کیا ہوگا
اب ایک حرف برہنہ بہت ضروری ہے

ہمارے شہر کے حالات جاننے کے لیے
ہمارے شہر میں رہنا بہت ضروری ہے

کہیں تو آپ سے وہ بات ہم کہیں کیسے
جو بات آپ سے کہنا بہت ضروری ہے

یہ طے ہے کہ ہر اک رنگ ہے اسی کا رنگ
ہر ایک رنگ میں رہنا بہت ضروری ہے

کبھی نہ کہنے کے مطلب بھی سَو نکلتے ہیں
اگرچہ چپ بھی نہ رہنا بہت ضروری ہے

یہ جان تن کے لیے دُکھ اُٹھائے گی کیا کیا
اب اِس مکان کا ڈھنا بہت ضروری ہے

اگرچہ کام یہ دشوار ہے ذرا پھر بھی
خلاف دھارے کے بہنا بہت ضروری ہے

دیا ہے آپ کو مضطر یہ مشورہ کس نے
ہمیشہ موج میں رہنا بہت ضروری ہے

O

(لاس اینجلس (امریکہ) میں روڈنی کنگ کے واقعہ کے بعد ہونے والے فسادات کے پس منظر میں)

یہ ہم - زمین پہ چل کر روا روی میں گرے
یہ آپ - اتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے

شکستہ پا بھی ہم، اندھے بھی ہم گرے بھی تو کیا
نظر پہ ناز جنھیں تھا وہ روشنی میں گرے

ہوا کے زور پہ اُڑتے تھے آسمانوں میں
ہوا کے رکتے ہی ردّی کی ٹوکری میں گرے

—— ...... ——

ہماری راہ میں گہرا انا کا کھڈ بھی تھا
اسی میں گرنے کا ڈر تھا ہمیں اُسی میں گرے

ہماری منطق الگ ہے، ہماری سوچ الگ
کہ ہم ندی میں سمندر کی دوستی میں گرے

تمام کوچہ و بازار گھوم گھام آئے
گرے جو آکے تو ہم اپنی ہی گلی میں گرے

چھپا چھپا کے جو اُس سے رکھے تھے چند آنسو
اُسی کے سامنے مضطر ہنسی ہنسی میں گرے

o

پروفیسر راہی قریشی

○

بات باقی ، بیان باقی ہے
میرے منہ میں زبان باقی ہے

عمر کم ہے چراغ کی ، لیکن
روشنی کا نشاں باقی ہے

فاصلہ درمیان باقی تھا
فاصلہ درمیان باقی ہے

ابھی زندہ ہے آخری دشمن
آخری امتحان باقی ہے

سایۂ گل میں ایک جنّت تھی
آگ کے درمیان باقی ہے

یہ بھی کیا کم ہے ۔ صحن مقتل میں
صبر کی آن بان باقی ہے

اہل اردو نہیں رہے ، راہی
اور اردو زبان باقی ہے

○○○

حمید الماس

○

رنگ ہے تیرا آسمانی سب
سر سے پا تک ہے ضوفشانی سب

تجھ سے ارزانیاں ہوئیں منسوب
میرے حصے میں ہے گرانی سب

تجھ کو معزول کرگیا کوئی
تو ہے اور تیری حکمرانی سب

آئینہ بدگماں نہیں ہوتا
دل ترا وجہ بدگمانی سب

سارا سیلاب میرے سینے میں
ہر طرف ڈھونڈتے ہیں پانی سب

رات گذری تو یہ کھلا مجھ پر
س کے لئے تھے امتحانی سب

سب میں افضل رہے حمید الماس
یاد ہیں پھول کے معانی سب

محمد طاہر

(ترجمہ: قاسم ندیم)

سبجیکٹ

(محمد طاہر۔ ۱۹۳۹ء میں چنار، مرزاپور (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۶۷ء سے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اب تک دو سو سے زیادہ کہانیاں چیدہ چیدہ رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ اپنی تخلیقات میں عام آدمی کی زندگی کی عکاسی کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ زندگی کے تجربات کو کامیابی سے کہانیوں میں پروتے ہیں۔ بہت سی کہانیوں کے تراجم کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔)

گدلے پانی سے بھرے تسلے میں ٹیوب گھماتے وقت جب ایک جگہ سے بلبلے نکلنے لگے تب مراری نے ٹیوب تسلے سے باہر نکال لیا اور پنکچر کی جگہ پر انگلی رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ہوا کھول دی۔ ہوا کھولنے کے ساتھ ہی انھیں اپنے اوپر چھپکے سے آئی ہوئی دھوپ کا جیسے یکایک احساس ہوا۔ سائیکل کا ٹیوب نکالنے میں اور ٹسٹنگ کے دوران نیم کا سایہ کب سرک گیا، انھیں معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ دھوپ شدت کی تھی اور انھیں اپنی بنیان کے اندر پسینے کی بوندیں رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ انھوں نے نیم کی جڑ کی اور دیکھا۔ روز کی طرح اب سامان سمیٹ کر وہیں رکھنے کا وقت ہو گیا تھا۔

انھوں نے کچھ دوری پر بنے ہوئے چائے خانے پر بھی نظر ڈالی، جہاں سائیکل کا مالک پنکچر بنانے کے لیے کہہ کر چائے پینے کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ لوٹتا ہوا دکھائی نہیں دیا تو انھوں نے اطمینان سے سائیکل کھینچ کر نیم کے تنے کے نیچے رکھ لی۔ پھر تسلہ اور لکڑی کا بکسہ بھی وہیں رکھ لیا۔ ہتھیلی کی پشت سے پیشانی پر آگیا پسینہ پونچھ کر وہ بیٹھ گئے اور پنکچر کی جگہ کو کانس سے گھسنے لگے۔

اس دوران ایک سائیکل فٹ پاتھ پر ان کے سامنے آگئی تھی اور ہاتھ کے ٹیوب پر ہی نظریں جمائے وہ "ہوا" یا "پنکچر" لفظ سننے کا انتظار کرتے رہے۔

کچھ پلوں میں آواز سنائی نہ دی تو انھوں نے آہستہ سے سر اٹھا کر سائیکل کے پہیوں پر نظر ڈالی۔ دونوں پہیوں کی ہوا ٹائٹ دیکھ کر ان کی نظر اوپر سائیکل والے کی طرف اٹھ گئی۔ سائیکل والا عجیب سی نظروں سے مراری کو تک رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر خوشی کا تاثر۔ مراری کا ہاتھ رک گیا اور ان کے منہ سے نکلا۔ "کہیے۔"

بیس، بائیس سال کا وہ نوجوان اب بھی مراری کی طرف مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ کچھ عجیب سا محسوس کرتے ہوئے مراری کھڑے ہو گئے۔ "کہیے۔ کیا کام ہے؟" ان کے منہ سے نکلا۔ نوجوان ہنسا اور جوش بھرے لہجے میں بولا۔ "وہ آپ کی ہی تصویر ہے! لیکن کتنی شاندار، کسی نے آپ کا فوٹو، یہاں سائیکل بناتے وقت کھینچا تھا نا؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہاں" مراری کو یاد آیا۔ پچھلے سال گرمیوں کی شروعات میں ایک آدمی کیمرہ لیے ہوئے آیا تھا۔ کئی طرح سے ان کے فوٹو کھینچ لے گیا تھا۔ کہہ گیا تھا کہ تصاویر انھیں بھی دے جائے گا۔ مراری کو اپنی تصاویر پانے کی تو نہیں، ہاں دیکھنے کا ارمان

ضرور تھا۔ لیکن وہ آدمی بعد میں دکھائی نہیں دیا تھا۔
"یہاں بارہ دری میں تصویروں کی نمائش لگی ہے، ہندوستان بھر کے بڑے بڑے فوٹو گرافروں کی کھینچی ہوئی ت
اس میں ہیں۔ داس صاحب کی تصویر، میرا مطلب ہے، آپ کی تصویر جو داس صاحب نے کھینچی تھی، اس کو دوسرا ا
ہے۔ دو ہزار روپے ۔۔ نوجوان نے کہا۔
"میری تصویر کو۔ دو ہزار روپے!۔ مراری کی آواز میں بڑی حیرت تھی۔
"ہاں۔ تصویر تو آپ کی ہی ہے، لیکن اس میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ انھیں غور سے دیکھتا۔
"کیا تصویر مجھ سے ملتی جلتی نہیں ہے ؟"۔
"اگر تصویر آپ جیسی نہ ہوتی تو میں آپ کو پہچانتا کیسے ؟ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تصویر آپ سے زیادہ ا
آپ وہ تصویر دیکھیں گے ۔۔
نمائش میں کچھ ٹکٹ ہے کیا؟
ٹکٹ تو نہیں، لیکن ... اس نے مراری کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور تکلیف دہ آواز میں بولا۔ "آپ میرے سا
میں وہاں چوکیدار ہوں، مجھے ستار کہتے ہیں۔ عبدالستار۔ چار بجے سے میری ڈیوٹی شروع ہوتی ہے۔ چھ بجے نمائش
ہونے سے پہلے میں آپ کو اندر لے جا کر آپ کی تصویر دکھا دوں گا۔ چاہیں تو آپ میرے ساتھ ابھی چلیے ۔۔
"ابھی ... ابھی تو نہیں چل سکتا۔ یہ سائیکل دینی ہے۔ سوا چھ تک کام کی بھیڑ رہتی ہے۔ آج اپنی دوا بھی
یہاں سے لینی ہے۔ طبیعت کچھ خراب ہے ۔۔
"ٹھیک ہے۔ کل چلیے گا۔ اسی وقت میں آوں گا۔
"کل ہی ٹھیک رہے گا۔ میں آج دو دن کی دوا لے لوں گا۔
اچھا چلوں۔ کہتے ہوئے اس کے سائیکل پر بیٹھ جانے کے بعد مراری کی نظریں کچھ دیر تک اس کی پیٹھ پر جمی رہیں
یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی ان کی تصویر پر دو ہزار روپے انعام بھی پا سکتا ہے۔ کیا ہے اس تصویر میں، کیا رہ گیا
گلے سڑے جسم میں ؟ جسے دیکھ کر کوئی دو ہزار روپیے انعام دے گا۔ ستر پچھتر سے اوپر کا کھوکھلا جسم۔ اندر د
آنکھیں اور زندگی کی خوشیوں اور آسائشوں سے خالی چہرہ۔ پیٹ کے لیے بس دو روٹی کی خاطر چلتے ہاتھ۔ وہ بھی اس لے
ناتواں جسم کو بھی بھوک کی بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ اگر بے چینی محسوس کیے بغیر، بھوک سے موت آسکتی ت
وہ اس لو، دھوپ میں فٹ پاتھ پر نہ بیٹھتے۔ بنا کھانے پیے اپنی کوٹھری میں پڑے رہتے اور چپ چاپ مر جاتے۔
انھوں نے دیکھا، سائیکل والا آرہا تھا۔ یکایک وہ سامنے کھلے ٹیوب پر جھک گئے۔ ربر کی چپی پر سولیوشن لگایا ا
جگہ پر چپکا دیا۔ سائیکل والا سامنے آگیا تھا اور ابھی تک ٹیوب باہر دیکھ کر کچھ بڑبڑایا۔ مراری نے کچھ دھیان نہیں دیا۔
جب وہ ہوا بھرنے لگے تب سائیکل والے نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "اب ہوا بھرنے کی آپ کی عمر نہ
کوئی لڑکا رکھ لیجیے اس کام کے لیے۔۔
انھوں نے سوچا مشورہ برا نہیں ہے۔ شام کو آفس سے لوٹنے والوں کی بھیڑ کے وقت ایک ایک سائیکل
میں ہوا بھرنے میں پانچ منٹ لگا دیتے ہیں۔ اس بیچ کچھ لوگ ان کی سست رفتاری کو دیکھ کر آگے بڑھ جایا کرتے ا
تیز لڑکا رہے گا تو زیادہ لوگوں کو نپٹایا جا سکتا ہے۔
انھوں نے سائیکل اٹھا کر کھڑی کر دی تو سائیکل والے نے چالیس پیسے ہاتھ پر رکھ دیے۔ انھیں جسم میر
سی محسوس ہو رہی تھی۔ آج بخار ابھی سے ہی چڑھ رہا ہے کیا؟ گلا بھی سوکھ رہا تھا اور اندر سے بے چینی سی محسو

تھی۔ آج آفس کی بھیڑ نپٹا پائیں گے؟ انھوں نے ناامیدی سے سوچا اور بے دلی سے یا جھوٹا ہی لکڑی کے بکسے میں اوزار بھرنے لگے۔

دوسرے دن دوپہر بعد سے ہی ستار کا انتظار کرنے لگے۔ کل وہ ایک دوسرے ڈاکٹر سے دوا لے آئے تھے۔ ڈاکٹر نے دو تین قسم کی گولیاں دی تھیں۔ بخار رات کو ہی اتر گیا تھا۔ وہ سوچنے لگے، اب آج شام کو بھی نہ چڑھے تب تعریف کی بات ہے۔

تین بجے ستار آگیا۔ سائیکل سے ایک پیر نیچے ٹیک کر بولا، آداب عرض ہے چاچا۔۔ اپنائیت سے بھرا یہ طرز تخاطب انھیں بہت اچھا لگا۔

انھوں نے اوزار بکسے کے اندر ڈال دیے اور بکسے کے دونوں کنڈوں میں موٹی زنجیر پھنسا کر زنجیر نیم کے تنے کے گرد لپیٹ دی۔ پھر زنجیر کے دونوں سروں کو ملا کر موٹا تالا لگا دیا۔

"آگے بیٹھیں گے یا پیچھے"۔ ستار نے پوچھا۔

"پیچھے ہی ٹھیک رہے گا۔۔ انھوں نے کہا۔ آج انھوں نے بنیان کے اوپر کرتا پہن رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی سفید کرتے میں سے بھی بنیان کا کالا پن جھلک رہا تھا۔

"آپ کی عمر اب کچھ کرنے کی نہیں رہ گئی۔۔ اور کوئی نہیں ہے کیا؟" ستار نے پوچھا۔

یہ سوال آنے دن دو تین گاہکوں سے سنتے تھے اور جواب دینے کی بجائے خاموش رہ جایا کرتے تھے لیکن اس وقت چپ رہنا، ستار کو لگر مند کرنے کے برابر تھا۔ بولے، "ایک لڑکا ہے، ولایت میں ڈاکٹری کرتا ہے۔۔

"ولایت میں!" ستار کے ہاتھ میں سائیکل کا ہینڈل ڈگمگا سا گیا۔ "پتہ نہیں، اب ہے بھی یا نہیں!" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی آواز میں کرختگی آگئی تھی۔ ایک زمانے سے شاید آٹھ دس سال سے کوئی خبر نہیں ملی۔۔

ان کی آواز میں کچھ ایسا اثر تھا کہ ستار نے آگے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے پیڈل مارتا رہا۔ بارہ دری سے کچھ پہلے، بانس کی ٹٹیوں سے گھرے ایک چائے خانے کے سامنے ستار نے سائیکل دھیمی کر کے کہا۔ "اتریے چاچا۔۔ یہاں ایک ایک چائے کی پیالی پی لی جائے۔۔ وہ سائیکل سے اتر گئے۔ چار بجے ڈیوٹی پر لگنے کے بعد پھر نو بجے تک فرصت نہیں ملتی۔ اسی لیے یہاں پہلے چائے پی لیتا ہوں۔ آپ سگریٹ کون سی لیں گے۔ ستار نے کہا۔

"میں بیڑی پیوں گا۔۔

"نہیں نہیں، سگریٹ لیجیے نا!" ستار نے بغل کی دکان سے سستی سگریٹ کی ایک پیکٹ خرید لی۔

گلاس میں چائے پینے کے ساتھ ساتھ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کئی سال پہلے کی ایک شباہت ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ سنہرے کام والی لال رنگ کی چمک دار وردی اور سنہری پگڑی میں بڑے صاحب کے کمرے کے دروازے پر اسٹول پر بیٹھی ہوئی ان کی اپنی شبیہ۔ کسی بھی گزرتے ہوئے چپراسی سے کہہ دیتے "ابے میرے لیے ایک چائے بول دینا ذرا، اور سگریٹ بھی۔۔ تو کچھ دیر بعد ہی وہیں ان کی چائے سگریٹ آجاتی۔ وہاں صاحب سے ملنے والے افسروں کے نام کی سلپ یا کارڈ کے ساتھ ایک یا دو کا نوٹ بھی ساتھ ہوتا تھا۔ نوٹ بے ترتیبی سے اپنی جیب میں ڈالتے اور سلپ یا کارڈ صاحب کی میز پر رکھتے۔ شام گھر لوٹ کر چارپائی پر جیب خالی کرتے تو کچھ وقت نوٹوں کی گڈی بنانے اور گننے میں لگ جاتا۔

"آیئے چاچا، چلیں۔۔ ستار چائے والے کو پیسے دے کر بولا۔

بارہ دری کے دروازے پر وہ آئے تو انھیں یکایک لگا جیسے یہاں آنا زیادہ ضروری نہیں تھا۔ کیا فائدہ ہوگا اپنی تصویر دیکھ کر۔ آج طبیعت کچھ ٹھیک تھی، چار پیسے بنا لیتے۔

دونوں طرف دیواروں پر لگی تصاویر کے بیچ سے ہوتے ہوئے ستار انھیں ہال کے سرے پر لے گیا اور ایک تصویر کی

طرف اشارہ کرکے بولا۔ "دیکھیے یہ رہی آپ کی تصویر۔"

انھیں کچھ پل یہ فیصلہ کرنے میں لگ گئے کہ واقعی یہ ان کی تصویر ہے بھی یا نہیں لیکن تصویر انھیں کی تھی۔ ستار کل ایک بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اس میں جگہ جگہ بنیان کے سوراخ تو دکھائی دے رہے تھے، لیکن پسینے کی چپچپاہٹ اور بدبو کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ چہرے پر خشخاشی داڑھی اور جھریاں تھیں۔ سب کچھ دیکھنے میں اچھا لگ رہا تھا۔

انھوں نے غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔ رنگ پر ٹائر چڑھاتے وقت جو مشقت کا اثر ہاتھوں کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی آجاتا تھا، وہ تصویر میں بالکل واضح تھا۔ جسم کی مانند پڑتی ہوئی طاقت کا احساس کرکے جھنجھلاہٹ اور مجبوری کا تاثر۔ چند لمحات کے لیے اپنی تصویر سے نظریں ہٹا کر انھوں نے اطراف کی تصویروں اور پورے ہال پر نظر دوڑائی۔ نیچے بڑھیا قالین بچھا تھا اور دیواروں پر شاید موٹا کاغذ چڑھا ہوا تھا جس پر ان کی تصویر پیتل کے کیلوں سے جڑی ہوئی تھی۔

انھوں نے ایک لمبی سانس لی۔ جب اشوک نے ڈاکٹری پاس کی تھی، بلکہ جب وہ پڑھ ہی رہا تھا، تبھی سے دل میں بڑے لوگوں کے گھر کی طرح اپنے رہنے کے لیے ایک گھر کا تصور ابھرتا تھا۔ تصور میں بڑے صاحب کے گھر کا قالین، صوفہ سیٹ اور رنگین دیواروں والا کمرہ، اس میں بیٹھے ہوئے چکن کے سفید کرتے پاجامے میں صاحب کے والد کی شباہت ابھرتی تھی۔ وہ صاحب کے بیٹھک کے کمرے کی جگہ اشوک کے بیٹھک کے کمرے کا تصور کرتے اور صاحب کے والد کی جگہ پر خود اپنی۔ ان کی تصویر آج ان کے تخیلی کمرے میں لگی تھی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے رگڑ کر انھوں نے ستار سے پوچھا، "اس تصویر کے نیچے کیا لکھا ہے؟"

"داس صاحب نے تصویر کا نام دیا ہے کچھ۔" ستار تصویر کے اور نزدیک پہنچ گیا اور آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ "نو کیپ دی وھیل موونگ۔"

مطلب جاننے کے لیے انھوں نے ستار کی جانب دیکھا تو وہ جیسے جھنپ سا گیا۔ بولا۔ "کیپ یعنی رکھا، وھیل یعنی پہیہ، موونگ یعنی چلنا۔"

معنوں پر زیادہ دھیان دینا انھیں بے ایمانی لگا۔ اس لیے بولے۔ "چلو چلیں، تمھاری مہربانی رہی جو تم نے تصویر دکھادی۔"

"مہربانی کی کون سی بات ہے چاچا! مجھے تو مزہ آگیا کہ تصویر والے کو گوشت پوست میں میں نے دیکھ لیا۔ میں تو داس صاحب سے کہوں گا کہ آپ کو بھی کچھ دیں۔"

"آتے رہنا ادھر۔" وہ بولے۔ "ہوا، پنکچر ۔۔۔۔۔۔"

"بہت اچھا چاچا۔ آداب عرض۔"

○

اس شام گیٹ پر اسٹول پر بیٹھے بیٹھے رنگ برنگے کپڑوں میں مرد، عورتوں کو نمائش کے اندر جاتے ہوئے دیکھ کر اور ہال میں لوگوں کو چاچا کی تصویر کے سامنے کھڑا دیکھ کر ستار من ہی من میں خوش ہوتا رہا۔ اس کی جیسے تمنا ہو رہی تھی کہ وہ سب سے چلا چلا کر کہے کہ وہ فلاں جگہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سائیکل کی مرمت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی بے چینی سے داس صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ انھیں بتانے کے لیے بے چین تھا کہ وہ مراری سے مل چکا ہے اور انھیں تصویر بھی دکھا چکا ہے۔ لیکن داس صاحب دکھائی نہیں دیے۔ نمائش بند ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ستار سے جب رہا نہیں گیا تب اس نے سامنے سے تنہا آتی ہوئی انیتا گوئل کو روک لیا۔ انیتا گوئل کی کھینچی ہوئی تصاویر نمائش میں لگی ہوئی تھیں۔ ستار کے "ایک منٹ میم صاحب۔" کہنے پر انیتا گوئل ٹھٹھک گئی اور بڑے بڑے گاگلز سے آنکھیں اس پر ٹکا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "کہو ستار!"

اس نے جلدی جلدی اتاولے انداز میں مراری لال سے ملنے اور انھیں ان کی تصویر دکھانے کی بات بتادی۔ اس نے
ہا کہ انیتا گوئل کی آنکھیں تعجب سے کھلی رہ جائیں گی کہ مجھے بھی مراری لال کو دکھاؤ لیکن وہ بڑے سرد لہجے میں بولی۔
ہم کسی کو بھی اپنا سبجکٹ بنا سکتے ہیں اور سبھی کو یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔۔
"اور انعام۔۔۔۔۔
"انعام اس بات پر نہیں ملتا کہ تصویر میں کون ہے؟ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ تصویر کھینچی کیسے گئی ہے۔ واس صاحب
سویر فوٹوگرافی انٹرسٹ کی چیز ہے۔ کتنے کلیر ڈیٹیلس..... یعنی ہر چیز کتنی صاف ہے۔ ہاتھ کی ایک ایک نس صاف
ہے۔ ماتھے پر کی لکیریں کتنی جاندار ہیں۔ داڑھی کے بال تو اتنے کلیر ہیں کہ ایک ایک بال گن لو۔ کمال کی فوٹوگرافی ہے۔
ں۔۔۔ کچھ لوگ ادھر میرا انتظار کر رہے ہیں۔۔
ستار اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ نمائش بند کرنے سے پہلے وہ ایک بار پھر چاچا کی تصویر غور سے دیکھے گا۔ اس نے طے

○

نمائش کے آخری دن ستار آرہا تھا۔ تو اس نے سوچا کہ آج مراری لال سے پوچھ لے کہ وہ پھر تو تصویر نہیں دیکھنا
گے۔ آج واس صاحب ضرور آئیں گے۔ ان سے بھی مراری لال کی ملاقات کروادے گا۔ وہ فٹ پاتھ پر گیا تو دیکھا، بکسے
س مراری لال گھٹنوں کے درمیان سر ڈالے بیٹھے تھے۔
"آداب عرض چاچا جان۔۔ کہنے پر انھوں نے دھیرے سے سر اٹھایا اور جیسے بڑی کوشش کرکے اس کی جانب دیکھا
پر پہچان کا تاثر ابھرا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"خیریت تو ہے چاچا۔۔
ان کے منہ سے دھیمی آواز نکلی جو ستار کو سنائی نہ دی۔ وہ سائیکل سڑک پر کھڑی کرکے ان کے پاس پہنچ گیا اور ان کی
ہاتھ رکھ دیا۔ "ارے آپ کو تو تیز بخار ہے، کلائی ایک دم جل رہی ہے۔ کوئی دوائی؟"
انھوں نے سر ہلادیا اور جیسے کمزوری محسوس کرتے ہوئے اپنا سر دوبارہ گھٹنوں پر ٹیک دیا۔
"چلیے آپ کو اسپتال لے چلوں۔ ایڈمٹ ہوجائیے۔۔
وہ کچھ بولے نہیں۔ ایڈمٹ ہونے کے نام سے اندر سے کوفت سی محسوس ہوئی۔ ستار نے انھیں سائیکل پر آگے
ر گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔ ابھی ڈیوٹی شروع ہونے میں پون گھنٹہ باقی ہے۔ تب تک میں آپ کو بھرتی کرادوں گا۔
ایمرجنسی میں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر انھیں کچھ گولیاں دے کر وداع کرنا چاہتا تھا مگر ستار نے عاجزانہ انداز میں
۔ بتایا کہ بے یار و مددگار ہے۔ مزدوری کرتے ہیں۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔ تب کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر انھیں
کرنے پر تیار ہوگیا۔

کاغذات پر کرنے کے بعد وارڈ میں انھیں پلنگ پر پہنچاتے پہنچاتے چار بج گئے۔ وارڈ میں پلنگوں کے ساتھ کی بچی
پر صراحی، تھرماس یا کچھ دوسرا سامان تھا اور مراری لال کی تپائی خالی دیکھ کر ستار کو اچھا نہیں لگا۔ اس لیے چوراہے
اس نے صراحی اور گلاس خریدا، پھر صراحی بھر کر مراری لال کی تپائی پر رکھ دی۔ ان کا ہاتھ تھام کر، جلدی ٹھیک
کے لیے کہا اور وہ وارڈ سے باہر آگیا۔ سوچ رہا تھا، اب گھنٹہ بھر دیر سے پہنچے گا تو دیپ چند کی بڑبڑاہٹ سننے کو ملے گی۔
دوسرے دن ستار ڈیوٹی کے دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلا۔ اس نے سوچا مراری لال کے پاس ایک آدھ گھنٹہ بیٹھے گا۔
جانے دے گا۔ انھیں کی صحبت میں بیٹھ کر جانے پیے گا اس کے بعد ڈیوٹی پر جائے گا۔

وارڈ کے دروازے پر سے اس نے پلنگ پر نظر ڈالی تو پلنگ خالی دکھائی دیا۔ کیا وہ اسپتال چھوڑ کر چلے گئے یا کر دیے گئے؟ حیران سادہ خالی پلنگ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بغل کے پلنگ پر لیٹے ہوئے مریض سے بولا، "یہ مراری ا[illegible] گئے؟"

"وہ تو کل رات ہی گزر گئے۔۔"

"گزر گئے!" ستار کو اس بات پر بالکل ہی بھروسہ سا نہ ہوا۔

سامنے سے خاکی وردی میں آتا ہوا وارڈ بوائے ستار کے پاس رک گیا اور خالی پلنگ کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

"نمبر آپ کا رشتہ دار تھا کیا؟۔۔

"رشتہ دار نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔

وارڈ بوائے آگے بڑھنے لگا تو ستار اس کے قریب پہنچ گیا اور آہستہ آواز میں پوچھا۔ "ان کی لاش کون لے گیا؟"

لاش! اناٹومی میں چلی گئی۔ یہ کہتے ہوئے وارڈ بوائے دروازے سے باہر چلا گیا۔ باہر نکل کر سائیکل اسٹینڈ د[illegible] پرچی اور پیسے دے کر اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ "بھئی، یہ اناٹومی کیا ہوتا ہے؟ اس میں لاش بھیجنے کا کیا مطلب[illegible]

لاوارث لاشیں وہاں بھیج دی جاتی ہیں۔ اسٹانڈ والے نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا، چیر پھاڑ کر کے ل[illegible] ڈاکٹری پڑھانے کے کام آتی ہیں۔۔

ستار نے سرہلا دیا۔ اس کے چہرے سے یہ تاثر جھلک رہا تھا کہ وہ سب سمجھ گیا۔ پھر وہ سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اداسی اور گہری ہو گئی۔ نمائش میں لوگوں کو مراری لال کا فوٹو دیکھنے کے منظر کے ساتھ ساتھ ایک اور منظر اس کے[illegible] میں ابھرنے لگا تھا، لیکن جیسے اس منظر کو مٹانے کے لیے ہی اس نے اپنا سر زور سے جھٹک دیا اور تیزی سے[illegible] مارنے لگا۔

انجمن خواتین کی اپیل

اہل خیر حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ زکوۃ، خیرات، صدقات کا انجمن کو عطیہ د[illegible] کر مدد کریں۔ انجمن نادار لڑکیوں کی شادی، دینی تعلیم، ٹیلرنگ سنٹر کے کاموں میں اہل حضرات کے تعاون سے خدمات انجام دے رہی ہے۔ انجمن غیر مقیم افراد ملت سے جو ریاستوں، امریکہ، کناڈا وغیرہ میں مقیم ہیں خصوصیت کے ساتھ اس کار خیر میں حصہ ادا کرنے[illegible] درخواست کرتی ہے۔

عطیہ دہندگان حسب ذیل پتے پر عطیات جمع کروا کر رسید حاصل کر سکتے ہیں۔

شاہدہ صمد۔ صدر انجمن خواتین آندھرا پردیش

روبرو ضلع پریشد آفس۔ 577-3-5، خیریت آباد، حیدر آباد۔ انڈیا

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں ارسال کی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)۔

نام کتاب: جنوں کنارا (مجموعہ کلام) مصنف: اسعد بدایونی سائز: 1/8 ڈیمائی۔ .
صفحات: قیمت: پچاس روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، یونیورسٹی مارکٹ، علی گڑھ۔

معاملہ اگر تعداد کا ہو تو غزل گو شعرا کی ایک طویل فہرست پیش کر دینا آسان ہے لیکن سوال اگر اس صنم سنگ بدن کی مزاج شناسی کا ٹھہر جائے تو بڑی خفت کا سامنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے اس طویل فہرست کے تناظر میں۔ اور حقیقت حال شاید یہی ہے کہ جب بھی قیامت کا ذکر چھیڑتے ہیں تو بات "اس کی جوانی تک آ پہنچتی ہے۔ اس اعتراف میں قطعی کسی ندامت کی ضرورت نہیں کہ تمام تر بدعتوں کے باوجود غزل جو صحیح معنوں میں غزل ہے اسی انداز میں مسند آرا اور اسی مقام پر متمکن ہے جو اس کا مقام خاص ہے اور قحط الرجال کے باوجود اسعد بدایونی جیسے اس کے مزاج شناس موجود ہیں۔

"خیمہ خواب" پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ اسعد بدایونی نے قابل قدر شعری روایات سے اکتساب حسن کرتے ہوئے ایک تازہ کار شعری نظام کی دریافت کا کام انجام دیا ہے۔ "جنوں کنارا" کے مطالعے سے میرے اس خیال کو قوت پہنچتی ہے اور اپنی گفتگو کو آگے بڑھانے کا امکان نظر آتا ہے۔ اسلوبیاتی تازہ کاری اور نفسیاتی تہہ داری کے عمل میں تیز رفتاری کے ساتھ مصروف ہیں اور ان کی غزل اس حوالے سے بیک وقت غزلیہ روایت کے مدار میں سفر بھی کرتی ہے روایتی غزل کے حصار کو توڑتی بھی ہے۔ "خیمہ خواب" کے بعد "جنوں کنارا" تک کا سفر بہت زیادہ تحیر خیز نہیں جو خلاف توقع بھی ہے مگر یہ بات بھی کچھ کم خوش گوار نہیں کہ انھیں دوسرے بہت سارے ہم عصروں کے برخلاف آج بھی اپنے اجتہادی اسلوب پر دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے اپنا ایک ڈکشن بنایا ہے جس میں تازگی بھی ہے اور گہرائی بھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کئی درجن غزلوں کے درمیان سے بھی ان کی غزل کو نکال لینا ایک آسان کام ہے۔ ظفر اقبال نے ان غزلوں کے حوالے سے اسعد کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ اس کی زمینیں تازہ اور شگفتہ ہیں۔ یہی تازگی اور شگفتگی دراصل ایک مخصوص حزن سے پیدا ہوتی ہے اسعد بدایونی کی پہچان ہے۔

دیار دل کا سفر ناتمام رہ گیا ہے
ستارہ بجھ کے سرِ بام شام رہ گیا ہے

بجز فراغ ہے کیا آدمی کی آسانی
مگر ہمیں تو ابھی کتنا کام رہ گیا ہے

میں اک طرف ہوں کسی کنج کم نمائی میں
اور ایک سمت جہاں داری زمانہ ہے

کتاب عمر بھری جا رہی ہے لیکن کیوں
نہ کوئی لفظ نہ چہرہ پرانا ہوتا ہے

مٹی کی مملکت میں نمو کی زکوۃ پر
زندہ ہیں پیڑ آب و ہوا کے بغیر بھی

شاعری کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا نامعلوم مسحور کن کیفیات کا اسیر ہو کر رہ جائے۔ یہ عمل اس جہا دیگر سے تعبیر ہے جو شاعر اپنے اچھوتے احساس و وجدان سے تخلیق کرتا ہے اور جس کی اثرانگیزی سے وہ قاری کو اپنے معاملات و کیفیات کا شریک بنالیتا ہے۔ "جنوں کنارا" میں ایسے مقامات بار بار آتے ہیں اور خط و تحیر کے امتزاج سے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اسعد بدایونی نے اپنی شاعری میں دانشوری، فلسفیانہ مضامین اور ذہنی کشاکش سے کہیں زیادہ قلبی واردات سے کام لیا ہے اور ان کے اظہار میں وہ اپنے اکثر و بیش تر ہم عصروں سے آگے ہیں۔

نہ انتظار نہ قول و قسم سے جاگتی ہے
یہ آنکھ تشنگی بیش و کم سے جاگتی ہے

اسی سبب نہ کیے آرزو کے داغ شمار
چھپاؤں اس سے تو کیا ہو، اگر دکھاؤں تو کیا

یہ چاند جھیل کے پانی سے ہم کلام ہے کیوں
کنارے کس لیے رنج و ملال میں گم ہیں

اس کے ملنے پہ نہ تھا دارومدار دنیا
اب اگر اس کے بچھڑ جانے کا امکان ہے تو کیا

ہم ایسے دل زدگاں کے لیے زیادہ ہیں
تری نظر سے جو تحفے وصول ہو گئے ہیں

لہو میں گونجتی رہتی ہے ہجر کی آواز
عجیب لوگ تھے میں جن کو چھوڑ کر آیا

عجب اداس ندی تھی ہماری چاہت بھی
نہ کوئی لہر اٹھی نے کوئی بھنور آیا

بچھڑ کے تجھ سے کسی دوسرے پہ مرنا ہے
یہ تجربہ بھی اسی زندگی میں کرنا ہے

جنوں کنارا میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں جن پر گفتگو آئندہ کبھی ہوگی۔ فی الحال میں اپنے آپ کو اسعد بدایونی کی غزلوں ہی مرتکز رکھنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی ان کا مقام شناخت ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ انھیں یقیناً غزلوں کے حوالے سے یاد رکھے گی۔

کتاب خوب صورت اور صاف ستھری چھپی ہے۔ اس کی اشاعت میں مالی تعاون کے لیے اترپردیش اردو اکیڈمی

قابل مبارکباد ہے۔ (عین تابش)...

اس شمارے میں

انشائیہ

شخصیات

یادداشتیں

تحقیق

کتاب: مرزا غالب (باب ۳)

مطالعہ

نظمیں

غزلیں

افسانے

نقد و نظر

۳

آصف فرخی

پرانی کتابیں

ایسی باتوں پر دھیان بودلیئر کی طرف چلا جاتا ہے۔ "پرانا شہر اب باقی نہیں رہا، وائے کہ شہر کا نقشہ دل فانی سے بھی زیادہ سرعت سے مائل بہ تغیر ہے۔۔" اس نے پیرس کے بارے میں لکھا تھا کہ جہاں کے کرب ناک عذاب (SPLEEN) رقم کرنے پر وہ مامور تھا۔ وہ شہر کے عذاب لکھتا تھا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ لوگ بودلیئر کو نہیں پڑھتے اور وہ کرب شہر در شہر پھیل چکا ہے۔ ہم میں سے کوئی بودلیئر نہیں، لیکن اپنی کھڑکی سے جھانکتا ہوں تو وہی منظر میرے سامنے ہے، میری کھڑکیوں کے باہر کچھ نہیں ہے، صرف لامتناہیت ہے۔۔ شہر کا یہ منظر لامتناہی ہے، ابدی نہیں۔ میں اس شہر کے بارے میں اس طرح کے کلمات نہیں کہہ سکتا کہ جیسے بورخیس نے اپنے شہر کے بارے میں کہے تھے: "یہ یقین کرنا بے حد مشکل ہے کہ بیونس آئرس کا کوئی آغاز بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اتنا ہی ازلی و ابدی ہے جتنے ہوا اور پانی۔۔" میں اسے کتنے ہی رنگ بدلتے ہوئے دیکھتا ہوں اور اساطیر سے تہی، اس تغیر پذیر شہر کو نت نئے فریب و فن اختیار کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ شہر میرا قاری ہے۔ "میرا برادر، ہم زاد، مکار قاری۔۔" ہم دونوں کتابوں کی تلاش میں ساتھ رہے ہیں۔ ہم نے ان کتابوں کو اور ایک دوسرے کو ساتھ ساتھ پڑھا ہے۔ میں اس ساتھ کو یاد کرتا رہتا ہوں کہ یہ میرے لیے سرمایہ ہے۔

اپنے آپ کو اس کا ادا شناس سمجھنے کے باوجود میں جانتا ہوں کہ شہر کراچی بہت نظر فریب ہے، دیکھتے ہی دیکھتے بدل جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کسی صورت کو قرار نہیں۔ کتنی ہی نئی بستیاں آباد ہو گئیں اور نئے راستے کھل گئے، بہت سی پرانی عمارتیں ڈھا دی گئیں۔ زرد مٹیالے مقامی پتھر کی بنی ہوئی، ستونوں اور گنبدوں والی پرانی عمارتیں جن میں ہندوستانی اور وکٹوریائی انگلستان کے انداز تعمیر آپس میں پیوست ہو کر یک بنیاد ہو گئے ہیں اور وقت کے گزرنے نے اپنے نشانات ثبت کر دیے ہیں۔ ان کی جگہ بے روح اور بے کردار پلازہ اور منزلیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی عمارتیں جنھیں عمر رسیدہ ہوتے ہوئے تصور کرنا محال ہے۔ وبا میں مرنے والے لوگوں کی طرح سینما ہال ایک ایک کر کے ختم ہونے لگے اور شہر کے گنے چنے کافی ہاؤس بھی جانے پڑ گئے۔ سینما کو گھر گھر وڈیو نے بے کار کر دیا اور فاسٹ فوڈ کے رواج نے ان محفلوں کو بعد ازاں کو جہاں ایک آدھ پیالی کے سہارے دنیا جہان کے مسائل سے نبرد آزما ہوا جاتا تھا۔ ان کے اٹھ جانے کے ساتھ تو فرصت کا وقت گزارنے کا وہ انداز خطرے میں پڑ گیا جو خیال افروز بھی ہے خیال پرور بھی۔ کیفے جارج یا د میں کی سفید میز کے سامنے بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں کافی پیتے ہوئے اپنے دوستوں کی گپ شپ اور ادبی کاوشوں کو سنتا اور پہر کے شور میں بیٹھ کر جادو جگاتی فلموں کو کسی خواب کی طرح دیکھتا۔ مجھے وہ جگہیں یاد ہیں جنھوں نے ان زرخیز تجربات کو ممکن بنایا اور میں ان لوگوں کے ساتھ ماتم میں شریک ہوں جو اس اٹل حقیقت پر نوحہ کناں ہیں کہ شہر کا نقشہ تو بدل جاتا ہے مگر دل حسرت [illegible] نقشہ مٹانے نہیں مٹتا۔ کراچی سے سینما گھروں اور کافی ہاؤس کے غائب ہو جانے سے [illegible] ان کے علاوہ ایک اور ایسی روایت کے اٹھ جانے کا نہایت رنج ہے [illegible] [illegible] گلیوں اور فٹ پاتھوں سے وہ پرانے کتب فروش اٹھ گئے، جن کے [illegible]

والے مجھے یہاں کا سیلز مین سمجھ کر کسی کتاب کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں پر حیرت کرتا تھا جن کو دکان میں داخل ہونے سے پہلے ہی پتہ ہوتا کہ انھیں کون سی کتاب چاہیے، اور بہت اطمینان محسوس کرتا کہ زندگی یوں بھی گزاری جا سکتی ہے۔ پنگوئنز آتی رہیں اور میں یہاں سے اپنے آپ کو، اپنے حلقۂ احباب کو، ایک پورے شہر کو کروٹیں بدلتے دیکھتا گیا۔ اس سے چند قدم ایک برآمدے میں بغلی دکان میں چھوٹی سی دکان تھی۔ یہاں سے میں نے کامو کی کتابیں خریدی تھیں۔ اجنبی، طاعون اور زوال۔ چارلز ڈکنز اور وکٹورین ناولوں سے پچھلی صدی کے عظیم روسیوں اور ڈی ایچ لارنس تک پہنچنے کے بعد جدید فرانسیسی ادب میرے لیے ایک نئی دریافت تھا، اور "طاعون" نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ کتابیں مجھے اس دکان سے ملی تھیں۔ اب وہاں ٹوٹے پھوٹے ریڈیو مرمت ہوتے ہیں۔ وکٹوریا روڈ پر صدر ڈاک خانے کے سامنے ایک اور چھوٹی سی دکان ہے، جہاں پنگوئن کے نہ بک سکنے والے ڈھیر میں بالزاک کے کئی ایک ناول ہاتھ لگے۔ میں نے ہرمن ہیسے کی پہلی کتاب پڑھی۔ ریو سینما کے آگے روسی کتابوں کی دکان تھی، جو سمٹتے سمٹتے چند دن پہلے اپنی بساط ہی اٹھا گئی۔ اس سڑک پر دونوں طرف، شان دار اور فیشن ایبل دکانوں کی بھڑک دار رونق سے سجی ہوئی ایک آدھ دکان اور مجھے یاد ہے جہاں سے میں نے پولینڈ کی نظموں کا مجموعہ خریدا تھا۔ بہت ساری کتابیں، اور بعض اوقات رطب و یابس کا ڈھیر جس میں سے اپنے ڈھب کی کتاب تلاش کرنا ایک چیلنج معلوم ہوتا تھا اور وہ کتاب اس سعی و تلاش کا ثمرہ بن کر مل جاتی تھی، نئی کتاب ایک نئے منطقے کی دریافت، ایک نیا جہانِ خواب و خیال۔ منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں اور میں کتابوں کے ورق پلٹتا ہوں۔ ایک نئی کتاب آتی ہے اور اپنے جلو میں کتنے نئے احساسات بیدار کرتی چلی جاتی ہے، ایک نئی سرزمین کا سراغ، احساس کی انوکھی سمتیں، دید و دریافت کے واسطے نئے خزانے۔ ایسی ہی دکان کی شیلف سے میلان کنڈیرا کی پہلی کتاب ملتی ہے اور ایک نیا طرزِ احساس آشکار کرتی ہے کہ ناول لکھنے کا ڈھنگ یوں بھی ہے اور کامیو، بوہل، سنگر کے ملکوں کے علاوہ اور دیس بھی ہیں، جہاں کی کتابیں ایک اور ذائقے کی حامل ہیں۔ (پنگوئن نے اس سلسلے کا نام ہی رکھ چھوڑا ہے، ایک اور ہی یوروپ کے ادیب۔) اور جب میں ان دکانوں میں یہ مصنف ڈھونڈ رہا تھا تو تھامس اینڈ تھامس میں لاطینی امریکا کے ادیبوں کی کتابیں آنے لگی تھیں۔ ایک اور بر اعظم جو ڈھیرے ڈھیرے دریافت ہونے لگا! میں نے بورخیس اور اس کے بعد مارکیز، کورتازر، پاز، برگاس یوسا، فیونتیس، سباتو اور رلفو کو ڈھونڈنا اور پانا شروع کیا۔ ایسی جگہ تلاش کیا۔ یہاں سے یہ سراغ ملا اور یہیں سے یہ نشان۔ یہ سب مقام میرے حافظے میں کتابوں کے عنوانات سے مزین ہیں۔ دو برس پہلے پیرس گردی کے دوران، نوترے دام کے ہوش ربا کلیسا میں، میں نے فرش کو ایک جگہ سے نشان زد دیکھا تھا، اور اس نشان زدہ قطعے پر ایک عبارت اور ایک تاریخ درج تھی کہ یہاں پال کلودیل نے یقین کی ایک نئی دولت کو پایا۔ یہاں، عین اسی مقام پر۔ میں اس پتھر پر دو زانو ہو گیا اور احترام و عقیدت سے اسے چوم لیا تھا۔ شاید اس بہانے اس یقین کی دولت مجھے مل جانے! کیا پتہ وہ اس سنگین فرش سے مس کر گئی ہو اور اس میں سرایت کر گئی ہو کہ اس کا لمس حاصل کر کے ہم بھی قلب ماہیت کے اس معجزے میں شامل ہو جائیں! ایمان کے اس معجزے کی بدولت یہ مقام بھی بابرکت ہے اور میں اسے سلام کرتا ہوں۔ اسی جذبے کے ساتھ میں کراچی کی ان غائب ہوتی ہوئی کتابوں کی دکانوں کو یاد کرتا ہوں، جن پر کوئی پتھر نہیں لگا ہوا اور کوئی عبارت درج نہیں، لیکن جن کے نام کے INSCRIPTIONS میرے دل میں محفوظ ہیں۔ یہاں میرے ساتھ ایک معجزہ ہوا تھا۔ کشف المحجوب میں بیان کردہ روایت کے مطابق، میں نے یہاں اپنا وقت گم کیا اور اپنا وقت حاصل کیا۔ کتابوں میں لکھنے والا ایک نوجوان یہاں آیا اور یہاں سے نکلا تو ایسے کہ ایمان حاصل کر کے جا رہا ہو۔ بہت دن بعد تک اس افتاد کا حال مجھ میں نے ایک کتاب میں پڑھا۔ امریکی ناقد ہیر کرنس (اس سے میری ملاقات کیمبرج ہارورڈ کی پرانی کتابوں کی دکان میں ہوئی اور یہاں وہ مستقل ہو گئی کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا نظر آتا تھا۔ میری وطن واپسی سے قبل اسی نے مجھے ایک اور کتاب سے روشناس کرایا، اس کی اپنی کتاب جو چند دن پہلے ہی چھپ کر آئی تھی!) اپنے اس شوق کو مرض قرار دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ

میں [illegible] کے گھر گیا تھا اور اس وقت وہ یونیورسٹی بھوپال کے کیمپس میں واقع اپنے بنگلے کے کھیت میں آدھی آستینوں کی قمیص اور پتلون پہنے اپنے پودوں کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ جی ہاں اسے ان کے کھیت ہی کہنا چاہیے کیونکہ اس میں وہ ہر موسم کی ترکاریوں کی کاشت کرتے تھے، خود کھاتے تھے، دوسروں کو کھلاتے تھے۔ حقیقت میں وہ بیک وقت ان کا کھیت، باغیچہ اور لون تھا۔

اندر پہنچنے پر چائے یا کافی تو ہوئی ہی ہوگی اور پاکستان کا بعد از جنگ ذکر بھی گفتگو میں آیا ہوگا لیکن مجھے حیرت انگیز خوشی جب ہوئی جب انھوں نے اپنی نظموں کا مجموعہ "روداد خیال" مجھے پیش کیا۔ یہ کتاب 1961ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی اور اردو روایت کے مطابق اس کی فروخت سے بے نیاز وہ اسے ملنے والوں اور دوستوں کی نذر کرتے رہتے تھے۔ اس کتاب کے بارے میں میں آگے چل کر کچھ کہوں گا، پہلے میں ان کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

پروفیسر موصوف کا تعلق ہندوستان کے دکن سے ہے جہاں وہ 1915ء میں ایک دیہاتی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو مقیم حیدرآباد میں تھا، اور جس کا تعلق تلنگانہ سے تھا۔ بچپن اور نوجوانی اگر عسرت میں نہیں تو ایسی فارغ البالی میں بھی نہیں گزرے۔ ماں کا سایہ آٹھ سال کی عمر میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ رشتے داروں میں ان کا گہرا تعلق صرف نانی، دو ماموؤں اور ایک بھائی سے رہا۔ ان کے اساتذہ میں مرحوم محمد مارما ڈیوک پکتھال مترجم قرآن [illegible] تھے۔ تعلیم انھوں نے اردو میں عثمانیہ یونیورسٹی میں پائی۔ وہیں سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کیا اور اس کے فوراً ہی بعد [illegible] بیمار پڑے کہ لوگوں نے سوائے چند دوستوں اور چار رشتے داروں کے ان کی فاتحہ پڑھ لی تھی۔ جس خاتون نے ان کی اس دور میں بے لوث خدمت کی تھی وہی آگے چل کر ان کی شریکِ حیات بنی اور بقول ان کے "شادی جو ہوئی اس میں چار مہمان تھے۔ قاضی صاحب کے 5 روپیہ معاوضے کو ملا کر کل 27 روپے کا خرچہ ہوا تھا۔ یہ بات 1040ء کی ہے۔ اس طرح آج تک (1994ء) پچاس پیسوں کا (سالانہ) معاملہ بنا اور انھیں امید ہے "اگر زندگیاں باقی ہیں تو حساب اور بھی فائدے کا بن جانے گا۔" اپنی ازدواجی زندگی کو وہ غیر رواجی قرار دیتے ہیں۔ میں ان کی پوری ہی زندگی کو غیر رواجی قرار دیتا ہوں۔ وہ گھر اور محلے اور شہر تو کیا ساری زندگی ملک بھی بدلتے رہے ہیں۔ غالباً مرحوم سوویت یونین، چین اور جنوبی امریکہ کو چھوڑ کر وہ ساری دنیا کا چکر لگا چکے ہیں، اور اگر انھیں چاند پر کسی انسانی لاش کی تجزیاتی جراحت کے لیے مدعو کیا جاتا تو وہ وہاں کا چکر کب کا لگا آئے ہوتے۔ انھوں نے ہسپتالوں میں بھی کام کیا ہے، فوجی زندگی بھی دیکھی ہے اور زندگی کا بڑا حصہ مختلف ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں کے میڈیکل کالجوں کے شعبہ اناٹمی میں مردہ جسموں کی صحبت میں گزارا ہے۔ ان مردہ انسانی جسموں نے انھیں بلند پایہ تحقیق پر مبنی پچاس سے زیادہ پیپرز دیے جو تحقیق کے مستند رسائل میں دنیا بھر میں چھپ چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "اعصاب و ہڈیوں کی نمو، آنت کی اسعر کاری۔۔ یہ تین مضامین ان کے تحقیقی کام میں غالب رہے۔ گریز اناٹمی جو میڈیکل تعلیم میں وہی رتبہ رکھتی ہے جو عیسائی دنیا کی کتب میں انجیل کا ہے، اور جس سے مغز ماری کا شرف مجھے بھی رہا ہے، اس میں کسی کی تحقیق کا حوالہ آنا ایک طرح کی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں پروفیسر احمد محی الدین کے حوالے ان کی اعصاب اور ہڈیوں کی نمو پر کام سے متعلق ہیں۔ آنت پر ان کا کام "اپنے وقت پر صفِ اوّل میں تھا اور اس کے لیے سوالات اور ان کے حل کے راستے، وہ کہتے ہیں "خود میں نے تلاش کیے تھے۔ میں اس بات کا پابند رہا ہوں کہ اوّلاً تحقیق کے لیے سوال کو سادہ ترین رکھا جانے اور پھر اس کا جواب تجرباتی ذرائع سے ڈھونڈا جائے کم سے کم ساز و سامان کے ساتھ۔ اس بارے میں میرے برطانوی ہم پیشہ بہت کامیابی کے قائل تھے۔ مجھے رادھا کے ناچنے کے لیے نو من تیل کے ہونے اور سیدھے انگلی کا انتظار کے حیلے قبول نہیں۔"

جس دور میں وہ اور میں ایک ساتھ لیگوس میں رہے ہیں وہ ان کے کام کا عروج کا دور تھا۔ اس سے پہلے [illegible] کے کام کے دوران یا شاید اس کے بعد وہ اپنے ہم پیشہ پروفیسر ایجز کے اشتراک سے ایک اہم کتاب [illegible]

اپنے شعری مجموعے روداد خیال کے بارے میں انھوں نے مجھے بتایا ان کی "شاعری ردیف اور قافیے سے عاری تھی مگر ایسی بھی نہیں جیسی کہ بعض اردو رسائل میں آزاد نظم کے طور پر چھپتی ہے۔ مصرعے اور بعد خیال کی رو کو rhythm میں باندھے گئے تھے اور نظمیں بغیر اصلاح کے اسی ترتیب سے شائع کی گئیں جس میں وہ لکھی گئی تھیں۔ اس حد تک واردات واقعی روداد تھی۔ مفہوم کو سمجھ کر گنگنانے کے قابل نہ کہ لہک لہک کر سنانے کے لیے۔ مجھے تیز ہوا کے جھونکوں کی رفتوں کے ساتھ پیدا کرتے ہوئے بدلتے ہوئے ردم کا احساس رہا ہے۔ جب بھی کوئی چیز لکھنی شروع کی تو تاریخ، وقت اور جو تحریر لکھ ڈالی۔ سرخیاں بہت بعد میں لگائی گئیں۔ اور جب ختم کیا تو پھر وقت اور تاریخ نوٹ کر لیے۔ اس ریکارڈ کو بیس سال کے بعد دیکھا۔ واقعی وہ معروف بات سمجھ میں آئی کہ ندی تو وہی نظر آتی ہے جو کبھی تھی مگر پانی وہ نہیں ہوتا۔ دیمک نے اس یادداشت کو تلف کر ڈالا۔

مجھے قرآن میں سورہ لقمان اور سورہ تغابن بہت متاثر کرتی ہیں۔ مغرب کا وقت دل کو بہت بھاتا ہے بشرطیکہ سکون ہو، خموشی ہو اور منظر دور تک کا موجود۔ یہاں (انگلینڈ) میں ہے اور یہاں کے سبزہ زار میں بھی دور سے نظر آنے والی دھنی کلاں، خشک موسم کی ہلکی گرد جو مویشی گھر لوٹتے ہوئے اڑاتے ہیں۔ اس کے ساتھ اپلوں (سوکھا گوبر) کے جلانے چولہوں کا دھواں اور اس کی خاص بو، یہ سب گھیر لیتے ہیں۔ یہاں کی بارش میں اس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے جو مہینوں کی خشکی کے بعد برسات کی پہلی بارش جب دور سے اپنی سمت بڑھتی آتی ہے تو زمین سے جو خوشبو اٹھتی ہے وہ یہاں نصیب نہیں ہوتی۔ جگنو، بیر بہوٹی، بھڑے اور لال بھنورے ان سب کو گرفتار کرنے میں خاصا وقت گزارا ہے اور مختلف انواع کی تیتریوں کے اڑنے میں بھی۔

ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ روداد خیال کے علاوہ انھوں نے ادب میں کوئی اور قدم نہیں رکھا۔ شاید 1966ء میں انھوں نے چیونٹی کا سفرنامہ کے عنوان سے ایک داستان لکھی تھی جو میں نے بھی پڑھی تھی اور اپنا ایک پرانا مضمون اردو میں اردو رسم الخط کے متعلق بھی دکھایا تھا۔ دونوں چیزیں مرہون طباعت نہیں ہوئیں۔

ایمبریولوجی پر ان کی کتاب کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی رحم مادر میں ایک نئی جان کے پڑنے اور اس کے نشوونما پانے کی سائنسی داستان۔ اپنے ریاض کے قیام کے دوران بھی انھوں نے اناٹمی پر ایک کتاب طلبہ کے لیے لکھی تھی اور ان کی ایک کاپی میری بیٹی روبینہ کو بھیجی تھی جو ان دنوں یہاں پاکستان میں فرسٹ پروفیشنل ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کی طالبہ تھی۔ ریاض کے قیام کے دوران میرے اکسانے پر وہ اردو میں اناٹمی پر ٹیکسٹ بک لکھنے پر تیار ہوئے کیوں کہ میں نے انھیں بار بار لکھا تھا طلبہ جو میرے پاس علاج کے لیے آتے ہیں ان میں سے اکثر کو اتنی انگریزی بھی نہیں آتی کہ انگریزی کا اخبار پڑھ سکیں۔ بے چارے لغت دیکھ دیکھ کر درسی کتب پڑھتے اور کچھ بھی نہ آنے کی صورت میں اس میں سے امتحان میں متوقع چیزیں رٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب لکھی گئی۔ پریس میں بھیجنے کے لیے اسے انھوں نے خود اردو میں ٹائپ کیا لیکن کراچی میں کوئی پبلشر اس پر پیسہ لگانے کو تیار نہیں ہوا۔ بعد میں انھوں نے مجھے ریاض سے لکھا "کتاب کو میں نے زمین میں دفن کر دیا اور ٹائپ رائٹر ایک اور صاحب کو دے دیا"۔ ان کا ذکر مرزا ظفر الحسن نے اپنی کتاب ذکر یار چلے میں بھی کیا ہے۔
مرحوم محی الدین ان کے واقفوں میں سے تھے اور اردو کے نقاد راج بہادر گوڑ سے ان کے گہرے تعلقات ہیں۔ چڑیاں اور جانور پالنے کے وہ قائل نہیں ہیں کہ اگر میں مر جاؤں اور وہ پنجروں میں بند ہوں یا جیسے مچھلیاں اکویریم میں تو ان کو وقت پر کھانا نہ ملنے کے خیال کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ سفر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کسٹم والوں کے چیک کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کسی کامیابی پر فخر کا احساس دل سے نہ گمنڈ اور نہ ناکامی کا ملال۔ کسی اور شخص نے ان کے لیے ایک بار کہا تھا۔ آپ تو آئسکریم بھی پھونک کر پیتے ہیں۔ سفارش وغیرہ کے معاملے میں وہ قطعاً فرسٹ آدمی ہیں اور اس دور کے طلبہ میں جب اساتذہ کو جان کا خطرہ رہتا ہے ان کا یہاں وہ دن گزارنا بھی مشکل ہوتا۔ نہ جا

(آگے ص ۳۶ پر)

محمد نورالدین

بھولی بسری باتیں

دکن کے معروف بلند پایہ صحافی، معتبر ادیب و نقاد جناب محمد شبلی یزدانی کا انتقال بعمر (۸۴) برس اسی سال ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء کو ہوگیا۔ بہ حیثیت سب ایڈیٹر رہنمائے دکن بڑے معرکۃ الآرا اداریے لکھے۔ ان کے مضامین اور تبصرے ہمہ دانی اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہیں۔ کئی علما اور باکمال شخصیتوں کی صحبت میں بیٹھے، انھیں دیکھا اور سنا۔ فرزند محمد علامہ عبداللہ عمادی کی صحبت نشینی اور استفادے کا شرف ملا۔ علم کا شوق اور تحقیق کا چسکا تھا اور پھر زندگی میں بڑے نشیب و فراز بھی دیکھے تھے اس لیے بڑے تجربات و مشاہدات سے گزرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے جناب شبلی سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ اکثر ان کے مکان (خیریت آباد) ان سے ملنے کے لیے کشاں کشاں جاتا تو معلوم ہوتا گویا ایک دبستاں کھل گیا۔ شعر و ادب اور تاریخ پر باتیں ہوتیں۔ شنیدہ اور چشم دیدہ کئی معتبر واقعات اور قصے سننے کو ملتے آخر زمانہ میں گوشہ گیر ہوگئے تھے اور پھر ان میں مجھ میں عمر کا تفاوت بھی تھا اس کے باوجود رہنمائی کی۔ بڑے ذہین، صاحب ذوق اور خوش طبع و خوش بیان تھے۔ گھنٹوں ان کی باتیں سنتا مگر اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ آج ان کی کہی ہوئی باتیں ان کی زبانی سنانے تو بیٹھا ہوں مگر ان کی سی گل افشانیٔ گفتار کہاں سے لاؤں۔

۱) فرمایا: حضرت عبداللہ عمادی نے ایک مرتبہ کیفی حیدرآبادی کی رباعی سنائی اور فرمایا کہ اللہ کی حمد اور تعریف میں شعرا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ کئی اشعار نظر سے گزرے لیکن اس رباعی نے بہت متاثر کیا:

عالم تجھے پاک تر جانتے ہیں
عارف تجھے ہر رنگ میں پہچانتے ہیں
ہم کو ہے جان نہ پہچان مگر
بندے ہیں ترے تجھ کو خدا مانتے ہیں

اسی طرح نعت میں کسی کا شعر سنا کر بہت تعریف کی اور فرمایا ایسے شعر بہت کم نظر سے گزرے:

سرورِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

۲) ایک دفعہ رمضان المبارک میں مولوی احسان احمد صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ نے بڑے اہتمام سے سر شام علامہ عمادی کے گھر افطاری بھجوائی۔ شکریے میں برجستہ جو فصیح و بلیغ تحریر لکھ کر بھجوائی یہ ہے:

فطور آمد، فتور رفت، فطرش احسان آباد!

(فطور یعنی افطاری کا سامان)

۳) میں نے ایک مرتبہ عرض کیا: دکن میں کسی ایسے فرد کو جس میں نسوانیت ہو "تڑا" کہتے ہیں۔ کسی لغت میں لفظ ملا ہے نہ اس کے معنی۔ حضرت عمادی نے بڑی آسانی سے اس لفظ کی تشریح یوں کی کہ عربی زبان میں ترائب عورتوں کو کہتے ہیں اس لیے ایسے مرد کو جس میں عورت پن ہو اردو میں تڑا کہتے ہیں۔

۴) علامہ عمادی بحرالعلوم تھے۔ جس عنوان پر کہتے معلومات کا دریا بہا دیتے۔ کتنے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ جو کچھ

انجمن حمایت اسلام کے معتمد (سکریٹری) ہوگئے اور بعد میں گورنمنٹ نے ان کو خفیہ پولس کا کمشنر بنادیا۔ حضرت عمادی نے ان پر ایک نظم کہی اور اخبار زمیندار میں شائع کروائی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

جناب شیخ سے اک روز عرض کی میں نے | کہ پہلے آپ کی شہرت تھی اتقا کے لیے
خطاب حاجی و خانی و سخن دانی | غریب قوم کو اپنی ستا ستا کے لیے
نظر پڑا جو فراغ حمایت اسلام | تو عہدے اس کے زبردستیوں سے جا کھینچے
عجیب طرح کا ہے آپ کا صعود و ہبوط | ابھی وفا کے لیے تھا ابھی جفا کے لیے
جناب شیخ نے سن کر یہ ہنس کے فرمایا | وہ ابتدا کے لیے تھا یہ انتہا کے لیے

(بیاض جناب شبلی)

حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع، حضرت علامہ عمادی کے علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ حضرت عمادی کو اجازت تھی کہ کنگ کوٹھی کے کتب خانے میں بغیر اجازت جب چاہیں جائیں اور جو کتاب چاہیں دیکھیں۔ علامہ عمادی نے تاریخی حقائق کی روشنی میں دولت آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کے روابط کا بڑی عمدگی سے جائزہ لیا تھا کہ کس طرح انگریزوں نے چالاکی اور ڈپلومیسی سے شاہانِ آصفیہ سے روابط بڑھانے اور پھر کس طرح سرکار نظام کے علاقے اپنی مکارانہ پالیسی سے ایک ایک کرکے ہڑپ کرتے گئے۔ اس کتاب کا نام رکھا تھا" ربط و ضبط"۔ ایک اور دلچسپ مگر حقائق پر مبنی کتاب لکھی تھی" نمک حرامانِ دکن"۔ دونوں کتابوں کے مسودے حضور نظام کی خدمت میں پیش کیے تو آصفِ سابع نے بہت اظہار خوشنودی فرمایا تھا اور ان کتابوں کے مسودوں کو رکھ لیا۔ کبھی علامہ عمادی نے مانگا نہ آصف سابع نے واپس کیا۔ اگر یہ کتابیں چھپ جاتیں تو بڑی معرکتہ الآرا کتابیں ہوتیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضور نظام آصفِ سابع، استاد داغ دہلوی اور ان کی شاعری کے سخت مخالف ہوگئے۔ چناں چہ ایک دفعہ میں حضرت عمادی کے مکان میں موجود تھا کہ اتنے میں دو شاگرد پیشہ آصفِ سابع کا حکم نامہ لے کر آئے جس میں داغ کی شاعری کے نقائص پر لکھنے کا حکم تھا اور تاکید تھی کہ اسی وقت مضمون لکھ کر بھجوایا جائے۔ شام کا وقت تھا حضرت عمادی میز پر لیمپ رکھے کرسی پر بیٹھے قلم برداشتہ لکھتے رہے۔ حضرت کا خط بھی بہت خوب صورت اور دلکش تھا۔ لکھنے کا کمال یہ تھا کہ ایک لفظ یا ایک جملہ تک نہیں کاٹا اور کئی صفحات لکھتے گئے۔ جب لکھنا ختم کیا تو جو کچھ لکھا تھا نظرثانی کیے بغیر سرپر سوار شاگرد ---- کے حوالے کر دیا۔ میں اس امید میں بیٹھا تھا کہ ایک نظر مضمون دیکھ لوں مگر موقع ہی نہ ملا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کے بڑے بھائی مولانا سید ابوالخیر مودودی صاحب کا قیام حیدرآباد میں "لکڑی کا پل" کے پاس ایک مکان میں تھا۔ مولانا ابوالخیر مودودی دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں کارگزار تھے لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کہیں ملازم نہ تھے البتہ اخبار صبح دکن کی ادارت کا کام انجام دیتے تھے۔ ان کا اس وقت کا درجہ" مولانا" کا نہ تھا۔ گورا چٹا گول چہرہ داڑھی سے بے نیاز اور اچھا سا ستواں ناک نقشہ۔ رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جناب ابوالخیر مودودی نے شادی کی تھی مگر بعد میں طلاق دے دی تھی۔ گھر میں ان دونوں بھائیوں کے علاوہ صرف ان کی ضعیف والدہ صاحبہ رہتی تھیں۔ مکان دو منزلہ تھا۔ دوست احباب کی نشست اوپر کمرے میں رہتی تھی۔ زنانہ صحن سے گزر کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ آفس برخواست ہونے کے بعد چند مخصوص دوست پابندی سے یہاں جمع ہوتے تھے جن میں قابل ذکر ہیں قاضی عبدالغفار، آغا حیدر حسن، جوش ملیح آبادی، صدق جائسی، مولانا امجد علی اشہری، ڈاکٹر اشرف الحق، عزیز احمد خاں

مددگار اطلاعات۔ مولانا مودودی کی والدۂ محترمہ نیچے ورانڈے میں ایک چوکی پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جو بھی اوپر جاتا ان کو ادب سے سلام کرتا۔ وہ دعائیں دیتیں: "بیٹا جیتا رہے۔ خوش رہے"! یہ محفل خاص دوستوں کی محفل تھی۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ شعر و شاعری ہوتی۔ کبھی اپنے کبھی اساتذہ سخن کے اردو فارسی شعر سنائے جاتے۔ بعض بڑے دلچسپ مذاکرات ہوتے۔ ریاست کے حالات پر تبصرہ ہوتا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ جناب صدق سے میرے مخلصانہ اور سعادت مندانہ روابط ہو گئے تھے اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ اس محفل میں لے جاتے تھے۔ اہل علم کی اس محفل میں میری لب کشائی کا سوال ہی نہ تھا۔ میرا حال تو "میرا حصہ دور کا جلوہ" کے مصداق تھا۔ ڈاکٹر اشرف الحق اور جوش ملیح آبادی اکثر لمش باتیں کرتے تھے۔ مگر یہ تو بے تکلف دوستوں کی محفل تھی۔ سب ان باتوں کو برداشت کرتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ شام کے پانچ بجے سے رات آٹھ بجے اور کبھی رات دس گیارہ بجے تک یہ دلچسپ محفل جمی رہتی۔ چاء کا دور بھی چلتا اور اس کے ساتھ ہلکا سا ریفرش منٹ بھی ہوتا۔ اس موقع پر میں نے جناب شبلی سے پوچھا: جب محفل جمی رہتی تو مغرب کی نماز کیسے ہوتی تھی؟ فرمایا کہ سب بیٹھے رہتے تھے۔ کسی کو نماز کے لیے جاتے میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا: مولانا مودودی؟ کہا وہ بھی نہیں! جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی کی تشکیل کے سلسلہ میں پٹھان کوٹ (پنجاب) منتقل ہو گئے تو یہ محفل درہم برہم ہو گئی۔

۱۱) "علامہ سر اقبال کی مے نوشی کا عام شہرہ تھا۔ کسی کتاب یا مضمون میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اقبال جامعۂ عثمانیہ میں توسیعی لکچر دینے حیدرآباد آئے تھے۔ "بلاوسنہ" (خیریت آباد) کے محاذی ایک سنگ بستہ عمارت تھی۔ اس زمانے میں سرکاری مہمان اس میں ٹھیرائے جاتے تھے۔ اسی سرکار مہمان خانہ میں اقبال مقیم تھے۔ ایک دن ہم تین چار طلبہ مدرسہ سے چھٹ کے یہاں پہنچے۔ اقبال بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ کے بارے میں ہمیں کچھ پوچھنے کی اجازت دیں گے؟ تو کہا کہ ضرور پوچھیے۔ تب میں نے کہا سننے میں آیا ہے کہ آپ کی حضوری میں دخت رز کو باریابی رہتی ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ مسکراتے ہوئے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہے کہ آدمی سے گناہ ہو جائے تو اس کو چھپائے۔ اب میں آپ کے سوال کا اثبات میں جواب دیتا ہوں تو اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور نفی میں جواب دیتا ہوں تو فی الواقع اگر یہ بات صحیح ہے تو میں جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہوں۔ آپ کو کسی سے ایسا سوال نہ کرنا چاہیے کہ اس سوال سے ملال ہو اور اس کا جواب دیتے ہوئے اس کو شرمندگی ہو۔ اس پر میں نے کہا کہ تو مخفی گناہ کی بات ہوئی اور جو گناہ علانیہ ہو؟ اس سے میرا منشا داڑھی منڈانے کی طرف تھا۔ تو کہا کہ اس کو نفس کی کمزوری پر محمول کیجیے اور ہدایت و مغفرت کی دعا کیجیے۔۔

(اقتباس خط جناب شبلی)

۱۱۱) ابتدا میں روزنامہ "پیام" سے وابستہ تھا۔ ایک روز صبح حسب معمول دفتر پیام آیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خلاف معمول جناب قاضی عبدالغفار صاحب مدیر پیام میز پر لکھنے میں مصروف و منہمک ہیں۔ گھر، دفتر پیام کے احاطے ہی میں تھا لیکن صرف بنین اور پاجامے میں آفس کی میز پر کبھی بھی لکھتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر تھکاوٹ اور جاگنے کے آثار بھی نمایاں تھے۔ میں سلام کر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور پوچھا: آج آپ کچھ تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا: ہاں بھئی فانی کی میت میں گیا تھا تدفین کے بعد دیر گئے گھر آیا اور اب اخبار کے اداریے کے لیے تاثرات لکھ رہا ہوں۔ میں خاموش بیٹھا رہا اور وہ لکھتے رہے۔ اتنے میں فون آیا تو وہ اٹھ کر گئے اور پھر آ کر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی ملنے آتا تو اس سے بات کرتے وہ چلا جاتا تو پھر مصروف نوشت ہوتے۔ خلل اندازی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی فون آتا کبھی کوئی آدمی۔ میں چپ خاموش بیٹھے گنتا رہا کوئی سینتالیس

(۲۷) بار لکھنے کا تسلسل ٹوٹا۔کمال یہ کہ خیالات کی رو بار بار ٹوٹنے کے باوجود قائم رہی اور وہ قلم برداشتہ اپنے تاثرات قلم بند کرتے رہے۔ دوسرے دن ۲۹ اگست ۱۹۴۱ء کے اخبار پیام میں فانی کی موت پر قاضی صاحب کا جو اداریہ شائع ہوا وہ اردو ادب کا ایک شہ پارہ قرار پایا۔

قاضی صاحب نے اپنی سوانح عمری لکھنی شروع کی تھی۔اس کا نام رکھا تھا "بر ما چنین گزشت" بڑی دلکش اور شگفتہ تحریر اور ان کے اپنے مخصوص انداز بیان میں ہے۔چند صفحے مجھے سنائے تھے۔ معلوم نہیں مکمل ہوئی یا نہیں۔ قاضی صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔کوئی لڑکا ان کو نہ تھا۔دو لڑکیاں تھیں۔ فاطمہ عالم علی خان حیدرآباد (بنجارہ ہل) میں ہیں۔ دوسری صاحب زادی نجمہ محمد سلطان دلی میں رہتی ہیں۔ سر محمد یعقوب، قاضی صاحب کے خلیرے بھائی اور نسبتی برادر تھے بعد میں قاضی صاحب نے لکھنؤ میں ایک خاتون سے عقد کیا تھا۔ میں نے جب دیکھا تو جوان تھیں بس قبول صورت کہیے۔البتہ لکھنوی لہجے میں بڑی شگفتہ اور بڑی شستہ و رفتہ باتیں کرتی تھیں معلوم ہوتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے "عاصمہ"۔ان کا نام تھا۔گو شہ پردے کی کچھ ایسی پابند نہ تھیں۔ان سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ان خاتون کی تصویر قاضی صاحب کے ساتھ میرے پاس ہے۔

قاضی صاحب کے انتقال کے بعد مسز گروچرن داس سکسینہ نے ایک مضمون "امر بھارت" میں لکھا تھا جو تین قسطوں میں شائع ہوا۔ان کی شاعری کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنا ایک شعر مجھے سنایا تھا جو اب تک یاد ہے!

دکھاتا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
لیے جاتی ہے پیری سوئے گور آہستہ آہستہ

ایک دفعہ قاضی صاحب کو باہر جانا تھا تو ادارت کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں انکار کرتا رہا لیکن انھوں نے کہا وہ روز ڈاک سے ایڈیٹوریل لکھ کر بھجواتے رہیں گے۔ چناں چہ انھوں نے ایسا کیا بھی۔ یہاں تک کہ ریل میں بیٹھ کر بھی اداریہ لکھا اور بھجوایا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک صاحب کو دفتر کی ذمہ داری سونپ دی۔ میں ان کا نام نہیں بتاؤں گا مگر یہ ہے کہ یہ صاحب مجھ پر رعب جمانے لگے۔ مجھے پابند کیا کہ روز صبح 9 بجے سے رات ایک بجے تک آفس میں کام کروں۔ایسی ہی پابندیوں سے میں نے دفترِ پیام کی ملازمت چھوڑ دی۔

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

حضرت امجد حیدرآبادی

(وظیفے کی اجرائی میں خاص رعایت)

آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ان کے دور میں بیرونی مشاہیر کی زیادہ سے زیادہ عزت افزائی اور سرپرستی کی گئی اور بیرونی مشاہیر اور ان کے پراجکٹوں کے لیے یا ان کے تحقیقی اور علمی کاموں کے لیے جی کھول کر حکومت حیدرآباد کی جانب سے امداد جاری کی گئی لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاثر پوری طرح درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اس زمانے کے مخصوص تاریخی اور سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک آصف سابع کے شخصی طرز عمل کا تعلق ہے انھوں نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا اور منطقی نتائج کو اخذ کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے کسی شخصیت سے مرعوب ہو کر امداد جاری نہیں کی بلکہ ایسے کسی بھی عمل کو آخری مرحلے میں اپنے حق تنسیخ کو استعمال کرتے ہوئے کامیابی سے ہم کنار ہونے نہ دیا۔ حیدرآباد کے عظیم المرتبت شاعر حضرت امجد کے ساتھ انصاف کرنے کی جانب جب توجہ مبذول کروائی گئی تو آصف سابع نے اس حق دار کو اس کا حق دلانے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ یہ وہ دور تھا جب حیدرآباد کی سرزمین سے ابھرنے والی شخصیتیں بھی توجہ کی مستحق بننے لگی تھیں۔ چناں چہ آصف سابع کی حکمرانی کے آخری مراحل میں حیدرآباد کے باکمال فرزندوں کی امداد اور سرپرستی میں فیاضی سے کام لیا گیا۔ اس مضمون کا پہلا حصہ حضرت امجد حیدرآبادی سے متعلق ہے جس میں ان کے وظیفے کی کارروائی کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ مضمون کے دوسرے حصے میں مالی امداد اور وظائف جاری کرنے کے سلسلے میں آصف سابع کے رویے پر بحث کی گئی ہے۔

حضرت امجد حیدرآباد کے ایک نمائندہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اردو کے رباعی گو شعرا میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ اپنی طرز کے منفرد، صوفی شاعر تھے۔ انھیں صنف رباعی پر بے پناہ عبور ہونے کی وجہ سے شہنشاہ رباعیات بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت امجد جن کا پورا نام امجد حسین ہے صدر محاسبی میں ملازم تھے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز پر جامعہ عثمانیہ کے سینئر اساتذہ اور دارالترجمے کے ارکان نے محسوس کیا تھا کہ اس باکمال شخصیت (حضرت امجد) کو ان کا مستحقہ مقام نہیں مل رہا ہے جس کی تلافی ضروری ہے چناں چہ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر صاحبان اور ارکان دارالترجمہ نے باضابطہ طور پر اپنی تحریک حکومت کے پاس روانہ کی تھی جو حسب ذیل ہے

"پایہ تخت حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر، حکیم، مصنف حضرت مولوی امجد کی قادرالکلامی، حکمت آموزی و نکتہ نوازی و موثر کلامی کا ہندو دکن کے بہت سے نقادان سخن و اہل فضل و کمال نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ان کی مقبول عام و پسند خاطر نظمیں، اعلیٰ رباعیاں، ان کی تصانیف خود ان کی کھلی شہادتیں ہیں جو صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی امتیازی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ قابل عرض ہے کہ ہماری سلطنت ابد مدت کی فیاضیوں سے ہندوستان، ایران و عرب سیراب ہو رہے ہیں تو کیا یہ محل تعجب نہیں کہ ہماری حکومت آصفیہ جیسی علم پرور، معارف نواز حکومت کے امتیازی بذل و نوال سے اگر کوئی محروم ہے تو وہ صرف حیدرآباد ہی کا یہ مسلم الثبوت شاعر اور عالم جو تقریباً تیس

سال سے صدر محاسبی سرکار عالی کے دفتر میں (۸۰-۱۲۵) کے گریڈ میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر ان کو کم از کم اس وقت ان کی مدّتِ ملازمت کی رو سے جس وظیفے کے وہ مستحق ہو چکے ہیں وہ عطا کیا جانے اور ان کے کمالات شعری اور تصانیف علمی اور ادبی کے صلہ میں (۱۲۵) کا تکملہ بعنوان ماہوار خاص کیا جانے تو ملک کی ایک قابل قدر ہستی کی ایک متوقع سرپرستی اور مافات کی تلافی کی ایک گونہ صورت ہوگی اور حضرت امجد آئندہ فراغت خاطر کے ساتھ اپنے علمی اور ادبی کمالات سے عوام و خواص کو فائدہ پہنچا سکیں گے۔۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد صدر اعظم نے درخواست پر حسب ذیل تجویز لکھی

"امجد کے کلام کو میں نے دیکھا ہے یہ اپنے رنگ میں یگانہ ہے۔ ان کی خاموش، فقیرانہ اور علمی مشاغل کی قدر کرتے ہوئے ان کو ان کی تنخواہ کے انتہائی گریڈ کا وظیفہ دیا جا سکے تو قرین صواب ہو گا۔ ان کے لیے کوئی مناسب شکل آپ تجویز کر کے مجھ کو آگاہ کریں تو خوشی ہوگی۔۔

مہاراجہ نے مندرجہ بالا تجویز تحریر کر کے درخواست صدر المہام فینانس کے پاس روانہ کی۔ سررشتہ فینانس نے حضرت امجد کی مدت ملازمت و استحقاق وظیفہ کے متعلق صدر محاسبی سے استفسار کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ ان کی مدّت ملازمت تا آخر اردی بہشت ۱۳۴۰ف ۵ اپریل ۱۹۳۱ء، ۲۵ سال سے کم ہے۔ اور تین سال کا اوسط مشاہرہ (تنخواہ ۱۰۱ روپے ہے جس کے لحاظ سے ان کو ۳۷ روپے ۱۲ آنے وظیفہ پانے کا استحقاق ہے لیکن ان کی عمر اندرون ۵۵ سال ہے اور مدت ملازمت اندرون تیس سال ہے۔ لہٰذا ان کی وظیفے پر علاحدگی کا عمل کسی استثنائی صورت کے بغیر نہ ہو سکے گا تاآں کہ ان کی جانب سے صداقت نامہ معذوری پیش کیا جانے۔ حالیہ احکام کی رو سے زائد از استحقاق وظیفے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ ان کی مدّت ملازمت فی الوقت تقریباً ۲۴ سال ۲ ماہ ہے اور جو نصف وظیفہ پانے کے لیے تخمیناً ۱۰ ماہ کی کمی ہے۔ اس کمی کو بطور خاص رعایت و بلحاظ ان کی خاص شہرت کے معاف فرمایا جانے تو ان کو نصف وظیفہ باون روپے مل سکتا ہے اور جس سے حضرت امجد آئندہ زندگی فراغت کے ساتھ گزار کر اپنے علمی کمالات سے عوام و خواص کو فائدہ پہنچانے میں مصروف رہ سکیں گے۔ چوں کہ تحت دفعہ (۲،۲۷) ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی مدت ملازمت میں صرف چھ ماہ کی کمی کی معافی دی جا سکتی ہے اور اس کارروائی میں کمی کی مدت ۱۰ ماہ ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ بارگاہ خسروی کی منظوری کا محتاج ہے۔ صدر المہام فینانس نے ایسی رعایت کی سفارش کیے جانے کے متعلق اتفاق کرتے ہوئے اس کا بھی اظہار کیا کہ ادبی مشاغل کے لیے علاحدہ تحریک ہونی چاہیے تاکہ اس پر غور کیا جا سکے۔

یہ کارروائی باب حکومت کے اجلاس منعقدہ ۲۳ امرداد ۱۳۴۱ف ۲۸ جون ۱۹۳۲ء میں پیش کی گئی جس میں مہاراجہ سر کشن پرشاد صدر اعظم کے علاوہ ولی الدولہ بہادر صدر المہام فوج و تعلیمات، سر اکبر حیدر نواز جنگ صدر المہام فینانس سر رچرڈ ٹرنچ، صدر المہام مال و کوتوالی، عقیل جنگ بہادر، صدر المہام تعمیرات، لطف الدولہ بہادر، صدر المہام عدالت و امور مذہبی اور مہدی یار جنگ بہادر، صدر المہام سیاسیات شریک تھے۔ باب حکومت کے اس اجلاس میں بالاتفاق طے پایا حسب رائے سررشتہ فینانس بمعافی کمی نصف تنخواہ کا وظیفہ ایصال کیے جانے کے متعلق بارگاہ خسروی میں معروضہ گزرانا جانے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد، صدر اعظم کے عرض داشت مورخہ ۹ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ م ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء میں حضرت امجد کے وظیفے سے متعلق مذکورہ بالا تمام تفصیلات مع باب حکومت کی قرارداد درج کرتے ہوئے لکھا کہ انھیں بھی باب حکومت کی قرارداد سے اتفاق ہے۔ یہ عرض داشت آصف سابع کے ملاحظے اور احکام کے لیے پیش کی گئی۔ آصف سابع نے باب حکومت کی قرارداد کو منظور کیا اور اس بارے میں آصف سابع کا حسب ذیل فرمان مورخہ ۴ جمادی الاول ۱۳۵۱

م ۱۶/ستمبر ۱۹۳۲ء صادر ہوا۔

"کونسل کی قرارداد کے مطابق شاعر امجد کو نصف تنخواہ کا وظیفہ دیا جائے۔"

حضرت امجد کو خاص رعایت دیتے ہوئے مکمل وظیفے کی اجرائی کی منظوری دی گئی تھی۔ منظوری دیتے وقت باب حکومت کی قرارداد اور دیگر سفارشات کے ساتھ ہی ساتھ حضرت امجد کا شاعرانہ رتبہ اور ان کا علمی و ادبی کام یقیناً آصف سابع کے پیش نظر رہا ہوگا کیوں کہ آصف سابع ہمیشہ عرض داشت میں پیش کردہ سفارشات کو منظور نہیں کیا کرتے تھے بلکہ نفس معاملہ کے لحاظ سے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ کسی بھی کارروائی کی منظوری ان کی رائے اور مرضی کے تابع ہوتی تھی۔ عرض داشت میں پیش کردہ سفارشات کو نامنظور کرنے کے علاوہ کبھی کبھار وہ خصوصی امور میں کسی تحریک یا عرض داشت کے پیش کیے بغیر ہی مالی امداد یا رعایتی وظائف کی منظوریاں صادر کیا کرتے تھے۔ حسب ذیل دو کارروائیوں سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

حیدر نظم طباطبائی (حیدر یار جنگ بہادر) نے اپنے فرزند سید امجد کے نام تعلیمی وظیفہ کی اجرائی کے بارے میں درخواست دی تھی جس پر معتمد عدالت نے سفارش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا طباطبائی کا علمی اور ادبی پایہ جیسا بلند ہے اور ان کے فیضان علم سے نظام کالج اور مدرسہ عالیہ نے جو استفادہ کیا ہے اس کا اظہار غیر ضروری ہے۔ ان کا شمار علوم شرقیہ کے ان اساتذہ اور ماہرین فن میں ہے جن کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ لہذا ان کے فرزند سید امجد کے نام جو انٹر میڈیٹ کامیاب ہیں اور اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم ہیں بی۔ ایس سی کی تعلیم کی غرض سے دو سال تک چالیس روپے کلدار ماہانہ بطور وظیفہ منظور فرمایا جائے۔ گلانسی معین المہام فینانس (وزیر فینانس) نے معتمد عدالت کی تجویز و سفارش سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے اس بارے میں ایک عرض داشت آصف سابع کی خدمت میں پیش کی تھی مگر آصف سابع نے سفارشات کو نامنظور کیا تھا۔ اس بارے میں ان کا حسب ذیل فرمان مورخہ یکم صفر ۱۳۲۷ھ م ۲/نومبر ۱۹۱۸ء صادر ہوا تھا۔

"مولوی علی حیدر طباطبائی کی یافت نہایت معقول ہے یعنی پانچ سو روپے۔ ایسی حالت میں کیا وہ اپنے لڑکے کو بطور خود تعلیم نہیں دلا سکتے۔ وظائف تعلیمی تو ان اشخاص کی اولاد کو دیے جانے چاہئیں جو اپنی استطاعت سے تعلیم نہیں دلا سکتے مگر موجودہ مقدمے کی حالت تو دوسری ہے۔"

آصف سابع فریدوں الملک بہادر کی دو پوتیوں کے نام حسب ذیل فرمان مورخہ ۴/رجب ۱۳۳۶ھ م ۱۶/اپریل ۱۹۱۸ء کے ذریعہ دور عایتی وظائف تاحیات جاری کرنے کے احکام صادر کیے تھے۔

"سر فریدون الملک بہادر صدر المہام پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ نے میرے والد مرحوم کے عہد میں نیز میرے زمانے میں جو قابل قدر خدمات نہایت وفاداری اور خیر خواہی سے ادا کی ہیں ان کے صلے میں میری سالگرہ کی تاریخ یعنی غرۂ رجب ۱۳۳۶ھ سے ان کی دونوں پوتیوں فیروزہ اور روشن کے نام فی کس ایک سو پچیس روپے سکہ کلدار جملہ ڈھائی سو روپے سکۂ کلدار کے دو وظائف رعایتی تاحیات جاری کیے جائیں۔"

ان وظائف کی اجرائی کے لیے کسی تحریک یا درخواست کی بنا پر کوئی عرض داشت آصف سابع کی خدمت میں پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ انھوں نے از خود یہ وظائف جاری کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ آصف جاہی ریکارڈز کے مطالعے اور تجزیے کے بعد جو کاغذات اور فرامین اس خصوص میں پیش کیے گئے ہیں وہ یہ ظاہر ہی نہیں بلکہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں ہر معاملے کی یکسوئی اس معاملے کے حقائق اور MERITS کی بنیاد پر کیا کرتے تھے اور ہر کارروائی کے تمام

(آگے ص ۳۶ پر)

کتاب: مرزا غالب
مصنفہ: نتالیا پری گارنا
ترجمہ: اسامہ فاروقی

باب: ۴

شاعر اور عجم کے آتش کدے

"اس میں شاعرانہ آن بان والی کوئی خلافِ عقل بات ہے۔"
(ا۔ س۔ پوشکن)

پر اسرار "زرتشتی" استاد کی تربیت نے بہ ظاہر مرزا میں شعرِ عجم کا ذوق پیدا کیا۔ عجم کے معنی ہوتے ہیں "غیر عرب"۔ کسی زمانے میں تمام غیر اقوام کو عرب اس نام سے یاد کرتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ فارسی میں داخل ہو کر لفظ "عجم" قبل اسلام کے زرتشتی ایران کا مترادف بن گیا اور پھر فارسی، تاجک، دری یعنی ایرانی زبانوں سے متعلق سبھی علاقوں کا۔ اردو میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔

غالب نے شعر گوئی کا آغاز اردو سے کیا۔ ان کے اشعار نے فوراً آگرے کے ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس سلسلے میں مرزا کے حوالے سے حالی کی بیان کی ہوئی ایک روایت بھی ملتی ہے گو کہ غلام رسول مہر اسے غیر معتبر مانتے ہیں۔ اس کے مطابق آگرے ہی کے متوطن عظیم اردو شاعر میر تقی میر (۱۷۲۳۔ ۱۸۱۰ء) نے مرزا کے لڑکپن کے اشعار سن کر کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا، اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" میر نے ۲۰/ستمبر ۱۸۱۰ء کو وفات پائی، جب مرزا کی عمر تیرہ سال کی تھی، چنانچہ اگر یہ روایت مبنی بر حقیقت ہے تو یہ اس امر کی شہادت ہے کہ اس وقت تک مرزا نے شاعری شروع کر دی تھی۔ میر کو مرزا کے اشعار دکھانے والے کا نام بھی معلوم ہے۔ یہ شاعری کے شائق اور خود شاعر، مرزا کے ایک دوست کے والد نواب حسام الدولہ تھے۔ اس سلسلے میں مالک رام لکھتے ہیں: "اردو شاعری میں میر کا استناد مسلّم ہے۔ سب کو تسلیم ہے کہ غزل گوئی میں ان کا کوئی ہم سر نہیں اور ان کے متاخرین سبھی اساتذہ ان کو شاعروں کا سرتاج مانتے تھے۔ پہلے تو یہ امر واقعہ ہی قابلِ توجہ ہے کہ کسی نے میر کو غالب کی غزلیں دکھانے کی ہمت کی۔ سبھی جانتے ہیں کہ میر اپنے ہم عصر شعرا کو درخورِ اعتنا نہیں گردانتے تھے۔ نواب حسام الدولہ جو خود میر کے شاگرد تھے ان کے مزاج سے دوسروں کی بہ نسبت بہ خوبی واقف تھے۔ اور اگر وہ غالب کی غزلیں اپنے ساتھ آگرے سے لکھوا لے گئے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ صرف خود غالب کی صلاحیت پر مفتون تھے بلکہ ان کو یقین بھی تھا کہ میر ان اشعار کو پسند فرمائیں گے۔ میر کی رائے اس بات کا ثبوت ہے کہ حسام الدولہ غلطی پر نہیں تھے اور غالب کی صلاحیت کا صحیح اندازہ میر جیسے عظیم فن کار کی بصیرت کی شہادت ہے۔"

لیکن کیا مرزا کو واقعی ایسا کوئی استاد ملا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ایسا استاد جو ان کے اشعار پر اصلاح دیتا اور ان کی تربیت کرتا، یعنی ان کے ساتھ اس طرح سے پیش آتا جیسے بعد میں مرزا خود اپنے بہتیرے شاگردوں کے ساتھ پیش آتے تھے، انھیں نہیں ملا اور انھوں نے خود ہمیشہ اپنی استعدادِ شاعری کے خداداد ہونے پر زور دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "شاعری میں میں تلمیذ الرحمٰن ہوں اور معنی کی تاریکی کو اپنے گوہر استعداد کی روشنی سے دور کرتا ہوں۔ عدم سے تشکیل پایا ہوا میرا تلمذ ادا شدنی قرض کی طرح میرے لیے بار گردن نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کی اتالیقی کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔۔اس کے باوجود میر کے اندیشے صحیح ثابت نہ ہونے۔ بالآخر استاد کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادبی کارآموزی بھی غیر ضروری ہے۔اس کارآموزی کے لیے اپنے وقت کی شاعری سے گہری واقفیت اور اس شاعری کی روایات کا احترام ضروری ہے۔ جیسا کہ حالی لکھتے ہیں اس وقت اردو شاعری میں میر درد، میر تقی میر، سودا، جرات اور میر حسن کے اسلوب کو ایک مستحکم حیثیت حاصل ہو چکی تھی، یعنی ان شعرا کے اسلوب کو جو ایسی سیدھی سادی فطری زبان میں لکھتے ہیں، جس کی نمایاں خصوصیت بول چال کا روزمرہ تھا۔ لیکن اردو کی ابتدائی شاعری کا اسلوب دوسرا ہی تھی۔ "فارسیت کا رنگ۔اس کی خصوصیت تھی۔ تاہم یہ فارسی ادب کے کلاسیکی شاعروں کا رنگ نہیں، بلکہ فارسی شاعری کے نام نہاد "سبک ہندی۔کی پیروی تھی۔ "سبک ہندی۔کی ابتدا کا مسئلہ اب تک قطعیت کے ساتھ طے نہیں ہوا ہے لیکن سمجھا جاتا ہے کہ اس اسلوب کے پہلے ترجمان سولھویں صدی عیسوی کے شاعر جامی کے شاگرد بابا فغانی تھے۔

شاعری، جو اپنے ارتقا کا صدیوں پر محیط، مسلسل سفر طے کر چکی تھی، اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت پیچیدہ ہو چکی تھی۔اس لیے کہ اس میں اس کے کسی بھی عنصر کو نہ تو مسترد کیا گیا اور نہ ہی منسوخ، صدیوں سے یہ عناصر محض جمع ہوتے رہے اور محفوظ رہے۔ وہ اسلوب جس کی ابتدا کرنے والے کی حیثیت سے فغانی کی نشان دہی کی جاتی ہے دراصل اس وقت موجود شعر گوئی کے اصولوں کی مزید پیچیدگی کا محض ایک اور مرحلہ تھا۔ یا تو اس وجہ سے کہ اس شاعری کو خاص فروغ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے دربار میں حاصل ہوا، یا پھر اس لیے کہ ہندوستان کے فن کی نزاکت اور دقت پسندی ہمیشہ سے اس کی نمایاں خصوصیت رہی ہے، اس اسلوب کو "سبک ہندی۔ کا نام دیا گیا۔ ابتدا میں اس نادر اسلوب کی تشریح میں زور اس پر دیا جاتا تھا کہ "سبک ہندی۔ میں گویا کہ گہرائی میں بدرجہا اضافہ ہوا جس کی وجہ سے شاعرانہ خیالات کو غیر معمولی اختصار کے ساتھ ظاہر کرنا ممکن ہو سکا لیکن اس کے بعد "سبک ہندی۔ میں بعض دوسری خصوصیات بھی تسلیم کی گئیں جن کے بارے میں ہم گفتگو ذیل میں کریں گے۔

شاعر کا یہ ایقان کہ اس کے خیالات کا سلسلہ ادبی روایات کے واقف کاروں کے لیے واضح ہے اسے اپنے بیان کی درمیانی کڑیوں کو مختصر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ایک مفہوم میں اس طرز اظہار کی تشکیل اس طول کلام اور عبارت مرصع کے جواب میں ہوئی جو قاری کے ذہن کو الفاظ کے خوبصورت تانے بانے کو بہ نظر حیرت دیکھنے پر مجبور کرتے ہوئے اسے گویا کہ راہ مستقیم سے ہٹا دیتی تھی۔ مثال کے طور سے انوری کے اشعار دیکھیے۔

دوش سلطان چرخ آئینہ فام
آں کہ دستور شاہ راست غلام
از کنارِ نبرد گاہ افق
چوں بہ دستِ غروب داد زمام
دیدم اندر سوادِ طرہ شب
گوشوار فلک زگوشۂ بام

(کل شام جب وزیر شاہ کے غلام سلطان چرخ آئینہ تمثال نے افق کے میدان جنگ کے کنارے سے غروب کے ہاتھوں میں باگ ڈور تھمائی میں نے رات کے گھنگریالے بالوں کی سیاہی میں صبح کے کان میں آسمان کی بالی دیکھی)۔

اس ساری عبارت کے مفہوم کو ذیل کے فقرے میں ادا کیا جا سکتا ہے "صبح سویرے سے قبل چاند غروب ہوا اور

ع ہوا۔۔ اس کے بر عکس " سبک ہندی۔ کی شاعری میں کوئی بھی بیت لے لیجیے اس کے مطلب کی تشریح کے لیے
ں کی اپنی ضخامت سے کہیں زیادہ طولانی عبارت کی ضرورت پڑے گی۔

گل رخان • برسر خاکم چمنے ساختہ اند
چمنے برسر خونیں کفنے ساختہ اند

موں نے میری خاک پر چمن بندی کی ہے خون سے داغ دار کفن پر چمن کھلایا ہے ۔

متذکرہ بالا صورت حال کی تشریح کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ شاعر اس دنیا سے گزر گیا ہے اور اس کی موت کا سبب " عشق
۔ ہے ۔ اس کا کفن خونین اس لیے ہے کہ اس پر اس کی قلبی اذیتوں کا خون چھلکا ہے ۔ پھر بھی " گل رخوں۔ کو اس کشتۂ ناحق
اور جب وہ سوگ میں اس کی لحد پر اکٹھا ہوئیں تو ایک اچھا خاصہ چمن ہماری نظروں کے سامنے آگیا؛ اور " بہار پر آئی ہوئی ان
کے سامنے میں۔ غریب کشتۂ محبت گل رخاں و گل رخساران ہمیشہ کے لیے محوخواب ہے ۔ ابھی ابھی معرض وجود میں
گلستان ہم کو ایک لمحے کے لیے بھی کشتۂ محبت کے جسدِ خاکی کو فراموش کرنے کی اجازت نہیں دیتا، گویا کہ وہ خون سے
ن کا دوسری شکل میں عکس ہو۔ جیسا کہ محققین کہتے ہیں بابا فغانی کے اشعار اکثر چیستاں اور معمے کے مماثل ہیں۔ ان کی
شعری تخلیق کی ہے جس کا انحصار محض پینت کے تجربوں پر ہے ۔ قدرتی بات ہے کہ اس اسلوب کے حمایتی بھی تھے اور
اور موخر الذکر نے اس کو " فغانیات۔ یعنی فغانی کی لغویات کے اسلوب کا نام دیا تھا۔

، مرزا اسد اللہ خاں کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار بطور مثال پیش کرتے ہیں جو ان کے خیال میں متذکرہ بالا
سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ اس بات کا حوالہ دیتے ہیں جس میں پیکر خیالی کی تشکیل کے لیے پنبہ یعنی روئی کی
، خاص طور سے اس کی " پریشانی۔ یا بکھراؤ کی خصوصیت، کو چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے ۔ بالعموم یہ " غیر شاعرانہ۔ لفظ
س نوجوان شاعر کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے ۔

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا

مارا سابقہ اسی " اختصار۔ سے ہے ، جس کے لیے طول طویل تشریح کی ضرورت پڑتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ جیسا کہ ہمارا خیال
خیالی کی مرئیت ہمیں اس کی پیچیدگی سے قطع نظر کرنے پر مجبور کر سکتی ہے ۔ روئی سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تکیہ ہر لحاظ سے
لیکن اگر وہ پھٹ جائے تو اس میں سے روئی باہر نکلنے لگتی ہے ۔ شاعر یہاں " پریشانی۔ کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے
کے بھی ہوتے ہیں اور بکھراؤ یا انتشار کے بھی لیکن اس کے باوجود تکیے پر سر رکھنے سے انسان کو سکون اور قرار ملتا ہے ۔
ن کے مغز کو پھٹنے ہوئے تکیے کی روئی سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ بے قراری کی وجہ خوبانِ شوخ کی شاعری کی محبت کے تعلق سے
ہے ۔ شاعر کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے مغز یعنی دماغ کو راحت آفریں بالش یعنی تکیے کے طور سے
، بہ الفاظ دیگر اپنے حواس مجتمع کرے ۔ (ایک اور مقام پر ہم کو مغز کے تعلق سے اور بھی زیادہ افادیت پسندانہ رویے
ے گا) ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ اور ایک معمولی تکیے کی روئی دو یکساں خصوصیات، پریشانی اور راحت
ل ہیں۔ حالی کے خیال میں یہ اشعار اتنے غیر فطری ہیں اور ان کا طرزِ بیان اردو بول چال کے اتنا خلاف ہے کہ ایک کے سوا
ے آسان۔ قرار دیتے ہیں ان کے معنی بیان کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے ۔ ذیل میں ہم یہ شعر اور حالی کے حوالے سے
پیش کریں گے ۔ (یہاں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ حالی کی تشریح بھی اتنی پیچیدہ ہے کہ سلسلہ بیان جاری رکھتے
ں کی بھی تشریح کرنے کی ضرورت پڑے گی ۔"

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

حالی کہتے ہیں کہ ان اشعار کی شرح سے یہ معلوم ہوگا "کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے"۔ روحانی درجہ فنا یعنی" فنا فی الحق" تک پہنچنے کے لیے صوفی کو معرفت اور تکمیل کا مرحلہ در مرحلہ پیچیدہ سفر طے کرنا لازم ہے۔ وہ شخص جو معرفت حق کے لیے بے قرار نہیں غافل ہے اور اپنی غفلت کی وجہ سے وہ فنا میں جو لذت ہے اس سے محروم رہتا ہے۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو وہ کاٹ کر پھینک دیے جانے والے ناخن میں بھی باطنی معنی تلاش کر لیتا۔ کیوں کہ ایک واقف کار کے لیے ناخن بریدہ میں ایک اشارہ اور ایک ایما پنہاں ہے، جس کی وجہ سے یہ ابرو کا مرادف بن جاتا ہے۔ محبوبہ دل نوازی کی ہر جنبش ابرو معنی خیز ہوتی ہے، اس میں اشارت بھی ہوتی ہے اور ایما بھی۔ چوں کہ ناخن بریدہ ہلال یا ابرو کی شکل کا ہوتا ہے تو لہٰذا وہ ابرو کا کام دے سکتا ہے، اس لذت کی طرف اشارہ کر سکتا ہے جو فنا سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح سے کٹا ہوا ناخن بھی جادہ فنا کا ایک جزو ہے اور اس میں مسرت اور منزل مقصود کے حصول کی امید پنہاں ہے۔

سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ "یہ اوپر کی بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں، جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں"۔ مگر جیسا کہ حالی خیال کرتے ہیں اب بھی مرزا کے دیوان میں بہت سے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں، جن پر اردو شاعری کی زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے اور کچھ اشعار بطور مثال پیش کرنے کے بعد حالی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی، مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جاں کاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے"۔

اس میں شک نہیں کہ نوجوان شاعر کے تخیل کی طرفگیوں پر تھوڑا سا ہنس کر آگے بڑھ جانا بھی ممکن تھا، خصوصاً اس لیے کہ یہ تو شاعر کی زندگی کا محض آغاز ہے، حد درجہ معرکتہ الآرا واقعات کا ذکر تو آگے آنے والا ہے اور ابتدائی اشعار کے بعد پختہ کلام سے بھی سابقہ پڑے گا لیکن یہاں اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ ابتدائی شاعری ہی میں غالب کے شعری رشتے وضاحت سے دکھائی دیتے ہیں اور اس لیے یہاں ہم کو ان کی ادبی آموز گاری والے سوال کا جواب بھی مل سکتا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں کی ابتدائی شاعری متعدد ادبی ادوار کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے جن میں ابتدائی مغلیہ عہد کی سولھویں صدی عیسوی کی فارسی شاعری، آخری مغلیہ عہد کی سترھویں صدی اور ابتدائی اٹھارویں صدی کی فارسی شاعری اور اسی طرح سے بشمول میر اٹھارویں صدی عیسوی کی اردو شاعری شامل ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کی اردو شاعری کی اس پیڑھی کے شاعر اس میں شامل نہیں ہیں جو شاعری میں غالب کے قریب ترین متقدمین یا "آبا" کے زمرے میں ہیں لیکن دنیائے شاعری میں آبا و اخلاف کے درمیان سلسلہ ارتقا عام طور سے اتنا استوار نہیں ہوتا جتنا چچا بھتیجوں کے درمیان۔ "آبا" کے زمرے سے اپنی شاعری کے اس دور میں غالب نے صرف ایک ناسخ کو چنا۔ اردو شاعری میں اپنے "اجداد" کے زمرے سے انھوں نے میر، انشا اور سودا کا انتخاب کیا، لیکن بنیادی توجہ انھوں نے "سبک ہندی" کے فارسی گو شاعروں بیدل، صائب، غنی کاشمیری اور شوکت بخاری یعنی ان شاعروں کو دی جن کے مرزا "پر پوتے" لگتے ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ روسی شاعر اسیپ مندیلشتام نے کہا ہے: "بہت سے ایسے خزانے ہیں جن سے پوتے محروم رہ جاتے ہیں اور ان پر تصرف پر پوتوں کا ہوتا ہے"۔

غالب عبد الرزاق شاکر کو لکھتے ہیں: "محب من! آغاز شاعری ہی میں میں نے اردو میں طرز بیدل، اسیر اور شوکت کی پیروی کی، چناں چہ میری ایک غزل کے مطلع میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں! قیامت ہے

لیکن اس آہ و فریاد کے باوجود مرزا "بھی" شاعری کے شائق اور اس سے بہت اچھی طرح واقف تھے، اس کے آتش کدوں کے

دل دادہ تھے ، خود کو آگ میں رہنے والی اور آگ کھاکر زندہ رہنے والی اساطیری مخلوق سمندر سے تشبیہ دیتے تھے ۔" میں پارسیوں کی آتش بے دود کی حرارت سے پر ہوں، میں تند و تیز شراب معنی کی تلخیوں کا سرمست ہوں، میں عجم کے آتش کدوں کا سمندر ہوں۔ میں گلستان فارس کا بلبل ہوں۔ میری بے قراری کی وجہ خود میری ذات میں تلاش کرو۔ سبزے کو نمو ابر باراں سے ملتا ہے ، گلاب بادِ صبا کی موج سے کھلتے ہیں۔ پھول چننا اور ان سے گلدستے ترتیب دینا آپ کے اس خادم کا فن ہے اور پھلبارے اس کے احباب ہیں۔ یہ بجا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہنا چاہیے! اپنی گرمی انفاس سے شراروں کی کاشت کرنی چاہیے۔ شعلہ زبانی کی فصل کاٹنی چاہیے۔ خود جلنا اور آگ کو بھڑکانے کے لیے اپنی ہی ذات میں ایندھن حاصل کرنا ، اس حالت سے گزرنے کا بھی عجیب لطف ہے۔ اس آگ میں میں سدا جلتا ہوں جس کی لذت سے مرنا بھی منظور ہے۔"

نوجوان مرزا کے شعری معموں کے پیچھے اپنی ایک طویل ادبی روایت تھی۔ افسوس کہ ہمارے اپنے اور غیر ملکی مغربی ادب میں اس پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ بلاشبہ اس روایت کے حامل ہندوستانیوں، پاکستانیوں، ایرانیوں اور تاجکوں کے لیے اس میں ناقابل فہم پہیلیاں اتنی نہیں جتنی دوسروں کے لیے۔ لیکن اس روایت کے بارے میں ان کی تحریریں اکثر ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مطلب سمجھنے کے لیے صرف ترجمہ کافی نہیں، دوسری ثقافتی اشاری زبان میں اظہار مکرر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے بالعموم سوالات کے بندھے ٹکے جواب ان کے پاس بھی نہیں ملتے۔ حالاں کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم یہ جان سکتے کہ کون سے مضامین اور پیکر خیالی خود مرزا نے "ایجاد" کیے اور کون سے شاعری میں پہلے سے موجود تھے ، اس عہد کے ادب میں تمثیلی خیالات کو میراث میں پانے کے اصول کیا تھے اور اس کے لیے کون سی شعری تراکیب استعمال میں آتی تھیں۔

مشرق کے اسلامی ممالک کی ادبیات میں کافی دقیقہ سنجی کے ساتھ معیاری شعریات (عروض و بدیع) کی تشکیل ہو چکی تھی اور شاعری میں "جدید" و "قدیم"، "اپنے" اور "پرانے" کے مسئلے پر کافی توجہ دی جاتی تھی۔ فن شعر و سخن پر ان مقالوں کے مصنفین کے خیالات، ادیب اور شاعر کی شخصیت کی یکتائی اور اس کے اظہار ذات کے بارے میں اور ادب میں خیالات اور مضامین کو مستعار لینے اور ان کا سرقہ کرنے کے بارے میں عہد جدید کے ہمارے اپنے نظریات سے بالکل مختلف ہیں۔ بلاشبہ عہد وسطیٰ میں بھی ایک شاعر دوسرے شاعر سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا لیکن سمجھا جاتا تھا کہ مثالی رویہ یہ ہے کہ موضوعات کے موجودہ ذخیرے کو خوب سے خوب تر بنایا جائے اور اسے مزید ترقی دی جائے ، یہ نہیں کہ بہ ہر قیمت نئے پیکر خیالی اور نئے مضامین ایجاد کیے جائیں۔ ا۔ ب کدیلن نے اپنی کتاب "عہد وسطیٰ کی عربی شعریات" میں عربی شعریات کی کتابوں کے حوالے سے اس عمل پر بہت عمدگی سے تحقیق کی ہے مزید برآں محقق کے نتائج کا اطلاق اصولی طور پر فارسی نظریہ شعر و عبارت مرصع اور یہاں تک کہ اردو شاعری پر بھی ہوتا ہے کیوں کہ اس میں بھی عربوں کے ہاں سے فارسی ادب کے ذریعے آنے ہوئے وہی اصول کار فرما ہیں۔

اسی لیے مرزا اسد اللہ خاں کی تخلیقات میں بھی "اجداد" کے تمثیلی موضوعات و مضامین اور ان کے خیالات کے ذخیرے کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے۔

یہاں ہم دیکھیں گے کہ کون سے مضامین اور خیالی پیکر غالب اور "سبک ہندی" کے عہد متاخر کی شاعری کو ایک رشتے میں باندھتے ہیں۔ گفتگو کا آغاز اس امر کی نشان دہی سے کرنا مناسب ہو گا کہ ادیب اور شاعر کی اختراعات قوت واہمہ کا کھیل ہی عجیب و غریب مظاہر کیوں نہ دکھائی دیں، ہم ان کی قدر و قیمت کا اندازہ حقیقت خارجی کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ پیکر خیالی تخلیقی ہو سکتا ہے ، جس سے دنیا میں کوئی نئی دریافت ہمارے سامنے آسکتی ہے ، یا پھر، جیسا کہ کہتے ہیں، کھوکھلا اور رسمی بھی ہو سکتا ہے۔ فن میں بعید از قیاس باتوں سے دلچسپی کو اس وقت جائز قرار دیا جا سکتا ہے جب فن کار کا خیال اور اس کے پیکر خیالی کی حرکیت ہمارے تصور زماں، تاریخی عوامل کے ہمارے ادراک ، دنیا اور کائنات کے بارے میں ہمارے تصورات میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ سماج اور اس میں جینے والے فرد کے روحانی تقاضوں سے رشتہ ہی ہر عہد کی ادبی تخلیق کو ایک اپنا جدا گانہ رنگ عطا کرتا ہے اور اسی طرح سے

حد درجہ پیچیدہ، ارادتاً الجھا ہوا یا پھر بے تصنع، سیدھا سادہ فن بھی اپنے عہد کے اسرار کا حامل ہوتا ہے۔ کائنات کے تصور اور ادراک کی وہ خصوصیات، جو ہمیں مغلیہ عہد کے متاخر فارسی گوشعرا میں ملتی ہیں، آخری مغلیہ عہد کے معاشرے کے جمود اور انحطاط کے رجحانات کی عکاسی کرنے والے، روایتی فکر شاعرانہ کے واضح تعطل کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔ بے حس و حرکت غور و تفکر، ناتوانی انسان کو مجبور محض بنا دینی والی تقدیر کے خیالی پیکر شاعری دنیا کی ایک عجیب و غریب لیکن سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس دنیا میں عناصر ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے ہیں اور ان کے رشتۂ باہمی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بینائی لکھتے ہیں "اس کے چہرے سے میرے مردمکِ دیدہ میں منعکس ہونے سے میری آنکھ نے گلستان کی شکل اختیار کر لی اور اپنے اس چمن کی باڑھ میں کانٹوں سے لیے میں نے پلکوں کو استعمال کیا۔۔ مردمک یعنی آنکھ کی پتلی کے فارسی میں ایک اور معنی "انسان" کے بھی ہوتے ہیں۔ آپ دوسرے کی آنکھ کی پتلی میں جھانکیے، آپ کو اس میں ہمیشہ انسان ہی دکھائی دے گا اور حسینہ گلفام، یا بینائی کے اس شعر کو لیجیے جس کا مفہوم اوپر دیا گیا ہے تو اس کے رخسار، گلاب کی یاد دلاتے ہیں۔ اس طرح سے آنکھ گلستان قرار پائی اور پلکوں سمیت ہونے وہ خار دار باڑھ ہیں جو اس عکس بیش بہا کو چوروں سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن غور و فکر اور تصور سے انسان تھک جاتا ہے، اس پر افسردگی سے مماثل حد درجہ ناتوانی طاری ہو جاتی ہے، وہ تنہائی کے خواب دیکھنے لگتا ہے

بسکہ آزردہ ام از دیدنِ مردم چہ عجب
مردمِ دیدہ اگر از نظرم افتاد است
(غنی کاشمیری)

(لوگوں کے تصور نے مجھے اتنا خستہ حال کر دیا ہے کہ کچھ عجب نہیں اگر چہروں کو اس طرح تاکتے رہنے سے میری آنکھ سے مردمک گر پڑے۔)

ناتوانی کو شاعرانہ رنگ دینے کے رجحان کو اکثر درویشی اختیار کرنے والے فن کار کے ذاتی تجربے سے تقویت ملتی ہے۔ کبھی کبھی شاعر فقیروں اور خانہ بدوش درویشوں کی زندگی گزارتے تھے۔ ان میں سے بہتیرے واقعی ہمیشہ بھوک اور پیاس کی صعوبتیں اٹھاتے رہتے تھے۔ بے شک بلا استثنا سبھی شعرا اپنی ناتوانی، لاغری اور مصائب کی لفظوں میں تصویر کھینچتے تھے، اسی طرح بلا استثنا سبھی موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے تھے، بہ شرطیکہ یہ موت ان کو معشوق کے ہاتھوں نصیب ہو، یا پھر اس کی ایک غلط انداز یا تیغ جفاکش کے طفیل قتلِ عاشق کے لئے کون سے آلات و اوزار استعمال ہوں، اس کے لیے قواعد و ضوابط البتہ مقرر نہیں تھے۔

ناتواں گشتیم چنداں کز برائے قتل ما
تیغِ ابروئے بتاں را مو بجائے جوہر است

(میں اتنا ناتواں ہو گیا ہوں کہ میرے قتل کے لیے معشوق کی جنبشِ ابرو ہی بالکل کافی ہے عشق شاعر پر آگ کی طرح اثر کرتا ہے، وہ اس کے وجود کو کبھی جلاتا ہے تو کبھی پگھلاتا ہے)

چنداں گداختم کہ بہ یک اضطراب دل
داغِ تو چوں عرق ز سراپائے من چکید
(مرزا جلال اسیر)

(مجھے مصائب نے اس طرح پگھلا دیا ہے کہ دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ تیری یاد کی دلگیری مرے بدن پر سر سے پاؤں تک پسینے کی طرح پھیل جاتی ہے۔) اس لیے واحد سبیل یہ ہے کہ اذیت کی سب علامتوں کو مسرت کے ایک بہانے میں تبدیل کر دیا جائے۔ "اپنے اشکوں اور اپنی آہ و زاری پر خوشی منا! اس صحرا میں گنج نوبی سے کم نہیں۔

(بیدل)

اس شاعری کا مزاج عام طور پر المیہ طرز کا ہے

در نمکدانِ کواکب استخوانِ سودہ است
دل بخوانِ چرخ مہماں کش نہ بندی زینہار

(ناصر علی)

ساروں کے نمکدانوں میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ہیں آسمان کے دسترخوان سے دل نہ لگا جہاں مہمانوں کو قتل کرتے ہیں)

لیکن آدمی کے لیے اپنے اندر کے انسان کو مارنا اور گنبد گردوں کو امید کی نظر سے دیکھنا چھوڑ دینا بہت مشکل ہے۔ ہے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے، پسی ہوئی ہڈیوں کے چمکیلے نمک سے بھرے ہوئے نمک دانوں جیسے ہی کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ گنبد گردوں تقدیر کی ٹھوکروں کا سرچشمہ تو ہے ہی لیکن وہ عروجِ روحانی کی علامت بھی ہے۔ اسی عروج روحانی کے لیے تو تلاشِ حق کے راستے پر چلنے والے انسان کو دنیوی جذبات کے ہیجان اور خواہشاتِ نفسانی سے خود کو پاک کرنا چاہیے اور زور مند ہونا چاہیے تو بس ایک حق کا

رتبہ منصوری خواہی زہستی پاک شو
نردبان بام گردوں ساز چوب دار را

(ناصر علی)

(معرفت منصور کے درجے کی تلاش ہے؟ خود کو اپنے وجود سے پاک کر۔ چوب دار سے گنبد گردوں پر پہنچنے کے لیے بڑھی بنا لے)

منصور، یعنی اسلام کی ابتدائی صدیوں کے صوفی منصور حلاج نے اعلان کیا تھا کہ خدا کی معرفت انھیں حاصل ہو گئی ہے اور "اناالحق۔ کا نعرہ بلند کیا تھا۔ حلاج کو نہایت بے دردی سے سزائے موت دی گئی، پہلے ان کو چوپارہ کیا گیا اور پھر پھانسی پر چڑھایا گیا۔ کچھ عرصے بعد تصوف کے سبھی مسالک کی رو سے وہ ایک عارف شہید کی حیثیت سے ولی اللہ تسلیم کیے گئے ان کے نعرۂ "اناالحق۔ کی بعد کے دور میں جڑ پکڑنے والے نظریۂ "وحدت الوجود۔ کے مطابق تشریح کی گئی جس کی بنیادی خصوصیت وجود ظاہری کے وجود الٰہی میں گم ہو جانے کا تصور تھا۔ تاہم تشریح کا ایک دوسرا نقطۂ نظر بھی تھا۔ جس کے مطابق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت حلاج "وجود سے مبرا ہونے۔ کے اس درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ حق کے نام سے گفتگو کرتے بلکہ اس کے برعکس وہ خود اپنے وجود کو حق کا ظرف مانتے تھے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے غالب اس بحث مباحثے میں بڑے نرالے ڈھنگ سے شریک ہوتے۔ فی الوقت یہ ملحوظ خاطر رکھنا مناسب ہو گا کہ سیڑھی یعنی بہ تدریج تنزیہہ روح کی علامت، افلاک تک پہنچاتی ہے اور جیسا کہ ناصر علی کا خیال ہے، حلاج کے لیے وہ چوب دار سے بنی ہے۔ داخلی دنیا کی بہ نسبت پر توجہ اور محاسبۂ نفس، ترکِ دنیا اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اس داخلی دنیا کو، تصوف کے نظریے کے مطابق، متواتر رحم تکمیل تک پہنچانے کی کوشش، شوخ اور کسی حد تک فطری رنگ کی تصویروں میں پیش کیے جانے والے، تنگی، گھٹن اور قیدیے ایک ضمنی اور ناگوار احساس کو پیدا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تخلیہ نشینی کی محدود فضا میں صوفی کو محسوس ہونے والی گوناگوں کیفیات کو عملاً کبھی کبھی مختلف منشیات سے بھی تحریک ملتی رہی ہو، اور اسی لیے اپنے وجود کی تنگی یا اس کے خلاف اس کے پھیلاؤ، وسیع سے وسیع حدود میں بھی اس کے نہ سما سکنے یا وجود کے سمٹ کر ایک نقطے میں مرکوز ہو جانے سے خیالی پیکر ہو سکتا ہے کہ محض بھنگ، افیم یا حشیش سے پیدا ہونے والے احساسات رہے ہوں۔ امر واقعہ کچھ بھی ہو یہ مضمون حد درجہ انوکھا ہے، جس کو شاعری میں طرح طرح سے باندھا گیا ہے

می خروشد ز سرو تا شمشاد
کہ دریں تنگنائے غم بنیاد
نالہ ایم و ز خود گزشتن نیست
جز سوئے خاک بازگشتن نیست
(بیدل)

(سرو سے لے کر شمشاد تک سبھی فریاد کناں ہیں کہ اس تنگ نائے ہستی میں جس کی بنیاد غم پر قائم ہے ہم سرتاپا نالہ ہیں اور اپنے وجود سے باہر نہیں نکل سکتے، خاک کی طرف لوٹنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔)
اور اسی لیے بے حسی کا، خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو، خیر مقدم کرنا چاہیے، بصورت دیگر ہر طرح کی حرکت اور نمو اپنے جلو میں دکھ اور اذیت کو بھی لائے گی۔

ہوائے گلشن ہستی شگفتن بر نمی تابد
نصیبِ غنچہ خندیدن نہ باشد تا نفس دارد
(ناصر علی)

(فضائے گلستاں پھولوں کے کھلنے کے لیے ناموزوں ہے، غنچے کا کام ہے کہ جب تک ہمت ساتھ دے وہ نہ مسکرائے)
بات یہ ہے کہ اگر غنچہ ہنس پڑے گا تو اس کی کٹوری چاک ہو جائے گی اور وہ پھول معرضِ وجود میں آئے گا، مرجھانا جس کا مقدر ہے۔ دنیا ناپائدار ہے اور انسان فانی ہے۔

از سبک روحاں اثر در خاک دانِ دہر نیست
کاروانِ شبنم از ریگِ روان برخاستست
(صائب)

(اس خاک دان میں سبک روحوں کا نشان بھی باقی نہ رہے گا، شبنم کا کارواں ریگ رواں سے ہوا ہو جایا کرتا ہے)
اپنی ذات کی طرف مراجعت "اپنی ہی ذات کی طرف سفر۔ وجود کا ایک بنیادی اصول بن جاتا ہے اور یہ، جذبہ روحانی کی ماہیت ہو یا خارجی دنیا کے مظاہر، ذات کے اپنے ہی حصار میں مقید ہو جانے کی خیالی تصویروں کے ایک پورے سلسلے کو جنم دیتا ہے :

ہمائے گلشنِ قدسی مکاں چہ می جوئی
تو آشیان خودی، آشیاں چہ می جوئی
(ناصر علی)

(گلشن قدسی کے ہما، تجھے اپنے ٹھکانے کی کیا جستجو ہے؟ تو خود اپنا آشیانہ ہے، تجھے آشیانے کی کیا تلاش ہے"
ناسخ ناصر علی کی آواز لوٹاتے ہیں :

اب کہاں نالے، کہ اس لیلیٰ کا مسکن دل ہوا
تھا جرس جو پیش ازیں وہ ان دنوں محمل ہوا

جب مجنوں کے دل نے لیلیٰ کو اپنے آپ میں سمو لیا یا یوں کہیے کہ جب وہ روحانیت کے ایسے اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا جب معشوق یا بہ الفاظ دیگر حق خارج سے منتقل ہو کر انسان کے باطن میں آگیا تو دل کے فرائض منصبی میں بھی تبدیلی آگئی پہلے وہ جرس کارواں کی طرح آہ وزاری کرتا تھا اور اب محمل کا کام دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی اذیتوں میں اضافہ ہو

ہوا کیوں کہ اب اس میں لیلیٰ کی موجودگی کی وجہ سے آہ وزاری کی گنجائش باقی نہیں رہی۔
عموماً جادۂ عشق اشیا کے معنی و مطالب میں بنیادی تبدیلی لاتا ہے :

پائے مادر راہ عشق ازبسکہ می آید بہ سنگ
می رسد در گوش من از کاسۂ زانو صدا
(غنی کاشمیری)

(جب جادہ عشق پر میرا پاؤں پتھر سے ٹکراتا ہے، مجھے گھٹنے کی چپنی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے)
جب انسان خود کو خدا کی جستجو کے لیے وقف کر دیتا ہے تو دیوار جیسی طیارہ سازی کے لیے ناموزوں شے (اسی فضائے ...دود کی علامت) بھی کام کی ثابت ہوتی ہے :

مابہ خود واماندگان را دل تپیدن شہپراست
اضطراب سیل ، در سیر آورد دیوار را
(ناصر علی)

(ہم جیسے اپنی ذات میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے بے چینی پنکھ کا کام دیتی ہے، دریا کا اضطراب دیوار کو بھی متحرک کر دیتا ہے)
بند شیں ٹوٹ جاتی ہیں، کائنات جذبہ عشق کے زیر اقتدار آجاتی ہے، چاہے یہ جذبہ عاشق کو برباد ہی کیوں نہ کر دے :

حسن و عشق پاک راشرم و حیادر کار نیست
پیش مردم شمع دربری کند پروانہ را
(صائب)

(پاک حسن اور عشق کو شرمانے اور جھجکنے کی ضرورت نہیں، شمع سب کی آنکھوں کے سامنے پروانے کو اپنی آغوش ...یں لیتی ہے)
لیکن اس شاعری کے لیے دنیا میں پائی جانے والی سماجی برائیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی مذمت کے موضوعات ...ی اجنبی نہیں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے ایک نہایت نازک خیال اور دقیقہ سنج شاعر صائب ...ے اشعار ہمیشہ "شعر کی صوری ہم آہنگی" کی اسلوبیاتی خلاف ورزی کی مثال کے طور سے پیش کیے جاتے ہیں۔ (دیکھیے یوزانی) ...ں کہ یہ شاعر اپنے کلام میں "عامیانہ" الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کہ وہ اپنی دنیا کے نظام سے ...وشی کا اظہار کرتا ہے :

زادۂ بد گہر از پاک گہر ممتاز است
مگس سگ ز مگس ہائے دگر ممتاز است
(صائب)

(بدگوہروں نے گوہر آب دار کی جگہ لے لی ہے، گوبر مکھی ہمیشہ دوسری مکھیوں سے بڑی ہوتی ہے)
لیکن اس نظام اقدار میں دنیا کی مذمت صرف ترک دنیا کی طرف رہ نمائی کرتی ہے :

جہان استخوانیست بے مغز صائب
بہ پیش سگ اندازاین استخوان را

(صائب ! دنیا ایک بے مغز ہڈی ہے اسے کتوں کے سامنے ڈال دے)
جیسا کہ خورشید الاسلام نے اپنی تحقیقی تصنیف "غالب" میں ثابت کیا ہے، وہ تمام شعرا جن کا ہم نے یہاں حوالہ دیا

ہے اسد اللہ خاں سے ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں خصوصی قربت رکھتے تھے۔

تاہم بیدل کا اثر غیر معمولی طور سے زبردست، پہلودار اور پائیدار تھا۔ اس میں شک نہیں اتنا عظیم ادبی ورثہ چھوڑنے والے شاعر کو کلی طور سے سمجھنا ایک ناپختہ ذہن کے لیے ممکن نہ تھا، خواہ وہ مرزا جیسے غیر معمولی صاحب بصیرت نوجوان کا ذہن ہی کیوں نہ ہو۔ چناں چہ غالب کی ابتدائی شاعری میں ہمیں بیدل کے موضوعات کا صرف جزوی اظہار ملتا ہے، اور یہ موضوع ہے دنیا کی انتہائی قنوطی عدم قبولیت کا: دنیا کی بنیاد دکھ اور اذیت پر ہے، آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، وہم و طلسم و خیال ہے، راز کائنات سمجھ سے باہر ہے، دنیا فانی ہے اور صرف خواہشات کو جنم دیتی ہے چناں چہ دنیا سے قطع تعلق کر لینا چاہیے، ہر طرح کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، عقل اور علم کے پھندوں سے چھٹکارا پا کر اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے۔ اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر عالم خارجی کے واہمے سے عہدہ برا ہوتے ہونے اور خواہشات کو قابو میں لا کر اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ خورشید الاسلام بھی کہتے ہیں یہ موضوعات بیدل کے افکار اور شاعری کے بحر ذخار کی محض جزوی نمائندگی کرتے ہیں۔ مکمل احاطہ نہیں کرتے۔ مزید برآں انھوں نے اور دوسرے محققین نے وضاحت کی ہے کہ بعد کے دور میں بھی بیدل کی شاعری کا اثر غالب پر برقرار رہا اور وہ اپنے کلام میں بیدل کے مضامین کو آگے بڑھاتے رہے۔ بات یہ ہے کہ مغلیہ عہد متاخر کی شاعری کے سیاق و سباق میں بیدل کا یہ موقف ایک طرح سے سارے ادبی رجحان کی نشان دہی کرتا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تقلید بیدل میں مرزا اسد اللہ خاں دگنی قوت متخیلہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

خلوت آبلہ پا میں ہے جولاں میرا
خوں ہے دل تنگی وحشت سے بیاباں میرا

پاؤں کے وہ آبلے یا چھالے جن سے خون رستا رہتا ہے بالعموم اس بادیہ پیمائی کی نشانی سمجھے جاتے ہیں جو جنون عشق کی حالت یا عالم وحشت میں کی جاتی ہے۔ اسی نے مجنوں کو ریگستان کے چکر لگانے پر مجبور کیا تھا۔ یہ چکر آبلوں کے مشابہ ہیں یا پھر اس کے برعکس کہا جا سکتا ہے کہ آبلوں کی شکل اور اصل ایک ایسے تلازم خیال کو معرض وجود میں لاتی ہے جس کی وجہ سے ذہن مجنوں کی دشت نوردیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اپنے آپ میں گم ہو جانے کی ضرورت شاعر کو خود اپنے آبلہ پا میں پوشیدہ ہو جانے پر اکساتی ہے۔ وہ سارے بیاباں کو اپنے دشت نوردی سے مجروح پاؤں کے خون میں رنگا ہوا دیکھتا ہے تو اس پر وحشت اور بے قراری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہاں بیدل کے کم از کم تین پسندیدہ موضوعات استعمال ہوئے ہیں: گردش پیہم، بے قراری اور وحشت۔ پاؤں کے آبلے ناصر علی اور دوسرے شاعروں کی خدمت میں خراج تحسین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تبسم کے مضمون کی اصل بھی وہی ہے۔

بجائے غنچہ و گل ہے ہجوم خار و خس یاں تک
کہ صرف بخیہ دامن ہوا ہے خندۂ گل چیں کا

باغوں میں بالعموم مسکرانے اور کھلنے کے لیے بے قرار کلیوں کی بہتات ہوتی ہے، لیکن اس باغ میں خار و خس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ کسی کام کے تو ہیں نہیں، سوائے اس کے کہ باغ بان کے کپڑے پھاڑیں۔ تو پھر کیا! اور جلدی میں بخیہ کیا ہوا دامن تار مسکراہٹ یا خندۂ دنداں نما کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ مجازی مسکراہٹوں والے اس مجازی گلشن میں مرزا اسد اللہ خاں کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے گھر ہی میں ہوں اور وہ اس اجاڑ باغ کی صورت حال کو بے روک ٹوک ترقی دیتے ہوئے، پیکر خیالی کو مبالغے کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں ہے کہ مرزا کے ذہن کی چستی اور تیزی انھیں اپنے پیش رووں سے مسابقت اور ہم نوائی پر مجبور کرتی تھی اور جیسا کہ خونیں آبلہ پا والی بیت کی مثال سے ظاہر ہے وہ ایک مبالغہ آمیز مضمون کے جواب میں متعدد مبالغہ آمیز مضامین

اانبار لگادیتے تھے۔ واقفیت رکھنے والے قاری کی نظر میں آبلہ پائی کے پیکرِ خیالی کو ایک مخصوص رنگ اس امر واقعہ سے ملتا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں کو نہ صرف یہ کہ کبھی دشت نوردی اور بادیہ پیمائی سے سابقہ نہیں پڑا تھا بلکہ جیسا کہ مغل شرفا کے ایک م ور خاندان کے نوعمر رکن کو زیب دیتا ہے وہ گلیوں میں کبھی پاپیادہ نہیں چلتے تھے، کہیں جانا ہوتا تو پالکی ہی میں جاتے۔

گنبدِ گردوں تک پہنچانے والے زینے کے معاملے کے بارے میں بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کلیتہً بہ خیر و خوبی انجام گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس معاملے کا، جس کا ہم ذکر کرنے والے ہیں، شاعری سے راست کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس قصے کے بعض پہلوؤں سے ان روحانی کارہائے نمایاں کے بارے میں مرزا کے رویے کا اندازہ ہوتا ہے، جن کی وہ اپنے اشعار یں اتنی سرمستی کے ساتھ تصویر کشی کرتے ہیں۔ غالب کے خسر الٰہی بخش معروف نہ صرف شجاعت میں بلکہ اہلِ اسلام میں پنے تقدس کے لیے بھی ممتاز تھے۔ نوجوان ان کے ہاں اکٹھا ہوتے اور وہ ان کو تصوف کی تلقین کرتے اور صوفیوں کے ور طریقے سکھاتے۔ ایک دفعہ ان کے جی میں آئی کہ پارسائی کے ایک کار نمایاں کی بجاآوری اپنے نوجوان داماد کو سونپ کر سے بھی روحانیت کے رموز و اسرار سے واقفیت رکھنے والوں کے زمرے میں شامل کریں۔ اس غرض سے انھوں نے پنے سلسلے کے مشائخ کا شجرہ مرزا کے حوالے کیا کہ اس کی نقل کر دو۔ مرزا نے خوشی سے کار مفوضہ اپنے ذمے لے لیا لیکن شائخ کی تعداد زیادہ تھی اور مرزا کو سعادت روحانی کے حصول کی جلدی تھی۔ جب مرزا الٰہی بخش کو شجرے کی نقل ملی تو انھیں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ مشائخ کے نام اس طرح لکھے ہیں کہ ایک لکھ دیا تو دوسرا حذف کر دیا، تیسرا پھر لکھ دیا تو چوتھا ساقط۔ انھوں نے مرزا سے پوچھا کہ "باقی سب کہاں ہیں؟" مرزا نے کہا "حضرت! شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ وزینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا، آدمی ذرا اچک اچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔" جیسا کہ حالی ذکر کرتے ہیں خسر نے پھر کبھی مرزا سے اس طرح کی فرمائش نہیں کی اور مرزا ہمیشہ کے لیے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

غالب نہ صرف متذکرہ بالا شعرا کی پیکر تراشی بلکہ ان کے نظریۂ حیات کو بھی خراج تحسین ادا کرتے ہیں اور اپنی قلبی بفیت کی نقشہ کشی میں غیر معمولی قوت متخیلہ کا مظاہرہ کرتے ہیں ہندوستانی فاضل خورشید الاسلام نے، جن کا ہم اوپر بھی ذکر کر چکے ہیں، نوجوان غالب اور عہدِ مغلیہ کے متاخر شعرا کے کلام کے موضوعات، خیالی پیکروں، مضامین اور ہیئت کا موازنہ کرکے ایک بہت بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ چناں چہ غالب نے جن شعرا کی تقلید کی ہے ان کا حوالہ دیتے ہوئے ہم ورشید الاسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے۔ تاہم فی الوقت ہمارا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ غالب اور ان شعرا کی دنیا میں ن کا انھوں نے تتبع کیا مشابہت کہاں ہے اور اختلاف کہاں۔ غالب اکثر اپنی بدبختیوں کا ذکر اور ناکامیوں کا شکوہ کرتے ہیں: قسمت کا مارا اور دیارِ دہلی کا ایک بدنصیب، اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمان اور اعمال کے اعتبار سے مسلمان کے بھیس یں کافر و آتش پرست، مہمل گو جسے غلطی سے غالب کا نام دے دیا گیا ہے۔

خرسندی غالب نہ بود زیں ہمہ گفتن
یک بار بہ فرمائی کہ "اے ہیچ کسِ ما!"

(غالب ان سب باتوں سے کہاں خوش ہو سکتا ہے، ایک بار یہ کہہ دے کہ اے وہ شخص جو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے)

سراج الدین احمد کے نام اپنے خط کی ابتدا اس طرح کرتے ہوئے غالب اس ظلم و ستم کا شکوہ کرتے ہیں جو قسمت نے ان پر ڈھائے ہیں۔ نہایت نفاست سے قلم بند کی ہوئی مرصّع فارسی عبارت، واضح اور نپے تلے اسلوب کا ایک شاہکار ہے۔ لیکن اگر اس عبارت کا ہم عنفوانِ شباب میں ناصر علی اور غنی کی تقلید میں لکھے ہوئے شعر سے موازنہ کریں تو غالب کی ابتدائی شاعری میں بھی سادہ اور فطری طرزِ بیان کی ایک مثال ہمارے سامنے آئے گی:

ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی

محولہ شعر پر اس جدت اور صلابت کی چھاپ واضح ہے جو اس وقت تک غنی اور ناصر علی کے کلام میں "سبکِ ہندی" ایک نمایاں خصوصیت بن چکی تھی۔ خورشید الاسلام ان کے خیالی پیکروں کی "مادیت" کی وجہ سے ان کی نکتہ چینی کرتے ہیں ا مثال کے طور پر غنی پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی شاعری میں معشوق حقیقی نہیں ملتا، آب ونان کا غم البتہ ہے۔ واقعی جیسا کہ اس صنفِ سخن کا تقاضا ہے غزل میں روحانیت ہونی چاہیے، اس کو اوپر کی طرف مائل پرواز ہونا چاہیے، آب و نان کے اظہار کے لیے دوسری، نسبتاً ادنیٰ درجے کی اصنافِ سخن سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن "سبکِ ہندی" کی شاعر روحانیت کے دائرے میں مادیت کو بھی جگہ دیتی ہے۔ اور اصولِ جمالیات کے نقطۂ نظر سے وہ یہ کام نہایت بے ڈھنگے سے انجام دیتی ہے۔ اچانک غزل کی لطیف، "کوہستانی" فضا میں پہنچ کر یہ مادی شے، فریبِ نظر کے کسی اصول کے تحت گویا کہ ہوا میں معلق ہو جاتی ہے، حد سے زیادہ واضح دکھائی دیتی ہے اور ڈھٹائی کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے منڈلا رہتی ہے۔ وہ دھوپ چھاؤں، ظلمت و نور کے عملِ اجتماعی سے خارج ہو جاتی ہے اور غزل کی دنیا نے رنگ میں کھپ نہیں پا؟ وہ اپنی "فوق حقیقی" ملاحدگی اور خود مختاری کا تاثر پیدا کرتی ہے:

فکرِ پرواز جنوں ہے، سببِ ضبط نہ پوچھ
اشک چوں بیضۂ مژگاں تہہ پر پنہاں ہے

غالب کی ابتدائی شاعری کو فوق حقیقت نگاری سے مشابہت دینا ایک حد تک ہی مناسب ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا شا بہتر ہو گا کہ "سبکِ ہندی" کے فروغ کے دوران شاعری میں جائز مضامین کی حدود میں توسیع ہوئی تھی اور اب شدید جذبا کو "پرزور" اور غیر معمولی الفاظ میں ظاہر کرنے کا حق حاصل ہو چکا تھا:

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغز استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

ان شاعروں کے مقابلے میں جن کا انھوں نے اتباع کیا غالب کی ابتدائی شاعری میں بہت سے موضوعات کو اظ کا اپنا اور نیا ڈھنگ ملا:

بہ وقت سر نگونی ہے تصور انتظارستاں
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا

اس شعر میں صوفیوں کے استغراق اور اپنی ذات میں ڈوب جانے کے عمل کے لیے مخصوص اندازِ نشست کی بھ شکل تراشی کی گئی ہے۔ بعد کے دور میں مرئیت غالب کے خیالی پیکروں کی ایک نمایاں خصوصیت قرار پائے گی۔ لیکن اس طر کی تصویر کشی کے امکان تک پہنچنا بہ جائے خود نئے اسلوب کی ایک کامیابی تھی (غالب نے اس بیت میں ناصر علی کا تتبع ہے)۔ قدرتی بات ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جس کی حیثیت محض تجربے کی ہے: یہاں نہنگ گردوں بھی ہے (بہتر ہے کہ چاند، ستاروں کی تاک جھانک کرنے والی آنکھوں کے لیے نہنگ کا کام کرتا)، اور صابونِ سحر بھ ہے (سحر از بہر شست و شوئے داغِ ماہ صابون ہے)

غنی کی تقلید میں کہے گئے مرزا اسد اللہ خاں کے اشعار میں بھی کبھی کبھی مضامین کا وہی کتابی اور رسمی انداز بیا دکھائی دیتا ہے جس کا الزام خورشید الاسلام نے خود غنی پر لگایا ہے:

مسی آلود ہے مہرِ نوازش نامہ پیدا ہے
کہ داغِ آرزو نے بوسہ لایا ہے پیام اس کا

مسی اس سیاہ سفوف کو کہتے ہیں جس سے دانتوں کو رنگا جاتا تھا۔ مہر کا، جس پر صاحب مہر کا نام کندہ ہوتا ہے، اور دستخط کی قائم مقامی کرتی ہے، ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی بتاتے چلیں کہ جب شاعر اپنے لیے کوئی تخلص لیتا تھا تو اسی قلمی نام کی مہر بنوالیتا تھا اور تخلص کی تبدیلی کی صورت میں اسے مہر بھی تبدیل کروانی تھی۔ خود مرزا اسد اللہ خاں نوجوانی میں اسد تخلص کرتے تھے اور پھر انھوں نے غالب تخلص اختیار کیا، جس کے بعد انھوں نے اپنے نئے قلمی نام کی مناسبت سے نئی چہار پہلو مہر بنوائی۔ اس مہر کا نقش ہم کو ان کے مخطوطات کے پہلے صفحے یا عنوان اور متفرق اوراق اور مخطوط کے حاشیوں پر بھی ملتا ہے۔ محولہ بالا شعر میں مہر پر جو نامۂ معشوق پر ثبت ہے، اسی مسی کے آثار نمایاں ہیں جو معشوق نے اپنے دانتوں پر لگا رکھی ہے، اس طرح سے مہر داغ آرزو کی اور ساتھ ہی ساتھ بوسۂ لب کی بھی یاد دلاتی ہے۔

کائنات کی تنگی اور گھٹن کا احساس، جو دراصل بیدل سے مستعار لیا گیا ہے، اس بیت میں ملتا ہے :

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

قدرتی طور سے اس پر تکلف اور گاہے غیر فطری پیکر تراشی پر بہت کچھ تنقیدیں بھی ہوئیں۔ حالی لکھتے ہیں "ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے ...... مرزا سے کسی موقعے پر یہ کہا آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا، اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے :

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا : حاشا، یہ شعر میرا نہیں ہے۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہ مزاح کہا، میں نے خود آپ کے دیون میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں!" حالی نے یہ قصہ، غالب کی ابتدائی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے، لیکن چوں کہ اس میں دیوان کا ذکر ہے، تنقید کا تعلق یا تو نسبتاً بعد کے دور سے ہے، جب کہ دیوان غالب شائع ہو چکا تھا یا پھر بہ صورت دیگر، دیوان کی ان بالکل ابتدائی اشکال میں سے کسی ایک سے ہے جن کے صرف قلمی نسخے دستیاب تھے۔ بہ ہر حال ناقدین نے بارہا تحریراً اور راست مرزا کو ان کے کلام کے تعلق سے اپنی حیرانی، ناپسندیدگی اور کبھی کبھی عام مذمت کی حدوں کو چھوتی ہوئی خفگی سے آگاہ کیا۔ لیکن ہر شاعر کا اپنا راستہ ہوتا ہے۔ غالب عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں : "پندرہ سے پچیس سال کی عمر تک میں پیچیدہ مضامین میں داد دقیقہ سنجی دیتا رہا اور دس سال میں اشعار کا اچھا خاصہ بڑا دیوان مرتب کر لیا لیکن جب میں خود پر تنقیدی نظر ڈالنے کے قابل ہوا تو یہ اشعار میری نظر سے گر گئے۔

* * *

نوٹ

گزشتہ ماہ یعنی جون ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع شدہ کتاب "مرزا غالب" کے باب ۲ "آگرے کی تصویریں" میں چند سطور نادانستہ حذف ہو گئی ہیں۔ اس شمارے کے صفحہ ۲۷ اور ۲۸ کے درمیان تسلسل کے لیے صفحہ ۲۷ کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت کا اضافہ کر لیں :

لیکن اس کے بعد ایسا لگتا تھا کہ قسمت مہربان ہو گئی اور کم و بیش سکون قائم ہو گیا۔ صوبہ جات متحدہ کے لیے جن

میں آگرہ شامل تھا، اس وقت سے سیاسی استحکام کا دور شروع ہوتا ہے جو نصف صدی سے کچھ اوپر برقرار رہا۔ اور پھر از "تخت شاہی ہل گئے اور افسرِ شاہانہ گر پڑے۔ اور زلزلے سے بھی زیادہ زبردست ایک طاقت نے برطانوی اقتدار کی بنیادوں ہلا کر رکھ دیا۔ یہ ۱۸۵۷ء۔۱۸۵۹ء کی عظیم قومی بغاوت تھی۔

نصف صدی کی امن و سکون کی زندگی ایک ملک اور ایک انسان کی زندگی میں اچھی خاصی طویل مدت سمجھی جا سکتی۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے لیے یہ نصف صدی ایک المیہ سے، یعنی ۱۸۰۲ء میں ان کے باپ کی موت سے شروع ہوتی اور جلد ہی ۱۸۰۶ء میں ان کے سرپرست نصر اللہ بیگ بھی انتقال کر جاتے ہیں۔ ان عزیزوں کی اموات کا غم شاعر ساری ز محسوس کرتا رہا۔ سراج الدین احمد کے نام۔۔۔۔۔

...

سلسلہ ص ۱۴

وہ بعض پرنسپل اور اساتذہ کی طرح اسلحہ سے لیس اور باڈی گارڈ کو ساتھ لیے کالج آنا پسند کرتے۔

مختصراً ان کی روداد حیات یوں رہی ہے: حیدرآباد دکن، برطانوی فوج کی ملازمت، قیامِ انگلستان۔ جہاں انھوں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی، حیدرآباد دکن، سنگاپور، حیدرآباد سندھ، سنگاپور، پشاور، بغداد، آسٹریلیا، نائجیریا، تنز سعودی عرب، کوالالمپور، اور یونیورسٹیوں کی زندگی سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈبلن میں گیارہ سال کا قیام 1991ء سے تاح انگلستان میں ہیں۔ جہاں ان کے جوڑوں کا درد انھیں سردی میں بہت ستاتا ہے۔ بیگم ایک طویل بیماری کی گرفت میں ہیں کا وقت پڑھنے، بیوی کی تیمارداری کرنے اور اپنے باغیچے کی دیکھ بھال میں گزرتا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ابھی تک کے جھکولوں میں ہیں اور نہیں جانتے بالآخر وہ پاکستان آجائیں گے جہاں ان کے بھائی ہیں یا دکن کی کشش انھیں وہاں لے جائے گی۔ مگر میرا خیال ہے اگر اب بھی کسی یونیورسٹی کو دنیا میں کہیں بھی ایک نیا میڈیکل کالج کھولنا ہو اور اس اینٹمی ڈپارٹمنٹ کی داغ بیل ڈالنے کے لیے انھیں بلایا جائے تو وہ باوجود اپنے 80 سال کے وہاں جانے کو تیار ہو جائیں جیسا کہ وہ متذکرہ بالا ممالک میں زندگی بھر کرتے آئے ہیں۔ ان کے بلند پایہ اور تدریسی کام کو دیکھتے ہوئے جس کا ذکر ہی کسی سے کرتے ہیں میرے ذہن میں ان کے لیے میر کی وہ رباعی آتی ہے:

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے — ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے ایک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

سلسلہ ص ۲۲:

پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد معقول اور منطقی نتائج اخذ کرتے ہوئے فیصلے کیا کرتے تھے۔

مآخذ

یہ مضمون آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی حسب ذیل امثلہ کے مواد کی بنیاد پر قلمبند ہے۔

1۔ Instalment No.83 List No.7 Serial No.82

مقدمہ:۔ تحریک پروفیسرانِ جامعہ عثمانیہ وغیرہ نسبت اجرائی وظیفۂ رعایتی بنام مولوی احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی۔

2۔ Instalment No.81 List No.1 Serial No.298

مقدمہ:۔ درخواست حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی در بارۂ اجرائی وظیفۂ تعلیمی بنام سید امجد فرزندِ خود کی نسبت۔

3۔ Instalment No.80 List No.5 Serial No.401

مقدمہ:۔ اجرائی ماہوارات خاص بنام مسماتان فیروزہ و روشن نبیری سر فریدون الملک بہادر۔

***

جواد رضوی

مخدوم محی الدین

مصنف: الیکسی، سوخاچیف

ترجمہ: اسامہ فاروقی

(مخدوم پر روسی مصنف کی کتاب کی رسم اجرا کے بعد ایک میٹنگ میں مغنی تبسم سے میری ملاقات ہوئی اور انھوں نے دوران گفتگو یہ حکم صادر کر دیا کہ آپ کو اس کتاب پر تبصرہ لکھنا ہوگا۔ میں نے کہا بھئی میں نہ ادیب ہوں اور نہ نقاد پھر میں اس خدمت کا کس طرح اہل بن جاتا ہوں۔ مغنی ماننے تیار نہ تھے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنا یہ فرض خرابی صحت اور کچھ گرمی کی شدت کی وجہ بروقت پورا نہ کر سکا اور یہ سمجھا کہ چلو بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن حال ہی میں ایک محفل میں مغنی سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو پھر انھوں نے کہا کہ اب تو گرمی کا موسم ختم ہوگیا ہے اور آپ کی صحت بھی بہتر نظر آتی ہے۔ اب تو آپ کو تبصرہ ضرور لکھنا ہوگا۔

مغنی کا یہ اصرار شاید اس وجہ سے ہو کہ میں مخدوم کا پرانا ساتھی رہا ہوں اور یہ بھی کہ اس کتاب کا مسودہ ارباب ادبی ٹرسٹ نے جن کی جزوی امداد سے یہ کتاب شائع ہوئی مجھے بھیجا تھا اور میری رائے طلب کی تھی۔ میں نے اس معیاری کتاب کی جلد اشاعت کی پرزور سفارش کی تھی۔ اب تو میرے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیجیے یہ مختصر سا تبصرہ پیش خدمت ہے۔)

مخدوم کی شخصیت، شاعری اور ان کی سماجی سرگرمیوں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان پر غالباً پہلی کتاب ڈاکٹر داؤد اشرف نے لکھی تھی جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئی۔ جب مخدوم کی (۶۰) ویں سالگرہ کے موقع پر بڑے پیمانے پر جشن مخدوم منایا گیا تو ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں اور دانشوروں نے ان کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا اور پڑھا۔ ان کے انتقال کے بعد کئی معیاری رسالوں کے خصوصی نمبر نکالے گئے اور کئی تحقیقاتی کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن زیر تبصرہ کتاب ایک نامور روسی اسکالر ڈاکٹر الیکسی، سوخاچیف نے روسی زبان میں لکھی ہے جو مخدوم پر کسی غیر ہندوستانی اسکالر کی غالباً پہلی انتہائی مبسوط اور محققانہ کتاب کہی جا سکتی ہے جس کا بہت ہی خوب صورت ترجمہ اردو میں محمد اسامہ فاروقی نے کیا جو قابل مبارکباد ہیں۔ روسی مصنف کا تعارف مغنی تبسم نے کچھ اس طرح کروایا ہے۔ "پروفیسر سوخاچیف یوں تو ایشیائی ادب کے شعبے کے سربراہ ہیں اور اس خطۂ ارض کے درجنوں زبانوں میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں مگر وہ خود صرف اور صرف اردو کے اسکالر ہیں اور ان کی بیشتر تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی نگارشات اور تراجم کا تعلق ادبیات اردو سے ہے۔" مصنف نے مخدوم کی ابتدائی زندگی اور تعلیم، ان کی ابھرتی ہوئی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے کلام کے مختلف ادوار کا نہ صرف تفصیلی جائزہ لیا ہے بلکہ اس دور کے ہم عصر شاعروں: فیض، مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر

کے کلام سے تقابلی تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس تعلق سے مغنی نے پیش لفظ میں کہا ہے کہ "حسبِ ضرورت ہم عصر شعرا۔
کلام اور مخدوم کی شاعری کا تقابلی جائزہ بھی لیا۔ اس طرح عمیق مطالعے کے ذریعے وہ شعر یا نظم کی گہری ساخت تک "
جاتے ہیں اور اس کی تہہ داری اور معنوی جہات کو روشنی میں لے آتے ہیں۔"

مصنف نے اس کتاب میں (۸) اہم موضوعات اور (۴) ذیلی عنوانات کا احاطہ کیا ہے اور آغاز سفر اور سما
سرگرمیوں کے زیرِ عنوان مخدوم کے خاندان، ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیم اور اس دور کے سیاسی اور سماجی پس منظ
تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ دوسرے ابواب میں ان کی شاعری کے مختلف ادوار، ان کے مجموعۂ کلام "سرخ سویرا اور گل
وغیرہ میں شامل تخلیقات کا ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بڑے ماہرانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں اساتذۂ
کے کلام کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کتاب کے مختلف موضوعات کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا
کہ پوری کتاب میں ایک خاص نظریاتی، تجزیاتی، تنقیدی اور جدلیاتی نقطۂ نظر رواں دواں ہے۔

اسی نقطۂ نگاہ کی بنا پر مخدوم کے حالاتِ زندگی کا تفصیلی ذکر کے ساتھ شاید اس مناسبت سے ان کا تعلق جنوبی ہند
ایک دیسی ریاست سے تھا مصنّف نے پس منظر کے طور پر بہمنی سلطنت اور عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں
سرسری طور پر ذکر بھی کیا ہے اور آصف جاہی خاندان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"آصف جاہی خاندان میں کسی کو بھی ہندوستانی ثقافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن ان کے وزرا میں ت
یافتہ اشخاص اور علوم و فنون کے سرپرستوں کی کمی نہیں تھی۔۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک بیرونی مصنف نے کتنے پتے کی بات
ہے۔ اسی طرح اس وقت حیدرآباد کی جاگیرداری سماج کا جو حال زار تھا اس کا نقشہ ہندوستان کی ایک بڑی تجارتی فرم
منیجر پر کاش پنڈت نے جو ادبی صلاحیت کے بھی حامل تھے، جنوبی ہند میں اپنے سفر کے تاثرات کا اظہار کچھ اس طر
ہے: "دیسی ریاستوں کے قطبین کو دیکھ لینے کے برابر ہے۔ تراونکور پہاڑی، مرطوب، صاف ستھرا علاقہ ہے اور وہاں کی آ
کافی تعلیم یافتہ ہے۔ اور پھر ریاست حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حیدرآباد ایک سپاٹ، پتھریلا، دھوپ سے
ہوا میدان ہے جہاں کی آبادی ان پڑھ ہے۔ وہ آگے یہ بھی لکھتے ہیں "تراونکور چل چل اور ہنگاموں سے ابلتا رہتا ہے۔ حید
عہدِ وسطیٰ کی بے مصرف، ٹھٹھری ہوئی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے لاتعداد امرا ناقابلِ تصور عیش و عشرت کی زندگی گزا
ہیں۔ حیدرآباد کے تعلق سے مصنف نے ان تمام باتوں کا ذکر شاید یہ واضح کرنے کے لیے کیا ہے کہ مخدوم کی تخلیقات
تناظر میں معرضِ وجود میں آئیں اور وہ مخدوم کی زندگی اور کلام پر کس طرح اثرانداز ہوئیں چناں چہ خود مخدوم نے اس ب
سماج کی عکاسی اپنی نظم حویلی میں یوں کی ہے:۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج

مار وکثر دم کا ٹھکانا، جس کی دیواروں کے چاک
اف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

مخدوم کے کلام کے ارتقا، ان کی ادبی اور فنی باریکیوں اور کن اصناف سخن پر انھوں نے طبع آزمائی کی ان پر ناقدا
ڈالنا میرے اس تبصرے کا مقصد نہیں ہے کیوں کہ مخدوم صرف ایک قدآور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک بلند پایہ ٹریڈ
لیڈر اور کمیونسٹ پارٹی کے ایک سربرآوردہ رہنما بھی تھے۔ اس لیے میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ ان کے ؟
قومی اور بین الاقوامی حالات و واقعات اور کمیونسٹ پارٹی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کے کس طرح اثرات پڑے۔ سرخ س

ابتدائی دس، پندرہ نظموں میں رومانی اور عنفوانی میلان غالب نظر آتا ہے جس میں شاعر نے پاکیزہ محبت اور مسرّت کے نغمے گائے ہیں جس کے بہترین نمونے ان کی نظمیں طور، ساگر کے کنارے اور تلنگن وغیرہ ہیں۔ لیکن مخدوم کی ابتدائی تخلیقات میں بھی "سماجی موضوعات" کے شمول میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا ثبوت ان کی نظم "جنگ" سے ملتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اب مخدوم کی دلچسپی کا مرکز صرف عشقیہ شاعری نہیں رہ گئی تھی۔

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا جس سے ساری دنیا کے سیاسی اور معاشی حالات پر بڑے دوررس اثرات پڑے جن سے ایک حساس شاعر کا متاثر ہونا تو فطری امر تھا۔ چناں چہ جنگ کے ان ۵، ۶ برسوں کے دوران مخدوم کی جو شعری تخلیقات معرضِ وجود میں آئیں ان پر جنگ سے پیدا شدہ حالات اور مسائل کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی ایک درجن سے زائد یہ نظمیں ہیں۔ جنگ، مشرق، موت کا گیت، آزادیِ وطن، مسافر، روحِ فغفور، زلفِ چلیپا، سپاہی، انقلاب، اندھیرا، جنگِ آزادی اور اسٹالین وغیرہ۔

اسی دور کی بعض نظموں میں "ادبی دہشت پسندی" کے چند نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ اگر مخدوم کے اس دور کے کلام کا ذرا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس جنگ کی نوعیت کے تعلق سے عالمی کمیونسٹ تحریکوں کا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے۔ چناں چہ مخدوم نے اپنی نظم "سپاہی" کے بارے میں یہ واضح کیا ہے کہ (یہ نظم دوسری عالمی جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی ہے)۔

اس وقت کے سیاسی پنڈتوں اور کمیونسٹ رہنماؤں کے مطابق اس جنگ کے دو مختلف دور تھے۔ پہلا دور ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۱ء میں ختم ہوا جس کو سامراجی جنگ کے دور سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان ابتدائی دو برسوں میں سامراجی حکومتیں آپس میں دست و گریباں تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ ساری دنیا کو آپسی ہوسِ اقتدار کا شکار بنائیں اور آپس میں تقسیم کر لیں۔ جب ہٹلر جون ۱۹۴۱ء کو سابق سوویٹ یونین پر حملہ آور ہوا تو جنگ کا کردار بدل گیا اور اب وہ ایک عوامی جنگ کہلائی جانے لگی کیوں کہ اب جنگ صرف سامراجی طاقتوں کا اکھاڑا نہیں رہی۔ اب ایک سوشلسٹ حکومت بھی اس جنگ میں شریک ہو گئی جو یہ سمجھتی تھی کہ ہٹلر پورے یورپ پر قابض ہونے کے بعد سوویت یونین (جو دنیا کا پہلا سوشلسٹ ملک تھا) کو شکست دے کر ساری دنیا کے عوام کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے ہٹلر کے ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنانے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ساری دنیا کے عوام ہٹلر کے بربری حملوں کے خلاف آواز اٹھائیں اور اس کو شکست دینے کے لیے متحدہ طور پر جد و جہد کریں۔ چناں چہ اس پورے زمانے میں مخدوم اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کے کلام میں اسی بات پر زور دیا جا رہا تھا کہ فاشزم کو شکست دی جائے اور عوامی جنگ کو کامیاب بنایا جائے تاکہ ساری دنیا کے عوام کو ہٹلر کی غلامی سے بچایا جا سکے۔ عالمی سطح پر یہ بات بالکل درست تھی۔ لیکن اس مسئلے پر ہندوستان کی ترقی پسند طاقتیں ایک سیاسی الجھن کا شکار تھیں۔ فاشزم کے خلاف جد و جہد کرنا تو برحق لیکن اس جنگ میں شریک انگریز سامراجی اس وقت بھی ہمارے ملک کو غلام بنائے ہوئے تھے اور جلد از جلد ہمیں آزادی دینے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ان پیچیدہ حالات میں ہمیں ایسی حکمتِ عملی بنانے کی ضرورت تھی کہ فاشزم کے خلاف جد و جہد جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک میں سامراجی تسلط کے خلاف جد و جہد میں بھی تیزی پیدا کی جائے تاکہ ہم قومی دھارے سے الگ تھلگ نہ پڑ جائیں۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا جس کے نقصان دہ نتائج ہمیں برسوں تک بھگتنے پڑے۔ چناں چہ مصنف نے بھی اس طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"جنگ کے دوران ہندوستان میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے لیکن مخدوم کی شعری تخلیقات میں ان کا عکس نہیں دکھائی دیتا۔ بظاہر سماجی اور سیاسی کاموں کی بھاری ذمہ داریوں کی وجہ سے شاعری اور ادبی مشاغل کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی تھی مگر طویل خاموشی کا کیا یہی ایک سبب تھا؟ اصل میں اس "طویل خاموشی" کا سبب وہ سیاسی الجھن اور انتشار

تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔
جنگ کے اختتام کے بعد کمیونسٹ اور ایک الجھن میں پھنس گئے۔ ملک کی بد بختانہ تقسیم کے بعد ہندوستان کو جو آزادی وہ حقیقی تھی یا انگریز سامراجیوں اور ہندوستان کے بورژوا طبقے کے ناپاک گٹھ جوڑ کا ایک ڈھکوسلا اور اسی تباہ کن پالیسی جڑا ہوا ایک اور مسئلہ تھا کہ کیا آزادی مل جانے کے بعد بھی تلنگانے میں ہتھیار بند لڑائی جاری رکھنا درست تھا؟ جب مہینوں اور برسوں تک مباحثہ جاری رہا۔ ان تمام نقصان دہ، تنگ نظر اور انتہا پسندانہ پالیسیوں کے بُرے اور منفی اثر کمیونسٹ ادیبوں کی تخلیقات پر پڑے جس سے مخدوم کا کلام کس طرح مبّرا رہ سکتا تھا؟

ان ہی نظریاتی قلابازیوں کی بنا پر مخدوم کی کئی نظموں پر ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے دانش وروں نے تنقید کی جس کا ذکر اپنی کتاب میں مصنف نے بھی کیا ہے۔ مثلاً عالم خوند میری نے مخدوم کی نظم "زلفِ چلیپا" کے بار میں یہ کہا کہ "مخدوم محی الدین کے پاس روایتی طرز میں شاعری کے لیے خصوصاً غزل کی تخلیق کے لیے اعلیٰ درجے کا ذوق تاہم ۱۹۵۶ء تک انھوں نے غزلیں نہیں لکھیں۔ بقول ان کے (عالم) اس کی وجہ یہ ہے کہ مخدوم نے شعوری طور پر اپنی ش تخلیقات کو اشتمالی نظریات کے تابع رکھا، انھوں نے اپنے ہی نغمات کا گلا گھونٹا اور صرف "زلف چلیپا" میں شعری تخلیہ نظریاتی گرفت کو کچھ ڈھیل دی"۔ مصنف عالم کی اس تنقید سے متفق نہیں ہیں لیکن اس وقت کمیونسٹ پارٹی جس سیاسی نظریاتی خلفشار سے گزر رہی تھی اس کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ عالم کی تنقید بڑی حد تک درست تھی۔

آخر میں چند معترضہ جملے! کیا تبصرہ نگار کا کام کتاب کی صرف خوبیاں اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے؟ اس نظر سے تو تبصرہ صرف قصیدہ بن کر رہ جائے گا۔ تبصرہ نگار کا یہ بھی فرض ہونا چاہیے کہ وہ زیرِ تبصرہ کتاب کی خامیوں فروگزاشتوں کی طرف بھی اشارہ کرے۔ اس کتاب میں بھی کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جانا ضروری۔ "سر گرمیوں" کے باب میں صفحہ (۴۸) پر یہ لکھا گیا ہے کہ "۱۹۳۷ء کے اواخر یا ۱۹۳۸ء کے آغاز میں "ویکاجی ہوٹل" کے ایک کمرے میں جہاں ان دنوں مخدوم کا قیام تھا حیدرآباد کے مختلف کالجوں کے چند طلبہ کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ جلد مخدوم محی الدین اور سبط حسن کی تحریک پر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخ حیدرآباد میں قائم ہوئی"۔ یہ تحریر حقائق مبنی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ سبط حسن کی پہل پر کالج کے چند طلبہ کی ایک میٹنگ بلائی گئی تھی جس میں سبط حسن علاوہ اونکار پرشاد، مرزا حیدر حسین، نریندر دت اور نور الحسن جعفری شریک ہوئے تھے اور اسی میٹنگ میں اسٹوڈ فیڈریشن کی شاخ حیدرآباد میں قائم کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مخدوم نے نہ پہل کی تھی اور نہ وہ اس میٹنگ میں شر تھے۔ میں شخصی طور پر تمام شرکاء میٹنگ سے واقف ہوں اور چوں کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اس لیے اس کی سچائی سے کو واقف کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح "تلنگانے کارزمیہ" کے باب میں صفحہ ۹۱ پر یہ کہا گیا ہے کہ "بغاوت کے دوران با کو اسلحہ کی فراہمی کے ذمہ دار اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی آندھرا پردیش کی ریاستی کمیٹی کے موجودہ سکریٹری کے۔ مہندرا کے بیان کے مطابق باغیوں میں بنیادی طور پر سیاسی کاموں کی دیکھ ریکھ کرنے والے مخدوم کو اسکولوں کے ا اور آزاد علاقوں میں عوام کے لیے تہذیبی کام کے انصرام کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی"۔ اس بات کی صحت کے بار میں مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس لیے مہندرا کو فون کر کے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ "اسلحہ کی فراہمی" کا ذمہ دار تھا لیکن مخدوم کے تعلق سے جو باتیں میرے حوالے سے کہی گئی ہیں وہ غلط ہیں۔ کیوں کہ مخدوم کبھی بھی "آزاد علا میں نہیں گئے تھے۔ کتاب کی جن فروگزاشتوں کے بارے میں یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مخدوم کی پایہ شخصیت اور عظمت میں کوئی کمی کی جائے بلکہ منشا یہ ہے کہ چند واقعاتی غلطیوں کو درست کیا جائے۔

"اس بات میں کسی پس و پیش کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کتاب بہت ہی خوب ہے اور اس کا ترجمہ خوب تر۔"

(آگے ص ۵۶ پر)

فرحت زاہد

ادھورے سفر کے مسافر

خواب میں گاڑی چلاتے ہوئے
میرے سامنے وہ بس آگئی ہے
جس میں Learning Disable بچے سفر کر رہے ہیں
میں بس کے شیشوں سے
ن بچوں کے سر دیکھ سکتی ہوں
ن میں سے بعض اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں
ور بعض باہر کی دنیا کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں
بچے جب صبح اپنے گھروں سے چلے
ان کی ماؤں کے چہروں پر آدھی مسکراہٹ تھی
کول پہنچے، تو آدھے سے کم علم ان کے حصے میں آیا
کول کے آدھے سے زیادہ بچوں نے
سے دور رہنا پسند کیا
ام کوئی۔ وی پر آدھی خبریں ان کی سمجھ میں نہ آسکیں
رات کو جب وہ عام بچوں کی نسبت
ھا گھنٹہ پہلے ہی سو گئے
ان کی مائیں
اری رات زندگی کے ادھورے سفر پر چلتی ہوئی گاڑیوں کے
یانک خواب دیکھتی رہیں

***

پرتوِ پرواز

جب میرا بچہ
اڑتے پرندے کے ساتھ
اپنے بازو پھیلا کر بھاگتا ہے
تو لگتا ہے
میرے اندر سینکڑوں پرندے
ایک ساتھ پرواز کر رہے ہیں

***

حسن فرخ

خواب

جو بیس ہی تاریخ تھی
جو
ذہن کے پردے پہ تھرکتی ہی رہے گی
گرمی میں بھی
سردی کی خنک تاب فضا تھی
معصوم سے لہجے کی مہکتی ہوئی خوشبو
وہ قرب کی حدت
کہ وجود اس میں پگھل جائے
بس فاصلہ اک جسم کا تھا بیچ میں حائل
ایسا
کہ جیسے لانگو کے اس پار اترنا بھی تھا مشکل
وہ فاصلہ برسوں سے گزرتا ہوا صدیوں پہ تھا حاوی
نیچوں کی کھنک "ٹوٹی فروٹی" کے پیالے ہی میں غرقاب
ہونٹوں کی ادا، غنچۂ نورستہ کی تجسیم، حسیں خواب
اٹھتے ہوئے خوشبو کے بگولے تھے بدن سے
گم سم سا
فقط محو نظارا تھا
مجھے ہوش نہیں تھا

اب سوچ رہا ہوں
منظر تو یہی تھا،
جو بہت پہلے مرے خواب میں آیا تھا
بھلا کون سی تاریخ تھی اس دن

ہاں یاد آگیا، جو بیس ہی تاریخ تھی
کیا خواب بھی اب خواب نہیں ہیں؟

یوں بھی ہوتا ہے

چاند کا ایک ٹکڑا، ننھا منا، شیریں شیریں
ہر راز سے واقف، ہر جنبش کی لذت پہ نازاں
غنچہ دہن، سرمایۂ جاں، گودی میں پروان چڑھتا تھا
اب کہتا ہے، اپنی فکر کرو، صبر کرو، جھنجھلاتے کیوں ہو

رات کی تاریکی، حالات کے اندھے کنویں سے ابھرا
ایک ستارا، سہما سہما، حیراں حیراں
آنکھوں میں اتر کے، ہاتھوں سے پھسل کر، فرحاں فرحاں
کہتا تھا، سورج میری منزل ہے، آنکھوں میں دیے جلاتے کیوں ہو

وقت کی ہر ہر آہٹ سے خوف زدہ
ایک ستارہ جھل مل جھل مل، شاداں شاداں
زینوں سے اترا تھا، جذبوں کی فرحت سے گریزاں
کہتا تھا۔ بیزار نہیں ہو تو ڈولی آخر منگواتے کیوں ہو

سورج کی تمازت سے بپھرا
ایک ستارا۔ سمٹا سمٹا، لرزاں لرزاں
آنگن میں پھیل گیا تھا، لمحوں کی شدت سے پشیماں
کہتا تھا، جب آگ بجھا نہیں سکتے ہو تو لگاتے کیوں ہو
پھر لوٹ گیا وہ دے کر ایک کھلونا

لمحوں میں بدلتے زرد رتوں کے تیور میں سمٹے
اور نہ جانے کتنے ستارے، دھیرے دھیرے، فرحاں فرحاں
دل کی دھرتی پر بکھرے، پہلی بارش کی بوندوں سے پرافشاں
کہتے تھے اظہار کی جراءت تو کر ہی چکے، پھر گھبراتے کیوں ہو

آج سبھی اپنے اپنے مدار میں داخل جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں
میں سرحد پہ خلا کی ٹھہرا، بس گردش دیکھا کرتا ہوں
کھوئی کھوئی آنکھوں کو، خوابوں کے کھلونے بیچا کرتا ہوں

اقبال متین

○

آدمی ہوتا ہوا بھی کوئی اوتار لگے
وہ گزرجانے جہاں سے وہیں بازار لگے

شب کے سناٹوں میں پر تول رہی تھی دنیا
پو پھٹے ایک کرن دوشِ زمیں بار لگے

اس کے کوچے میں مری شانِ انا بھی دیکھو
کتنے ارمانوں کے جمگھٹ ہیں سرِدار لگے

کوئی دیوار سرِراہ رکاوٹ بن جائے
کوئی رستہ سرِمنزل مجھے دیوار لگے

اس کے اقرار میں انکار کا پہلو نکلے!
اس کا انکار بھی اک طرح سے اقرار لگے

ہائے اس شخص کا اندازِ کرم بھی دیکھو
میرے پاس آنے تو خود اپنے سے بیزار لگے

جھک کے ملتے رہے ہم اہلِ زمانہ سے مگر
دو قدم پیچھے بھی رہتے ہوئے سردار لگے

وہ جو اک شخص نے چاہا مجھے اقبال متین
اس کے گھر جاؤں تو وہ درپۓ آزار لگے

***

○

ہم برے ہیں بھی تو ہر دل میں اتر جاتے ہیں
دشمنوں کو بھی دعا دے کے گزر جاتے ہیں

سب ہمارے ہیں، ہمیں بھی کوئی اپنا سمجھے
کہہ نہیں سکتے مگر سوچ کے ڈر جاتے ہیں

اپنی چوکھٹ پہ ٹھٹھک جاتے ہیں دستک کی طرح
اپنے آنگن میں بھی مانندِ سحر جاتے ہیں

دیکھنے والے تجھے دیکھ کے جی لیتے ہیں
چاہنے والے تجھے دیکھ کے مرجاتے ہیں

جب کبھی وہ نہیں دیتا ہے ہمیں اذنِ سخن
لے کے ہم کاسۂ اوصافِ ہنر جاتے ہیں

اور کیا دو گے چلو زخم ہی سی لیں مل کر
آج کل اچھے بھلے لوگ بھی مرجاتے ہیں

ہم کو اقبال متین اتنا بتاتے جانا
کبھی آنکھوں سے بھی اشکوں کے شرر جاتے ہیں

***

ڈاکٹر محبوب راہی

○

ر مسلسل بے گناہوں کے قلم ہوتے رہے
نامے فتح و نصرت کے رقم ہوتے رہے

ں ہیں وہ سرخمیدہ ، دست بستہ دربدر
ر پہ جن کے سرِ تسلیم خم ہوتے رہے

سکلیں آساں ہوئیں ہم پہ بھی غالب کی طرح
تی ہم بھی خوگرِ رنج و الم ہوتے رہے

ستدوں کے کھیل تو تاریخ کے ہر دور میں
یہ قریہ ، بستی بستی ، بیش و کم ہوتے رہے

ہم کو چنگاریاں بستر کی جھلساتی رہیں
ر تکیے رات بھر اشکوں سے نم ہوتے رہے

س قدر بھی خاک ڈالی وقت نے راہی وہاں
ر بھی روشن مرے نقشِ قدم ہوتے رہے

○

ہر خاکہ ادھورا ہے ، مکمل نہیں ہوتا
درپیش کوئی مسئلہ اب حل نہیں ہوتا

دیرینہ وہ اک درد جو منسوب ہے دل سے
ہوتا تو ہے بس یہ کہ مسلسل نہیں ہوتا

میں دھوپ میں حالات کی رہ جاتا جھلس کر
ممتا کا مرے سر پہ جو آنچل نہیں ہوتا

رقت کسی صدمے پہ بھی طاری نہیں ہوتی
دل اب کبھی جذبات سے بوجھل نہیں ہوتا

دل اپنا کھلا ہر کس و ناکس کے لیے ہے
ہم سے تو یہ دروازہ مقفل نہیں ہوتا

راہیؔ کی طرح تلخی حالات پہ کوئی
یوں شدتِ احساس سے پاگل نہیں ہوتا

سعدی تسکین

○

سمندر اٹھ کے جو ٹکرا گیا سفینے سے
تو ناخدا بھی ہوا ناامید جینے سے

تیرے ساتھ کٹھن راستے ہوئے آساں
تیرا ساتھ چھٹا چھٹ گئے پسینے سے

باقی عمر ہے پھرتا رہوں گا گلیوں میں
میں تیری یاد کا چہرا لگائے سینے سے

آج مرگیا تسکینؔ تو غم نہیں اس کا
جیتا رہا وہ زندگی ... قرینے سے

شفیع اللہ خاں رازؔ اناوی

○

آدمی گر یہ کہاں ہے وقت کی دہلیز پر
زندگی محوِ فغاں ہے وقت کی دہلیز پر

علم بے چارہ کڑکتی دھوپ میں ہے بے قرار
جہل زیرِ سائباں ہے وقت کی دہلیز پر

اپنی جو مخصوص اک پہچان رکھتا تھا کبھی
اب وہ بے نام و نشاں ہے وقت کی دہلیز پر

میرِ منزل سو رہا ہے ، راہزن بیدار ہے
زندگی کا کارواں ہے وقت کی دہلیز پر

ڈوبنے والوں کا منظر دیکھنے آئے ہیں لوگ
رازؔ ، بحرِ بیکراں ہے وقت کی دہلیز پر

قمر جمالی

کن کھجورا

جانے یہ شام ڈھلنے سے پہلے عروسی جوڑا کیوں پہن لیتی ہے! سانولی دھوپ کو منہ چڑا لینے کے لیے۔! دن ڈھلتا ہے۔ پرندے غول در غول اپنے آشیانوں کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ تاریکیوں سے بچنے کے لیے یہ کھلے میدانوں سے نکل کر مزید تاریکیوں میں ہی کیوں پناہ لیتے ہیں!

دن کا چہرہ سانولانے لگا ہے۔ شنگرفی لبادہ دھواں دھواں سا ہے۔ اب ہر طرف سیاہی کا تسلط قائم ہو گیا ہے۔ میں باغ کے اسی کم رونق حصے میں بنفشی تاریکیوں میں گھل گئی ہوں۔ مگر... سامنے... وہ پتھر کا مجسمہ پھر بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرے میں یہ پتھر کا مجسمہ کتنا پراسرار معلوم ہوتا ہے! بالکل میری زندگی کی طرح۔ سنگِ سیاہ کا یہ مضبوط عربی گھوڑا، اور اس پر سوار اتنا ہی مضبوط سپاہی اپنے داہنے ہاتھ میں تلوار اٹھائے کیسا عجیب و غریب منظر پیش کرتا ہے۔ شاید یہ اپنی زنگ خوردہ تلوار سے رات کا سینہ چیرتا ہے۔ کیا یہ تنہا ہی اس ہولناک تاریکی کو شکست دے سکتا ہے؟

اب تو رات کی بھیانک زبان روشنی کی ایک ایک رمق کی چاٹ گئی ہے۔ مجھے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ اس گھوڑے کی مضبوط ٹانگوں میں جانے کہاں کی قوت ہے! کتنی صدیوں سے یہ اس سوار کو اٹھائے پھر رہا ہے! شاید یہ دونوں ہی پاگل ہیں گھوڑا بھی اور اس کا سوار بھی۔ تاریکیاں کب کس سے شکست کھائی ہیں!!

چڑیوں کی چہچہاہٹ کم ہو گئی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز پر خاموشی کا پہرہ ہے۔ مگر.... باغ کے اس مانوس گوشے سے دبی آواز آرہی ہے۔

"ماجھی رے۔۔۔ پتوار سنبھالو... نیا" ڈوبی جاوے ہے۔۔

آج پھر اس مسخرے نے یہ ریکارڈ بجا دیا ہے۔ جانے شام ڈھلے صرف یہی ریکارڈ بجانے کے لیے وہ ساحل پر کیوں آتا ہے؟ میرے احساس اتھل پتھل ہو رہے ہیں۔ میرا مندمل شدہ ناسور پھر سے رسنے لگا ہے۔ اسے میرے خفتہ زخموں کو کرید کر کیا ملتا ہے!! گیت کی آواز شدت اختیار کر چکی ہے۔ خاموش لہروں میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ لہروں کے دائرے پھیلنے لگے ہیں۔ پھیلنے لگے ہیں۔ میری سانسیں اٹکنے لگی ہیں۔ سینہ پھٹنے کو ہے۔ افوہ۔ خدایا!

"کون ہو تم۔۔؟ کون ہو؟ شام ڈھلے صرف یہ ریکارڈ بجانے کے لیے یہاں کیوں آتے ہو؟ بند کرو اسے۔ یا پھر میں خود..

"ٹھہرو۔۔۔

پتہ نہیں یہ جنون مجھے کہاں کہاں رسوا کرے گا۔ بے خیالی میں میں نے یہاں تک دست درازی کی!

"آپ کون ہوتی ہیں مجھے روکنے والی؟"

یہ شاید سچ کہہ رہا ہے۔ ندامت بوجھ بن گئی ہے۔

"یہ گیت مجھے بے حد پسند ہے۔۔۔

کتنا بے باک ہے یہ مرد۔ گھاس پر لیٹے ہی لیٹے کس شانِ بے نیازی سے بات کر رہا ہے!

مگر... مگر مجھے اس کے اس انداز سے گھن کیوں نہیں آ رہی ہے؟ شاید میں نے اسے برداشت کر لیا ہے۔
"دوسروں کے قصے میں دخل انداز ہونا جرم ہے محترمہ۔۔
"معاف کر دیجیے۔ غلطی ہو گئی ہے۔۔
"ایسے نہیں۔۔وہ اٹھ کر میرے قریب آگیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا ہے۔ عجیب انسان ہے! عفو و درگزر کی تہذیب سے واقف نہیں ہے۔
"اس گیت سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"
"رشتہ؟ ہنہہ۔۔یہ کیا سمجھتا ہے میرے نزدیک آنا اتنا آسان ہے!
روز کی طرح مدرسے سے چھٹی ہوتے ہی میں پھر اسی باغ کی طرف گامزن ہوں۔
دہی رونق ہے۔
ڈوبتی
سسکتی
دہی روشنی۔
مدھم
مدھم
میں پھر اسی سمنٹ کے بنچ پر سمٹ کر بیٹھ گئی ہوں۔ جانے اس بنچ کا رخ اسی مجسمے کی طرف کیوں ہے۔ میری نظریں اس پر رک کر تھم سی گئی ہیں۔ ڈوبتی، سسکتی سانسوں میں ماضی کی تلخیاں قطرہ قطرہ تحلیل ہونے لگی ہیں۔ سپاہی کے ہاتھ میں تلوار آگے پیچھے جھول رہی ہے۔ گھوڑے کے جسم سے دھواں سا اٹھ رہا ہے۔
اجلا
اجلا
بالکل سفید چادر کی طرح۔ میرا بدن جھرجھری لے رہا ہے۔ میں لرزنے لگی ہوں۔ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے دور تک بنتے ٹوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب وہاں کوئی مجسمہ نہیں ہے۔ وہاں تو میری ماں ہے۔ بستر مرگ پر۔ بالکل تنہا۔ لاغر اتنی کہ بستر پر دکھائی نہیں دیتیں۔ شاید دھنس رہی ہیں اندر ہی اندر۔ دراصل یہ بہت تھک گئی ہیں۔ دشتِ رسوائی میں جانے کب سے بھٹکتی رہی ہیں!
تنہا
تنہا
صرف آکسیجن سلنڈر کی گھڑگھڑاہٹ ہی ان کی زندگی کی واحد شہادت ہے۔ ورنہ سارا جسم تو کبھی کا مر چکا ہے۔ میری ماں کتنی عظیم فن کار ہے ایسے مریں گی تھوڑے ہی فن کار کبھی نہیں مرتا۔ وہ تو ہر موت کے بعد مزید توانا ہو کر ہی جی اٹھتا ہے۔ کاش کوئی یہ بتا سکتا کہ فن کار کی حقیقی موت کب واقع ہوتی ہے!
نیم وا آنکھوں میں بلا کا کرب اور کپکپاتے ہونٹوں پر بلا کا استقلال ہے۔ میرا کتنا خیال ہے ابھی دو گھڑی کے بعد ہی مضطرب آنکھیں کھولے یہ میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ ضبط کرتے میرا برا حال ہے۔ میں چپ ہوں۔ مگر پلکوں پر لرزتے آنسو خود اپنی زبان آپ ہیں۔
"بیٹی! زندگی کے سفر کی بڑی نرالی تہذیب ہے۔ شب مسافرت خود چل کر طے کرنی ہوتی ہے۔ ہم سب کچھ دیر کے لیے کچھ دور تک، بس ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ منزل تک تو مسافر کو خود ہی چل کر پہنچنا ہوتا ہے۔ نہ کوئی قافلہ ساتھ ہوتا

ہے۔ اے کاروان۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے میری ہی طرح تم بھی ایک اچھی فن کار ہوگی۔ تم سمجھتی ہو
کار کے معنی؟ فن۔ کار۔! جن کے دل سلگتے بھی ہوں دھواں لبوں سے خارج نہیں ہوتا۔۔

"اماں! اماں! رکو۔ ادھر مت دوڑو۔ ادھر کچھ نہیں ہے۔ ادھر تو بس سناٹا ہے۔ عجیب سناٹا۔ روح کو کھینچ کر باہر
سناٹا!

تم چکرا جاؤ گی۔ گر جاؤ گی۔

زخمی زخمی

پیاسی پیاسی

اماں۔

چھوڑو مجھے۔ کون ہو تم؟

"گر جاؤ گی محترمہ! کدھر دوڑے جا رہی ہو۔ یہاں سے ریلنگ ٹوٹ گئی ہے۔

کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟"

شرم سے میں پانی پانی ہو گئی ہوں۔ جانے کتنے لوگ مجھے یوں بے تحاشا بھاگتے دیکھے ہوں۔ سر کی نسوں سے چم چم نہ
بوندیں اترنے لگی ہیں۔ اس شخص کی مضبوط باہوں کا سہارا ملتے ہی میرے احساس ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ مجھے نیند آنے لگی
میں اس اجنبی کے سینے سے چپک گئی ہوں۔

"یہ ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟ کس سے ڈرتی ہو؟ لو کافی پیو۔۔

مجھ میں اب انکار کی تاب نہیں ہے۔ ساری کافی غٹاغٹ پی گئی ہوں۔ دماغ کی رگوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ میں خود کو تا
محسوس کرنے لگی ہوں۔

"چلو تمھیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔۔

بڑا چالاک مرد ہے۔ میری بے بسی کو خود سپردگی سمجھتا ہے۔ میں کیا کوئی کاٹھ کی گڑیا ہوں۔؟ ہنہہ۔!۔

چھٹی کے ساتھ یہ بچے کس اشتیاق سے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگتے ہیں! شاید انھیں ان کی مائیں یاد آتی ہیں

"خدایا! ممتا کس شدید جذبے کا نام ہے!۔

یہ جیپ بچوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی میری طرف کیوں آرہی ہے۔! بڑا ڈھیٹ آدمی ہے۔ خواہ مخواہ ہی گلے پڑ جاتا ہے۔

"کیوں ڈر گئیں نا وردی سے؟"

یہ کیا مجھے چور سمجھتا ہے جو اس کی وردی سے ڈر جاؤں گی۔

"چلو آؤ۔ دیکھ کیا رہی ہو؟"۔

ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے دوسرا ہاتھ میری طرف یوں پھیلا رہا ہے جیسے میں اس کی..... "آتی ہو کہ اٹھا لوں خود سے۔؟
پھر خود سے اور کچھ اپنے اطراف بڑھتے بچوں کے اژدہام سے ڈر کر میں بلا تردد اس کی جیپ میں بیٹھ گئی ہوں۔ جیسے
اسی باغ کی طرف دوڑ رہی ہے۔ شاید یہ شخص بھی میری طرح سنسان ہے۔ اندر سے۔

جیپ رک گئی ہے۔ اب یہ شخص مجھے اپنے برابر بیٹھنے کے لیے مجبور کرنے والا ہے۔ مگر میں۔ اس کے برا
.... یہ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔! یہ شخص شاید جادوگر ہے۔ زبان اس کے متعلق کسی بھی منفی اظہار کو ادا نہیں کر
شاید میں اندر سے ٹوٹنے لگی ہوں۔ بکھرنے لگی ہوں۔ دائرے پھیلنے لگے ہیں۔ حصار ٹوٹ رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ قطعی
ایسا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرانے گی۔ میں اس شخص کے سحر سے خود کو محفوظ رکھوں گی۔

"منحوس!۔

ـک۔۔ کیا نام تھا اس خاتون کا؟"
"نام انام میں کیا رکھا ہے۔ وہ ایک عظیم فنکار تھیں۔ ہزاروں نام تھے ان کے۔ ہر دن نیا نام۔ ایک نئی زندگی کا عنوان۔۔
"پھر بھی۔۔۔
"مہتاب بائی، میر نُہ والی۔۔
بند ضبط ٹوٹنے کو ہے۔ طوفان سینے کو پرت در پرت پھاڑ کر باہر نکلنے کو ہے۔ میں برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔
میں جانتا ہوں اظہار لفظوں کا پابند نہیں ہے۔ میں نے اپنی طرف سے اعلان کر دیا ہے۔ تمھاری مرضی نہیں پوچھ
کیوں کہ مجھے یقین ہے جو بات تم اپنی نگاہوں سے کہہ چکی ہو اسے دہرانا پسند نہیں کرو گی۔
.....اور وہ گیت۔ جس سے تمھیں نفرت ہے۔ مجھے عقیدت ہے۔ یہ وہ گیت ہے جسے میں بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ اپنی ماں
زبانی۔۔" کاش! تم جانتیں کہ....
"نہیں۔ مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کہا نا کہ تم نے "گھر" کہتے صرف سنا ہے۔ دیکھا نہیں۔ ہوش سنبھالا
خود کو ہاسٹل میں پایا۔ پھر اس وقت جب تمھیں پتہ چلا کہ تمھارا اپنا بھی گھر ہے۔ تم یتیم نہیں، تمھاری ماں بھی ہیں
اس وقت تک اس گھر کی دیواریں ہی ڈھنے لگیں۔ اور یہ کہ تم اپنی ماں کو دیکھ بھی نہ سکیں۔ سلمیٰ! میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں
گھر کیسے کہتے ہیں۔۔ میرے وجود کے اندر ایک آندھی سی چلنے لگی ہے۔ دل کے نہاں خانوں میں چسپاں کئی تصویریں میر
نگاہوں کے آگے تیزی سے گردش کرنے لگی ہیں۔ میری ماں کی تصویر۔۔ گھر کی تصویر۔۔ ہاسٹل کی تصویر۔۔ انگلی پکڑ کر پا
چلاتی میری وارڈن کی تصویر۔ کتنے بے جان سوال یک لخت بولنے لگے ہیں۔ سب دھواں سا ہے۔ میں خود کو مسلسل سہارا د
کی کوشش کر رہی ہوں۔
یکایک ہواؤں کے تیور بدل گئے ہیں۔ "خنک بادل ہونٹوں پر رقص کرنے لگے ہیں۔ پلکوں سے آبشار پھوٹ گیا ہے
مطلع کہیں کہیں سے صاف ہونے لگا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں آج وہ پتھر کا مجسمہ پھر سے متحرک ہے۔ اور اس کے سا
ساری فضا رقص ہے۔ شاید.....سوار نے ایڑھ لگا دی ہے۔

یوسف عارفی

مٹتے لمحوں کا ایک منظر

ویران فصیلوں کو ڈھا کر کھلی سڑک بنانے کا منصوبہ جب طے پانے لگا تو اس نے محسوس کیا جیب میں رکھے ریوالور پر اس کے ہاتھ کی گرفت قدرے ڈھیلی ہو گئی ہے، اور ریوالور سے اب اسے خوف سا آنے لگا ہے ...... اس نے بے ارادہ تینوں افسروں سے اجازت لی اور بڑے ہال سے گزرتا خواب گاہ میں چلا آیا۔

خواب گاہ میں مغربی سمت والی ادھ کھلی کھڑکی پر لٹکتے پردے دھول سے میلے ہو رہے تھے۔ الماری میں رکھی کرم خوردہ کتابیں، شکن آلود بستر اور محراب کے دائیں جانب لٹکتی بندوق نیم مردہ اندھیروں کا جز بنتی جا رہی تھی۔

خواب گاہ کا دروازہ یوں کھلا چھوڑ کر جب وہ شکن آلود بستر کی جانب بڑھنے لگا تو اس نے محسوس کیا، ریوالور پر اس کے ہاتھ کی گرفت لمحہ بہ لمحہ مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے بہ دقت اپنی عرق آلود پیشانی صاف کی اور خوف زدگی کے احساس سمیت بستر پر دراز ہو گیا...... اور سوچنے لگا۔

ویران فصیلیں ڈھادی جائیں گی...... اور سورج کی شعاعیں کچے مکانوں اور محراب پر لٹکتی بندوق سے گلے مل جائیں گی ..... تب اس کا چہرہ کس قدر بدل جائے گا؟ شاید پہچانا بھی نہ جا سکے ...... اجنبیت ...... ہاں شاید اجنبی جان کر کوئی اس سے پوچھ ہی بیٹھے ......

"کون دیس کے رہنے والے ہو۔"

"جھوٹ!" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "میں نے کوئی شئے فروخت نہیں کی ہے ...... بازار گواہ ہے ...... بازار ......!"

اس نے بڑی احتیاط سے ریوالور جیب سے نکالی اور خواب گاہ کے کھلے دروازے کے اس پار نشانہ تاکنے لگا۔

فصیلیں ...... نہیں ...... گرائی ...... جائیں گی ......

بڑی برہمی کے عالم میں اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔ مگر اچانک اس نے محسوس کیا اس کے ہونٹ خون آلود ہو رہے ہیں اور اسے اپنے ہی خون کے ذائقے سے کراہیت سی آنے لگی ہے۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے خون آلود ہونٹ صاف کر لیتا راہداریوں میں اسے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

خواب گاہ میں نیم مردہ اندھیرے گہرے ہو رہے تھے اور وہ نزدیک آتی قدموں کی چاپ کو یکسر بھلا دینا چاہتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سامنے کھڑی بلند قامت لکڑی کی مقفل الماری کو دیکھا جس میں فصیلوں کے تقریباً سارے کاغذات حفاظت سے رکھے گئے تھے۔ ان کاغذات میں اس بات کی تصدیق درج تھی کہ فصیلیں ایک غیر معینہ مدت تک نہیں ٹوٹ سکتیں۔

"غیر معینہ مدت!" وہ دبے قدموں سے چل کر خواب گاہ کے بیچوں بیچ آکھڑا ہو گیا۔ "لیکن ہر شئے کی مدت تو معین کی ہے۔"

"میں!" خواب گاہ کے بیچوں بیچ کھڑے اپنے وجود کو اس نے یوں دیکھا جیسے وہ اپنے وجود کی معین کردہ مدت معلوم کر رہا ہو۔ پل بھر کے لیے ایک احمقانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری فصیلیں ڈھادی جائیں گی تو وہ خود بخود معینہ مدت آخری ہو جانے پر پہنچ جائے گا اور ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔

اچانک اس نے جیب سے ریوالور نکال لی اور اندھا دھند فائر کرنے لگا۔
"لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔۔۔ریوالور خالی تھا۔
اس نے صدر دروازے سے آتی چند مانوس آوازوں کو سنا۔ اور اس کا یک بہ یک جی چاہا خالی ریوالور ہی صدر دروازے پر دے مارے اور پوری قوت سے چلا کر حکم دے:
"گیٹ آؤٹ میرے پراسفٹ شنا ساؤ!"
وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا صدر دروازے تک پہنچ گیا۔
"سرکار کا راج پاٹ سلامت رہے۔۔۔۔۔۔
"تم!" اس نے پرانی وضع قطع کے میلے کچیلے دعائے خیر دینے والوں کو انتہائی حقارت سے دیکھا اور چیخ پڑا۔
"بکواس بند کرو!" پھر وہ ہانپتی سانسوں کے ساتھ خواب گاہ میں لوٹ آیا۔
خواب گاہ کی دیواروں پر آویزاں اس کے اجداد کی شاہانہ تصویریں جیسے اس کی بداخلاقی پر ملامت کرتی دکھائی دیں۔ اس کا جی چاہا وہ ایک ایک تصویر کے قریب جائے اور باادب ہو کر رندھی رندھی آواز میں کہہ دے:
"میں نے پوری کوشش کی ہے آپ کی تصویریں اسی طرح آویزاں رہیں اور فصیلیں کبھی ٹوٹنے نہ پائیں اور میں در بدری کے عذاب سے۔۔۔۔۔۔
"اپنی اس کوٹھی کو بہت جلد خالی کر دینا ہوگا مسٹر "ن"!" پشت سے آتی ہوئی آواز ان تین افسروں میں کسی ایک کی تھی جنھیں وہ بڑے ہال میں محو گفتگو چھوڑ آیا تھا۔
اچانک غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں چلا گیا اور انگلیاں ریوالور کو چھو گئیں۔
"کارتوس سے خالی ریوالور۔۔۔۔۔۔!" کسی نے چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔
"کیا کروگے اس بے کار شئے کا۔۔۔۔۔۔؟"
یک لخت اس نے محسوس کیا اس کی زبان گنگ ہوتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ ذہن پر گہرا سناٹا مسلط ہو رہا ہے اور سینے میں جاتی سانسیں الجھ رہی ہیں۔ اس نے بغیر کچھ کہے جیب سے ریوالور نکالی۔۔۔۔ لمحہ بھر کے لیے سامنے کھڑے تینوں افسر مارے دہشت کے کپکپا اٹھے۔ تب اس نے اپنے خشک ہوتے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری اور یوں مخاطب ہوا:
"تمھاری دہشت زدگی اور میری ست رنگی طبیعت کا منظر آج آخری بار اس خواب گاہ میں ابھر آیا ہے جس میں میرے اجداد کی تصویریں آویزاں ہیں۔۔۔۔۔۔ ہو سکے تو اس منظر کو اپنی آنکھوں میں قید کرلو۔۔۔۔۔۔ تاکہ یہ منظر۔۔۔۔۔۔" اس نے آہستگی سے پہلا قدم اٹھایا پھر کہا۔۔۔۔۔۔ "اس منظر کی حقیقت۔۔۔۔۔۔!!" یکایک اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔
پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا خواب گاہ سے نکل گیا۔

OoO

خالد سہیل (کینیڈا)

جزیرہ

کیا تمھارے والدین زندہ ہیں؟
ہاں۔
آخری دفعہ ان سے کب ملے تھے؟
دس سال پہلے۔
تمھارے بہن بھائی ہیں؟
ہاں۔
ان سے آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی؟
سات برس پیشتر۔
کہاں ملے تھے؟
راستے میں ملاقات ہو گئی تھی۔
کیا تمھارے دوست ہیں؟
کوئی نہیں۔
کیا تمھارا گھر ہے؟
نہیں۔
کہاں رہتے ہو؟
جہاں رات ٹھہر جائے۔
تمھاری آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟
کوئی نہیں۔
تو تم زندہ کیسے ہو؟
بس زندہ ہوں۔
تم کب سے اس طرح زندگی گزار رہے ہو؟
تقریباً بارہ برس سے۔
تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟
کچھ بھی نہیں۔
تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟
پتہ نہیں۔
کیا تمھارے لیے ویلفیر کا انتظام کروں؟
اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

"رہائش کا انتظام؟
اس کی بھی حاجت نہیں۔
تمھیں کھانے پینے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی؟
نہیں۔
کیا ہم کسی طریقے سے تمھاری مدد کر سکتے ہیں؟
نہیں، بہت بہت شکریہ۔
میری سوشل ورکر کے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔
اس شخص کو پولیس ہسپتال لے آئی تھی تاکہ اسے داخل کرلیا جائے کیوں کہ وہ بہت ناتواں اور کمزور تھا۔ گلیوں، اروں میں سوتا تھا بھوکا پیاسا رہتا تھا۔ چوں کہ سردی کا موسم آگیا تھا اس لیے پولیس پریشان تھی کہ کہیں وہ سردی سے لر مر نہ جائے۔
"ڈاکٹر صاحب اسے داخل کرلیں تاکہ اس کی صحت بہتر ہو سکے۔۔ پولیس مین نے مشورہ دیا۔
"کیا تم ہسپتال میں داخل ہونا چاہتے ہو؟"
"نہیں میں بیمار نہیں ہوں۔۔
میں ڈاکٹر ہو کر بھی بے بسی کے دریا میں ڈوب گیا۔
میری سوشل ورکر نے اس کے والدین کو اطلاع دی اور وہ اسے گھر لے گئے۔
دن کے بعد پولیس اسے دوبارہ لے آئی۔
ملہ پھر وہی تھا۔
اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے اس کی بہن کے پاس بھیج دیا۔
یہ حل بھی ایک ہفتے سے زیادہ کام نہ آسکا۔
پولیس کا اصرار تھا کہ اس شخص کا ذہنی توازن درست نہیں اس لیے اسے چند مہینوں کے لیے پاگل خانے داخل کرنا ہیے لیکن میں متفق نہیں تھا۔
میرے نزدیک مسئلہ اس کا نہیں تھا پولیس کا تھا جو شہر میں ایک ایسے شخص کو برداشت نہ کر سکتی تھی جو روایتی راز سے زندگی گزارنا نہ چاہتا تھا۔
اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے ایک بورڈنگ ہوم میں بھیجا۔ پولیس نے اسے تنبیہ کی کہ اگلی دفعہ اگر وہ شہر کی گلیوں یں سوتا ہوا پایا گیا تو اسے جیل میں بند کردیا جائے گا۔ وہ بے اعتنائی سے مسکرا دیا۔
ایک باپ بیٹا صبح کی سیر کرنے شہر کے باہر گئے تو بچے کو تالاب میں کچھ تیرتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے باپ کو بتایا تو ندازہ ہوا کہ وہ لاش تھی۔ ایمبولنس اس لاش کو لے کر آئی۔ میں لاش کو دیکھ رہا تھا اور پاس ہی وہ بچہ کبھی مجھے اور کبھی پنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرانی کے دیے ٹمٹما رہے تھے۔
"ابو۔
"جی بیٹا۔
"ابو میرے ٹیچر نے بتایا تھا کہ جس چیز کے چاروں طرف پانی ہو اور زمین سے تعلق نہ ہو وہ جزیرہ ہوتا ہے۔۔
"ہاں بیٹا۔
"تو یہ آدمی ایک جزیرہ تھا۔۔
وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے بیٹے کو آغوش میں اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)۔

نام کتاب: میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد مصنفہ: طیبہ بیگم
سائز: 1/8 ڈیمائی صفحات: 342 قیمت: 125.00 روپے
ملنے کا پتہ: ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

بلگرام ایک مردم خیز خطہ ہے۔یہاں کی سرزمین سے سید حسین بلگرامی (نواب عماد الدولہ، عماد الملک سی۔ایس۔آئی، ایل ایل۔ڈی) اور ڈاکٹر سید علی بلگرامی جیسے مایۂ ناز سپوت پیدا ہوئے۔نواب عماد الملک اور ان کے بھائی ڈاکٹر سید علی بلگرامی اپنی خاندانی شرافت، ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے باعث تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔دونوں کی علمی اور عملی سرگرمیاں ہندوستان سے باہر یورپ میں بھی خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔دونوں بزرگوں کے خاندان حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں اپنی روشن خیالی، تدبر و فراست کے ساتھ علم و عمل کے میدان میں اب تک سرگرم عمل ہیں اور اپنی خاندانی روایات پر قائم ہیں۔نواب عماد الملک کی صاحبزادی طیبہ بیگم بلگرامی وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے مدراس یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔وہ اردو کی ممتاز ادیبہ اور ناول نگار تھیں۔ان کی صاحبزادی سکینہ بیگم مرحومہ حیدرآباد کی ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ خواتین کی وہ معتمد اور ماہنامہ "سب رس" کی معزز رکن بھی رہیں۔اسی خانوادے کے چشم و چراغ طیبہ بیگم، سکینہ بیگم مرحومہ کی دختر نیک اختر ہیں۔

طیبہ بیگم حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی۔عثمانیہ یونیورسٹی سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ایک عرصے تک وہ پیشۂ تدریس سے وابستہ رہیں۔طیبہ بیگم نے اپنی زندگی میں کافی صعوبتیں برداشت کی ہیں مگر استقلال اور صبر سے وہ اپنی منزل پر گامزن ہیں۔وہ ایک با صلاحیت ادیبہ ہیں۔ان کی تخلیقات اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب بھی ان میں تلاش و جستجو کی لگن باقی ہے اور کچھ کر دکھانے کی تمنا بھی۔زندگی سے طیبہ بیگم نے ہار نہیں مانی ہے۔نامساعد حالات میں انھوں نے ایم۔اے (اردو) میں داخلہ لیا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام طلبہ و طالبات میں اپنی قابلیت کا سکہ بٹھادیا اور ایم۔اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔پوسٹ گریجویٹ کالج، بشیر باغ میں وہ میری شاگرد رہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اردو کی معروف ادیبہ اور افسانہ نگار طیبہ بیگم کی چوتھی تصنیف ہے۔میر عثمان علی خاں پر اردو میں چند کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر وہ مختصر اور تعارفی نوعیت کی ہیں۔ضرورت تھی کہ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے سلطان العلوم کی خدمات کا جائزہ لیا جائے۔طیبہ بیگم نے حتی الامکان واقعات کی چھان بین کی کوشش کی ہے۔مختلف ماخذوں سے استفادہ کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔دلائل کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ہے۔سلطان العلوم کے ذی مرتبت خاندان کے افراد اور ممتاز دانشوروں سے انٹرویو لے کر قیمتی مواد اکٹھا کیا ہے اور اس مواد کو سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

طیبہ بیگم کو حیدرآباد فرخندہ بنیاد اور نواب میر عثمان علی خان مرحوم سے گہری وابستگی اور عقیدت مندی ہے جس کا کتاب میں جگہ جگہ اظہار ہوا ہے۔پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی اس رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں "آصف سابع میر عثمان

لی خاں اوران کا عہد۔ اردو میں اپنے موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہے جس میں آصف سابع کی حیات اور شخصیت کے علاوہ ان کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نو ابواب ہیں "حرف اول"۔ کے عنوان سے طیبہ بیگم نے اس کتاب کی تصنیف کا مقصد بیان کیا ہے۔ عقیدت مندی سے سرشار، جذبات سے بھرپور یہ جملے ملاحظہ کیجیے۔ "آج میر عثمان علی خان یاد آتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ تیرگی میں کہیں چنگاریاں مچل گئی ہیں۔ کیوں نہ ان چنگاریوں کو شعلے بنا دیں۔ یادوں کے اپنے اوراق سے ان کے سیاہی چرالیں۔۔ (ص۔ ۲۱)

دوسرے باب میں سیاسی اور سماجی پس منظر دکھلایا گیا ہے۔ تیسرے باب میں آصف جاہی حکومت کی بنیاد کی تفصیل ہے جس میں عہد آصفی کے ادبی ماحول اور تعلیمی ترقیات اور اصلاحات کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ چوتھے باب میں آصفی پرچم۔ کے عنوان سے اس پرچم کی تاریخ اور اس کی رسمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں باب "حیدرآباد کا حوقف تاریخ ہند میں"۔ کے عنوان سے ہے جس میں طیبہ بیگم نے لکھا ہے:

"تاریخ ہند میں راجہ اشوک کا دور زرّین دور کہلاتا ہے۔ دوسرا زرّین دور مغلیہ سلطنت کے بادشاہ اکبر اعظم کا کہلاتا ہے تو تیسرا دور آصفیہ سلطنت کے تاجدار میر عثمان علی خاں کا کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ چھٹے باب میں میر عثمان علی خان کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ساتویں باب میں" میر عثمان علی خان کا شاہی نسب نامہ" دیا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں" میر عثمان علی خان، شخصیت، اخلاق و عادات کے بارے میں سیر حاصل مواد فراہم کیا گیا ہے۔ ۳۷ سال تک سلطان العلوم نے ریاست حیدرآباد پر حکومت کی۔ میر عثمان علی خان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ شاہوں کے شاہ تھے۔ اچھے سے اچھا لباس پہن سکتے تھے لیکن اس درویش صفت انسان نے بہت ہی معمولی لباس زیب تن کیا۔ ان کی غذا بھی بہت سادہ تھی۔ غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔

حصۂ دوم گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جس میں دورِ عثمانی کا نظم و نسق، علمی اور سماجی خدمات، اردو زبان اور آصف جاہی سلطنت، آصف جاہی سلاطین کی اردو نوازی کے نمونے، ادیبوں، شاعروں اور علمی، ادبی اداروں کی سرپرستی، عہدِ آصفی کا ادب اور خواتینِ دکن، آصفی دربار اور بابت حکومت سے وابستہ امرا، وزرا اور مشاہیر، حیدرآباد دکن کے تاریخی مقامات، میر عثمان علی خان آصف سابق کے عہد حکومت کی عمارتیں اور کلچر کی تفصیلات ملتی ہیں۔

یہ کتاب ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ گٹ اپ بہت اچھا ہے۔ جاذب نظر سرورق ہے۔ کتابت گوارا ہے۔ نادر تصاویر کے اضافے سے اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ طیبہ بیگم کی اس علمی کاوش کو یقیناً ارباب ذوق پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

(پروفیسر اکبر علی بیگ)

سلسلہ ص ۲۴

پڑھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب روسی زبان میں نہیں لکھی بلکہ اردو میں۔ اور یہ بات بھی بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ اگر ادارہ شعر و حکمت نے اس کتاب کی اشاعت کا بیڑہ نہ اٹھایا ہوتا تو اردو زبان کے شیدائی مخدوم پر ایک مستند اور مبسوط کتاب سے محروم رہتے۔ ایک ماہر ترجمہ نگار کو ڈھونڈ نکالنے اور سعی مسلسل کے بعد مکتبۂ شعر و حکمت کے وساطت سے اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا سہرا مغنی تبسم کے سر ہے جو قابلِ مبارکباد ہیں۔۔

***

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجرا: ۱۹۳۸ء

فون: 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۶ اگست ۱۹۹۴ء شمارہ: ۸

فی پرچہ	: ۷ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ	: ۳۰ ڈالر
زرِ سالانہ	: ۷۵ روپے	پاکستان، برما، سیلون	: ۱۵ رر
کتب خانوں سے	: ۱۰۰ روپے	انگلستان	: ۲ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۴۸۲۔ ۵

سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے بے انتخاب پریس عابد روڈ میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع کیا

اس شمارے میں

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: نتالیا پری گارنا

ترجمہ: اسامہ فاروقی

باب: ۴

سبکِ ہندی

قوتِ متخیلہ نے کلیتہً ان کے وجود کو اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ (براتینسکی)

انیس سال کی عمر میں اسد اللہ خاں نے اپنا پہلا دیوانِ اردو اور چوبیس سال کی عمر میں، سنہ ۱۸۲۱ء میں، دوسرا دیوا ردو مرتب کیا، جس کے بعد جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں اردو شاعری سے ان کا دل ہٹ گیا اور تیس سال کے دوران وہ بنیادی طور نارسی میں لکھتے رہے۔ تاہم چوبیس، پچیس سال کی عمر ہی میں پوشکن، گوئٹے اور بائرن اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ ان عظیم شاعروں کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ کیٹس نے چھبیس سال کی عمر میں وفات پائی اور لیر منتف ستائیس سال ، عمر میں مقتول ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی شعرا کے تخلیقی سوتے عموماً مدتِ دراز تک خشک نہیں ہوتے تھے اور مشرق یں ایسا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ شاعری تو صرف نوجوانوں کے نصیب میں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ وہ روایت رہی و جس کے مطابق ایک شاعر کے لیے طول طویل آموز گاری، مستند شاعروں کے کلام سے گہری واقفیت، اور مستند قابلِ تقلید کلام کے دفتر کے دفتر ازبر کرنا لازمی سمجھا جاتا تھا اور جس کے بغیر اسے اپنے ہم سروں کی حرفت گاہ میں ماہرِ فن سلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس باب میں ہم غالب کی بالکل ابتدائی شاعری کے بارے میں گفتگو جاری رکھیں گے، جب وہ اسد تخلص کرتے ہے۔ ان کا یہ آموز گاری کا دور ساتھ ہی ساتھ خود اپنی ذات کی تلاش کا دور بھی تھا۔

ایک مفہوم میں غالب کی ابتدائی زندگی کی شعری تخلیقات، اور مزید برآں شاعر کی طرزِ زندگی کی مذمت کی روایت الطاف ین حالی سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "یادگارِ غالب" میں شاعر کی جوانی کی حالت کے بارے میں خود اس کے الفاظ حوالہ دیتے ہیں:

"بافرو فرہنگ بے گانہ و با نام و ننگ دشمن، بافرو مایگاں ہم نشیں و با او باش ہم رنگ، پانے بے راہ پوئے و زباں بے صرفہ گوئے، در شکست خویش کردوں را دوست یار و دو آزارِ خویش دشمن را آموز گار۔ تیزیٔ رفتار من از مسجد و بت خانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و مے کدہ را بہ یک گرزہ۔"

(نیک نامی اور دولت میرے لیے اجنبی ہیں۔ اور میں خود نام و ننگ کا دشمن ہوں۔ فرومایہ لوگوں کا ہم نشین ہوں اور
باشوں کے ساتھ میرا یارانہ ہے۔ میرے پاؤں آوارہ گردی کے عادی ہیں اور زبان یاوہ گوئی کی خوگر۔ اپنے ہی سر پر مصیبت
ڈھانے میں چرخ ستم پیشہ کا میں مددگار ہوں اور دشمن کا صلاح کار۔ میری بھاگ دوڑ سے مسجد اور بت خانے سے گرد
اڑ رہی ہے اور خانقاہ و مے کدہ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں)۔ حالی اس کے بعد یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا نے
کپن اور جوانی کا زمانہ زندگی کے ایسے پہلوؤں کے مشاہدے میں گنوایا جن سے کسی بھی شائستہ انسان کو کوئی سروکار نہیں
ناچاہیے۔ حالی نے مرزا کی جن کوتاہیوں پر حرف گیری کی ہے ان میں "شمیان" اور "عرق تاک" کی دوسری اقسام کے تعلق
سے مرزا کے شوق اور مذہبی معاملات سے ان کی قابل افسوس بے پروائی کو کچھ کم اہمیت نہیں ہے۔ اور اگر اس "غفلت اور
مستی کے عالم" میں بھی انھوں نے شاعری کی طرف توجہ کی اور ایسی "بے خبری" کے زمانے میں بھی "شاعری کی تکمیل کا
یال" انھوں نے فراموش نہیں کیا تو یہ "صرف ان کی طبعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا"۔

مرزا کی صفائی میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حالی کے محاکمے کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی سخت ہوتے ہیں۔ حالی بلا مبالغہ غالب
کے پرستش کی حد تک معترف تھے اور اس کا ثبوت مرزا کی شہرت کو لازوال بنانے کی غرض سے اس جاں فشانی سے لکھی ہوئی
ن کی تصنیف سے ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایسے فرد تھے جس کا تعلق مرزا کے بعد کی پیڑھی سے تھا اور اس سے بھی
یادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کا نظریۂ حیات دوسرا تھا۔ عہد جدید کی اردو شاعری کا لیکھا جوکھا حالی سے شروع ہوتا ہے لیکن ان
میں اور مرزا میں فرق یہ ہے کہ حالی اپنی شاعری کو اعتدال پسند روشن خیالی کی کیاریوں میں پروان چڑھانے کے قائل تھے اور
ن کی شاعری وہ نہیں تھی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے

"کاش تم جانتے کہ کس خس و خاشاک میں بے جھجک شاعری اگتی اور پروان چڑھتی ہے"۔

مرزا کی ابتدائی شاعری پر بحث کرتے ہوئے حالی تصریح کرتے ہیں کہ ابتدا میں شاعری کی جو روش مرزا نے اختیار کی
ی وہ اردو شاعری کے ارتقا کی عام روش سے مختلف تھی۔ ارتقا کے اس رجحان کی نوعیت کیا تھی اور اس روش کی پیروی یا
س سے انحراف کا مطلب کیا تھا اس شاعری میں تقلید اور اجتہاد کے طریقے کیا ہیں؟

ہم غالب کی ابتدائی شاعری کے عہد مغلیہ کے متاخرین کی شاعری سے تعلق اور اس کے اتباع کی نشان دہی اوپر
چکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کے اس نظام میں دراصل کن حدود کے اندر اجتہاد اور جدت جائز ہے اور اس
کے حسن و قبح کا کیسے اندازہ لگایا جاتا ہے؟ اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں غالب کی ابتدائی شاعری اور فارسی اور اردو شاعری
کے تعلق باہمی کی وضاحت کرنی ہوگی۔ اردو شاعری، جس کی خطیبانہ طرز ادا اور شعریات حقیقی معنی میں فارسی شاعری کے بطن
سے نکلی ہیں، اور جو غالب کے عہد تک دولسانیت سے آزاد نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود اس کو فارسی شاعری کے تعلق سے
اس کے لیے مثالی حیثیت رکھتی تھی، خود مختاری کا احساس ہو چلا تھا۔ خورشید الاسلام کے الفاظ میں اس نے "آخر آخر
فارسی کا بوسیدہ لباس چاک کرکے اردو کی نئی قبا زیب تن کرلی"۔ لیکن اپنی خود مختاری کے اعلان کے باوجود اس نے تزئین
عبارت اور تشکیل شعر کے مستعار لیے ہوئے اصولوں کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ اردو شاعری کے ارتقا کی مختصر تاریخی مدت،
اصول شعر گوئی میں کسی بنیادی تبدیلی کے لیے یا ان سے قطع تعلق کرکے نئی پیکر تراشی کے راستے دریافت کرنے کے لیے
اکافی تھی۔ نوجوان غالب ان راستوں کی سرگرمی سے تلاش شروع کرتے ہیں۔

حالی لکھتے ہیں "خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے تو اول سے آخر تک قوم کی شاہ راہ سے سر مو انحراف نہیں کیا اور جس
چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی، اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہ راہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رخ
چلنا اختیار کیا، اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا، تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے

سودا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکال لی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔۔

لیکن اس سے بھی غالب مطمئن نہیں تھے۔ حالی اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "میر، سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں، وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامۂ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں۔ چناں چہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو، مرزا کے سوا، اہل زبان میں گزرے ہیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے، جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔۔ اس لیے حالی کو اعتراف ہے کہ اگر میر، سودا اور ان کے مقلدین کے کلام کا یکے بعد دیگرے مطالعہ کیا جائے تو "ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے۔۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کا فارسی درباری شاعری سے متاثر ہونا اور موخرالذکر کے مخصوص اسالیب کی دل کشی پر فریفتہ ہونا اور ان کا اثر قبول کرنا ناگزیر تھا۔ اور سب باتوں کے علاوہ ہر عہد میں شاعری کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے اور ان دنوں مغلیہ ہندوستان کے بااثر اونچے حلقوں میں سرزمین ہندوستان کی ساختہ پرداختہ فارسی شاعری کی طرف میلان خوش مذاقی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

بالآخر فارسی کلاسیکی شاعری یعنی رودکی، فردوسی، رومی، سعدی، حافظ اور جامی کا کلام بھی اس عہد کے تعلیم یافتہ مسلمان کی روحانی دنیا کا ایک جز تھا۔ اس ادب کے تمام اصناف میں غزل کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور غزل گوئی کی صلاحیت اور اس صنف سخن میں کمال کو شاعر کی عظمت اور میدان شاعری میں اس کے کارہائے نمایاں کا معیار تسلیم کیا جاتا تھا۔ غزل غنائی شاعری کے بنیادی رجحان کی حیثیت رکھتی تھی۔ حافظ کی تخلیقات، جن کو فارسی غزل کی معراج مانا جاتا ہے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں عہد متاخر کی غزل کے لیے ایک طرح سے نقطۂ آغاز کا درجہ رکھتی تھیں۔

غزل کی ساخت کے بارے میں، روسی زبان میں اس کے متعدد ترجموں کے پیش نظر، سبھی تعلیم یافتہ قاری کچھ کچھ واقفیت ضرور رکھتے ہوں گے۔ انھیں ترجموں اور تعارفی تحریروں سے انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ غزل کے روایتی موضوعات عشق، شراب اور حسن ہیں۔

غزل کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خاموشی سے پڑھے جانے سے کہیں زیادہ وہ ایک مخصوص لَے سے سنائے جانے کے لیے ہوتی ہے۔ اسے بہت بڑا نقص سمجھا جاتا ہے اگر دیوان میں دو مصرع ایسے بھی نہ ہوں جنھیں گنگنانے کو جی نہ چاہتا ہو۔

اور تہذیب انسانی کے ہر شاہ کار کی طرح غزل بھی ایک لحاظ سے معمّے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس امر پر، حافظ کی غزلوں کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے، فرانسیسی فاضل لزار نے بہت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہر شعر بہ جائے خود واضح ہے تاہم اس کے اطراف متلازم خیالات کا ہالہ ہم کو یہ گمان کرنے یا محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان کے پیچھے ایک پراسرار دنیا پوشیدہ ہے۔ مزید برآں غزل کو بہ حیثیت مجموعی پڑھ لینے کے بعد راز کی سی ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر شعر کے لفظی معنی سمجھ میں آجانے کے بعد بھی ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی بھی ہے جو شعور کی گرفت میں نہیں آتی اور یہ کہ شاعر کا مافی الضمیر لفظی معنی کی حدود کے پرے ہے، مختصر یہ کہ اشعار اشاری طرز میں لکھے گئے ہیں۔۔

اسی لیے حافظ کو بجا طور پر "لسان الغیب" یعنی ترجمان اسرار کا لقب دیا گیا تھا۔ تمثیلی زبان کی تہہ داری اور تلازمیت اسرار، اشارہ و کنایہ اور مجاز کا غزل کی لازمی خصوصیات میں شمار کیا جانے لگا۔ اگر شاعری کی حقیقت پسندی اور زندگی کی ط
اس کی پیش رفت کا انسان اور اس کے ماحول کے گوناگوں روابط کے ادراک کی حیثیت سے بیان یہ اصناف سخن میں غیر معتد

جا سکتا تھا جن کے ارتقا کا رخ انیسویں صدی عیسوی میں نئی نئی ظہور پذیر ہونے والی نثر سے صریحاً قربت کی طرف تھا تو
ل کے تعلق سے، رمز و کنایہ کا تقاضا برقرار تھا اور زندگی کے مصائب پر. شاعر کی فریاد یا عشق کے نفسانی پہلوؤں کے حد
سے زیادہ صاف گوئی کے ساتھ ذکر کی نقادوں کی طرف سے کڑی مذمت کی جاتی تھی۔

دریں حالے کہ یہ "سبکِ ہندی" کی غزل ہی ہے جس نے اس قسم کے اذکار کو روایت میں شامل کرنے کی کوشش
۔ شبلی لکھتے ہیں کہ غزل میں نتیجتاً فن کارانہ اظہار کی نئی اشکال معرض وجود میں آئیں۔ "حسینانِ بازار" سے عشق کو "واقعہ
وئی" میں شمار کیا جاتا اور اگر غزل میں موضوع مدح سرائی "معشوقۂ دل نواز" ہوتی تو اس سے منسوب اشعار کا وصف
تغزل" کہلاتا۔ تاہم دراصل یہاں شاعر کے حیاتی اظہار نفس کے تقاضے اصناف سخن کے نظام ضوابط و قواعد سے میل نہیں
کھاتے تھے، جس کا واضح ثبوت غزل کے تعلق سے، سب سے مقدم، حسن اور خوش آہنگی کا مطالبہ تھا۔ اس میں "روئی پانی"
کے موضوعات کو شامل کرنے کی کوششوں کی ہمیشہ مذمت کی جاتی تھی۔

لیکن وقت گزرتا گیا اور نظامِ شعر کے اندر رفتہ رفتہ ایسی تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کی وجہ سے اس کی کارکردگی میں بہ ظاہر
وئی "خلل" کبھی نہیں پڑتا تھا۔ ہم قدرے تفصیل سے ان جدتوں کا ذکر کریں گے جن کی نشان دہی شبلی نے اپنی تصنیف
"شعر العجم" میں کی ہے۔

ان جدتوں کا تعلق بیت کی ذیلی معنوی تنظیم سے ہے۔ شبلی "بیت" کی تین بنیادی اقسام کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۱) بیت جس میں معنی آفرینی، خیال بندی اور مضمون سازی کو غلبہ حاصل ہو۔
۲) بیت جس میں شاعرانہ تمثیل اور دلیل کا کام دینے والا مجازیہ استعمال کیا جائے یا بہ الفاظ دیگر تمثیل نگاری کی جائے۔
۳) بیت جس کی تعمیر مناسبت لفظی پر کی جائے۔

بیت کی پہلی قسم تجزیے کے لیے سب سے زیادہ پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے، کیوں کہ اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے
عناصر کا صحیح تعین بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان اصطلاحات کا بے قاعدہ استعمال ہے۔ اس لیے ٹھوس تجزیے کی
غرض سے یہاں ہم کوشش کریں گے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم کی مجمل طور ہی سے سہی وضاحت کریں۔ اس حلقہ
تصورات کے لیے کلیدی اہمیت لفظ "معنی" کو حاصل ہے۔ یہ عربی الاصل ہے اور عہد وسطیٰ کی شعریات کے ماہرین اسے
"خیال"، "مطلب"، "مفہوم"، "تصور" اور "خیالی تصویر" کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم اسے "خیال" اور "مدعا"
کے مفہوم میں استعمال کریں گے، ظاہر ہے کہ اس سے ہماری مراد خیالِ شاعرانہ اور مدعاء شاعرانہ ہوگی۔

موضوع، تصور، مضمون اور خیال ہمیشہ شاعری کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ "سبکِ ہندی" کی خصوصیت یہ تھی کہ اس
نے خیال کے ان ذہنی قالبوں کو بیت کے اسلوب ساز عامل کا رتبہ دے دیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب بس ایک ہے
بیت کی ایسی فنی تشکیل جس میں صرف ایک موضوع، ایک تصور یا ایک خیال شاعرانہ بیت کی ساری فضا پر حاوی ہو۔ لیکن اس
کے لیے موضوع، خیال اور فکر کو نشو و نما دینے کی ایک مخصوص تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بلاوجہ نہیں ہے کہ اس طرح
کے اسلوبیاتی مسائل کو معنی آفرینی، خیال بندی، مضمون سازی، خیال آرائی، مضمون آرائی وغیرہ جیسے نام دیے گئے ہیں۔
(یہاں [illegible] کی اصطلاح کا "عالم آفرینی" یعنی تکوین کائنات یا بہ الفاظ دیگر ارادہ خداوندی کی تجسیم سے مقابلہ دل چسپ
سے [illegible]

جب قالب "سبکِ ہندی" کی روایات کی تقلید کرتے ہیں تو وہ اپنے متقدمین سے میدانِ شعر میں مقابلے کا بیڑا
اٹھاتے ہیں اور جیسا کہ دستور کا تقاضا ہے ان کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان کا کلام قابلِ تقلید نمونے کے کلام سے سبقت

لے جانے۔ قابلِ تقلید نمونے کی تخلیق تو انھیں ڈھانچوں کی حدود میں ہوتی ہے، تاہم کسی نہ کسی پہلو سے شعر کو اصل سے بہتر ہونا چاہیے۔

اب ہم دیکھیں کہ غالب اس مسئلے سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ خورشید الاسلام نے اپنی تصنیف میں موازنے کے لیے اچھی خاصی تعداد میں مثالیں اکٹھا کر دی ہیں اور اہم بات یہ کہ اس امر کا تعین کر دیا ہے کہ زیرِ بحث شعر کا کس زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح سے انھوں نے ہمارا کام بڑی حد تک آسان کر دیا، کیوں کہ کسی کے لیے اپنے بوتے پر یہ فیصلہ کرنا کہ بیت میں کیا" باندھا" گیا ہے، مضمون سازی کی گئی ہے، خیال بندی کی گئی ہے یا پھر معنی آفرینی، خاص مہارت کی موجودگی میں گو کہ ناممکن نہیں، لیکن دیگر صورتوں کی طرح، یہاں بھی کسی طرح کے بندھے ٹکے اصول بالکل نہیں ہیں۔ مزید برآں مختلف مصنفین کبھی کبھی ایک ہی بیت کی خصوصیت کا تعین مختلف طرح سے کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں اپنے ایک ہم عصر کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں: "مرقع نگاری مبنی بر حقیقت ہے، زبان شستہ ہے، موضوع نیا ہے، خیالات شائستہ ہیں اور ادائیگیِ مضمون کا ڈھنگ لاجواب ہے۔" جب حالی غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ خیال اس بیت کے مضمون سے وسیع تر تھا اور غزل گوئی کے اصول کے مطابق مضمون کو ایک ہی بیت میں باندھنا ضروری ہوتا ہے۔ ساری غزل کے مضمون کا تعین بھی غزل کی پہلی بیت یعنی مطلع سے ہوتا ہے۔ تو آیئے سب سے زیادہ معیّنہ زمرے یعنی مضمون سے گفتگو کا آغاز کریں۔

مثال کے طور پر ماتم کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے شوکت لکھتے ہیں:

مگو کہ ماتمی نیست مرگِ مجنوں را
کہ ہست چشمِ غزالاں سیاہ پوش ہنوز

مضمون کو یہ شکل قصۂ لیلیٰ مجنوں کے اس واقعے کی بنیاد پر دی گئی ہے جس میں مجنوں صیاد کے بچھائے ہوئے جال سے غزالوں یعنی ہرنوں کو اس لیے چھڑاتا ہے کہ ان کی آنکھیں اسے لیلیٰ کی آنکھوں کی یاد دلاتی ہیں۔ مزید برآں "چشمِ غزال" سے عام طور سے، شرمیلی، جھینپنے اور کترانے والی حسینہ کی کالی سرمگیں آنکھوں کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں چشمِ غزال کو محض سیاہ نہیں بلکہ سیاہ پوش بتایا گیا ہے۔

غالب اس بیت کا شاعرانہ "جواب" یوں دیتے ہیں:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

یہاں دنیا سے گزر جانے والے عاشق کو بجھی ہوئی شمع سے تشبیہ دی گئی ہے اور دھویں کو شعلے کے لباسِ ماتمی سے مزید برآں سیہ پوشی نہ صرف شعلۂ شمع کشتہ نے اختیار کی ہے بلکہ شعلۂ عشق یا عشقِ شعلہ ساماں نے، جو اس واحد شخص پر ماتم کناں ہے جو جانتا تھا کہ سچا جوش محبت کس کو کہتے ہیں۔ یہاں غالب کے شعر میں شوکت کے مقابلے میں پیکرِ خیال بڑی حد تک الجھا ہوا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ پیچیدگی مضمون کو ترقی دینے اور اس میں شدت پیدا کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اگر پہلی صورت میں ماتم کہا کہ کالی آنکھوں کی قدرتی علامت ہے تو دوسری صورت میں ماتم کے مضمون کو نسبتاً غیر طبعی اور پیچیدہ انداز میں باندھا گیا ہے۔ یہاں بجھتی ہوئی شمع کا دھواں' ماتم کی اور شعلۂ عشق کی علامت ہے۔ غالب اسی طرح گھٹن یا تنگیِ کائنات کے اس مضمون کو بھی مزید پیچیدہ بناتے ہیں جس سے ہم بیدل کے کلام یا خود غالب کے تخلیق کردہ پیکرِ خیالی (گنبدِ آسماں، بیضۂ مور) کے وسیلے سے واقف ہیں:

تنگیِ رفیق رہ تھی ، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

مسرتوں کی تقسیم میں انتہائی بخل سے کام لینے والا اور مسافر کو "حرص و طمع سے مکڑی ہوئی۔ نظر سے بر ماننے والا یہ چرخِ کہن اسے نہ صرف یہ کہ ہستی بلکہ عدم میں بھی، چین سے سانس نہیں لینے دیتا۔ کٹھن شعر کے مرکزی کردار کے پورے نہ ہونے والے امکانات کی علامت اور ایک طرح سے وہ مقام بن جاتی ہے جس کی حدود میں اس کی زندگی کا سارا عمل آغاز سے انتہا تک پہنچتا ہے۔ تقدیر کے جبر سے جڑا ہوا "وجودیاتی کٹھن"۔ کا مضمون غالب کی ایک ایسی دل چسپ اور معنی خیز دریافت ہے، جسے انھوں نے اس تقدیر کو مرنیت عطا کر کے اور مجازی شکل دے کر بیدل کے مقابلے میں اور گہرا کر دیا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں غم عشق کے خیالی پیکر کی تعمیر معشوقہ کے ہاتھ میں پتھر کے مضمون پر کی گئی ہے۔
ناسخ لکھتے ہیں۔

اس پری نے جب اٹھایا سنگ مجھ دیوانے پر
آتشِ رنگ حنا سے صاف اخگر ہوگیا

بہ الفاظ دیگر پنجہ حنائی کا حسن پتھر کے ٹکڑے کو جو اس کی گرفت میں ہے عاشق کی اذیتوں میں اضافہ کرنے والی کچھ زاید خصوصیات عطا کرتا ہے۔ کہاں معمولی پتھر اور کہاں اخگر یعنی دہکتا ہوا انگارہ۔ موخرالذکر اپنے شکار کو نہ صرف زخمی کرے گا بلکہ اس کو جلائے گا بھی۔ غالب کے شعر میں اس مضمون کو دہرایا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اذیت کے راحت میں تبدیل ہو جانے کے اس تصور سے جو غالب کے لیے مخصوص ہے اس میں مزید گہرائی بھی آگئی ہے:

لگے گر سنگ سر پر، یار کے دستِ نگارین سے
بجائے زخم ، گل برگوشۂ دستار ہو پیدا

گلاب یا کوئی بھی دوسرا پھول، جس سے مشرق میں مرد اپنی دستار کو سجاتے ہیں، جشن اور مسرت کی علامت ہے۔ اگر معشوقۂ ستم پیشہ واقعی عاشق کو پتھر سے زخمی کرنے کے لیے آمادہ ہے تو یہ غیر معمولی مسرت کی بات ہے، کیوں کہ کنپٹی کا زخم گلاب کی یاد دلاتا رہے گا اور مسرت کے اظہار کے لیے مزید اہتمام کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے معشوقہ کے ہاتھوں عاشق کو شدید ترین اذیت ٹھیک اس صورت میں پہنچتی ہے جب کسی قسم کا لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے اس ستم پیشہ کے ذہن میں یہ خیال ہی بالکل نہیں ہوتا کہ اس نامراد کو کوئی اذیت پہنچائی جائے۔

یہاں یہ نشان دہی مناسب ہوگی کہ دونوں اشعار میں ایک ہی اصول کی پیروی کی گئی ہے جسے ہم "مضمونِ شاعرانہ کے ارتقا۔ کا نام دے سکتے ہیں جس کے ذریعے ہمارے خیال میں متذکرۂ صدر اصطلاحات "خیال بندی"، "تزئینِ عبارت"۔ اور "مرقع نگاری"۔ سبھی کو ایک رشتے میں بہ خوبی مربوط کیا جا سکتا ہے۔

اس تواتر کی داد دینی چاہیے جس کے ساتھ ایک شاعر کسی مضمون کو بڑی دیدہ ریزی سے باندھتا ہے اور اس کی شاعرانہ منطق کی پیروی کرتے ہوئے دوسرا شاعر اس میں اضافہ کرتا ہے اور، جیسا کہ اکثر غالب کے یہاں مشاہدے میں آتا ہے، اس کو غلط ثابت کرتا ہے۔

اس طریقۂ عمل کی خصوصیات میں سے ایک اس کی ہوا بستگی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہماری مراد مضمون کے امکانات پر اکتفا کرنے کے رجحان سے ہے۔ مثال کے طور سے "پنبہ"، یعنی روئی کا مضمون ہی لیں، جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔

اے خوشا وقتے کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے

خم یعنی مٹی سے بنے ہوئے شراب کے بڑے بڑے گھڑوں یا کوزوں کی مہر توڑ کر جام بھرے جاتے ہیں اور پھر ان
، منہ پر روئی کی ڈاٹ لگائی جاتی ہے۔ بے تکلف محفل میں مہمان شراب کے اتنے جام چڑھا جاتے ہیں کہ ان کی روئی کی ڈاٹیں
اکٹھا کی جائیں تو اتنی ہوں گی کہ ان سے ایسا اچھا خاصہ بڑا قالین بن سکتا ہے جس پر ان سبھی بلانوشوں کو بٹھایا جا سکے۔

اس ایک مضمون سے جو متقدمین شعرا میں خیام کے پاس بھی ملتا ہے زیادہ سے زیادہ ضمنی خیالی پیکر اخذ کیے
تے ہیں اور یہ مضامین ایسا لگتا ہے کہ شاعرانہ منطق کی مشروطیت کی بدولت ایک دوسرے سے برآمد ہوتے ہیں۔ مذکورہ
شعر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی توقع سے بھی آگے نکل جانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حالی کے ولولے کی
روی کرتے ہوئے شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کو یہ کامیابی محض ایک "روئی کے پھے۔" سے متعدد روشن خیالی تصویروں کو
بن لینے۔ سے حاصل ہوئی ہے۔

جیسا کہ شوکت اور غالب کے اشعار میں خود سر حسینہ کی مثال سے واضح ہے ایک ہی مضمون مختلف مناظر کے ذریعے
بن کیا جا سکتا ہے:

بونے طلب نمودم و کردی نگاہ تلخ
امیدہا کہ از تو دلم داشت بیم شد
(شوکت)

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
ہنس کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
(غالب)

دونوں اشعار میں ایک ہی صورت حال کا ذکر ہے۔ محبوبۂ خود سر کے حضور میں کیے ہوئے شکووں اور شکایتوں اور
رض تمنا کا نتیجہ عاشق کے حق میں الٹا ہی نکلتا ہے۔ غالب کے یہاں مضمون ایک مختصر سے ڈرامائی منظر کی شکل اختیار
رتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ شعر کا مرکزی کردار اپنے سوا "بزم ناز۔" کے تمام حاضرین کو اپنی معشوقہ کے تعلق سے اغیار
یں شمار کرتا ہے جب کہ وہ ستم پیشہ صرف اسی کو غیر سمجھتی ہے اور چناں چہ محفل سے اٹھا دیتی ہے۔ "تکرّم باز۔" کے اترے
ہوئے چہرے کا تصور کر کے مسکرائے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس دفعہ غالب کے ہاں مضمون کا ایک نیا پہلو مزاحیہ عنصر اور
صورت حال کی طرفگی کے احساس کا مرہون منت ہے۔

خورشید الاسلام بجا طور سے ان مضامین کو "طنز۔" اور "شوخ مزاجی۔" کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ بالعموم
ظرافت کا ذوق جو غالب کی فطرت میں داخل ہے طنز میں مبدل ہو کر ان کے تمام خیالی پیکروں میں ایک نئی روح پھونک
دیتا ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ غالب کے مضامین میر کے مقابلے میں زیادہ انوکھے ہیں۔

اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ غنی کاشمیری پہلے ہی کہہ چکے ہیں:

از بس کہ شعر گفتن شد مبتذل دریں عہد
لب بستن است اکنوں مضمون تازہ بستن

غالب کہتے ہیں:

اسد! اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

" خیال بندی" کی صورت میں یہی طریق کار اپنایا جاتا ہے۔ خیال کے لفظی معنی ہیں قوّت واہمہ، تصور، ذہنی شب
دائرہ ہے جس میں ہم کو " سبک ہندی" کے تعلق سے عموماً پائے جانے والے اس خیال کی بنیاد مل جاتی ہے کہ
مخصوص فلسفیانہ نظام یا فلسفیانہ شاعری ہے۔ شعر میں گویا کہ خود مکتفی مفہوم پا جانے والا خیال شاعرانہ اور قوت وا
دراصل معتذکرۂ صدر ہوا بستگی کا نتیجہ ہے) حقیقت کے تعلق سے دو طرح کے رویّوں کا محرک ہو سکتا تھا۔ وہ خا
تاثرات کو مادّی شکل دینے کے کام آ سکتا تھا۔ خیال بندی کی اس صورت کے بارے میں خورشید الاسلام لکھتے ہیں
میں ایسا ہو سکتا ہے کہ " شاعر خارجی صداقت سے آزاد ہو کر اور اپنی زود حسی کو اس کا بدل قرار دے کر ذاتی اور عارضی
میں گم ہو جائے ۔۔ ایسی صورت میں وہ اپنے محدود جذباتی تجربے کو وجود کے معروضی قانون کے مساوی قرار دیتا۔
اس کی تخلیق پر موضوعیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

جیسا کہ خورشید الاسلام لکھتے ہیں خیال بندی کی دوسری صورت یہ ہے کہ شاعر اپنی ذہنی پختگی کا مظاہرہ کرے۔
اپنے کلام کی تصوریت میں شدت پیدا کرے، جب کہ شاعر فلسفیانہ غور و فکر کا سہارا لے کر ذاتی تجربے کی سطح سے ا
ہے اور اس طرح سے زندگی کی صورت گری کو ایک نئی سطح، وجود کی باضابطگیوں کے اظہار کی سطح تک پہنچا دیتا ہے۔

انھیں محقق کی رائے ہے کہ غنی، ناصر علی اور اس عہد کے دیگر شعرا کے یہاں اور غالب کے ابتدائی تجر
طریقہ عمل موضوعی یعنی داخلی ہے، کیوں کہ اس داخلیت کے نتیجے میں ان شعرا کو خود ان کی کوششوں یا ان کی تر
اوروں کے ذریعے زندگی میں بہتری کے امکانات نہیں دکھائی دیتے۔ آگے وہ لکھتے ہیں کہ " سبک ہندی" کے صرف ا
بیدل کو اس پابندی سے آزاد ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ غالب اس وقت تک جب انھوں نے بنیادی طور سے فارسی میں شاعری اختیار کی بیدا
سے آزاد ہو چکے تھے۔ اس وقت تک، یعنی ۱۸۲۰ء کی دہائی کے آغاز تک انھوں نے " پرداداؤں کی تقلید سے کنارہ کشی ا
تھی اور " نگڑ داداؤں" یعنی ابتدائی مغلیہ عہد کے فارسی گو شعرا کے کلام میں خیالی پیکروں اور تصورات کا ایک جہا
کرلیا تھا اور واقعی اگر غالب کے ابتدائی دور کے اردو قلمی نسخوں میں بیدل کی تقلید میں کہے گئے مختلف اشعار، ان
اور ان کی ہم نوائی میں کہے گئے کلام کے علاوہ بیدل کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے تو غالب کے کلیات فارسی میں بیدل
اتنی بار آیا ہے کہ شاید اس کی گنتی انگلیوں پر کی جا سکے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک جب کہ انھوں نے طرز بیدل کی
کنارہ کشی اختیار کی، متعدد محققین، اور خاص طور سے غالب کی فارسی شاعری کے بارے میں علمی تصنیف کے موا
کرمانی کی رائے میں، غالب " عملی طور سے بیدل کے کلام کے خیالات اور روح کو کلیتاً اپنے میں جذب کر چکے تھے
کرمانی آگے لکھتے ہیں: " نفسیات کا اصول ہے کہ جو کچھ انسان عنفوان شباب میں سیکھتا ہے وہ اس کے شعور
ہو جاتا ہے۔ غالب نے بیدل سے گہرا استفادہ اپنی نوجوانی کے ٹھیک اس دور میں کیا جب وہ بہ حیثیت شاعر تشکیل
مرحلے سے گزر رہے تھے۔ یہ کیسے فرض کرلیا جائے کہ انھوں نے بیدل سے بالکل قطع تعلق کرلیا اور اپنا اسلوب یک
دیا۱۴ اس کے لیے شہادت ناکافی ہے۔ اس کے برعکس، ان خصوصیات کے علاوہ، جو ابتدائی مغلیہ عہد کی فارسی
غالب کو ورثے میں ملیں، ان کے کلام میں سنجیدگی اور غور و فکر کا وہ عنصر سلامت ہے، جو انھیں بیدل سے حاصل
وہ ان استعاروں اور پیچیدہ خیالی پیکروں میں سراسر ڈوبے ہوئے ہیں جو صرف اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز تک
مروج تھے اور جنھیں اس سے پیش تر دور کے شعرا سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اجمالی طور سے ہم یہ نتیجہ نکال

ے کے تصوف کا جو بلاشبہ رسمی ہے، ان کے فلسفیانہ تجسس اور ان کی انسان دوستی کا سر چشمہ بیدل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے غالب کی ابتدائی شاعری میں بھی غلبہ "موضوعی۔ یا داخلی قوت متخیلہ یا پرواز خیال کو
ل نہیں ہے۔ یہ حکم صرف ان کے بالکل ابتدائی یا حد درجہ روایتی خیالی پیکروں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کائنات کا موضوعی
حد درجہ قنوطی اور قریب قریب بھیانک نظریہ حیات کو جنم دیتا ہے اور انھیں صورتوں میں شعرا اکثر صوفیانہ طرز فکر
تے ہیں۔

چناں چہ فراق کا مضمون ہمیشہ متصوفانہ رنگ کا حامل رہا ہے، کیوں کہ انسان "ازل ہی میں اپنے خالق سے جدا کر دیا
ور شاعر کے تمام باطنی تاثرات کا ایک بڑا حصہ اس جدائی میں بیتنے والے مصائب کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لیے
باعث تعجب نہیں ہے کہ ہجر کی توصیف کے لیے ایسے خیالی پیکر تلاش کیے جاتے ہیں جو اس کے سارے المیے کو
ر سکیں:

ہجر میں ساغر سے آئی مجھ کو ساقی بوئے خوں
بادہ کھنچوایا ہے شاید زخم کے انگور کا!
(ناسخ)

کائنات کا حسن، رنگوں کی چمک دمک اور دھوپ چھاؤں کی اٹکھیلیاں اگر سخت سے سخت دل کو بھی متاثر کیے بغی
رہتیں تو شاعر کے دل کا کیا پوچھنا، جس کے لیے حسن، جوش اور امنگ کا سر چشمہ ہے، چاہے وہ شعوری ہو یا وجدانی!

لیکن ایک زندہ دل نوجوان سے بھی روایت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس جہان سے اپنی بیزارگی کی مختلف علامات، اور
طرح سے بھانت بھانت کی رنگا رنگی کے پیچھے اس کی نگاہ پیش بیں کو دکھائی دینے والی سرزان اور موت کا تذکرہ کرے:

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

بادی النظر میں تو لگتا ہے کہ طوطیِ بسمل کی جاں کنی کی کیفیت اور فطرت، جہان اور حیرت کدے یعنی اس مقدس
ت گاہ میں، جہاں حسن کے حضور میں بہ صد احترام اظہار عقیدت کیا جاتا ہے دور کی بھی مناسبت نہیں ہے۔ غالب کی
ب ہندی۔ کی شاعری میں "طوطی اور آئینے۔ کا مضمون مختلف مفاہیم رکھتا ہے۔ سب سے پہلے یہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ
سے مراد یہ جہان ہے۔ مزید برآں جب طوطے کو بولنا سکھاتے ہیں تو اسے آئینے کے سامنے بٹھاتے ہیں تاکہ وہ اپنے عکس
" باتیں کرے۔۔ شاعر کو اکثر طوطی خوش بیاں سے تشبیہ دیتے ہیں: کائنات کے حسن کے اظہار سے معذوری کے سبب شعر
طوطیِ بسمل کو جاں کنی کی اذیت میں تڑپتا ہوا بتایا گیا ہے۔

قسمت اور انسان کی کوششوں کی لاحاصلی کے خیالی پیکر کو غالب اپنے شعر میں فنا کے تعلق سے بقا کے "زہر خند۔ کے
ون کے ذریعے خاص گہرائی عطا کرتے ہیں۔

خاک بازیِ امید کارخانہ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بہ خندہ وا پایا

وہ اشعار بھی جن میں خیال شاعرانہ فلسفیانہ مواد سے عاری ہو "خیال بندی۔ کی صنعت میں لکھے گئے اشعار کے
ے میں آتے ہیں۔ ناسخ کے یہاں تمام عاشقوں کو پیام موت دینے والی حسن کی قاتلانہ طاقت کا پیکر خیالی اسی طرح کا ہے:

لگا دے شعلۂ عارض سے گر وہ آگ گلشن کو
کباب و سیخ سمجھیں بلبل و شاخِ نشیمن کو

غالب یہاں بھی اپنی نکتہ سنجی سے نمونے کے شعر سے سبقت لے جاتے ہیں، ان کے خیال شاعرانہ کی پرواز کچھ ایسا گل کھلاتی ہے جو آپ کے اور ہمارے گمان کے باہر ہے:

چمن میں کون ہے طرز آفرین شیوۂ عشق
کہ گل ہے بلبل رنگین و بیضہ شبنم ہے

تاہم مرزا کے بالکل ابتدائی تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرانہ فلسفہ طرازی کے چوکھٹے میں وہ اس وقت بھی موضوعیت کی بندشوں سے آزاد ہو رہے تھے۔

چنانچہ شوکت، سمندر، کیڑے کا موازنہ، جو عوام کے اعتقاد کے مطابق آگ میں نہیں جلتا، عشاق "آتش قبا" سے کرتے ہیں۔

سمندر طینتاں را پشت گرم از سوختن باشد
رگ برق است تار پیرہن آتش قبایاں را

اس "زر تشتی" مضمون اور غالب کی قوت متخیلہ کے لمس سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چنگاری کی طرح یہ شعر برآمد ہوتا ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

زندگی چند روزہ ہے اور یہ جہان جس کی حدود میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس گھر کی طرح غم و اندوہ سے پر اور تاریک ہے جہاں مرنے والوں کا ماتم کیا جا رہا ہو لیکن اگر تاریکی کو دور کرنے والی ایک شمع کو بھی حرارت قلبی سے زندگی مل جائے تو پھر زندگی بے کار بسر نہیں ہوتی۔ نوجوان غالب یہاں انسانیت پسندانہ نظریۂ حیات کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔

حالی کا کہنا ہے کہ خیال بندی کا طرز بلاشبہ شاعری کے ارتقا میں واقعی انقلاب برپا کرنے والا ایک نیا قدم تھا۔ لیکن فارسی شاعری کی تاریخ میں اس انقلاب کو آنے میں کم و بیش چار سو سال لگے تھے جب کہ اردو شاعری میں یہ انقلاب ایک پیڑھی کی مدت حیات کے اندر اندر ہی پیدا ہو گیا۔ حالی کا خیال ہے کہ اردو غزل کی بنیاد فارسی غزل پر ہے۔ اردو شعرا نے غزل کو اپنی مادری زبان کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے فارسی شاعری کی تمام کامیابیوں سے استفادہ کیا۔ فارسی گو متقدمین کے ہاں غزل غنائی جذبات کے اظہار کے لیے مختص تھی اور ان حدود سے متجاوز نہیں ہوتی تھی۔ اردو شعرا کے پاس بھی غزل کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت اس کا حسن اور نفاست تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ فطری سادگی کی حدود سے متجاوز نہیں ہوتا تھا۔ لیکن چوں کہ خیالات شاعرانہ کا حلقہ محدود تھا رفتہ رفتہ یہ سادہ، لطیف اور بلیغ اسلوب روبہ زوال ہو گیا اور کچھ عرصے بعد "متاخرین کے لیے ایک بچوڑی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ سادہ اور فطری اسلوب کی جگہ ادب میں اولیت الفاظ اور خیالی پیکروں کے پر تصنع استعمال کو حاصل ہو گئی۔ حالی کا خیال ہے کہ اس نئی طرز کو اول غالب نے اور انھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، عارف اور داغ نے رواج دیا۔

اس میں شک نہیں کہ متقدمین کی شاعری کے "سادہ اور فطری اسلوب" کے بارے میں حالی کی رائے میں بڑی حد تک مبالغے کا عنصر بھی شامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری کے نظریہ سازوں کی تصانیف میں "سہل ممتنع" کو ہمیشہ جمالیاتی نصب العین کی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم بدلتے ہوئے ذوق سخن سے مجبور ہو کر نقاد بسا اوقات اس خصوصیت کا انطباق ایسی شاعری پر بھی کرتے تھے جس میں سادگی نام کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ مختلف ادوار میں "سادگی" کی اصطلاح کا مفہوم بھی بدلتا رہتا تھا۔ یہ عہد وسطیٰ کی شاعری کی پیچیدگی سے سادگی کی طرف، پھر دشوار پسندی کی جانب اور اس کے بعد از سر نو سادگی کی

ی کی طرف ارتقا کا نتیجہ تھا۔ اوپر ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ غالب کے اسلوب کی "سادگی" کا کیا مفہوم ہے اور واقعۃً اس میں کتنی پیچیدگی ہے۔

لیکن یہاں ہم اشعار کی ان اقسام کی طرف رجوع کریں گے جن کی ساخت "سبک ہندی" کے رواج سے مربوط ہے۔ رانہ استدلال" کے حامل شعر کو دو ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے مصرع میں دعویٰ پیش کیا جاتا ہے، اصول بیان کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں اصول کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے دلیل دی جاتی ہے۔ استدلال کو بہ ظاہر مہمل یعنی الی ہونا چاہیے کیوں کہ شعر کی منطق بہرحال شاعرانہ ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ مشہور شعر ساخت کے اعتبار سے بیدل کا تتبع یا یوں کہیے بیدل کا ترجمہ ہے۔ حالی اس شعر کے بارے میں لکھتے بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ں آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے، جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔"

اس طرح کی شاعرانہ منطق کے لیے خیالات کا ایسا سلسلہ درکار ہوتا ہے جو اصول کو دو طرفگی عطا کرے اور طنزیہ سے کام لینے کا موقع فراہم کرے، بہ الفاظ دیگر اس طرز شعر گوئی میں شاعر کے لیے مضمون شعر کو پیچیدہ بنانے کے امکانات فراہم ہو جاتے ہیں۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

حالی اس شعر کی منطق کی تشریح یوں کرتے ہیں: "اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے، جو بالکل اچھوتی ہے۔ شاعر یہ واست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور درپردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ کا حساب کیوں کر دوں! وہ شمار میں اسی قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں، تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں ار میں اسی کثرت سے ہیں، جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں نے سے مراد یہ رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ رت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا، اور وصل میسر آیا تو شراب نہ پی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں، داغ دل پر کھائے ہیں۔"

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

س شعر کے بارے میں حالی لکھتے ہیں: "ایک ٹھیٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دست یاب ہو جانا ں ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ ملنا آسان نہ ہوتا، یعنی دشوار ہوتا، تو کچھ دقت نہ تھی کیوں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے تے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں، اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے نجات نہیں ہوتی۔"

یان "متناسب" الفاظ اور محاوروں سے مراد شعر میں "آسان"، "سہل" اور "دشوار" کا نفی اور اثبات میں استعمال ہے۔

ہم نے حالی کی اس تشریح کا حوالہ پھر ایک بار اس امر کی اہمیت ذہن نشین کروانے کے لیے دیا ہے کہ تلازمات سلسلہ خود بھی کتنا پیچیدہ ہے جس کے ذریعے کلیتہً مترادفات اور اضداد پر مشتمل ایک قول کی ایسی تشریح تک پہنچنا ممکن ہے۔ دوسرے موقعوں پر شاعر متناسب الفاظ اور محاورات تک اور بھی پیچیدہ طریقوں سے پہنچتا ہے۔

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بے تاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
گرمیٔ برقِ تپش سے زہرۂ دل آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں
شوخیٔ بارش سے مہ فوّارۂ سیلاب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسد
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

عموماً غزل میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی موضوع کو برتنے کا رواج نہیں ہے۔ محولہ بالا غزل ابتدائی دور میں اس صنف سخن کی ایک خاصی نادر مثال ہے، جس میں ہجر میں گزاری ہوئی ایک شب تار برشگال کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہاں غزل کا وہ متن پیش کیا گیا ہے جو دیوان عرشی (گنجینہ معانی) میں ملتا ہے۔ غزل کا دوسرا شعر توجہ کا مستحق ہے۔ اس کی لفظیات میں حسب ذیل سلسلہ ہائے الفاظ کی نشان دہی کی جا سکتی ہے: گرمی، تپش، برق، آب، حلقہ، شعلۂ جوالہ، گرداب۔ ان میں سے گرمی، تپش، برق اور شعلہ جوالہ اپنی "آتش مزاجی" کی بنا پر، "آب" اور گرداب۔ پانی سے تعلق کی بنیاد پر اور بالآخر "حلقہ" اور "گرداب" گولائی سے مناسبت کی وجہ سے الگ الگ زمروں میں آتے ہیں۔ شعر کے پہلے مصرع میں "زہرہ آب ہونے" محاورہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب "خوف" ہوتا ہے، اس کے علاوہ "آب ہونے" کا مطلب "پگھلنا" بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے "آبی" اور "آتشی" دونوں سلسلہ ہائے الفاظ میں ربط قائم ہو جاتا ہے۔ طوفان برق و باراں کی لفظی تصویر، جو گرداب کو ہوا میں آتشیں حلقے بناتے ہوئے بھڑکتے ہوئے جوالہ کی یاد دلانے والے حلقۂ آتشیں میں تبدیل کر دیتا ہے، معنوی اعتبار سے یک ساں اور مربوط مفاہیم کے کامیاب انتخاب کی مدد سے کھینچی گئی ہے۔

اس غزل کا شمار غالب کے اس کلام میں ہے جسے انھوں نے بعد میں اچھے خاصے اضافے اور بعض اشعار میں ترمیم کے ساتھ اپنے "دیوان" میں شامل کیا۔ چناں چہ غزل کے پہلے شعر کو بھی انھوں نے تبدیل کیا۔ پختہ عمر میں شاعر کو پہلا مصرع اور اس کی کم زور اور غیر واضح مناسبت لفظی جچی نہیں۔ شعر کی پہلی شکل میں زہرۂ دل "گرمی برق تپش" کی وجہ سے پگھل کر پانی ہو گیا تھا، پیکر خیالی زیادہ واضح نہیں تھا، "گرمی" بہ ظاہر ضرورت سے زیادہ تھی۔ شعر کی دوسری شکل میں یہ خامی دور ہو گئی:

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا

ان تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہے؟ یہاں امر واقعہ کی ظہور پذیری کے وقت کا تعین کر دیا گیا ہے جو پہلے صرف اس سے قبل کے شعر سے معلوم ہو سکتا تھا۔ اس طرح کی اطلاع کے لیے شعر کی حدود کے باہر جانے کی ضرورت کو کلام کا نقص سمجھا جاتا ہے۔ جب اس امر کا تعین ہو گیا کہ واقعہ دورانِ شب پیش آتا ہے تو نتیجتاً شعلۂ جوالہ اور رات کے طوفان برق و باراں کی خیالی تصویروں میں جان پڑ جاتی ہے۔ "گرمیٔ برقِ تپش" جیسی بعید از فہم ترکیب الفاظ کی بجائے ترمیم شدہ شعر میں برق راست دلِ سوزاں سے گرتی ہے اور یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ "سوزِ دل" کا مطلب غم و اندوہ بھی ہوتا ہے اور بالآخر تبدیل شدہ مصرع

، میں آب نہیں ہوتا۔ یہاں مضمون میں کھینچ تان کچھ زیادہ ہی تھی، بلکہ یہ امر شاعرانہ منطق کے خلاف ہی تھا،
ے کی جگہ دل نہیں جگر ہے۔ یہاں تھوڑی سی باریکی بھی ہے۔ لفظ "جگر" کے معنی جان و دل دونوں ہوتے ہیں،
۔ جگر کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوتا۔ ترمیم شدہ مصرع میں ابر کا جگر یعنی زہرۂ آب ہوتا ہے۔ شب، ابر، برق،
کے وقت دل میں برپا ہونے والے طوفان باد و باراں کی تصویر کو زیادہ فطری رنگ دینے والا نیا سلسلۂ الفاظ ہے،
اس لیے کہ یہاں ایک اور سلسلۂ الفاظ بھی موجود ہے، یعنی دل، سوز (غم و اندوہ)، اشک (آب) اور آنکھوں کے
حوالہ۔ اوپر "زہرہ آب ہونے" کا مفہوم ہم نے "خوف" بتایا ہے، چناں چہ یہاں رات کے طوفانِ باد و باراں سے
الے خوف کے موضوع کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہاں بہتر مناسبت لفظی، خیالی تصویر کو اور زیادہ فطری
تی ہے۔

مانده اشعار* کا بھی اسی طرح سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ مناسبت لفظی کی رعایت صریحاً غزل کے مقطع میں بھی
۔ (نغمہ، ساز، عشرت، مضراب، تار، نفس، ناخن غم)۔ موسیقی سے تعلق رکھنے والا سلسلۂ الفاظ خاصہ واضح ہے۔
تہائے قلبی" سے متعلق سلسلۂ الفاظ کی تعمیر اس ناخنِ غم کے پیکر خیالی پر رکھی گئی ہے جو تارِ نفس کو مرتعش کرتا
صل شعر کے مرکزی کردار کے الم ناک خیالات کی علامت ہے۔ حالی بجا طور پر غالب کی تمام ابتدائی شاعری کو
مام دیتے ہیں۔

۔ اردو شاعری کے ارتقائی شارعِ عام کے برخلاف رخ پر سفر بارور ثابت نہ ہوا تو بہ قول حالی، مرزا کو اپنا رخ بدلنا پڑا
ے پر قافلہ جا رہا تھا انھوں نے اس کے سوا ایک اور لیک اپنے لیے نکالی۔ دوسرے شاعروں کی تقلید ترک کر کے
اپنا منفرد طرز اظہار تلاش کر لیا۔ حالی لکھتے ہیں: "اور اگر دوسرے شعرا کے کلام کے بعد مرزا کے دیوان پر
، تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک
ہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی
ہے۔۔

ڈاکٹر احمد محی الدین

خود گزشت

ابتدا

میں ۱۹۱۵ء (۱۳۳۳ھ) میں پیدا ہوا، ایک دیہاتی خاندان میں، گو اتفاقاً وہ خاندان شہر حیدرآباد میں مقیم تھا۔ خاندان کا تعلق تلنگانہ کے علاقہ سے تھا اور مختلف وجوہات کی بنا پر اس کی معاشی حالت زوال پر تھی۔ ایسے خاندانوں کو ریاست حیدرآباد کے خوش حال طبقوں سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ خوش حال طبقے میں تین گروہ تھے۔ ایک گروہ جاگیر داروں اور بڑے زمین داروں کا تھا۔ جاگیر داروں میں مسلمان زیادہ اور ہندو کم تھے۔ بڑے زمین داروں میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس طبقے میں ایک ممتاز گروہ ساہوکاروں کا تھا جو تقریباً سب ہی مارواڑی ہندو تھے۔ مسلمان جاگیر دار خصوصاً ان کے قرض دار تھے۔ تجارت بھی ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ سرکاری ملازمتوں میں مقامی مسلمان اور ہندو ادنیٰ مقام پر تھے۔ بااثر مقام شمالی ہند کے محدودے چند مسلمان خاندانوں کو حاصل تھا۔ میرے خاندان میں، عام دیہاتی مسلمانوں کی روایت میں "نوکری چاکری" کا دخل صرف والد اور چچا کے دور سے ہوگیا تھا۔ اس سے قبل چند نسلیں معمولی تجارت سے گزر بسر کرتی تھیں۔ یہ نوکریاں بھی ایسی تھیں کہ زمین کا محصول سرکار کے لیے جمع کرنے کے لیے ایک خاص "حلقے" میں ہر ماہ پچیس دن دورہ کرنا پڑتا تھا۔ اس مسلسل سفر کے لیے سواری یا تو ٹٹو تھا (جیسے تانگے کا گھوڑا) یا بیل گاڑی جسے بنڈی کہتے تھے، یا اگر ذرا ہموار فرش کی ہو تو کھاچر۔ میری بچپن کی یادوں میں ایسے ہی سفر، اور کہیں کہیں پڑاؤ اب بھی تازہ ہیں۔ ہر تالاب کو سمندر، نالے کو دریا اور سور کو ہاتھی سمجھنا ۴-۵ برس کی عمر کے بچے کے لیے قدرتی بات ہے۔ مٹی کی دیواروں کے گھر اور بوسیدہ دروازے کے اس پار بور بچہ (تیندوہ) کا قر قر کرنا بھی اب تک کانوں میں گونجتا ہے۔ پانچ سال کی عمر کے بعد جب کبھی شہر حیدرآباد اور کبھی گاؤں میں رہائش ہوتی تو بھی مدرسے کی گرمائی طویل تعطیل کے دوران میں والد کے ساتھ دیہات کے دورے پر نکل جایا کرتا تھا۔ وہ تو اپنے کام میں لگے رہتے اور میں گاؤں کے اطراف کے علاقے میں گھومتا رہتا دکن کے تلنگانہ علاقے میں گھنے جنگل محدود رقبوں میں تھے۔ زراعتی دیہات میں جھاڑیاں تھیں، اور چھوٹی پہاڑیاں بھی لیکن بیشتر زمین پر اوسط جسامت کے پودے اور گھاس اگی ہوتی تھی۔ اور ان پودوں میں جنگلی پھل ہر موسم میں مل جاتے اس لیے گھومتے وقت بھوک پیاس کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ یہ گھومنا ننگے پیر تھا۔ کانٹا چبھے تو چپل سینڈ (ناگ پھنی) کے کانٹے سے کھود کر نکال لیا جا سکتا۔ خود چپل سینڈ کے گدرے پھل کے مغز کو بھی اسی کے کانٹے کے ذریعہ نکال لیا جاتا۔ اس پھل کے رس میں بھوک اور پیاس دونوں کا مداوا تھا۔ سردیوں میں سیتا پھل (شریفہ) کہیں نہ کہیں موجود ہی رہا کرتا۔ لیکن بعض علاقوں، خصوصاً حیدرآباد شہر کے اطراف کی جھاڑیوں میں اس کی بہتات تھی۔ ایک گاؤں ایسا بھی دیکھا کہ شریفہ نہ صرف جنگل میں تھا بلکہ خود گاؤں اور اطراف کے کھیتوں کی باڑیں بھی شریفہ ہی کی تھیں۔ مختصراً یہ کہ گھومتے رہو تو کھانے پینے کی کوئی فکر نہ تھی۔ البتہ چوکنا رہنا پڑتا تاکہ کہیں سانپ سے مڈھ بھیڑ نہ ہو جائے، خصوصاً سیتا پھل کی جھکی ہوئی شاخوں کے تلے۔ ایسی احتیاط تو بندر بھی فطرتاً کرتے ہیں۔

میں اس ماحول کا اس قدر طویل ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ وہ آج کل کے لڑکوں کے لیے شاید ٹی۔ وی کی کہانی لگے۔

میری زندگی اس وقت، خصوصاً دس سال کی عمر سے، جب کہ تعلیم کی غرض سے خاندان مستقلاً شہر حیدرآباد میں رہنے
معمول سے کچھ زیادہ ہی ذمہ دارانہ رہی۔ کیوں کہ والد کی ملازمت انھیں شہر کو سال میں تین چار بار ہی آنے دیتی تھی۔ وہ
مختصر عرصے کے لیے۔ عورتیں اس زمانے میں سخت پردے میں رہتی تھیں۔ اس لیے علاوہ مدرسہ اور فٹ بال
مصروفیت کے، گھر کا روزانہ کا سودا سلف اور مہینے دو مہینے کا زیادہ بھاری سامان بازار سے خرید لانے کا ذمہ میرا ہی
اس کے علاوہ مجھے سبزیاں بونے اور مرغیاں پالنے کا بھی شوق تھا۔ حسن اتفاق سے ہمارا گھر شہر کے عین کنارے ا
علاقہ میں تھا جہاں مستقل بہتا نالہ (بلکہ ندی) تھا اور پھل کے درخت کثرت سے تھے۔ عام اجازت تھی کہ جو پھل
گرجانے وہ کوئی بھی اٹھالے۔ اس کے علاوہ جنگلی پھل بھی وافر تھے۔ جمعہ اور دوسری چھٹیوں کے دن ان پھلوں کو کھ
اور جمع کرکے گھر لے آنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ مدرسہ جانے، بازار جانے، مختلف کاموں سے نبٹنے میں روزانہ تقریباً
میل تو یوں ہی پیدل چلنا ہوتا اور اکثر و بیشتر یہ ۱۵ میل بھی ہوجاتا۔ سواری کا نام کسی نے سنا نہ تھا۔ یہ معمول ۱۷ سال کی
میں عثمانیہ میڈیکل میں داخلہ کے دو سال بعد تک (یعنی ۱۹۳۴ تک) جاری رہا۔ اور دوست احباب اس گلاڈی کی زندگی کو
ڈے (یوم کلیہ) کے موقع پر اسٹیج پر بھی مذاق کے طور پر اچھالتے تھے۔ گاؤں والا (دیہاتی) کا ٹھپہ مستقل لگا رہا۔ اس پر
فخر بھی تھا، اور ہے۔

میری خوش بختی یہ تھی کہ چند نہایت قابل تعظیم اساتذہ نے مجھ میں ذاتی دلچسپی لی۔ ان کی عنایات کی تفصیل بہت
طویل ہوگی، لیکن ان کے نام گنانا فرض ہے۔ ساتویں جماعت میں چند اور کر (مرہٹہ برہمن) آٹھویں سے دسویں جماعت تک
اولکر مرہٹہ برہمن۔ انھیں حضرت نے مجھے سائنس کے اکتساب کا طریقہ سکھایا۔ اس کے بعد مزید کسی "استاد" کی ضرورت
نہیں رہی) ثناءاللہ شریف، مشتاق احمد، ہیری ہرائیر (تامل برہمن)۔ ان کا ایک احسان مجھ پر ہے کہ اگر وہ میری خاطر فکر کرتے
جھوٹی کارروائی سے میری عمر کو ۶ ماہ نہ بڑھا دیتے تو میں میٹرک کے امتحان میں شریک نہ ہو سکتا اور شاید اس کے بعد مز
تعلیم حاصل ہی نہ کر سکتا) محمد مارماڈیوک پکتھال (مترجم قرآن شریف) یونیورسٹی میں مولانا مناظر احسن گیلانی، میڈیکل
کالج میں ڈاکٹر رنگاریڈی، پروفیسر شنکر وامن ہارڈیکر اور پروفیسر خورشید حسین۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ طلبہ کی تعداد بہت کم تھی
اور اساتذہ سے ادب کی حدود میں رہ کر تعلقات ایسے رہتے تھے کہ جب ضرورت ہوئی ان کے ہاں (بلکہ ان کے گھروں پر بھی)
چلے گئے۔ ایسے اساتذہ سے تعلق مستقلاً قائم رہا۔ عمروں کے ساتھ دینے تک۔ میں اس بات سے قدرت کا نہایت مشکور
ہوں کہ میرے تعلقات اپنے شاگردوں میں سے چند ایک کے ساتھ کئی ملکوں میں اسی انداز میں قائم رہے۔ بھارت اور
پاکستان میں بھی ایسے ممتاز ڈاکٹر اب بھی ہیں جن کے ابتدائی دور میں تھوڑی سی تدریس کا فخر مجھے حاصل رہا اور ان سے اب
تک برادرانہ رشتے باقی ہیں۔

ایسے ماحول سے گزر کر میں نے ۱۹۳۷ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے امتحان کی منزل طے کی اور فن طب کو روزی کا
ذریعہ بنایا۔ پہلے ہی دن ایسے مقام پر بھیج دیا گیا جو ریاست حیدرآباد کا سب سے دور اور فرسودہ مقام مشہور تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ میڈیکل کالج میں لیکچر اور امتحانات اسی زبان میں ہوتے لیکن عثمانیہ
ہاسپٹل میں انگریزی زبان رائج تھی۔ درسی کتابیں انگریزی ہی تھیں کیوں کہ ترجمے مکمل نہیں ہو پائے تھے۔ ویسے بھی اگر
ترجمے تیار رہتے تو ان کے نئے ایڈیشن وقت پر نہیں تیار ہو سکتے تھے۔ ان مسائل سے کوئی رکاوٹ حصول علم میں پیدا نہیں
ہوئی۔ بلکہ ایک خاص فائدہ ہوا جس کا تجربہ بار بار اور اکثر مضحکہ خیز مواقع پر مجھے برصغیر کے باہر کام کے دوران ہوا (اس کا
ذکر بعد میں آئے گا)۔ فائدہ یہ تھا کہ انگریزی کتاب کو رٹ لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی طب کی کتابیں اتنی زیادہ اور
ضخیم ہوتی ہیں اور ہر کورس کا وقت اس قدر تنگ ہوا کرتا ہے کہ رٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جامعہ عثمانیہ کے طالب

علم کو انگریزی متن اخذ اور جذب کرنے کے ساتھ اسے اردو میں پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ اخذ و جذب ہی حصول علم کی جان ہیں۔ اور اس کا ثبوت بات کو تحریر و تقریر میں اردو کے لباس میں پیش کرنا تھا۔ اس موضوع پر بعد میں کئی مواقع مشاہدے اور تبادلہ خیال کے رونما ہونے۔ بات جب چینی اور یورو پین لوگوں سے ہوئی تو معاملہ اتفاق رائے پر ختم ہوا۔ لیکن برِ صغیر کے ایسے افراد سے بات ہوئی جو انگریزی ہی پر ایمان رکھے ہوئے تھے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس مسئلے پر میں نے ایک علمی محفل میں تقریر کی تھی جس کا لب لباب یہ ہے کہ:۔

(۱) دماغ کسی خاص طبقے کا اجارہ نہیں۔ غریب امیر سب ہی اسے پاتے ہیں۔ اس لیے ہر طبقے کے اعلیٰ صلاحیت والوں کو علم کے فروغ کا موقع ملے تو سماج کا فائدہ ممکنہ حد تک پھیلتا رہے گا۔

(۲) جو معاشرے اچھی تعلیم کو عوام تک پھیلانے ہوتے ہیں وہی علمی، فنی اور صنعتی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کی واضح مثال جاپان، چین اور کوریا ہیں۔ وہاں تحریر حروف تہجی پر مبنی نہیں ہے۔ غیر زبان کو پڑھ بھی لیا جائے تو اسے اپنے رسم خط میں لکھا نہیں جا سکتا۔ اپنی زبان میں متن کا اظہار اخذ و جذب کے عمل کے ساتھ خیال کو اپنا قالب دینے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) برِ صغیر میں اعلیٰ تعلیم کو انگریزی زبان میں مقید رکھنے اور عوام کو گھٹیا ذرائع تعلیم مہیا کرنے کا نتیجہ سائنس اور صنعت (اور فوجی صلاحیت) میں پستی ہے۔ باوجود اس کے کہ جاپان اس میدان میں ۱۸۶۸ء سے قبل تھا ہی نہیں اور چین، کوریا تو اور بھی بعد میں میدان میں کودے ہیں، برِ صغیر پر سبقت حاصل کر چکے ہیں۔ برِ صغیر میں خواص اور عوام کے الگ راستوں کے دستور کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ بہتر صلاحیت والے ترک وطن کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی اداروں میں جو لازمی تقسیم کار کے ساتھ گروہ بنتے ہیں (مثلاً مزدور اور انجینیر اور ڈیزائن بنانے والے)، ان میں دوطرفہ تبادلہ خیال نہیں ہو پاتا۔ جاپان کی صنعتی کامیابی میں مسلسل ربط اور تبادلہ خیال کا بڑا حصہ ہے۔

یہاں تک میں نے وہ پس منظر پیش کیا ہے جس میں میری تربیت ہوئی۔ اور عمر کے پہلے ۲۹ سال ریاست حیدرآباد میں گزرے۔ اس کے بعد اب ۱۹۹۴ ہے اور عمر کے ۷۹ سال ختم ہو چکے ہیں۔ یہ عرصہ ایک طرح کے سفر میں گزرا۔ اگرچہ کہ بعض ملکوں میں پڑاؤ سال ہا سال رہا لیکن یہ بھی ابن بطوطہ کی تقلید ہے۔ بلکہ میں اس سفر کے بیان میں خود ریاست حیدرآباد میں ۱۹۳۷۔ ۱۹۴۳ کا دور شامل کروں گا جب کہ میں میدان عمل میں تھا۔ بعض ممالک میں ایک سے زیادہ بار رہنا ہوا ان تجربوں کو ممالک کی سرخی کے تحت اکھٹا لکھا جائے گا۔

حیدرآباد دکن

۱۹۳۷ء سے اختتام ۱۹۴۳ تک میرا جو ذاتی تجربہ ہے وہ بیشتر اس لیے بیان کرتا ہوں کہ اس سے وہاں کے عام حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ حسن اتفاق سے میں ایم بی بی ایس کے امتحان میں درجہ اول پانے والا اکیلا تھا اور سنا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں میرا ریکارڈ ابھی تک باقی ہے۔ اس کے باوجود میرا تقرر میڈیکل آفیسر کے عہدے پر جو ہوا تو ایسی جگہ بھیجا گیا جہاں لوگ سزا بھگتنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانے میں امتحان سے فراغت کے بعد نگرانی کے تحت ایک سال کے تجربے کی شرط نہیں تھی۔ ۲۲ سال کی عمر، سرکاری اور انتظامی کام کا سرے سے تجربہ نہیں۔ شہر حیدرآباد سے ۲۰۰ میل دور، قریب ترین دوسرے ڈاکٹر سے ۴۰ میل کے فاصلے پر دو ندیاں حائل جن پر پل نہ تھے، جنگل جس میں شیر کبھی سڑک روک دیا کرتے تھے۔ سواری کوئی نہیں، بجلی پانی کا سوال ہی کیا، شدید گرمی، دوائیں ندارد، ۸ افراد کا غیر تربیت یافتہ عملہ، تعلقے کے مستقر اور اطراف کے کوئی ۲۰۰ مربع میل کی آبادی کی مکمل طبی اور قانونی ذمہ داری۔ یہ ڈیوٹی ایک مہینے کی ہی تھی لیکن کسی وقت بھی طبی یا قانونی مسئلہ جو ناقابل حل تھا وہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ ڈیوٹی ہمہ وقتی تھی، ہفتے کے ساتوں دن اور ہر دن کے

۲۴ گھنٹے ڈیوٹی ہی کے تھے۔

اس کے برخلاف چند اور حضرات جن کا ریکارڈ کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں سے بھرا تھا یا تو شہر حیدرآباد میں یا قریب ہی کسی اچھے مقام پر متعین کیے گئے تھے۔

غالباً سلوک کی ناہمواری نظامت صحت (ڈائرکٹر کا دفتر) میں ادنیٰ کلرک حضرات کا کرم تھا۔ میں ایک تو بے وسیلہ دیہاتی تھا۔ دوسرے یہ کہ بابوؤں کو سلام کرتے پھرنے کا عادی نہ تھا اور شاید یہی خامی ایک اور واردات کا سبب بنی۔ شہر حیدرآباد واپسی پر میں پروفیسر خورشید حسین (سرجن) کا مددگار بنا۔ وہ مجھ پر خاص طور سے مہربان تھے۔ لیکن صرف ایک مہینے کے بعد وہ مرض جو کوئی ایک سال سے اندر ہی اندر پھیل رہا تھا اس نے مجھے اپنے ہی وارڈ کے ساتھ لگے کمرے میں بطور مریض لٹا دیا۔ وہ مرض ریڑھ کی ہڈی کا دق تھا۔ بطور حکومت کے ملازم ڈاکٹر کے مجھے کمرہ مفت ملا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد نظامت صحت سے مراسلہ آگیا کہ میری ملازمت ختم کردی گئی کیوں کہ میں منصرم (عارضی) اسامی پر رکھا گیا تھا۔ مگر میرے باقی تمام ساتھی (اور بیش تر پانچ کے بجائے سات آٹھ سال میں ایم بی بی ایس پاس کرنے والے) مستقل اسامیوں پر لیے گئے تھے۔ کرایہ ادا کرنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے میں گھر جا کر لیٹ گیا۔ یہ سب انھیں بابوؤں کا کرم تھا جن کا ذکر ابھی رہا ہے اور جن سے میں قطعی واقف نہ تھا اور نہ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ وہ بابو مسلمان تھے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر نائیڈو (ہندو) آر۔ ام۔ او نے انگریز ڈائرکٹر اور سپرنٹنڈنٹ عثمانیہ ہاسپٹل سے اجازت لے کر مجھے کہلا بھیجا کہ میں واپس اسی کمرے میں آجاؤں جس میں دوران ملازمت فریش تھا اور باوجود قاعدے کے خلاف ہونے کے وہ ساری مراعات جو ملازمت کے ہوتے ہونے میسر ہوتیں مجھے ملیں گے۔ ڈاکٹر نائیڈو نے کبھی اشارہ تک نہیں کیا کہ بلا استدعا میرے لیے انھوں نے یہ رعایت حاصل کی تھی (اور ان کے سوا کوئی یہ کر بھی نہیں سکتا تھا)۔ اگر وہ مجھے واپس ہسپتال میں نہ بلاتے اور صحت یاب ہونے تک (جس میں ۱۸ مہینے لگے) ہر قسم کی سہولت و رعایت مہیا نہ کرتے تو اگر میں زندہ بھی رہ جاتا تو قطعی معذور ہو کر۔ ۱۹۳۷ء میں دق ہی کیا کسی بھی مرض کے لیے انٹی بایوٹک تو کیا کوئی بھی موثر دوا موجود نہ تھی۔ اس کے باوجود میں صرف ۱۸ ماہ میں نئی ملازمت حاصل کر کے کام پر لگ گیا، حالاں کہ سوئٹزرلینڈ کے مشہور ڈاکٹر رولئر (ROLLIER) کے ہاں اس مرض کا علاج کم از کم تین سال میں ہوا کرتا تھا۔ ایک میں بے وسیلہ آدمی بچ گیا تو کیا؟ ان گنت مجھ جیسے ریاست حیدرآباد میں سسکیاں لیتے، ایڑھیاں رگڑتے مرگئے یا فاقوں کی نذر ہوگئے۔

نئی ملازمت کے ساتھ مجھے عثمانیہ میڈیکل کالج میں طب کے مضمون کے عملی حصے کی تدریس کا موقع بھی مل گیا اور دو سال بعد جب کلینکل میڈیسن (Clinical Medicine) کے لکچرر کی اسامی کا اعلان جامعہ کی طرف سے ہوا تو میں نے بھی درخواست دی اور منتخب کرلیا گیا لیکن تقرر کے احکام جب آنے تو پتہ چلا کہ میرے ایک دوست جو اس وقت اپنے خاندان کے خرچ پر برطانیہ میں ایک اور ہی مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری کے لیے کام کر رہے تھے اور شعبہ طب میں اس اسامی کے لیے درخواست بھی داخل نہیں کی تھی، مستقلاً مقرر کردیے گئے اور میں ان کی واپسی تک عارضی ملازم رکھا گیا تھا۔ ان صاحب کے ایک بھائی سیول سروس میں کلیدی عہدے پر تھے اور اقرباپروری میں یکتا مشہور تھے۔ میرا تو ادنیٰ سے ادنیٰ بابو بھی مربی نہ تھا۔ ۱۹۴۳ء میں یہ اقرباپرور بزرگ کسی اور عہدے پر متعین ہوگئے اور ان کے ایک رقیب جامعہ کے معاملات سے متعلق ہوئے۔ انہوں نے میرے دوست کے معاملے میں کھنڈت ڈالی لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ البتہ اس جھگڑے میں میری تنخواہ بند ہوگئی اور میں ہندوستان کی فوج میں ملازمت تلاش کر کے جنوری ۱۹۴۴ میں حیدرآباد چھوڑ کر چلا گیا۔ اس فوجی دور کا باب الگ بندھے گا لیکن ذکر خیر اب ریاست حیدرآباد کا ہو رہا ہے۔

کوئی تین سال قبل ایک چھوٹا سا رسالہ کراچی میں دیکھا جو "حیدرآبادیوں" کی طرف سے نکلتا ہے۔ اس میں قاسم

رضوی کی قلمی شبیہ تھی۔ بپھرے تیور اور تلوار میان سے کھینچتے ہوئے، گرجتے ہوئے دکن کے یہ "شیر" تھے۔ لیکن حقیقت کیا تھی؟ یہ ایک معمولی وکیل تھے، شمالی ہند کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے (میں ان کے بھائیوں سے واقف تھا)۔ بھرے جلسے میں اعلان کیا تھا کہ اپنا سب کچھ مجلس اتحاد المسلمین کی نذر کر رہے ہیں، بلکہ شیروانی بھی اتارنے لگے تھے، لیکن مجمع کے اصرار پر پھر سے گنڈیاں لگائی تھیں۔ حیدرآباد پر ہندوستان کے قبضے کے بعد میری ملاقات انجمن اتحاد المسلمین کے سابق خازن سے ہوئی۔ وہ میرے دوست تھے۔ انھوں نے میرے سوال پر بتایا کہ قاسم رضوی نے پھوٹی کوڑی تک انجمن کو نہیں دی تھی۔ اس انجمن کے بانی بہادر خان (بہادر یار جنگ) بڑے اچھے مقرر تھے لیکن پورے نواب بھی تھے۔ انجمن کے سکریٹری میرے ایک ہم جماعت کے بھائی تھے۔ ناکام وکیل اور قرضے کے بارے میں ان کی شہرت رضاکاروں کے دور میں کون کرتا۔ قاسم رضوی نے ان گنت کم کچھ مسلمانوں کی موت یا تباہی کا سامان کرایا۔ بھارت کی قید سے چھوٹ کر کراچی آنے تو بیان دیا کہ ترجمہ و تفسیر قرآن کر رہے ہیں۔ یہ اعلان بھی لال قلعے پر جھنڈا گاڑنے کے اعلان سے کم نہ تھا اور شاید اسی قدر کامیاب رہا۔

جب میں برطانوی ہند کی فوج میں دوسرا سال ختم کر رہا تھا تو حکومت دکن نے کارروائی کر کے مجھے واپس بلوا لیا اور کہا کہ میں اناٹمی میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لیے برطانیہ جاؤں۔ جب میں ۱۹۴۶ میں وہاں چلا گیا تو پتہ چلا کہ مجھے اسکالرشپ پر بھیجا گیا ہے۔ غالبا میں اکیلا اس قاعدے کے تحت بھیجا گیا تھا۔ یعنی حیدرآباد کی ملازمت ختم اور سابقہ اسامی کی تنخواہ بند۔ اس کے برخلاف چند حضرات جنھوں نے ۸ یا ۹ سال میں کئی ناکامیوں کے بعد دوم درجے سے ڈگری حاصل کی تھی وہ ڈیپوٹیشن پر بھیجے گئے تھے۔ یعنی کہ برطانیہ کے اخراجات کے علاوہ ریاست کی ملازمت اور اس کی تنخواہ بھی جاری رہی یہ بھی گم نام باہوؤں کا کرم تھا۔ اور ایک لحاظ سے یہ واقعی کرم تھا کیوں کہ مجھے بعد میں ریاست کو مستقلاً چھوڑنے میں پس و پیش کی نوبت نہ آئی۔ برطانیہ میں صرف دو سال بعد مجھے لندن یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو کی جگہ مل گئی اور میں نے اسکالرشپ کو خیرباد کہہ دیا۔

۱۹۵۰ء میں حیدرآباد واپس ہوا تو مجھے اناٹومی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یعنی یہ تیسری بار نئے سرے سے ملازمت دی گئی۔ اوائل ۱۹۵۱ء میں اس پروفیسری کو خیرباد کہہ کر میں نے سنگاپور میں لکچرر کی اسامی قبول کر لی اور بعد میں دو سال لیے ہوئے اسکالرشپ کی رقم کا ملا واپس کر دی۔ آخری قسط ۷ اپائی کی تھی۔ اس کی رسید تبرک کے طور پر محفوظ رکھا ہوں۔

۱۹۵۱ء کے بعد ایک دوست اور ایک بزرگ عزیز کے اصرار پر صرف ۷ دن کے لیے ۱۹۷۶ میں حیدرآباد گیا تھا۔ اس مختصر عرصے میں دو ہندو دوستوں نے بڑی دعوتیں کیں۔ خوب مجمع کیا۔ ایک مسلمان دوست ڈاکٹر سید عبدالمنان کا مہمان رہا۔ یہ ہم جماعت بھی ہیں اور شفیق و کریم بھی۔ بھائی سے زیادہ قریب ہیں۔ بدلے ہوئے حالات کی شکایت ہندو دوست مسلمانوں سے زیادہ ہی کر رہے تھے۔ گزشتہ چار سالوں میں دو دفعہ پھر وہاں گیا ہوں۔ ملک کے حالات ابتر ہیں مگر دوستوں کے خلوص و کرم میں ذرا فرق نہیں آیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی قوموں کے دوست ہیں۔ مگر کئی ایک گزر گئے۔ اب صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنو بھی تو گنجائش باقی رہتی ہے۔ ۷۵ سال سے زیادہ تو تقریباً سب ہی کی عمر ہو چکی۔ وہ ساری خرابیاں جو ریاست کے نظام کا جز تھیں ترقی کر چکی ہیں اور عوامی سیاست کی غنڈہ گردی کے علاوہ ہندو سیاسی جماعتوں کی فسطائیت اور سماج میں فساد کو مستقل کرنے کی کارروائیوں کا زور ہے۔ مسلمان سہمے ہوئے ہیں اور شریف ہندو نالاں مگر بے بس۔ مجلس اتحاد المسلمین اب ایک خاندان کی جاگیر بن چکی ہے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ خلیج اور سعودی عرب میں نوکریاں کرتا ہے اور اس کے اہل خاندان حیدرآباد شہر میں پیسہ ضائع کرتے ہیں۔ ایک اور چھوٹا گروہ امریکہ کے سبز کارڈ کی فکر میں رہتا ہے۔ اکثریت موت کی منتظر ہے۔ حیدرآباد کے ۱۹۳۱۔۱۹۴۳ کے دور کی چند خوش گوار یادیں اب بھی ہیں۔ مرزا ظفر الحسن مرحوم کی

(آگے ص ۳۱ پر)

ڈاکٹر محمد علی اثر

مولانا محمد باقر آگاہ

(جدید تحقیق کی روشنی میں)

مولانا محمد باقر آگاہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے، میر اور سودا کے ہم عصر متبحر عالمِ دین، بلند قامت شاعر اور ایک باکمال نثر نگار تھے۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے بلکہ سنسکرت(۱)، برج بھاشا(۲)، تلگو(۳)، اور اروی(۴) زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ باقر آگاہ کے والد کا نام محمد مرتضیٰ تھا جو بیجاپور کے متوطن تھے۔ انھوں نے بیجاپور کے زوال کے بعد ترک وطن کرکے ویلور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ باقر آگاہ ویلور ہی میں تولد ہوئے۔ ان کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ان کی ولادت کا سال ۱۱۵۰ھ تحریر کیا ہے (۵)۔ ڈاکٹر زور (۶) نے ۱۱۸۵ھ، پروفیسر سروری (۷) اور پروفیسر یوسف کوکن (۸) نے ۱۱۵۸ھ بتایا ہے۔ باقر آگاہ کے بیانات کی روشنی میں آخرالذکر سنہ پیدائش ہی زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے۔(۹)

باقر آگاہ ویلور کے مشہور بزرگ اور صاحبِ دیوان شاعر حضرت شاہ ابوالحسن قربی (۱۱۱۷ھ۔۱۱۸۲ھ) کے مرید، شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔ یہ انھیں کے فیضِ صحبت اور تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ باقر آگاہ پندرہ سال کی عمر سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوگئے۔ سترہ برس کی عمر میں انھوں نے اپنے مرشد (حضرت قربی) کی مدح میں ایک قصیدہ تحریر کیا تھا جسے دیکھنے کے بعد استاد نے اپنے ہونہار شاگرد کے لیے دعا کی اور کچھ ہی عرصے میں، ایک متبحر عالم اور باکمال شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ نواب والاجاہ والیِ کرناٹک ان کے علم و فضل کے ایسے قدردان ہوئے کہ انھیں اپنے فرزندوں امیر الامرا اور عمدۃ الامرا کا اتالیق مقرر کیا۔ چند روز بعد الپور کی جاگیر عنایت کی اور پھر انھیں معتمد خاص کے عہدے پر مامور کیا۔(۱۰)

نواب صدیق حسن خاں نے اپنے تذکرے "شمعِ انجمن" میں لکھا ہے کہ "کرناٹک میں ان کے ایسا کوئی سربلند نہ ہوا اور مدراس میں ان کا کوئی عدیل نہیں، صاحب تصانیفِ کثیرہ تھے اور بہت سے کمالات کے حامل تھے۔(۱۱)

"تذکرۂ صبحِ وطن" کے مولف کا بیان ہے کہ "تمام فنون میں عربی، فارسی اور ہندی (اردو) کی پچاس ہزار چھ سو ابیات (۱۲) ان کی کثرتِ تصانیف کی گواہ ہیں۔ اس علاقے (مدراس) کے بہت سے لوگ ان کے فیض سے مرتبۂ فضل و کمال کو پہنچے۔ (۱۳)

مولانا مہدی واصف اپنے تذکرے "حدیقۃ المرام" میں رقم طراز ہیں کہ "اللہ نے آپ کو شرح صدر سے مشرف فرمایا اور علوم کے دروازے آپ پر کھول دیے ۔۔۔ آپ بڑے فاین تھے جس کی نظیر نہیں۔ قاموس آپ کو حفظ تھی ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ علماءِ عصر کو آپ پر شک و حسد ہوتا تھا۔ آپ کی معلومات اور عربی و فارسی طرزِ تحریر آپ کے کمال پر دال ہے۔ (۱۴)

مولف "تذکرہ نتائج الافکار" کا بیان ہے کہ "گلشنِ کرناٹک میں ان جیسا سرو پیدا نہیں ہوا اور گلستانِ مدراس میں

اُن کے مقابلے کا رنگ افروز گل نہیں کھلا۔(۱۵)

متذکرۂ بالا تذکرہ نگاروں کے بیانات کے پیشِ نظر بعد ازاں پروفیسر سروری، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر زور پروفیسر یوسف کوکن اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولانا آگاہ کی حیات اور کارناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو باقر آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد کا تعین ہی ہوسکا ہے اور نہ ان کے صحیح ناموں کا علم۔ مثال کے طور پر پروفیسر سروری نے باقر آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد ۱۴ بتائی ہے (۱۶)۔ جس میں آٹھویں نمبر پر "مثنوی گلزار عشق۔ کا تذکرہ کیا گیا ہے نویں اور دسویں نمبر پر جن کتابوں کے نام۔ "قصہ رضوان شاہ۔ اور "روح افزا۔) دیے گئے ہیں وہ کوئی علاحدہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ "مثنوی گلزار عشق۔ ہی کے دو مرکزی کردار ہیں۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آگاہ کی سترہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں (۱۷)۔ جن میں سولھویں اور سترھویں نمبر بالترتیب "فرائد در عقائد۔ اور فرائد در فوائد۔ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اول الذکر نام (فرائد در عقائد) کی کوئی کتاب باقر آگاہ نے نہیں لکھی البتہ "رسالہ عقائد۔ کے عنوان سے ایک کتاب ضرور لکھی ہے جس کا ذکر ہاشمی صاحب نے نویں نمبر پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ آگاہ کی ایک کتاب "فرائد در بیان فوائد۔ ہے جو ہاشمی صاحب کی دی ہوئی فہرست میں "فرائد در عقائد۔ کے نام سے سترھویں نمبر پر ہے۔ ہاشمی صاحب نے آگاہ کی ایک اور کتاب "رسالہ فقہ۔ کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کیا جس کا تذکرہ خود انھوں نے "کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی فہرست۔ میں ص ۸۱ پر کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے مولانا آگاہ کی تصانیف کی تعداد سترہ بتائی ہے (۱۸)۔ جس میں چودھویں نمبر پر "فرائد در عقائد۔ کا نام ملتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا ہے کہ آگاہ نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ یہ ضرور ہے کہ "رسالہ عقائد۔ کے زیر عنوان انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا ذکر ڈاکٹر زور نے پہلے نمبر پر "عقائد نامہ۔ کے نام سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ زور صاحب نے سولھویں نمبر پر "خمسہ متحیرہ۔ کا نام تحریر کیا ہے۔ حالاں کہ اس کتاب کا عنوان "خمسۂ متحیرہ اوج آگاہی۔ ہے اور یہ پانچ مثنویوں (۱۔ صبح نو بہار عشق ۲۔ ندرت عشق ۳۔ غرقاب عشق ۴۔ حیرت عشق ۵۔ حسرت عشق) کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر یوسف کوکن نے باقر آگاہ کی بارہ اردو تصانیف کی نشان دہی کی ہے (۱۹)۔ جن میں درج ذیل کتابیں شامل نہیں ہیں

حاشیہ من درپن۔ رسالہ فقہ۔ مناجات آگاہ۔ معراج نامہ۔ ہدایت نامہ۔ فرقہ ہائے اسلام۔ وفات نامہ رسول اللہ ریاض السیر۔ مراثی آگاہ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد کا تعین تو نہیں کیا ہے لیکن ان کی سولہ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ جن میں "خمسہ متحیرہ اوج آگاہی۔ شامل نہیں ہے البتہ پانچ مثنویوں کے اس مجموعے کی دو مثنویوں (صبح نو بہار عشق اور ندرت عشق) کو دو علاحدہ تصانیف کے نام دیے ہیں (۲۰)۔ اس کے علاوہ جالبی صاحب نے "مثنوی روپ سنگار۔ کو "مثنوی ادب سنگار۔ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی کو اس سلسلے میں ایک سہو یہ بھی ہوا کہ انھوں نے آگاہ کی اردو نظم و نثر سے متعلق تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ایک فارسی کتاب "احسن التبیین۔ کا نام بھی شامل کر دیا ہے (۲۱)۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی کتاب "اردو نثر کا آغاز و ارتقا۔ میں باقر آگاہ کی دو تصانیف "محبوب القلوب۔ اور "فرائد در فوائد۔ کے نام سہوا "معیوب القلوب (۲۲)۔ اور "فوائد در قواعد۔ تحریر کیے ہیں۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جدید تحقیق کی روشنی میں باقر آگاہ کی اب تک معلوم تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو تصانیف کے صحیح نام مع سنہ تصنیف کے علاوہ دیگر ضروری معلومات بھی یک جا کر دی جائیں تاکہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کو کسی الجھن یا مغالطے سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

مطبوعہ تصانیف : ۱۔ رسالہ عقائد (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ) ۵۰۰ ابیات پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع عقائدِ اہل سنت ہے۔ درج ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ باقر آگاہ کی پہلی تصنیف ہے :

کہا میں نئیں کبھی دکنی میں اشعار مجھے ہے شعر کہنے سوں بہت عار (۲۴)

اس تصنیف کا نام خود مصنف نے " مثنوی ہشت بہشت " کے دیباچے میں " رسالہ عقائد " بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۸۵ھ کی تصنیف ہے (۲۵)۔ لیکن مختلف کتابوں میں اس کے نام اور سنہ تصنیف کا غلط اندراج ملتا ہے۔ جیسے :

" عقائدِ اہل سنت " (سنہ تصنیف قریب ۱۲۵۰ھ) (۲۶) عقائدِ آگاہ (سنہ تصنیف ۱۲۰۰ھ) (۲۷)۔ فرائد در عقائد " (سنہ تصنیف ۱۲۰۰ھ) (۲۸) " فرائد در بیان فرائد " وغیرہ (۲۹)۔

۔ تحفۃ النساء (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ) آٹھ سو ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں بنات الطاہرات اور امہات المومنین کے اوصاف مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ خود مصنف نے درج ذیل اشعار میں اس کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعار کی وضاحت کی ہے :

ہیں آٹھ سو اس کے جملہ ابیات پڑھنے میں ہے اس کے بھوت برکات

اگیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ یاد (۳۰)

۔ ہشت بہشت (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ تا ۱۲۰۶ھ) یہ کتاب دراصل سیرت نبی کے موضوع پر درج ذیل آٹھ منظوم رسائل کا وعہ ہے :

۱۔ من دیپک (۱۱۸۵ھ) ۲۔ من ہرن (۱۱۸۵ھ) ۳۔ من موہن (۱۱۹۶ھ) ۴۔ جگ سوہن (۱۱۸۵ھ) ۵۔ آرامِ دل (۱۱۸۵ھ) راحت جاں (۱۱۸۶ھ) ۷۔ من درپن (۱۲۰۶ھ) (۳۱) ۸۔ من جیون (۱۲۰۶ھ) (۳۲)

آگاہ نے " ہشت بہشت " کے ابتدائی چھ رسالے ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۶ھ کے درمیان نواب محمد امیر الامرا بہادر کی مائش پر مکمل کر لیے تھے۔ لیکن دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کی تصنیف کا کام طوالت میں پڑ گیا یہاں تک کہ ۱۲۰۳ھ میں ان کے " رفیق باتوفیق " (امیر الامرا) نے وفات پائی اور باقر آگاہ کا دل سرد ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد دوست احباب کی توجہ ٰی اور اصرار پر ۱۲۰۶ھ میں آخر کے دو رسائل کی بھی تکمیل عمل میں آئی۔

۴۔ حاشیہ من درپن (سنہ تصنیف درمیان ۱۲۰۶ھ ۔ ۱۲۲۰ھ) من درپن " ہشت بہشت " کا ساتواں اور تین ہزار ایک سو تھ اشعار پر مشتمل ضخیم ترین رسالہ ہونے کے باوجود مصنف کی نظر میں مختصر تھا اسی لیے اس نے اس پر ۱۲۵۰ ابیات کا حاشیہ تحریر کرنا ضروری سمجھا۔ اس حاشیے میں " اعجاز قرآن " کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چناں چہ خود مصنف کا بیان ہے کہ :

پس از حمد خدا و نعت مختار سن اس مضموں کو گوشِ دل سے اے یار

کہ من درپن میں بولا میں یہ ایجاز بائیں بہیں قراں کا اعجاز

جب اس کو مختصر تر کردیا ہوں کئی جا میں اشارت کر گیا ہوں

یہ نظم صاف کے تئیں اب کہا میں بطور حاشیہ اس پر لکھا میں (۳۳)

۵۔ محبوب القلوب (۱۲۰۶ھ) چار ہزار تر سٹھ ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مستند ت و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں آگاہ نے محبوب سبحانی کی مدح میں ۵۵، ۵۵ شعر کے دو قصیدے بھی ہیں۔ اگر مثنوی کے اشعار میں قصیدوں کے شعر بھی شامل کر لیے جائیں تو جملہ ابیات کی تعداد ۴۱۷۳ ہو جاتی ہے۔ ذیل اشعار میں محبوب القلوب کا سنہ تصنیف اور ابیات کی تعداد بتائی گئی ہے :

تھا ششم سال بارا سو اپر جب بحال خوش ہوا ہے یہ مرتب

تمام ابیات اس کے اے مساعد ہوے چار الف و ترسٹھ بے قصاید

۶۔ ریاض الجنان (۱۲۰۷ھ) اس مثنوی میں اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ سنہ تصنیف اور اشعار کی تعداد درج ذیل اشعار میں ظاہر کی گئی ہے :

جب تھے بارا سو اور سات برس ۔ تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس
ہیں گی ابیات اس کی تین ہزار ۔ اور نود پہ نو بلا تکرار

۷۔ تحفتہ الاحباب (۱۲۰۷ھ) اس کتاب میں اصحاب رسول کے مناقب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی تین ہزار چار سو چھبیس اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف ۱۲۰۷ھ ہے :

درسن یک الف و دو صد اور سات ۔ فضل حق سے ختم پایا خوب دھات
ہیں گے سب ابیات اس کے بے گمان ۔ سہ ہزار و چار سو چھبیس جان

۸۔ فرائد در فوائد (۱۲۱۰ھ) مختلف کتابوں میں اس مثنوی کے دوسرے نام "فرائد در عقائد" (۳۴) اور فوائد در قواعد (۳۵) بھی ملتے ہیں لیکن اس کا صحیح نام "فرائد در فوائد" ہے (۳۶)۔ جیسا کہ خود باقر آگاہ نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے :

"اس رسالے کا نام "فرائد در فوائد" ہے۔ ہر فائدہ اس کا دردانہ بے مول اور خراج ملک معنی کا ہم تول ہے۔ ہندی زبان میں ہے کرکرا سے سرسری نہ جان۔"

پوری کتاب میں آگاہ نے ستائیس فوائد کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں سے ابتدائی اٹھارہ فوائد وحی و قران کے بارے میں ہیں اور باقی فائدوں میں احادیث رسول کی منزلت، نیکیوں کی توصیف وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مثنوی ایک ہزار پانچ سو دس ابیات پر پھیلی ہوئی ہے اور ۱۲۱۰ھ ماہ رمضان میں تصنیف کی گئی۔ جیسا کہ درج ذیل اشعار میں خود اس جانب اشارہ کیا ہے :

تمام ابیات اس کے جو ہیں سب رس ۔ یک ہزار و پان صد و دس
تھے بارا سو پہ جب دس اے گرامی ۔ بہ شہر صوم پایا ہے تمامی

۹۔ روضتہ الاسلام (۱۲۱۴ھ) بعض محققین نے اس مثنوی کا نام "روضتہ السلام" لکھا ہے (۳۸)۔ جب کہ خود مصنف نے اس کا نام "روضتہ الاسلام" لکھا ہے: "نام اس کا ہے روضتہ الاسلام، دیوے حق سب کو اس سے نفع تمام ۱۲۴۴ ابیات (۳۹) پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع شافعی فقہ ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو ادب کی نشوو نما" میں "روضتہ الاسلام" کی تاریخ تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ مثنوی ۱۲۱۴ھ / ۷۹۹ اھ میں تصنیف ہوئی۔ "محمدی مذہب" اور "روضۂ دلنواز" سے اس کی تاریخیں نکلتی ہیں (۴۰)۔

ڈاکٹر اقبال کے دیے ہوئے متذکرہ مادہ ہائے تاریخ اس لیے صحت پر مبنی نہیں ہیں کہ اول الذکر سے ۸۹۴ اور آخر الذکر سے ۱۱۰۹ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ "روضتہ الاسلام" کے آخر میں خود مصنف نے تین قطعات تاریخ لکھے ہیں، جن کی آخری ابیات یہ ہیں :

کہا سال اتمام ناگہ سروش ۔ کہ " ہے یہ عجب روضۂ دلنواز "

ناگہاں از سر امداد سروش ۔ بول اٹھا، روضۂ دینؔ و اسلام
کہا ناگہ ہاتف از سرجد ۔ ہے یہ بیشک محمدی مذہب

اول الذکر شعر میں " ہے یہ عجب روضہ دلنواز" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے جب کہ آخر الذکر دونوں اشعار میں تعمیہ ہے

یعنی "روضۂ دین و اسلام" کے اعداد میں "سر اعداد یعنی الف (۱) کے اعداد جمع کیے جائیں۔ اسی طرح آخر الذکر شعر کے دوسرے مصرع کے اعداد میں "سرِ جد" یعنی ج (۳) کے اعداد شامل کیے جائیں تو تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔

۱۰۔ رسالہ فقہ (قبل ۱۲۰۰ھ) دو سو چھیاسٹھ اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں فقہ کے مسائل نظم کیے گئے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ باقر آگاہ کے تمام تذکرہ نگار اور محققین نے جن میں نصیر الدین ہاشمی بھی شامل ہیں آگاہ کی اردو تصانیف میں "رسالہ فقہ" کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ خود نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات سالار جنگ کے صفحہ ۸۱ پر اس مخطوطے کا تذکرہ کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ "یہ کتاب طبع ہو چکی ہے مگر نایاب ہے"۔

غیر مطبوعہ تصانیف

۱۔ گلزارِ عشق (۱۲۱۰ھ) پروفیسر سروری نے آگاہ کی چودہ تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے آٹھویں نمبر پر "گلزار عشق" اور نویں اور دسویں نمبر پر علی الترتیب "قصۂ رضوان شاہ اور روح افزا" کے نام تحریر کیے ہیں۔ حالاں کہ "گلزار عشق" ہی میں آگاہ نے "قصۂ رضوان شاہ اور روح افزا" کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ دراصل آگاہ کی تصنیف کی ہوئی ایک ہی مثنوی ہے۔ جس کے سروری صاحب نے تین نام بتائے ہیں۔

"گلزار عشق" کے درج ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آگاہ نے اس کا آغاز ۱۱۹۱ھ میں کیا تھا اور تکمیل ۱۲۱۰ھ میں ہوئی۔ گویا یہ مثنوی ۱۹ سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

تھے جب یک ہزار اور نو کم دو سو — بنا اس کا دیباچہ اے گرم رو
گزر گئے ہیں جب اس پر انیس سال — ہوا بدر کامل یہ زیبا ہلال (۴۱)

"گلزار عشق" کے جملہ ابیات کی تعداد ۳۵۹۰ بتائی گئی ہے:

کیا اس کے بیتوں کو جب میں عدد — ہوئے سہ ہزار اور پان سو نود

"گلزار عشق" ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کے چار قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کی زینت ہے (۴۲)۔ اور ایک کتب خانہ آکسفورڈ میں محفوظ ہے (۴۳) اور اس مثنوی کے دو مخطوطے کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی کے خزانہ ہیں (۴۴)۔ "گلزار عشق" کا ایک ناقص الآخر نسخہ قاضی عبید اللہ لائبریری (مدراس) میں بھی موجود ہے۔ (فہرست مخطوطات ص ۱۳۱ مخطوطہ نمبر ۴۲)

۲۔ خمسۂ متحیرہ اوج آگاہی (۱۲۱۳ھ تا ۱۲۱۴ھ) یہ کتاب دراصل آگاہ کی پانچ مثنویوں ۱) "صبح نو بہار عشق" ۲) "ندرتِ عشق" ۳) "غرقابِ عشق" ۴) "حیرت عشق" اور ۵) "حسرت عشق" کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر سروری (۴۶)، ڈاکٹر زور (۴۷) اور نصیر الدین ہاشمی (۴۸) نے اس کتاب کا نام "خمسہ متحیرہ" لکھا ہے جب کہ یوسف کوکن عمری صاحب نے "خمسۂ متحیرہ" (۴۹) تحریر کیا ہے۔ راقم الحروف نے جب اس سلسلے میں قلمی نسخوں کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ آخر الذکر محقق کا دیا ہوا نام "خمسہ متحیرہ" ہی درست ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے آگاہ کی اردو تصانیف کی فہرست میں پیش نظر کتاب کا تذکرہ کیے بغیر اس مجموعے کی ابتدائی دو مثنویوں "صبح نو بہار عشق" اور "ندرت عشق" کی نشان دہی کی ہے۔ پروفیسر یوسف کوکن نے "خمسہ متحیرہ اوج آگاہی" کے بارے میں لکھا ہے کہ "اب تک اس کے کسی نسخے کا کہیں پتہ نہ چلا"۔ "گلدستہ کرناٹک" میں اس کا نام ملتا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے کل ابیات کی تعداد ۴۵۰۰ ہے (۵۰)۔

"خمسہ متحیرہ اوج آگاہی" کا ایک نسخہ کتب خانہ لطیفیہ "حضرت مکان" ویلور میں راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ کتاب کی جلد کے اوپر کسی نے مصنف کا نام "خوشی آرکاٹی" تحریر کیا ہے۔ یہ سہو غالباً اس لیے ہوا ہو گا کیوں کہ کتاب کے آخر میں خوشی آرکاٹی کا قطعہ تاریخ تصنیف درج ہے۔ "خمسہ متحیرہ" کا ایک اور نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہے (۵۱)۔ اس کے علاوہ اس

کتاب کی اولین مثنوی "صبح نو بہار عشق"۔ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کا مخزونہ ہے (۵۲) اور اس مجموعے کی تین مثنویاں "صبح نو بہار عشق"۔ "ندرت عشق"۔ اور "فرقاب عشق" اور مینل مینو سکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ محفوظ ہیں (۵۳)۔

"خمسۂ متحیرہ"۔ کی پانچوں مثنویوں کا موضوع عشق ہے، جس میں تصوف کے رنگ کا اضافہ کیا ہے۔

۳۔ روپ سنگار (۱۲۱۵ھ) پروفیسر یوسف کوکن اپنی کتاب۔ باقر آگاہ۔ میں "روپ سنگار"۔ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہیں۔ "یہ بھی ایک مشہور مثنوی تھی، اس کا نسخہ بھی نایاب ہے۔ صاحب تذکرہ "گلدستۂ کرناٹک"۔ نے اس کا تذکرہ (۵۴)۔ لیکن اس نادر و نایاب مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے (۵۵)۔

تین سو ستر ابیات پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع "نائیکہ بھید"۔ ہے بقول ڈاکٹر زور "سنسکرت شاعری میں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے جو مختلف جذبات واضح کیے گئے ہیں ان سے مصنف نے اس کتاب میں تفصیل بحث کی ہے (۵۶)۔ درج ذیل اشعار سے اس کے نام "روپ سنگار"۔ اور سنہ تصنیف (۱۲۱۵ھ) پر روشنی پڑتی ہے:

بنا جب حسن کا آئینہ اوتار — رکھا میں نام اس کا روپ سنگار
ہے یہ روپ سنگار وہ آرسی — کہ مونہہ اپنا دیکھے وہاں حسن و عشق
میں جب سال تاریخ چاہا، سروش — کہا میں عجب گل نشاں حسن و عشق
ہے اب ہجرت سے بارا سو پہ پندرا — کہ اعجاز اس کا ہے جیسے کا دیسا

۴۔ دیوان ہندی (اردو)

باقر آگاہ نے قصیدوں، غزلوں، قطعات اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے، جس تک چار قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ "دیوان آگاہ"۔ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے (۵۷)۔ ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کے قلمی نوادرات کی زینت ہے (۵۸) اور اس کے دو قلمی نسخے کتب خانہ مدرسہ محمدی مدراس کے مخزونہ ہیں

پروفیسر سیدہ جعفر نے "تذکرہ گلزار اعظم"۔ کے حوالے سے آگاہ کی تاریخ ولادت ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء بتائی ہے پھر چند سطور کے بعد وہ لکھتی ہیں کہ "باقر آگاہ نے پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۱۶۵ھ / م ۱۷۵۱ میں شاعری کی ابتدائی اگر آگاہ نے ۱۱۶۵ھ میں شاعری کی ابتدائی اور ان کا سنہ ولادت ۱۱۵۸ھ ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آگاہ نے سات کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا جو بعید از قیاس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحبہ نے آگاہ کی شاعری کی ابتدا کا سنہ / ۱۷۵۹ء لکھنے کے بجائے سہواً ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء تحریر کر دیا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "آگاہ نے سال کے اندر دیوان مرتب کر لیا ہوگا کیوں کہ شاعری خاص طور پر غزل، عہد شباب کی پیداوار ہوتی ہے (۶۲)۔"۔ پروفیسر سیدہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ باقر آگاہ کا دیوان ان کے دور آخر کی پیداوار ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کتاب کے دیباچے مصنف نے اپنی تقریباً تمام اردو تصانیف کے نام گنوائے ہیں جو ۱۱۸۴ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیان لکھی گئی تھیں۔ دوسرے کہ خود باقر آگاہ کا بیان ہے کہ انھوں نے گزشتہ تیس بتیس سال کے درمیان نظم کیا ہوا اردو اور فارسی کلام، حضرت قر انتقال کے بعد ضائع کر دیا (۶۳)۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے قلمی دیوان میں قصیدے، غزلیں، قطعات، رباعیاں، افراد، کبت اور دوہرے ہو اور آخر میں ایک رباعی تلگو زبان میں اور ایک فرد اردو زبان میں بھی ملتا ہے۔ دیوان کے آغاز میں نثری دیباچہ بھی ہے۔

کتب خانہ سالار جنگ کے مخزونہ "دیوان آگاہ"۔ میں نثری دیباچہ اور قصائد شامل نہیں ہیں۔ اس نسخے میں ۲۸۰

۸۴ رباعیاں، ۱۱ قطعات کے علاوہ ۴۷ متفرق اشعار، ایک تلگو رباعی، چند کبت اور دوہرے اور ایک فردار دو زبان میں بھی ہے۔
جناب علیم صبا نویدی نے راقم الحروف کی خواہش پر مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں محفوظ باقر آگاہ کے دونوں دواوین کے زیراکس اور سال کیے ہیں، جن میں صرف غزلیں، رباعیاں اور متفرق اشعار موجود ہیں۔ ان دونوں دواوین میں قصائد اور نثری دیباچے شامل نہیں ہیں۔ البتہ تمام دواوین میں غزلوں کی تعداد ۲۸۰ ہی ہے (۶۴)۔
۵۔ مناجات آگاہ تیرہ اوراق پر مشتمل اس مناجات کا ایک قلمی نسخہ، کتب خانہ رحمانیہ (مدراس) میں محفوظ ہے (۶۵)۔
۶۔ معراج نامہ۔ ۷۔ ہدایت نامہ۔ ۸۔ فرقہ ہائے اسلام (اوائل ۱۲۰۰ھ)
یہ تینوں مثنویاں پیرس کے قومی کتاب خانے کی زینت ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات میں ان کا تذکرہ کیا ہے (۶۶)۔
۹۔ وفات نامہ رسول اللہ ۔ آگاہ سے منسوب اس تصنیف کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اس کا تذکرہ یادگار نمبر بتقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب مدراس میں ملتا ہے (۶۷)۔
۱۰۔ ریاض السیر ۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آنحضرت کی سیرت سے متعلق اس نثری رسالے کو آگاہ سے منسوب کیا ہے لیکن زبان و بیان سے انشراح نہیں ہوتا کہ یہ رسالہ باقر آگاہ کی تصنیف ہے۔
۱۱۔ مراثی آگاہ ۔ چھ اوراق پر مشتمل یہ مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو کی زینت ہے (۶۸)۔ اس نسخے میں آگاہ کے تین سلام اور دو طویل مرثیے شامل ہیں۔
ڈاکٹر زور نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :
"یہ نسخہ دراصل "ریاض الجناں"۔ (دیکھو مخطوطہ جات نمبر ۶۲-۶۳) کا ضمیمہ ہے اور غالباً نسخہ نمبر ۶۳ کے ساتھ شامل تھا اور جلد بندی کے وقت غلطی سے علاحدہ کر دیا گیا ہے (۶۹)"۔
جہاں تک باقر آگاہ کے سنہ وفات کا تعلق ہے، سبھی محققین نے، جن میں پروفیسر سروری، مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر یوسف کوکن، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر سیدہ جعفر بھی شامل ہیں، ۱۲۲۰ھ بتایا ہے۔ اور مولوی محمد غوث کے تاریخی فقرے "قد مات فرد العصر" کا حوالہ دیا ہے۔ میر مبارک اللہ خاں راغب کے درج ذیل شعر سے بھی یہی سنہ نکلتا ہے :

سروشم سال فوتش گفت باآہ بفردوس معلّیٰ رفتہ آگاہ (۷۰)

صاحب "حدیقۃ المرام" (۷۱) اور "صبح وطن" (۷۲) کی تحقیق بھی یہی (۱۲۲۰ھ) لیکن یوسف کوکن کی کتاب میں ایک شعر درج ہے جس سے آگاہ کی وفات کا سنہ ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتا ہے :

قیل لی نجم بمدراس غرب ارخت، حالا باقر العلم ذھب، (نامعلوم) (۷۳)

اس کے علاوہ مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) جلد پنجم میں یہ قطعہ ملتا ہے جس کے آخری مصرعے سے بھی سنہ وفات ۱۲۲۱ نکلتا ہے :

چو رفت ازواردنیا بست آگاہ دریغا وا دریغا وا دریغا
پئے تاریخ آں از درد جاں کاہ نمودم سر بجیب فکر والا
بگفتا از سر ماتم ، سروشم فآہا ثمّ آہا ثمّ آہا (۷۴)

آخر الذکر قطعۂ تاریخ وفات اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ابوطیب خاں والا کا ہے، جو باقر آگاہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس تاریخی قطعے کے آخری مصرعے کے اعداد ۱۱۸۱ ہوتے ہیں اور اس میں سر ماتم یعنی "م" کے ۴۰ اعداد جمع کیے

PD 22) ص تو ۱۲۲۱ کا مجموعہ برآمد ہوتا ہے۔

حوالے اور حواشی

(۱، ۲) باقر آگاہ نے "روپ سنگار" کے نام سے نائکہ بھید کے موضوع پر ایک مثنوی لکھی ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ سنسکرت اور برج بھاشا پر بھی عبور رکھتے تھے۔ چناں چہ اس کتاب میں انھوں نے خود اپنے کبت اور دوہے بھی شامل کیے ہیں۔

(۳، ۴) "دیوان آگاہ" کے آخر میں ایک تلگو رباعی اور اردوی فرد بھی ملتا ہے۔

(۵) کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی فہرست ص ۴۳ (۶) تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد اول ص ۷۶ (۷) فہرست مخطوطات جامعۂ عثمانیہ ص ۱۷ (۸) باقر آگاہ ص ۲ (۹) یوسف کوکن نے آگاہ کی ولادت کی تاریخ ۱۴ رجب ۱۱۵۸ھ بتائی ہے۔ باقر آگاہ ص ۲ (۱۰) ڈاکٹر زور، اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو ص ۶۷۔ (۱۱) عطا کاکوی (مرتب) شمعِ انجمن ص ۱۵ (۱۲) نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ آگاہ نے تقریباً ۴۶ سال کے عرصے میں تقریباً ایک لاکھ اشعار کا ذخیرہ فراہم کیا (فہرست مخطوطات سالار جنگ ص ۳۴ (۱۳) محمد غوث خاں اعظم، صبح وطن ص ۹ (۱۴) مہدی واصف، حدیقۃ المرام ص ۲۶ (۱۵) قدرت اللہ خاں گوپا موئی، نتائج الافکار ص ۶۳ (۱۶) اردو مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ص ۱۸ (۱۷) کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۳۳ (۱۸) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد اول ص ۷۷ (۱۹) باقر آگاہ ص ص ۹۷ تا ۱۲۸ (۲۰، ۲۱) تاریخ ادب اردو جلد دوم (حصہ دوم) ص ۱۰۱۱ (۲۲) ص ۲۴۲ (۲۳) ص ۴۳۵ (۲۴) افسر صدیقی امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی جلد اول ص ۱۳ (۲۵) ڈاکٹر زور، تذکرہ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو جلد اول ص ۷۸ (۲۶) ڈاکٹر زور، تذکرۂ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو جلد سوم ص ۲۲۹ (۲۷) افسر صدیقی امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی جلد اول ص ۱۳ (۲۸) نصیر الدین ہاشمی، کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۸۲ (۲۹) ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر افضل اقبال، اماتی کتب خانہ خاندان شرف الملک (مدراس) کے اردو مخطوطات ص ۸۹ (۳۰) ڈاکٹر زور، تذکرۂ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد جلد اول ص ۷۸ (۳۱) من درپن کا سنہ تصنیف اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے "تھے بارہ سو کے اوپر چھ برس جب، ہوا یہ نسخۂ دل کش مرتب۔" (۳۲) باقر آگاہ نے "من جیون" کا سنہ تصنیف درجِ ذیل شعر میں لکھا ہے "بارہ سو اوپر تھے چھ برس جب، یہ نسخہ خوش ہوا مرتب۔" (۳۳) ڈاکٹر زور، تذکرہ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو جلد اول ص ۸۷ (۳۴) ایضاً ص ۷۷ (۳۵) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو و نثر کا آغاز و ارتقا ص ۴۳۵ (۳۶) فرائد در فوائد اس کا ہے نام۔ خدا اس کوں کرے خوبی سے اتمام (۳۷) نصیر الدین ہاشمی، کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۳۴ (۳۸) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۴۳۴ (۳۹) ڈاکٹر افضل اقبال، مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما ص ۱۶۸ (۴۰) ہیں سب ابیات اس کے بے تلبیس۔ دو ہزار اور چار سو چھبیس (۴۱) گلزار عشق کے مخطوط مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی (　　) کے اختتام پر ۱۴ اشعار کا ایک قصیدہ ہے جس کی ردیف "عشق" ہے اور جس کے آخری مصرعے "جلوہ زار طور ہے گلزار" سے تاریخ تصنیف ۱۲۱۰ھ برآمد ہوتی ہے (۴۲) نصیر الدین ہاشمی، کتب خانہ سالار جنگ کے اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۶۶۷ (۴۳) نصیر الدین ہاشمی، یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۵۵ (۴۴) افسر صدیقی امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی جلد پنجم ص ۱۱۰ و ص ۲۱۲ نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام عرفان عشق لکھا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۶۷۲ (۴۵) ڈ محمد غوث و ڈاکٹر افضل اقبال قاضی عبید اللہ لائبریری (مدراس) کے اردو مخطوطات (مخطوطہ نمبر ۴۴) ص ۳۱ (۴۶) فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ص ۱۸ (۴۷) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد اول ص ۷۷ (۴۸) کتب خانہ سالار جنگ

، قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص۶۷۲(۴۹) باقر آگاہ ص۱۳۶(۵۰) ایضاً ص۱۳۶(۵۱) کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں
وضاحتی فہرست ص۶۷۲(۵۲) افسر صدیقی امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی، جلد پنجم ص۱۵۹(۵۳) نصیر الدین
، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد جلد دوم ص ص۶۶-۲۶۵(۵۴) ص۱۳۶(۵۵) تذکرۂ اردو مخطوطات ادارہ
ات اردو جلد اول (مخطوطہ نمبر ۲۲۰) ص۲۴۱(۵۶) ایضاً ص۲۴۱(۵۷) اردو مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ص۱۷(۵۸)
۱۴(۵۸) کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص۴۲۶(۵۹) مدرسہ محمدی کے کتب خانے میں دیوان
، کا ایک نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے اس کے علاوہ علیم صبا نویدی نے آگاہ کے ایک اور قلمی دیوان کو ڈھونڈ نکالا
، (۶۰) دکنی رباعیاں ص۲۱۰(۶۱، ۶۲) ایضاً ص ص۲۱۰، ۲۱۱(۶۳) باقر آگاہ کے الفاظ یہ ہیں یہ حقیر نارس آگے تمیں جتیں
ں کے کیا فارسی اور کیا ہندی (اردو) میں سب اقسام میں تکلم کیا تھا اور ان سب کو بعد انتقال مرشد قدس سرہ دھو ڈالا
باچہ، دیوان آگاہ)(۶۴) ڈاکٹر افضل اقبال نے آگاہ کی غزلوں کی تعداد ۳۰۴ بتائی ہے۔ مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما ص
) غالباً ڈاکٹر اقبال نے آگاہ کی تصانیف کی تعداد کو غزلوں کی تعداد سمجھ لیا۔ (۶۵) کتب خانہ رحمانیہ کے اردو مخطوطات (مخطوطہ
۹۱) ص۱۱(۶۶) ص ص۴۴۵ تا ۴۴۷(۶۷) ص ص۸۳، ۸۴(۶۸) تذکرۂ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد اول ص۱۱۲
۶۹) ایضاً ص۱۱۲(۷۰) یوسف کوکن، باقر آگاہ ص۵۰(۷۱) مہدی واصف کے الفاظ یہ ہیں۔ "آپ نے ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ میں
ت پائی۔ ص۲۷(۷۲)، "چہار دہم ماہ ذی حجہ سنہ الف و مائتین و عشرین ہجری گریبان قبائے مستعار ہستی دریدہ۔" (۷۳) باقر
ص۵۰(۷۴) ص۲۷۲-۳۔

مضمون ۲۲

، "ذکر یار چلے۔ میں میرا بھی نام ہے۔ میں ان کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوا لیکن میرے دوستوں کی شرکت ہوا
تھی۔ مجھے کاموں سے فرصت نہ تھی۔ مخدوم محی الدین اور ان کے ہم خیال بھی میرے دوست تھے۔ ان میں سے اب
دے کے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ رہ گئے ہیں، اشتراکی لیڈر، انجمن ترقی اردو کے نائب صدر، مستند نقاد شعر و ادب اور
آبادی تہذیب میں ایک سربرآوردہ ہندو خاندان کی نشانی۔ مخدوم اشتراکی لیڈر پر نظر رکھنا اس کے یار غار نور الہدی (مرحوم
، وفات پاکستان میں ہوئی اور جن کی میں بڑی قدر کرتا تھا) کا سی۔ آئی۔ ڈی کے انسپکٹر کے عہدے کے سلسلے میں فرض
اور وہ دونوں میرے مکان پر ایک ساتھ چائے پینے موجود بھی ہوا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے مشہور خیاط صدیق صاحب
یق ٹیلرز) کی مجھ پر خاص عنایت یہ تھی کہ وہ نہ صرف میرے کپڑے مقررہ وقت سے قبل تیار کروا دیتے تھے، بلکہ کپڑا
اپنی پسند سے چنتے تھے۔ حالاں کہ ہر کس و ناکس ان کے پاس تیار کپڑوں کا تقاضا کرتے رہنے کا رونا روتا تھا۔ صدیق
ب کی وفات بھی پاکستان میں ہوئی۔ نور الہدی کی والدہ ملک شام کی تھیں اور ایک دفعہ انھیں علاج کے سلسلے میں مسجد
ا ہی سے ملحق مکان میں دیکھنے کا شرف ملا۔ ان کے شوہر اس مشہور مسجد کے امام تھے۔ ریاست کے نظام حکومت کی
، عام تو تھی لیکن اس میں انسانیت کے کچھ سفید اور کچھ رنگارنگ دھبے نظر بھی آجاتے۔ خواجہ حسن نظامی کی تقریر،
رنا تھ ٹیگور کا نظم سنانا، روف کا غزل گانا، ڈاکٹر بدر الدین بدر کا نظم سنانا۔ میرے کانوں میں اب بھی تازہ ہیں اور یا
، ختم بھی نہیں۔

زرینہ پروین

آرکائیوز میں محفوظ آصف سادس و آصف سابع کے فرمان

(سابق ریاست حیدرآباد کی تاریخ کے اہم ماخذ)

آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ریکارڈز کے کئی بیش قیمت اور اہم زمرے (Categories) محفوظ ہیں جن میں آصف جاہی ریکارڈز کو کئی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ریکارڈ کے اس زمرے میں کاغذات کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کاغذات مکمل اور ان کی ترتیب سلسلہ وار ہے۔ آصف جاہی دور کے یہ ریکارڈ قدیم دفاتر اور سکریٹریٹ کے ریکارڈ پر مشتمل ہیں۔ نظام الملک آصف جاہ اول اور سابق ریاست حیدرآباد کے ابتدائی دور میں نظم و نسق کے چودہ دفاتر تھے جو جاگیردار حکمرانوں کی تحویل میں تھے۔ ان دفاتر کے ریکارڈ فارسی زبان میں ہیں۔ سالار جنگ اول کی اصلاحات کے نتیجے میں سابق ریاست حیدرآباد میں سکریٹریٹ کے محکمے قائم ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخری حصے میں اردو کو ریاست میں فارسی کی بجائے سرکاری زبان کا موقف حاصل ہوا۔ حیدرآباد سکریٹریٹ ریکارڈ کا بیش تر حصہ اردو میں ہے لیکن کچھ سکریٹریٹ ریکارڈ انگریزی زبان میں بھی ہیں۔ آصف جاہی ریکارڈ تقریباً سوا دو سو سال ۱۷۲۴ء۔ ۱۹۴۸ء تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان ریکارڈوں کو کئی ذیلی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان ذیلی زمروں میں ایک اہم زمرہ نواب میر محبوب علی خان آصف سادس اور نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کے فرامین کا ہے۔ یوں تو آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ آصف جاہی ریکارڈوں کا آغاز ۱۷۲۴ء سے ہوتا ہے لیکن جہاں تک آصف جاہی حکمرانوں کے فرمانوں کا تعلق ہے وہ ۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء (عہد آصف سادس) سے دستیاب ہیں۔ سابق ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ اور علاحدہ فرمان کی اجرائی کے بارے میں ڈاکٹر داؤد اشرف اپنی تحقیق کی بنیاد پر لکھتے ہیں:

"آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ آصف جاہی ریکارڈ کے غائر مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سا ریاست حیدرآباد میں علاحدہ فرمان کے اجرا کا بتدریج ارتقا عمل میں آیا تھا۔ آرکائیوز میں محفوظ آصف جاہی ریکارڈوں م آصف سادس میر محبوب علی خان کے عہد سے فرمان ملتے ہیں اور وہ بھی ۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء سے جب کہ ان کی تخت نشینی ا حکمرانی کا آغاز ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء سے ہوا تھا۔ باقاعدہ اور علاحدہ فرمانوں کی اجرائی سے قبل یعنی ۱۳۱۹ھ سے قبل کے آرکا کے ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مدارالمہام کسی درخواست یا کارروائی کو اپنی تجویز یا سفارش کے ساتھ بذریعہ عر داشت آصف سادس کے ملاحظہ اور احکام کے لیے پیش کرتے تھے اور آصف سادس اس سلسلے میں اپنا علاحدہ فرم جاری کرنے کی بجائے اسی عرض داشت پر اپنا حکم لکھ دیا کرتے تھے۔ لائق علی خاں، سالار جنگ دوم اور آسمان جاہ بہادر۔ دور مدارالمہامی کی ایسی بہت سی عرض داشتیں آرکائیوز میں موجود ہیں جن پر آصف سادس نے بقلم خود تجاویز یا احکام تح کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہوتی تھی کہ مدارالمہام کی عرض داشت پر یا مدارالمہام کی جانب سے راس ملاحظے میں پیش کردہ کسی بھی شخص کی درخواست پر آصف سادس زبانی حکم دے دیا کرتے تھے اور مدارالمہام بعد م والی ریاست کا حکم متعلقہ عرض داشت پر اپنے قلم سے تحریر کر دیا کرتے تھے۔" (مضمون "داغ اور حیدرآباد" شمولہ کتا "حاصل تحقیق" ص ۵۵-۵۶)۔

آندھراپردیش آرکائیوز میں لائق علی خان سالار جنگ دوم مدارالمہام کی عرض داشتوں کا ایک رجسٹر موجود ہے ج

ین لائق علی خاں مدارالمہام کی جانب سے پیش کردہ ستاون (۵۷) عرض داشتیں موجود ہیں۔ جو ریاست کے نظم و نسق کے
تلف امور سے متعلق ہیں۔ ان تمام عرض داشتوں پر آصف سادس نے اپنے قلم سے بہت مختصر یا چند سطری احکام تحریر
یے تھے۔

آصف سادس اور آصف سابع کے جو فرمان آندھرا پردیش آر کائیوز میں محفوظ ہیں وہ سب کے سب اردو میں ہیں۔
صرف یہ فرمان بلکہ لائق علی خان سالار جنگ دوم مدارالمہام کی عرض داشتوں پر آصف سادس کے جو احکام درج ہیں وہ بھی
دو میں ہیں۔ بیش تر فرمان سفید، عمدہ اور دبیز BASKERVILE کاغذ پر تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ فرمان خاص تیار کردہ مجلد
جسٹروں میں رکھے گئے ہیں جنہیں چک کٹ بک کہا جاتا ہے۔ ان فرمانوں پر دونوں حکمرانوں کے مونوگرام موجود ہیں اور
رمان پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ آندھرا پردیش آر کائیوز میں ان آصف جاہی حکمرانوں کے علاوہ مختلف خاندانوں جیسے بہمنی
دل شاہی، قطب شاہی اور مغل سلاطین کے فرمان بھی موجود ہیں لیکن ان فرمانوں میں سے کسی بھی فرمان پر فرمان
انے وقت کے دستخط ثبت نہیں ہیں۔ اسی دور میں فرمانوں پر حکمران اپنے دستخط ثبت نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر شاہی
مہر ثبت کی جاتی تھی۔

آصف سابع کے اکثر فرمانوں پر ان کے دستخط کے نیچے معتمد پیشی، صدرالمہام پیشی اور صدر اعظم کے بھی دستخط
وجود ہیں لیکن تمام فرمانوں پر ان عہدہ داروں کے دستخط موجود نہیں ہیں۔

آصف سادس و آصف سابع کے ملاحظے اور احکام کے لیے عرض داشتیں پیش ہوا کرتی تھیں۔ جن پر ان کے فرمان
صادر ہوا کرتے تھے۔ ایسے تمام فرمانوں میں عرض داشتوں کے حوالے موجود ہیں لیکن خصوصی امور میں کسی بھی عرض
داشت کی پیش کشی کے بغیر بھی فرمان صادر کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے فرمانوں کی تعداد بھی کافی ہے جن کے
ذریعے درخواستوں کو واپس کرتے ہوئے ان کے بارے میں رائے دینے یا نوٹ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چند اہم فرمانوں کے آخر میں آصف سابع نے یہ حکم تحریر کیا ہے کہ ان فرمانوں کو عوام کی اطلاع کے لیے جریدہ
غیر معمولی میں شائع کیا جائے چناں چہ ایسے تمام اہم فرمان جریدہ غیر معمولی میں شائع کیے گئے۔ بعض اردو فرمانوں کے
ساتھ ان کے انگریزی تراجم بھی شامل ہیں۔

آصف سادس اور آصف سابع کے فرمانوں پر دائیں جانب اوپر کی طرف ان مقاموں کے نام درج ہیں جہاں فرمان
کے اجرا کے وقت حکمران مقیم تھے۔ مثلاً آصف سادس کے فرمانوں پر حویلی قدیم، پنج محلہ، سرداروِلا، سردار نگر وغیرہ
تحریر ہیں جب کہ آصف سابع کے اکثر فرمانوں پر کنگ کوٹھی لکھا ہوا ہے۔ شہر کے باہر کسی مقام پر قیام کرنے کی صورت پر
فرمان پر اس مقام کا نام لکھا جاتا تھا جہاں پر شاہی کیمپ ہوا کرتا تھا جیسے کیمپ نرسم پیٹ، کیمپ محبوب آباد وغیرہ۔

آصف سادس اور آصف سابع کے فرمانوں کو محکمہ واری اساس پر تقسیم کرکے انھیں علاحدہ علاحدہ مجلد رجسٹروں
(چک کٹ بک) میں رکھا گیا ہے۔ ایسے ۳۳۵ رجسٹروں میں یہ فرمان محفوظ ہیں۔ حسب ذیل جدول کے ذریعے ان فرمانوں
کے بارے میں ضروری تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

نشان سلسلہ	محکمہ کا نام	چک کٹ بک کی تعداد	سنین
1-	محکمہ فینانس	۷۵	۱۳۱۹ھ-۱۳۶۶ھ ۱۹۰۱ء-۱۹۴۶ء
2-	محکمہ داخلہ	۹۵	۱۳۱۹ھ-۱۳۶۶ھ ۱۹۰۱ء-۱۹۴۶ء
3-	محکمہ مال	۱۳۰	۱۳۱۹ھ-۱۳۶۶ھ ۱۹۰۱ء-۱۹۴۶ء
4-	محکمہ امور دستوری	۱	۱۳۵۵ھ-۱۳۶۵ھ ۱۹۳۶-۱۹۴۵ء
5-	نیم سرکاری	۱۳	۱۳۰۷ھ-۱۳۶۸ھ ۱۹۴۱ء-۱۹۴۸ء
6-	پیشی خداوندی سیاسیات (راز)	۷	۱۳۴۹ھ-۱۳۵۸ھ ۱۹۳۰ء-۱۹۴۹ء
7-	صنعت و حرفت ، صیغہ زراعت، صیغہ امداد باہمی صیغہ معدنیات ، صیغہ آبکاری، صیغہ طباعت	۱۲	۱۳۳۷ھ-۱۳۶۷ھ ۱۹۱۸ء-۱۹۴۷ء
8-	نظامت دارالقضاہ حیدرآباد	۲	۱۳۴۴ھ-۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء-۱۹۳۴ء

اوپر کی جدول سے ظاہر ہے کہ یہ فرمان بیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سال کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں آ
سادس کے آخری دس گیارہ سال کے فرمان اور آصف سابع کے مکمل ۳۷ سالہ دور کے فرمان موجود ہیں اس طرح آ
سادس کے فرمانوں کے مقابلے میں آصف سابع کے فرمانوں کی تعداد اب بہت زیادہ ہے۔

حال ہی میں آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اس آرکائیوز میں محفوظ فار
اردو ریکارڈوں کی ایک گائیڈ انگریزی زبان میں شائع کی گئی ہے جس میں آصف جاہی ریکارڈوں کے ایک ذیلی زمر
حیثیت سے علاحدہ طور پر ان فرمانوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

یہ فرمان بیسیوں موضوعات اور امور کا احاطہ کرتے ہیں۔ کسی بھی پڑوسی ریاست سے نزاعی امور کے بارے
گفت و شنید کرنے کے لیے فرمانوں کے ذریعے کمیشنوں اور ان کے ارکان کا تقرر کیا گیا تھا۔ برٹش ریذیڈنسی اور برطان
سے مختلف مسئلوں پر گفت و شنید کے بعد حکومت ریاست حیدرآباد کی پالیسی کے بارے میں فرمان صادر کیے گئے
آصف سابع نے اپنے فرمانوں کے ذریعے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وفود کا تقرر کیا تھا اور گفت
کے لیے رہنمایانہ ہدایتیں دی تھیں۔ یہ تمام فرمان آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ آصف سابع کا دہ ف

بھی دستیاب ہے جس میں انھوں نے اپنی رعایا کو ہدایت دی تھی کہ وہ میجر جنرل چودھری کے احکام اور ہدایتوں پر عمل کریں آصف سابع کے کئی ایسے فرمان بھی ہم دست ہیں جن میں انھوں نے اپنی رعایا سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن و امان برقرار رکھنے کی اپیل کی تھی۔ انھوں نے ہندو مسلم رعایا کو اپنی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا۔

سابق ریاست حیدرآباد میں باب حکومت کا قیام اس ریاست کی دستوری تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ باب حکومت کے قیام، صدور اعظم اور صدالمہاموں کے تقرر سے متعلق بھی فرمان موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست میں اہم عہدہ داروں کے تقررات کے لیے جو احکام صادر کیے گئے تھے ان کے بارے میں بھی فرمان موجود ہیں جن کے ذریعے سماجی برائیوں اور قابل اعتراض سماجی رسوم پر پابندی عائد کی گئی تھی جیسے بیگار کی موقوفی اور عشرۂ شریف میں سوانگ بھرنے اور ناچنے کودنے پر امتناع وغیرہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کے قیام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر اور اساتذہ کے تقرر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، آندھراپردیش یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور کئی تحقیقی اداروں کو گراں قدر مالی امداد دی گئی تھی۔ اس بارے میں تمام فرمان موجود ہیں۔

سابق ریاست حیدرآباد میں اردو کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی اعلیٰ پیمانے پر سرپرستی کی گئی تھی۔ انھیں کتابیں لکھنے اور علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہنے کے لیے وظیفے جاری کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ علمی، ادبی اور شعری تصانیف کی تکمیل کے لیے مالی اعانت بھی دی گئی تھی۔ ان سے متعلق بھی فرمان محفوظ ہیں۔ مسجدوں، مندروں، کلیساؤں اور اہم تاریخی عمارتوں کی مرمت اور تحفظ اور بعض اہم مذہبی تصانیف کی تکمیل اور اشاعت کے لیے بھی مالی امداد منظور کی گئی تھی۔ اس بارے میں بھی فرمان محفوظ اور دستیاب ہیں۔

درحقیقت آصف سادس اور آصف سابع کے یہ فرمان اس عہد کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ نو ریاست حیدرآباد کی تاریخ کے ایک دور کے نہایت اہم اور قیمتی ماخذ ہیں۔ اگر آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ متعلقہ کارروائیوں کے ساتھ ان فرمانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نہ صرف سابق ریاست حیدرآباد کی تاریخ کے ایک دور پر مستند مواد پہلی بار منظر عام پر آئے گا بلکہ اس دور کی سیاسی، سماجی، انتظامی، معاشی اور ثقافتی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی پڑے گی۔

فرحت زاہد

آسیب

کوئی سایا ہے، صدا ہے کہ ہے آسیب کوئی
روزِ اول سے مرے ساتھ ہے جو
بچپنے نے اسے تتلی کے پروں پر لکھا
اور لڑکپن میں سلگتا رہا صندل بن کر
بہکے بہکے سے تراشیدہ صنم خانوں میں
عمر کے سبز خیابانوں میں

اک سبک چاپ تعاقب میں رہی
ایک رس ہے کہ سماعت میں گھلا کرتا ہے
ایک نشہ ہے کہ سانسوں میں بہا کرتا ہے
کبھی فرہاد کو یہ تیشہ تھما دیتا ہے
کبھی صحراؤں سے مجنوں کو صدا دیتا ہے
گیت میں، رقص میں، رنگوں میں، یہ در آتا ہے
کوئی بھی رت ہو، یہ بادل تو برس جاتا ہے

پوجتے ہیں اسے ہم چھو نہیں پاتے اکثر
ہم تو پھولوں سے، ستاروں سے، کبھی شاموں سے
کبھی آوازوں سے، آنکھوں سے، خود اپنی جاں سے
قرض لیتے ہیں، دریچوں میں سجانے کے لیے
زخمِ احساس کا ہر تار جگانے کے لیے
جب بھی وحشت کوئی طوفان اٹھاتی ہے
وجد میں اپنے ہی سائے کو کچل دیتے ہیں
جسم خوابوں کا چٹانوں پہ پٹخ دیتے ہیں
پھر بھری رت کسی لہر میں گھل جاتی ہے
خود بھی پیاس کے دریا میں اتر جاتی ہے

حسن فرخ

… دریا میں فنا ہو جانا

وہ بات ------ جو کہ راز ہے
جبلتوں کے آئینہ میں جھانکتے ہوئے بدن کے سحر کا
ثبوت ہوش سے شعورِ ذات تک
نکاتِ فلسفہ کی پیچ پیچ لہر کا

جو دوپہر کی اجلی اجلی گرم ساعتوں سے
شام کی خنک خنک اداسیوں میں ڈوبتے
حرارتوں کے سرد پڑتے جذبۂ انا کے شوقِ بے جہات کا
خموشیوں کی سرحدوں سے، قہقہوں کی بے کھنک تک
ایک پل صراط ہے
ادھر گداز جسم کی لپک
سلگتی راکھ، دائرے کے سرمئی حصار
ابلتے جوہروں کے اتصال کی کہانیاں
صدف صدف ہیں بارشوں کی منتظر
بدن، مسک مسک کے پھیلتی اکائیوں کے لمس
کسمساتی ٹوٹتی سحر
کی لذتوں سے ہم کنار
سر بلک بلک کے تار تار

ادھر سپردگی کی رو، حواس گنگ، انتشارِ ذات کی پکار
وہ بات ------ لاشعور میں دبی ہوئی
لہو کے قطرہ قطرہ میں بسی ہوئی
وہ بات --- ایک راز
ذات سے صفات تک
سیاہیوں کی بے بصارت کے جزوِ بے ثبات تک
وہ بات، راز تھی تو
نور کے لبادے کیوں اتر گئے

کیشوراؤ جادھو

پرانا شہر میرا

ہر لمحہ
میرا شہر مجھے یاد آتا ہے
ہر صبح تلجا اور ھاگو تم
ہر سال محرم کا ہوا ہوتا غم

لیکن اب تو ہر گلی میں یزید ہیں
اور محرم کا تو غم ہرا ہی ہوتا جاتا ہے
(کہاں ہیں حسین، کہاں ہیں حسین؟)

ہر بستی لنکا ہے جن میں سیتائیں قید ہیں
لیکن ہنومان کہیں نہیں۔

میرا شہر
جس کی گلیوں سے یادیں وابستہ ہیں
جس کے درو دیوار مجھ سے بولتے تھے
اس شہر کی داستان کیا کہوں، جو مجھ سے چھوٹ چکا ہے۔

جہاں سویرے سویرے ملا مٹی کی صدا آتی تھی
اور دوپہر رنگ برنگی چوڑیاں بیچنے والوں کی
جہاں کلائیاں چوڑیوں کو خوب صورتی بخشتی تھیں۔

اس کی چوڑیوں سے بھری کلائی
جو چہرے سے پہلے چلمن کے باہر نظر آتی تھی۔
نہیں معلوم آج وہ کہاں ہے
گم ہو گئی ہے وہ میرے شہر کی طرح
جہاں ایک زمانے میں نگاہوں میں خنجر نہیں پیار ہوتا تھا۔

اس شہر کی داستان کیا کہوں
جس کے درو دیوار مجھ سے بولتے تھے

●●●

اقبال متین

O

کبھی بادل، کبھی اڑتے ہوئے آنچل مانگے
دل عجب شے ہے کہ اشکوں میں بھی کاجل مانگے

تو اگر سامنے آجائے تو نظریں جھک جائیں
تو نہیں ہو تو یہ دل تجھ کو مسلسل مانگے

بھری برسات میں صحرا کا بگولا ہوں میں
خشک صحرا میں محبت مری جل تھل مانگے

تو اگر ساتھ ہو میں ڈھونڈنے نکلوں خود کو
تو نہیں ہو تو مرا دل تجھے پل پل مانگے

دار پر چڑھ کے سچائی پہ لرزتا ہوا دل
کیا قیامت ہے کہ ہر جھوٹ پہ مقتل مانگے

سادگی اس کی؛ کبھی نظروں میں کھب جائے متین
اس کا پیراہنِ رنگین کبھی جھل جھل مانگے

O

تم کہاں جا کے مری زحمتِ جاں کو سمجھ
مجھ میں بس جاؤ، مرے دردِ نہاں کو سمجھ

ایسی افتاد تھی لب سی لیے ہم نے لیکن
ہم پہ جو بیت گئی اس کی زباں کو سمجھ

ہم کو خوش آیا ہے یوں جاں کا زیاں اب کے برس
چپ رہو تم بھی اگر جاں کے زیاں کو سمجھ

یہ بھی سچ ہے کہ بتوں میں بھی دھڑکتے دل ہیں
تم حرم میں بھی کبھی حسنِ بتاں کو سمجھ

شکر کرنا ہے تو پھر پھوٹ کے رو لو اک شب
خشک آنکھوں کی مگر طرزِ فغاں کو سمجھ

مجھ سے کل رات کوئی نیند میں کہتا تھا متین
خواب دیکھو نہ کبھی اس کے زیاں کو سمجھ

راشد آذر

○

تمام عمر یہ غم تھا کہ میرے پاس کوئی نہیں
خوشی یہ ہے کہ مرے واسطے اداس کوئی نہیں

ہمیشہ یاس میں ڈوبا رہا ، یہ فکر بھی نہ ہوئی
کہ میرے دل کے خزانے میں اب تو آس کوئی نہیں

ستارے یوں تو ہمیشہ بھلا نصیب لکھتے رہے
مگر یہ کیا ہے کہ میرے لیے تو راس کوئی نہیں

ہر ایک جذبہ جب اک حد میں ہو تو دل پہ بار نہ ہو
تمام جذبے اہم ہیں کہ ان میں خاص کوئی نہیں

خدا پرست تو آزر بہت ملے ہیں ہم کو مگر
عجب زمانہ ہے یہ ، مائلِ سپاس کوئی نہیں

نوٹ: یہ غزل کسی مروجہ بحر میں نہیں ہے۔ اس کا وزن میری اختراع ہے۔ "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔"

حسن فرخ

○

ہیں چرانے ہونے دن رات کہیں بھاگ چلو
چاک ہے پیرہنِ ذات کہیں بھاگ چلو

لمس ہی لمس ، ادھورا سا اٹھا ہوا لمس
برف بن جائیں نہ جذبات کہیں بھاگ چلو

کوئی شکوہ ہے ، نہ دوری ہے ، نہ فرقت ، نہ وصال
رہ گئی صرف ملاقات کہیں بھاگ چلو

ہوتے ہیں مصلحتیں ذہن کی گہرائی میں جیسے
موت جیتے ہیں یہ لمحات کہیں بھاگ چلو

دن تو سورج کی تمازت میں جلا اور بجھا
ہم سے کچھ پوچھ نہ جلے رات کہیں بھاگ چلو

***

مصطفیٰ شہاب

(لندن)

O

جتنے موسم گزرے تھے پھر ان کو کھا حیرانی نے
سب کو اپنے بیچ میں ڈالا ہے ایک چڑیا ڈھانی نے

ہم سمجھے تھے اس کے سفر کی منزل صرف سمندر ہے
جانے کتنے گھاٹ بھگوئے اس دریا کے پانی نے

میں تو تیری یاد کی چادر سر پہ تان کے سویا تھا
اس چادر میں آگ لگا دی آ کے رات کی رانی نے

خیر ہوئی جو ہم جیسوں کو کلبۂ جہاں میں کچھ نہ ملا
نقل مکانی کر دی آساں گھر کی بے سامانی نے

میں نے اس سے ہنستے ہنستے صرف اسی کی باتیں کیں
اس کو میری بات بتا دی میری اس نادانی نے

***

O

باہر دیکھا دکھ کا میلا ، تب مجھ کو احساس ہوا
سکھ کتنا گھر کے اندر تھا ، تب مجھ کو احساس ہوا

برسوں کس کا پانی پی کر سرسوں پھولی کھیتوں میں
سوکھ گیا جب دریا سارا ، تب مجھ کو احساس ہوا

مانگنے والے ہاتھ سے کیسے خون انا کا رستا ہے
میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا ، تب مجھ کو احساس ہوا

میں ہی تنہا رہتے رہتے بھول گیا آدابِ سخن
جب وہ مجھ سے مل کر لوٹا ، تب مجھ کو احساس ہوا

رات دیے نے جلتے جلتے شکلِ سحر سمجھائی شہاب
پھیلا جب آنگن میں اجالا تب مجھ کو احساس ہوا

***

عوض سعید

بند کمرے کی صدا

فرحت کا خط آتے ہی میں نے مکان کی تلاش شروع کر دی مگر کہیں بھی کرائے کا مکان مل نہ سکا۔ پگڑی بھی کچھ اتنی اونچی تھی کہ بساط سے باہر۔ ہر دوسرے تیسرے دن جب مسلسل فرحت کے خط آنے لگے تو مجھے اپنے آپ سے ایک وحشت سی ہونے لگی۔ وہ جو کہتے ہیں نا۔ کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ آخر ایک دن مکان مل ہی گیا۔ میں نے فرحت کو ٹیلی گرام سے اطلاع دی اور لاج کا کمرہ چھوڑ چھاڑ کر نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ فرحت آتے ہی گھر کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہو گئی۔

جب مجھے یہ احساس ہو گیا کہ ہم پوری طرح Settle ہو گئے ہیں تو میں نے بعض احباب کی دعوت بھی کی۔ سب ہی دوستوں نے کھانے کے ساتھ جب مکان کی تعریف شروع کر دی تو جی خوش ہو گیا۔ فرحت کا چہرہ بھی مسرت سے کھل اٹھا۔ مگر میں نے یہ بات محسوس کی کہ موہن نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔

کیا بات ہے موہن تم چپ کیوں ہو۔ کیا تمھیں یہ مکان پسند نہیں۔؟

میں نے یہ کب کہا۔ اتنے سارے لوگوں نے اس کی تعریف کی۔ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ پہلے پلائیں۔ یہاں سے ہٹ کر چائے پینے کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے۔

چائے آ بھی گئی اور سب لوگوں نے پی بھی۔ مگر موہن پھر بھی چپ رہا۔

پانچ منٹ۔ دس منٹ۔ آدھا گھنٹہ۔ اب موہن اونگھ رہا تھا۔

عجیب چائے پلائی تم نے۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔

کیا تم لوگ بھی ایسا محسوس کر رہے ہو۔

نہیں ہم تو کچھ زیادہ ہی چست ہو گئے ہیں۔

مجھے محسوس ہوا جیسے موہن خواہ مخواہ اسے گرانے پر تلا ہوا ہے چونکہ وہ خود ایک معمولی لاج میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اسے یہ صاف ستھرا مکان برداشت نہیں ہو رہا ہے۔

اگر تمہیں نیند محسوس ہو رہی ہو تو اپنی لاج میں جا کر سو جانا۔

کیوں کیا میں یہاں نہیں سو سکتا۔

سو تو سکتے ہو۔

تو سمجھ لو میں سو گیا۔ میں جب تک خود نہ اٹھوں۔ مجھے ہرگز ڈسٹرب نہ کرنا۔

سارے لوگ چلے گئے مگر وہ یوں ہی سوتا پڑا رہا۔ فرحت نے مجھ سے کہا بھی کہ اسے اٹھاؤ۔ وہ اب ہمارے لیے بوجھ بنتا جا رہا ہے۔

لیکن اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔ فرحت بھابی میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ میرے لیے ایک کپ کافی لے آنا۔ فرحت نے بادل ناخواستہ کافی کا ایک پیالا اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

کیاآپ لوگ کافی نہیں پئیں گے۔؟
یہ وقت کافی پینے کا نہیں ہے۔
اتنی عمدہ کافی پینے کے بعد اب میں زیادہ دیر یہاں بیٹھنا نہیں چاہتا۔اس لیے خداحافظ۔
خداحافظ۔
جب وہ چلا گیا تو سب نے سکون کی سانس لی۔
کیا کیا دوست پال رکھے ہیں آپ نے۔
کیا مطلب۔؟
مطلب وطلب کچھ نہیں۔اگر موہن نے پھر کبھی اس گھر میں قدم رکھا تو میں اس کی ٹانگ توڑ دوں گی۔
ایک دن موہن گھر آیا۔ مگر واقعی اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ پاؤں پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لاج میں پڑے پڑے وحشت ہو رہی تھی۔اس لیے یہاں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔ مطمئن رہیے۔
کل بڑے بازار کے چوراہے پر ایک آٹو والے نے ٹکر دے دی اور چلتا بنا۔ میرے پاؤں سے خون ٹپک رہا تھا پھر ایک بھلے مانس نے مجھے گورنمنٹ ہسپتال پہنچایا۔ پھر ڈریسنگ کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔
وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر کچھ سوچ کر کہا۔ پھر آؤں گا بشرط صحت وفرصت۔
ہاں ہاں ضرور آنا۔ تمھارا ہی گھر ہے۔
گھر نہ سہی وہ کمرہ ہی سہی جو مدتوں سے بند پڑا ہے۔ مگر ہاں یاد رکھنا۔اس کمرے کو ہرگز نہ کھولنا۔ ورنہ ساری نحوست گھر میں پھیل جائے گی اور پھر تم کہیں کے نہ رہو گے جو بات مجھے کہنی تھی وہ کہہ دی۔آگے تمھاری مرضی۔
میں خوف زدہ سا ہو کر رہ گیا۔آخر یہ بات موہن نے اس سے کیوں کہی۔اس بند کمرے میں کونسا راز چھپا ہے۔ وہ کونسی نحوست ہے جو کمرہ کھلنے پر اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔
وہ کہنے کو تو چلا گیا لیکن میری پریشانی اور بے چینی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔
میں نے فرحت کو آواز دی۔
وہ چلا گیا اب تم یہاں آ سکتی ہو۔
خدا کا شکر ہے کہ وہ آج جلد چلا گیا۔ورنہ ہمیشہ کی طرح چمٹ جاتا تو مشکل ہو جاتی۔
جاتے جاتے اس نے ایک عجیب بات کہہ دی جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ایسی کیا بات کہہ دی اس نے کہہ رہا تھا۔وہ بند کمرہ ہرگز نہ کھولنا۔
وہ اسٹور روم جو مدت سے بند پڑا ہے۔
ہاں وہی اسٹور روم۔
اسٹور روم پر یاد آیا۔ کل ایک عجیب حادثہ ہو گیا۔اسٹور روم کا تالا اچانک خود بخود کھل گیا۔یہ بات میں نے تم سے اس لیے چھپائی کہ تم بے جا وسوسوں میں نہ پڑ جاؤ۔
باہر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

یں نے فرحت کو آواز دی۔ کوئی غیر معمولی بات ہو جانے تو مجھ سے چھپانا نہیں۔ اس سے الجھنیں بڑھتی ہیں۔

ندہ ایسا ہی ہو گا۔

ر دن سکون سے گزر گئے لیکن ایک دن گھر کی ماما نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں آواز دی۔ بی بی جی۔ ذرا ادھر آیئے

نور روم جھاڑ رہی تھی کہ مجھے کوڑے میں یہ تصویر ملی۔ ہو بہو موہن بابو جیسی۔

رحت نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے تصویر لی اور حیران ہو کر رہ گئی۔

ے یہ تو موہن ہی ہے۔

را یہ تصویر تو دیکھیے۔

سویر۔ کس کی تصویر۔؟

ے یہ تو موہن ہے۔ اس کی تصویر یہاں کس طرح آگئی۔ وہی ناک وہی ہونٹ، وہی آنکھیں۔ وہی چشمہ۔ کہیں یہ

ی کی تو نہیں۔ مگر اسے ملکیت کے کھولنے کا احساس بہت تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک باہر کسی نے

ٹھایا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو باہر موہن لکڑی ٹیک کر کھڑا تھا۔

ماؤ بھائی اندر آجاؤ۔ یہ گھر تو تمہارا ہی ہے۔ میں تو محض کرایہ دار ہوں۔

ج تم نے اس بند کمرے کو کھول کر وہی غلطی کی جو برسوں پہلے میں نے کی تھی۔

مگر وہ تصویر۔؟

میری نہیں ہے۔!!

قدیر زماں

جمنا پار

اس واقعے کو سمجھنے کے لیے ضروری نہیں کہ دلّی کی اس سڑک کا ہی ذکر کیا جائے جہاں یہ گزرا ہے۔ وہ کوئی او
سڑک ہو سکتی ہے۔ لیکن لوگوں نے جس واقعے کو چند منٹ تک چلتے چلتے ہی دیکھا وہ اسی جگہ پر ہوا ہے۔ سڑک کے او
اوور برج ہے۔ اس پر رنگ روڈ ہے جو شمال کی طرف آگے چل کر اوٹر رنگ روڈ میں بدل گئی ہے۔ اوور برج کے نیچے
سڑک مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہے اس پر جمنا برج ہے۔ فلائی اوور برج کے نیچے جہاں یہ واقعہ ہوا وہاں ریلنگ سے
ہوا مثلث نما چھوٹا سا پلاٹ ہے جو ٹریفک کی سہولت کے لیے بنایا گیا ہے۔

جمنا برج کی طرف سے ہلکے سرخ رنگ اور مہین بالوں میں ایک توانا کتا ٹریفک سے بچتا بچاتا مثلث کی ریلنگ کے
سے باہر ٹرالک پر نظر رکھے آہستہ آہستہ آئی۔ٹی۔او کے علاقے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اچانک شمال کی جانب سے ایک دو
اونچا پورا اور چھریرے بدن کا اور جس کا رنگ ملگجی اور سیاہی مائل ہے برق کی طرح پھرتی سے چھلانگیں لگاتا ہوا ریلنگ
مثلث نما حصار میں داخل ہو گیا ہے۔ ایک کتا ریلنگ کے حصار کے باہر ہے اور دوسرا اس کے اندر۔ دونوں اپنی ا
خاموش کھڑے ہیں۔

سہولت کی خاطر ہلکے سرخ رنگ اور مہین بالوں والے کتے کو ہم الف کا نام دیتے ہیں اور ملگجی رنگ اور سیاہی
کتے کو جیم کا۔

الف اور جیم کے بیچ میں ریلنگ کوئی تین فٹ اونچی ہے۔ مغرب کی جانب چند گز کے فاصلے پر جہاں مثلث
ختم ہو جاتا ہے جیم کے باہر نکلنے کا راستہ ہے اور چاہے تو وہیں سے الف حصار کے اندر آ سکتا ہے۔ جیم دور سے تیز
دوڑتا ہوا آیا تھا اسی لیے پھلانگ لگا کر حصار کے اندر آ سکا تھا۔ اسے اب کھڑے ہو کر حصار کے باہر دوسری طرف جہاں
کھڑا ہے، پھلانگ لگانے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ الف کے قریب پہنچ چکا ہے اور درمیان میں ریلنگ کے باوجود اسے
جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ جیم تن کر کھڑا ہے اور اس کی تمام تر توجہ الف کی طرف ہے جب کہ الف کی نظریں معصومانہ
میں سڑک کی طرف لگی ہیں لیکن کبھی کبھی وہ آنکھیں چرا کر جیم کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ ریلنگ کی بدولت
اس پر اچانک جھپٹ نہیں سکتا۔ لیکن یا تو عادتاً یا غیرت کی وجہ سے وہ آگے بڑھنا بھی نہیں چاہتا کہ دشمن کی گھات سے
بھاگنے کی کوشش کرنا بزدلی ہوگی۔

دیر تک دونوں کے موقف میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ یوں ہی کھڑے رہے۔ الف معصوم ڈھیلے ڈھالے
میں اور جیم تنی ہوئی حالت میں۔

تھوڑی ہی دیر میں الف نے محسوس کر لیا کہ جیم کو کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ شاید وہ ایک آوارہ کتا ہے ورنہ
بیچارے پر جو اپنے کسی کام پر جا رہا ہے اس طرح کیوں جھپٹ پڑتا۔ اس خیال کے آتے ہی الف نے بڑے انکسار سے
طرف اپنی گردن موڑی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کو اپنی طرف دیکھ کر جیم نے غصہ کیا۔

"غر۔"

یہ سن کر الف نے کہا۔ ارے بھائی ابھی تو میں نے تم سے کچھ کہا بھی نہیں ہے اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ میں لڑائی کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ پھر تم میرا راستہ کیوں روک رہے ہو۔

یہ سن کر جیم نے پھر آواز نکالی۔

"غر-ر-ر۔۔

الف نے اپنا سر سیدھا کر لیا۔ یہ بندہ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ میں اس سے کیا بات کروں۔ کیسے کروں۔ رہے کہ میں یہاں بیٹھ جاؤں۔ شاید اس کی سمجھ میں آجائے کہ میرا ارادہ برا نہیں ہے۔ مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر شاید وہ یہاں چلا جائے۔ یہ سوچ کر الف جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ پھر اپنی گردن بغیر کسی طرف موڑے اس نے آہستہ سے کہا:

"لو۔ میں نے تمھاری بات مان لی ہے۔ میں اگر تم کو بڑا نہ سمجھتا تو اس طرح دم دبا کر بیٹھ نہ جاتا۔ اب تو تم اپنی راہ سکتے ہو۔۔

یہ سن کر بھی جیم جوں کا توں کھڑا رہا۔

الف بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ پھر وقت کے بیکار گزرنے کا احساس ہوا تو وہ چپکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس نے اپنی ے حرکت نہیں کی کہ مبادا اس کی حرکت جیم کو ناگوار گزرے۔ کھڑے ہو کر اس نے پھر ایک بار ملتجی نظروں سے جیم کی ، دیکھا۔ اس دفعہ جیم کی آواز اور بھی اونچی تھی۔

"غر-غر۔۔

الف نے اپنا سر جیم کی طرف سے پھیر لیا اور ٹرالک کی طرف ادھر ادھر حسرت سے تکنے لگا۔ کتنے اچھے شریف لوگ لہ بڑی تیزی سے اپنی اپنی سمت رواں ہیں۔ اگر ان لوگوں کو اپنے کام کا خیال نہ ہوتا تو یہ بھی جیم کی طرح سڑک گشتی کرتے، مجھ ، کسی کام پر جانے والے سے الجھ پڑتے۔ اسے پھر یہ بھی خیال ہوا کہ ان شریف لوگوں میں سے کسی ایک کی نظر ان ں پر پڑ جائے تو شاید اس قضیے سے نجات دلائیں۔ حسرت اور امید بھری نظروں سے وہ تھوڑی دیر تک ٹرالک کے ایک ، شخص کی طرف دیکھتا رہا۔ موٹروں اور موٹر سیکل پر جانے والوں سے تو اسے کوئی توقع نہ تھی لیکن شاید کوئی پیدل راہرو اس مدد کو آجائے۔ انسان تو دوسروں کے ذہن کو چٹکیوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ میری طرف ایک نظر پڑ جائے تو انھیں معلوم ہانے گا کہ میں لڑائی جھگڑے سے کتنا کتراتا ہوں۔ پھر مجھے وہ اس جاہل کتے سے نجات دلائیں گے لیکن کسی کے پاس اتنا ت نہ تھا کہ وہ ان کی طرف دیکھ کر اپنی رفتار ہی دھیمی کر لیتا۔ ان لوگوں کے ذہن میں ٹرالک سے بچنے اور وقت پر اپنی جگہ ہنے کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

انسانوں سے مایوس ہو کر الف نے سوچا۔ کیوں نہ وہ تھوڑی سی ہمت کر لے۔ دیر سے کھڑے کھڑے یہ جاہل کتا بھی ھکیا ہو گا۔ آخر اسے بھی تو کہیں نہ کہیں جانا ہی ہو گا۔ کیوں نہ میں دو چار قدم آگے بڑھ کر دیکھ لوں۔ اس خیال کے آتے ہی ے نے اپنا اگلا پاؤں اٹھایا۔ اس نے وہ پاؤں ابھی زمین پر رکھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے گرگراہٹ ہوئی۔

غرر۔ غرر۔ غرر۔ جیم کا منہ لمبا ہو گیا۔ درمیان میں ریلنگ نہ ہوتی تو شاید وہ الف کی گردن دبوچ لیتا۔

ریلنگ کی دوسری طرف جیم دو قدم آگے بڑھ چکا تھا۔

الف کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ واپس لوٹتا اور اپنے کام کو اس دن کے لیے ملتوی کر دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ اگر وہ یوں ہی آگے بڑھتا رہا تو جیم اس سے بھی تیز چل کر یا دوڑ کر مثلث کا حصار پار کر سکتا ہے۔ تھوڑے سے لے پر اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اس حصار سے باہر نکلنے کا راستہ ہے۔ وہاں پہنچ کر تو دونوں کا آمنا سامنا ہو گا۔ یہ سوچ کر

الف نے اپنا قدم روک لیا۔ پھر دوسرا قدم آگے نہیں بڑھایا۔

اب الف نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگا۔ میں یوں ہی آگے بڑھتا رہوں تو یہ جاہل بھی ریلنگ کے ساتھ ساتھ آ رہے گا۔ ممکن ہے یہ مجھ سے آگے نکل جانے لیکن ریلنگ کے آخر تک پہنچنے سے قبل ہی میں پیچھے لوٹنے کا بہانہ وہ بھی پیچھے ہٹ جانے گا۔ پھر میں اچانک رفتار تیز کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ قبل اس کے وہ مجھ تک پہنچ سکے یہ آگے بڑھنے لگا۔ جیم دوسری طرف زور زور سے بھونک رہا تھا اور وہ بھی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

معاً الف نے ایک دوسرا ہی خطرہ محسوس کیا۔ سڑک پار کرتے ہوئے مجھے ادھر ادھر دیکھنے کا موقع ہی کہیں کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا نہ جاؤں۔ زندگی کے کئی کام ادھورے رہ جائیں پروا نہیں لیکن یہ لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ میں اس کم بخت سے کسی طرح سمجھوتہ کرلوں۔ اس خیال کے آتے ہی الف اپنی جگہ جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دوسری بھی ٹھہر گیا۔

الف نے دھیمی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔

سنو بھائی۔

شٹ اپ۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ بھائی کسے کہتے ہو؟

آخر ہم دونوں کی برادری تو ایک ہے نا؟ الف نے کہا۔

بھوں۔ بھوں۔ جیم نے بھرپور آواز نکالی۔

کیا ہم دونوں ایک جیسے نہیں ہیں۔؟

غرر۔ غث۔ غث۔

صرف ہمارے رنگ روپ میں فرق ہے نا!

واؤ۔ واؤ۔ بھوں۔ بھوں۔

کیا ہم دونوں کے مسائل ایک جیسے نہیں؟

واؤ۔ بھوں۔ غر۔ غرر۔ واؤ۔

اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں؟

واؤ۔ واؤ۔

وانے میرے بھائی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں بھی تمھاری طرح غث غر۔ غر بھوں۔ واؤ۔ واؤ کر سکتا ہوں میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ غث غث۔ غرر غرر۔

غث غث۔ غرر غرر۔ دیکھو میں نے بھی تمھاری جیسی ہی آواز نکالی ہے۔ اگر تم مجھ سے لڑنا ہی چاہتے۔ نقصان پہنچانا چاہتے ہو تو اس وقت مجھے جانے دو۔ میں پھر آؤں گا۔

غاث۔ غر۔ بھوں۔ کیا کہا۔ تمھیں اس وقت جانے دوں؟

ہاں ہاں۔ اس وقت جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں پھر آؤں گا۔ تم جو بھی وقت دو مجھے قبول ہے۔ تم سے باتیں کروں گا۔ تم جو کہو گے وہی کروں گا۔ یہ وقت میرا بڑا قیمتی ہے۔

غٹاث غاث۔ بھوں بھوں۔ غرر غرر۔ تمھارا وقت بڑا قیمتی ہے؟

ہاں، ہاں سمجھ لو کہ مجھے اپنے مالک نے بلایا ہے یا مجھے اپنے ایک دوست سے ضروری کام ہے۔ یا یہ کہ میں اس وقت ڈاکٹر کے پاس جارہا ہوں۔ ایسا کوئی بھی کام اہم ہے۔

ہام۔ وہام۔ غناپ غناپ۔ تم یہاں سے جا نہیں سکتے۔

کیوں نہیں جا سکتا۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ اگر یہ علاقہ تمھارا ہے تو میں یہاں سے کچھ حاصل نہیں کررہا ہوں۔ چند منٹ کے اندر میں یہ علاقہ پار کر جاؤں گا۔ آخر تم بھی تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے علاقے سے گزرتے ہی ہوں گے۔

ہاں ہاں گزرتا ہوں لیکن آج تک کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے روکتا۔

پھر تم مجھے کیوں روک رہے ہو۔

اس لیے کہ تم میرے سامنے سے گزرر ہے ہو۔ مجھے یہ نہیں بھاتا کہ کوئی میرے سامنے اس طرح گردن اکڑا کر چلے۔

میں نے اپنی گردن کہاں اکڑائی تھی۔ ہم جس برادری کے ہیں اسی طرح تو چلتے ہیں۔ تم بھی تو اسی طرح چل کر کسی ہی علاقے سے گزرے ہوں گے۔

میری بات اور ہے!

آخر تم چاہتے کیا ہو؟

تم یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کیا تم چاہتے ہو کہ میں واپس چلا جاؤں۔ دیکھو۔ اس وقت میں بہت ہی اہم کام پر ہوں۔ اب مجھے جانے دو۔ اس سمت سے پھر کبھی نہیں آؤں گا۔

اس وقت تم واپس بھی نہیں جا سکتے۔

تو پھر اب میں کیا کروں؟

اب تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

یوں ہی کھڑے رہنا تو ہماری برادری میں کسی کی عادت نہیں۔

میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔

یہ میں کہاں مصیبت میں پھنس گیا۔

ہاں تم اب پھنس گئے۔

میرا قصور۔؟

قصور۔ قصور ہوتا ہے۔ سبب تلاش نہ کرو۔

ارے بھائی دیکھو تو۔ جتنی دیر تم مجھ سے الجھے رہے۔ سیکڑوں، ہزاروں لوگ سڑک کے دونوں پار گزرتے رہے۔ لوگ بھی اسی طرح ایک دوسرے کا راستہ روکنے لگتے تو یہ جمنا کا پل کبھی نہ بنتا۔ اسے پار کرکے تو میں یہاں تک آیا ہوں

پار کر کے نہ آتے تو تم بچ جاتے۔

جمنا پار کرنے کی آخر تم مجھے کیا سزا دینا چاہتے ہو؟

تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔

دیکھو، تم مجھے اس طرح تنگ نہ کرو۔ تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہوں گے لیکن میں بھی غیرت رکھتا ہوں۔

تو پھر آجاؤ۔

یہ ریلنگ ہمارے بیچ میں ہے۔ تم ہی اسے پھلانگ کر یہاں تک پہنچے ہو۔ اب ادھر بھی کود کر آنا تمھارا ہی کام ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ؟ ہم دونوں زخمی ہو جائیں گے۔

زخمی ہونا اور زخمی کرنا ہی میرا شیوہ ہے۔

اب بہت وقت ہو چکا۔ مجھے جانے دو۔ یہ کہہ کر الف نے اپنا قدم اٹھایا اور آگے کی طرف روانہ ہونے لگا۔

غر، غر، غرر، غرز۔ بھوں۔ غنث۔ غر۔ جیم کی آواز اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔ وہ بھی الف کے متوازی ریلنگ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ایک منٹ سے زیادہ کا وقفہ نہ گزرا ہوگا کہ دونوں مثلث کے اس کونے پر پہنچے جہاں حصار سے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔

جوں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہوا جیم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس نے جھپٹ کر الف کی گردن دبوچ لی۔ الف نے گردن کو ایک جھٹکا دیا۔ پاس سے گزرتے راہرو نے ہش ہش کی آواز نکالی۔ الف کو احساس ہو گیا کہ ذرا سی غلطی سے وہ سڑک پر کسی بھی تیز رفتار سواری سے ٹکرا سکتا ہے۔ اس نے تیزی سے حصار کے اندر کا رخ کیا۔ جیم دوبارہ اس پر جھپٹ پڑا لیکن الف نے اپنے سر کو جیم کی گردن کے نیچے کی طرف کیا اور اس کا گلا اپنے دانتوں میں دبوچ لیا۔ یہ کام اس تیزی سے ہوا کہ جیم کو اپنا پینترہ بدلنے کی ذرا بھی مہلت نہ ملی۔ ساتھ ہی الف نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے منہ کا ایک زور دار جھٹکا دیا۔ جیم الٹ کر زمین پر آرہا۔ الف نے اپنے پاؤں اس کے سینے پر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر تک وہ جیم کی گردن کو اپنے دانتوں سے جھنجھوڑتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اب جیم اپنی گردن اٹھانے کے لائق نہیں رہا ہے تو اسے وہیں چھوڑ کر چلتا بنا۔ پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ جیم کا کیا حشر ہوا ہے۔ جیم تھوڑی دیر تک پھٹی پھٹی آوازیں نکالتا اور کیں کیں کرتا رہا۔

رنگ روڈ، آئی۔ ٹی۔ او اور جمنا پل کی سڑکوں پر ٹرافک چھٹنے لگی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں جٹ رہے تھے۔ جو لوگ اپنی منزل پر ابھی تک نہیں پہنچے تھے انھوں نے چلنے کی رفتار تیز کر دی کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ جیم کی آواز ہی سن سکتا یا اسے وہاں سے اٹھ کر گردن لٹکائے ہونے جاتا ہوا دیکھ سکتا۔

***

نقد و نظر

لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔)

ش بخیر۔(خاکے اور مضامین) مصنفہ: فاطمہ عالم علی

ت: ۱۶۴ اشاعت: جولائی ۱۹۸۹ء قیمت:۔/15 روپے

لم علی، 8-2-332/7، روڈ نمبر 3، بنجارہ ہلز، حیدرآباد500034 ۔

ن فاطمہ عالم علی کا محبت بھرا تحفہ "یادش بخیر" ہاتھ میں آیا تو نہ جانے کتنی یادیں کچھ اس طرح تازہ ہو گئیں

مصرعے کی مجسم نظر آگئی:

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال! مومن

ریں جو قلم برداشتہ حلقۂ تحریر میں آئی ہیں ان کو آپ کوئی تبصرہ یا تنقید نہ سمجھیں۔ یہ صرف وہ تاثرات ہیں جو
۔ کاوش کے دماغ کی سطح پر ابھرے ہیں۔

یں وہ دن جب فاطمہ اور میں کرامت حسین گرلز کالج لکھنو میں پڑھتے تھے۔ اکثر کھانے کی چھٹی میں ہم
ر گپ شپ کرتے۔ فاطمہ کو ننٹنگ کا خاص شوق تھا۔ یہ بیٹھ کر نئے نئے نمونے ڈالتیں اور ہم ان کی ترکیبیں
خیال تھا کہ ان کے یہ تانے بانے ایک دن دل چسپ و دل گداز مضمونوں، حسین مرقعوں اور دل پذیر خاکوں
گے۔

الغفار مرحوم کی صاحبزادی ہونے کی بنا پر اور اس ادبی ماحول کے تحت جو ان کو میسّر تھا فاطمہ کی زبان اور
میں آئی ہے مگر حیرت ہے اس بات پر کہ ادب کے ذریعے تاریخ سازی اور تاریخی ادب کی تخلیق کا فن
ور کہاں سیکھا۔ میرے نزدیک یہ جوہر خداداد ہے۔

ون میاں، ابا، آغا چچا، شاہد بھائی کے علاوہ سرور ڈنڈا، مخدوم، رضیہ سجاد ظہیر، سلیمان اریب، قرۃ العین حیدر
۔ حمٰن وغیرہ کا تعارف اس اپنائیت اور خصوصیت سے کروایا ہے کہ ان کی زندگی کے وہ رخ سامنے آگئے
ش کر سکتے ہیں لیکن جن پر روشنی ڈالے بغیر کسی ادیب، شاعر یا مصنف کے پس منظر کا اندازہ نہیں ہو سکتا
ت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں فاطمہ جنھیں اپنے زمانے کے مشاہیر کو اتنا قریب سے
موقع ملا۔ ساتھ ہی خوش نصیب ہے اردو ادب جس کو فاطمہ کے پیکر میں ان حسین یادوں کو اپنی پوری آب
محفوظ کر لینے والا کیمرہ حاصل ہوا۔

اپنے بچوں کی ادبی معلومات کو بجائے مصنفین کے سن پیدائش اور تاریخ وفات تک محدود رکھنے کے ان
یے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے خزانے عطا کر سکیں جو آئندہ نسلوں میں ادبی شعور اور اسے آگے بڑھانے کا ذوق
زبان کو زندہ و پائندہ رکھنے کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

طنزیہ و مزاحیہ خاکے بھی ان ہی کی طرح دل چسپ اور پرکشش ہیں۔ کہیں ان کے تانے بانے حالات حاضرہ

سے ملتے ہیں اور کہیں یہ اپنے ہی حسبِ حال نظر آتے ہیں۔ بہرحال:
جلوہ ترا جس رنگ میں ہے ہوش رہا ہے!
(سلمیٰ کمال الدین حسن)

کتاب کا نام: خوشبو کے داغ (نظمیں) شاعر: علیم صبانویدی
مرتب: ڈاکٹر سید سجاد حسین، ڈیمائی سائز مجلد صفحات: ۸۸ قیمت۔/۵۰ روپے
اشاعت بار اول: ۱۹۹۳ء ناشر: ٹاملناڈو اردو پبلی کیشنز 26۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ،
مدراس۔600002

علیم صبانویدی جنوبی ہند کے قادر الکلام شاعر اور نثر نگار ہیں، ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ "جنوبی ہند کا شعر و ادب۔ نویدی کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت و بصارت کا مظہر مجموعہ نثر ہے جسے ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔
اردو کی غزلیہ شاعری اور نعتیہ شاعری کو علیم صبانویدی نے تخلیقی ذہانت سے عصرِ حاضر کی اچھی شاعری سے رشتہ دوز کیا ہے۔

زیر نظر نظموں کا مجموعہ "خوشبو کے داغ۔ ۳۴ نظموں پر مشتمل ہے، اردو کی رومانی شاعری کے گلدستے میں اخ-شیرانی اور جمیل مظہری کے ساتھ اسے بھی پڑھ کر انبساط و کیف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نغمگی اور حسن صبانویدی کی ان نظموں کا وصف تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں کا بیان بھی اپنا تاثر چھوڑتا ہے، علیم صبانویدی نے محبت کی پاکیزگی اور معشوق کی بے وفائی کی روئیداد نرم، صاف اور دھیمے لہجے میں رقم کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔
ڈاکٹر سید سجاد حسین لکچرار شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی نے علیم صبا کی شاعرانہ شخصیت پر مبسوط مقالہ لکھا ہے اور انھیں ہم عصر قلم کاروں میں لہجہ تراش شاعر اور معتبر فن کار قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ سانیٹ اور ہائیکو کی ہیت میں نعتِ رسول کی پیش کشی کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔
یقین ہے یہ مجموعہ رومانی شاعری کا ذوق رکھنے والوں سے خراج حاصل کرے گا اور نشاطِ فکر کے سامان فراہم کرے گا۔

(وقار خلیل)

سنہ اجرا: ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون: 310469

ماہنامہ سبرس حیدرآباد

جلد: ۵۶ ○ ستمبر ۱۹۹۴ء ○ شمارہ: ۹

فی پرچہ: ۷ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ: ۲۰ ڈالر
زرِ سالانہ: ۷۵ روپے	پاکستان، برما، سیلون: ۱۵ ″
کتب خانوں سے: ۱۰۰ روپے	انگلستان: ۱۲ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

ح سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس حیدرآباد میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد سے شائع کیا

اس شمارے میں

کتاب : مرزا غالب

مصنفہ : نتالیا پری گارنا

ترجمہ : اسامہ فاروقی

باب ۵

عشق مجازی

میری پیاری خیالی تصویر، اپنی جھلک دکھا دے،
جیسی تو جدائی کے وقت میرے سامنے تھی،
زرد اور جاڑے کے دنوں کی طرح ٹھنڈی،
جاں کنی کی اذیت سے مسخ شدہ ...

(پوشکن)

عشق کی "حقیقی" اور "مجازی" میں تقسیم صوفیہ کے اس تصور کی بنا پر کی گئی تھی کہ انسان کا معشوقِ حقیقی خدا ہی سکتا ہے۔ اس باب میں ہم "عشق حقیقی" سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی توجہ "عشق مجازی" کے بیان پر ہی مرکوز رکھیں ۔ یہ تصور مسلمانوں کی ادبیات میں اتنا مروج ہو چکا ہے کہ عموماً اس کی وضاحت درکار نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے لیے اس بغیر کام چلانا ممکن نہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ خارجی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں صوفیہ کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ں اور جہانِ سماوی کے مجاز یا تمثیل سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ واقعات جو اس میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ب" مجازی" مفہوم رکھتے ہیں، ان کی حیثیت جہانِ لافانی ولازوال کی وقتی شہادت کی ہے اور صرف یہی جہانِ لافانی، حقیقی نے کا مستحق ہے اور جیسا کہ صوفیہ کا خیال ہے جہان "مجازی" میں صرف عشق الٰہی حقیقی ہو سکتا ہے باقی سب عشق کی ں یا مجاز ہے۔ اس طرح سے روایت سے ناواقف قاری کے لیے یہاں ایک دامِ سخت پنہاں ہے، جس کا ثبوت ہم کو مل جانے گا۔

مرزا اسد اللہ خاں نے "عشق حقیقی" اور "مجازی" یعنی خدا سے عشق کے بارے میں بھی لکھا ہے اور عورت سے کے بارے میں بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری میں ان دونوں کے درمیان سرحد اکثر نہایت ہی نااستوار ہوتی ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں اور آگے بھی جا بجا دیکھیں گے کہ عشق کا موضوع بھی اتنا ہی خیالی اور مجازی ہو سکتا ہے جتنا کہ باقی ۔ یہاں نہ تو لوگوں کو ان کے اصلی نام سے یاد کرنا مناسب سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی زمان و مکاں کی واضح نشانی دہی کا ہے۔ عام طور سے کلام پر تاریخ نہیں ڈالی جاتی اور معشوق بھی کبھی "حقیقی" تو کبھی "مجازی" ثابت ہوتا ہے کیوں کہ ی مدح طرازی کے قاعدے ایک ہی ہیں۔ معشوق مجازی کے لیے بھی وہی القاب، استعارے، مبالغے اور دوسرے

ادبی و فنی وسائل استعمال کیے جاتے ہیں جو معشوق حقیقی کے لیے۔
نتیجتہً شاعر کے سوانح حیات کی طرف رجوع کرنا زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریباً لاحاصل ہوتا ہے۔ ایک نہایت معقول خیال یہ بھی ہے کہ شاعر کے کلام اور اس کے سوانح حیات کا موازنہ کبھی نہیں کرنا چاہیے تقریباً اسی زمانے میں، جس کے بارے میں ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں (یعنی ۱۸۲۳ء میں) جرمنی کے مشہور شاعر ہائنرخ ہائنے نے ایمرمان کے نام اپنے مکتوب میں لکھا " شاعر کے سوانح حیات میں اس کی شعری تخلیقات کی کلید پالینا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو اور یہ ثابت کرنا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو کہ سیاسی نقطۂ نظر، مذہب، شخصی تنفر، تعصب اور مصلحت اندیشی واقعی اس کے کلام پر اکثر اثر انداز ہوتی تھی، اس کے باوجود اس امر کو حوالے کے طور پر، خصوصاً شاعر کے حین حیات پیش کرنے سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیے۔ اگر کلام پر سوانح حیات کا وہ اثر جس کی ہم نشان دہی کر رہے ہیں واقعی پایا جاتا ہے تو ہم ایک طرح سے اشعار کو ان کی دوشیزگی اور اچھوتے پن سے محروم کرنے اور ان کے چہرے سے پراسرار نقاب کو ہٹانے کی حرکت بے جا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم مصنوعی طور پر، کھینچ تان کر ایسا اثر ثابت کرتے ہیں تو نتیجتاً ہم اشعار کو مسخ کرتے ہیں۔ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کبھی کبھی ہمارے سوانح حیات کے بیرونی خطوط اور ہمارے داخلی سوانح حیات میں مطابقت برائے نام ہی ہوتی ہے! کم از کم میرے ہاں ان میں مطابقت کبھی نہیں پائی گئی۔"
غالب ہائنرخ ہائنے کی ہم نوائی کرتے ہیں:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اس کے باوجود اس عہد کی یورپی شاعری میں شاعر کے سوانح حیات کے حقائق اور اس کی شعری تخلیقات کے حقائق کے ربط باہمی کا وضاحت کے ساتھ تعین نسبتاً بدرجہا آسان ہے۔ اگر مغربی یورپ کے عہد جدید کے شاعر کو قاری بنیادی طور سے اس کے عہد کے سیاق و سباق میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی نظر میں اس کی شاعری کی حیثیت اظہار ذات اور واردات قلبی کے کچے چٹھے کی ہوتی ہے تو مشرقی شاعر کو سب سے پہلے روایت کے توسط اور سیاق و سباق، اور دوسرے ادوار کی شاعری سے رشتوں کے پس منظر میں ہی سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے اور پھر اس کے بعد ہی ہم اسے ایک شخصیت اور اپنی آواز اور اپنے نام سے شعر کہنے والے کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ روایت کی گود میں پلے اور بڑھے ہوئے محقق کی نظریں شاعری کے آفاق کا احاطہ دور دور تک کرتی ہیں اور اس لیے شاید وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اعتماد کے ساتھ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ غالب کی مختلف غزلوں کے مندرجۂ ذیل اشعار کن دلی تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں:

ہے عرض جوہر خط و خال ہزار عکس
لیکن ہنوز دامن آئینہ پاک ہے

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسد
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یہ اشعار کس بارے میں ہیں؟ حسن کے بارے میں اور آئینے کی مدد سے اپنی نام وری کالوہا منوانے کی اس کی خواہش، اور رشک و حسد میں مبتلا پھولوں کے درمیان سیر باغ کے بارے میں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ اشعار ایک دوسرے سے برائے نام ہی مختلف ہیں؟ تاہم کلام غالب کے محقق پروفیسر خورشید الاسلام کے خیال میں وہ عشق کی تصویر کشی کی چار مختلف اقسام کے تحت آتے ہیں۔ یعنی پہلے شعر کا تخاطب "معشوق حقیقی" سے ہے اور باقی تین اشعار کا "معشوق مجازی" سے، تاہم دوسرے شعر میں معشوق کی روایتی تصویر کشی کی گئی ہے، تیسرے شعر میں اس کو اکبر شاہ دوم کے زمانے کے غازے کی مدد سے ایک حد تک انفرادی رنگ دے دیا گیا ہے اور چوتھے شعر میں ایک معیّنہ، جیتی جاگتی عورت کے تئیں واضح قلبی تعلق کی عکاسی کی گئی ہے۔

میں نے یہ مثال یہ دکھانے کے لیے دی ہے کہ چاہے وہ غالب کے سوانح حیات سے واقف ہو یا نہ ہو کسی بھی ناواقف اسرار قاری کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ عشق کی تصویر کشی کی ان چار اقسام میں تمیز کر سکے۔ لیکن ہمارے پاس ان درجہ بندیوں پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ان کا سلسلہ تو حالی سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے غالب کے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے نہایت اصول پرستانہ انداز میں حاشیوں میں "عاشقانہ"، "تصوف"، ظرافت"، "عشق مجازی" وغیرہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نتیجۃً اگر ہم غالب کے اشعار کو تواتر سے پڑھنا شروع کریں تو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ہم کہیں مرزا اسد اللہ خاں کے "حقیقی" اور "مجازی"، "روایتی" اور "غیر روایتی" معشوقوں کو بالکل سے گڈ مڈ تو نہیں کر دے رہے ہیں۔ تاہم امید ہے کہ قاری اب تک یہ تاڑنے میں کامیاب ہو چکا ہو گا کہ پہلے شعر میں عشق الٰہی ("حقیقی") کی عکاسی کی گئی ہے اور باقی تین اشعار میں ارضی محبت (یعنی عشق "مجازی") کی۔

ہمارے لیے دو راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہمیشہ ان لوگوں کی رائے کو ملحوظ خاطر رکھیں جو روایت کی گود میں پلے اور بڑھے ہیں اور مختلف اشعار کی مروجہ تشریحات سے ہم کو واقف کرواتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ شاعر کی زندگی کے حقائق اور اس کی غنائیہ شاعری کے نقطہ ہائے اتصال کو تلاش کریں۔

مرزا تیرہ سال کے تھے جب ان کی بارہ سالہ امراؤ بیگم سے شادی کر دی گئی۔ شادی بزرگوں نے طے کی تھی۔ اور گو کہ اس کو کامیاب اور پر مسرت قرار دینا مشکل ہے لیکن بہرحال رشتۂ ازدواج مستحکم ثابت ہوا اور میاں بیوی نے ساری زندگی اکٹھا بسر کی۔ اور گو کہ ایک سال کے فرق سے لیکن ایک ہی دن دونوں اس دنیا سے رخصت بھی ہوئے، پہلے میاں، پھر بیوی۔ تمام سوانح نگار اس امر پر متفق ہیں کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے کے تعلق سے ناراضگی کی شدت میں کمی ہوتی گئی، عمر نے جذبات پر قابو پالیا اور میاں بیوی میں اتفاقِ باہمی اور ایک دوسرے کے لیے احترام کے جذبات قائم ہو گئے۔

لیکن نوجوانی کے ماہ و سال کم عمر میاں بیوی کو محبت کا وہ جذبہ عطا کرنے سے قاصر رہے جسے قدیم ہندوستانی روایات کے مطابق رشتۂ ازدواج میں منسلک کم سن زن و شوہر کو ایک دوسرے میں جگانا چاہیے۔ ہدایات کی صحیح تعمیل اور خاص طور سے وضع کیے ہوئے بے شمار، مختلف مذہبی رسوم کی غرض و غایت بھی اسی مقصد کا حصول ہے۔ اپنی قابل قدر علمی تصنیف "علم الاقوام کی روشنی میں ہندوستان" میں اسنسارف نے کم سنی کی شادیوں کے مسئلے کا مطالعہ کرنے والے بعض فضلا کے خیالات کا حوالہ دیا ہے۔ کھیت کر کی پیروی میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں عام طور سے مسلم نقطۂ نظر کے مطابق "صحیح العقیدہ مرد اور عورت کو عشق و محبت کا جذبہ اپنے سدا کے شریک زندگی کے علاوہ کسی اور کے لیے کبھی نہیں محسوس کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا اتفاق پیش نہ آئے اس کی پیش بندی کے لیے بچوں کی شادی ان میں جنسی شعور بیدار ہونے سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے۔" آگے اسنسارف، رابندر ناتھ ٹیگور کے اس خیال کا حوالہ دیتے ہیں جس میں وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ "خواہش نفسانی" رشتۂ ازدواج کے تصور میں شامل سماج کی منشا کے راستے کا روڑا ہے اور اسی لیے یہ رشتہ "خواہش نفسانی" کے بیدار ہونے سے قبل ہی باندھا جاتا ہے۔ اور حالاں کہ محولۂ بالا افکار میں گفتگو ہندو ذاتوں کے

تعلق ہے ہے ، ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ چوں کہ ان کے نظریات اور روایات کا اثر مغلوں کے اعلیٰ طبقات کی طرز زندگی پر ا
خاصہ نمایاں تھا، تو ان طبقات میں بھی کم سنی کی شادی کے رواج کو مذکورہ صدر مسائل کے حل سے مربوط کرنا بے بنیا
ہو گا۔

تاہم، جہاں تک غالب کا تعلق ہے، جیسا کہ غالب کے متعدد سوانح نگاروں نے اشارتاً ذکر کیا ہے، سمدھیوں کی ا
سے پھر بھی کچھ تاخیر ہو ہی گئی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، دلہن کے خاندان کا شمار آگرے کے مشہور ترین اور نا
خاندانوں میں تھا۔ گانا بجانا بھی تھا، دھوم دھام کی بارات بھی تھی، دعوت بھی تھی اور قدرتی طور سے سڑکوں پر شا
سے جلوس کے دوران اور حویلی کے زنانے اور مردانے میں شادی کی مختلف رسوم کے گیت گاتے ہوئے ڈومنیاں
مستعدی سے پورا زور لگانے ہوئے تھیں۔ جلوے یعنی آئینے میں منہ دکھائی کی رسم بھی ان کے گانے کے ساتھ ادا کی
شادی کی رسم کے دوران دلہن کا چہرہ سہرے یعنی پھولوں کی نقاب سے ڈھکا رہتا ہے جسے نکاح خوانی کی رسم کی تکمیل کے
بعد اٹھایا جاتا ہے اور تب دلہا نئے شادی شدہ جوڑے کے سامنے رکھے ہوئے یا عروس کی انگوٹھی میں جڑے ہوئے آ
میں اپنی دلہن کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے۔ یہ رسم ڈومنیوں کے روایتی گانوں کے ساتھ انجام پاتی ہے۔ جناب
رجب علی بیگ سرور اپنے " فسانہ عجائب " میں لکھتے ہیں : " وہ بھی عجب وقت تھا، آرسی مصحف روبہ رو، محبوب دل خواہ
دو، سورۂ اخلاص کھلا، آئینہ رونمائی میں مزے لوٹتا، سلسلۂ محبت مستحکم ہو رہا، ڈومنیوں کا سیٹھیاں گانا، دولھا دولھن
شرمانا۔ " اس کے بعد دولھے کو مصری کھلانے کی رسم کی باری آتی ہے جس کے دوران دلہن کے سر، سینے، کاندھوں
گھٹنوں پر مصری اور مٹھائی کی ڈلیاں رکھی جاتی ہیں اور دلہے کے ہاتھ پیچھے باندھ دیے جاتے ہیں اور اس کا فرض یہ ہوتا
کہ وہ گرائے پڑائے بغیر ساری مصری اور مٹھائی کھالے۔ دلہا دلہن کے پلنگ پر گلاب کی پنکھڑیاں بکھیر دی گئی تھیں اور
عود، لوبان وغیرہ کی خوش بو سے بسا ہوا تھا۔ شادی کی تقریب میں شریک گانے بجانے والوں میں ایک مغنیہ بھی تھی جس
طرف مرزا متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس واقعے کا ذکر مجموعۂ مضامین " غالب کی زندگی کے واقعات " میں شامل
(افسوس ہے کہ عملاً کوئی تحریری شہادت نہیں فراہم کی گئی ہے اور نتیجتہً یہ کہنا ممکن نہیں کہ یہ قصہ کس حد تک لائق اعتبار
" الٰہی بخش حاکم احمد خاں اس واقعے کو بیان کرتے ہیں۔ مرزا غالب کی الٰہی بخش معروف کی دختر امراؤ بیگم سے شادی کا
منایا جارہا تھا۔ نواب کے ہاں تقریب میں گانے بجانے والے بلانے گئے تھے۔ ان میں اتفاقاً ایک مغنیہ بے انتہا دل کش
دل فریب تھی۔ غالب اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ "

یہاں بلاتوقف یہ صراحت کر دینی ضروری ہے کہ اس بارے میں کہ اس لڑکی کی سماج میں کیا حیثیت تھی، اس کا
کیا تھا اور عمر کیا تھی؟ یوں سمجھیے کہ ہماری معلومات نہیں کے برابر ہیں۔ اس کے باوجود کہ بعد میں غالب نے اپنے ایک
میں خود لکھا ہے کہ وہ ایک ڈومنی پر فریفتہ تھے متعدد سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ وہ ڈومنی نہیں بلکہ ایک طوائف کے ع
میں گرفتار تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر اپنی کتاب " غالب " میں چاندنی چوک، دہلی کی نشان دہی اس طوائف کی جائے رہائش کی حیثیت
سے کرتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ چودھویں بیگم یا ماہ چہار دہم، شاعری سے بھی بہ خوبی واقف تھی اور اسے سمجھنے
صلاحیت رکھتی تھی۔ غالب نے صرف مغل جان نامی ایک طوائف کا اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے لیکن ان میں اس کے ت
سے غالب کے عشق کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ڈومنیوں اور طوائفوں میں فرق یہ ہے کہ اگر اول الذکر کا ہندو جاروب کش
کی نچلی ذات میں شمار ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گانا بجانا بھی ان کا پیشہ تھا تو موخرالذکر بالعموم مسلمان اور تربیت یا
گانے بجانے والیاں ہوتی تھیں اور سماج کے اعلیٰ طبقات کا دل بہلاتی تھیں۔ اس ذات سے تعلق رکھنے والوں کی بودوبا
کے علاقے اور ان کے کام کی مانگ کی مناسبت سے ڈوم اور ڈومنیاں مختلف پیشے اختیار کر سکتے تھے۔ وہ چتا میں جلانے
لکڑیاں بیچتے تھے۔ رسی بنتے تھے، ٹوکریاں بنتے تھے، چھپر چھاتے تھے اور جاروب کشی کرتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ سا

وہ ہر جگہ مختلف رسوم کے موقعے پر گانا بھی گاتے، بہ الفاظِ دیگر ان کی حیثیت پیشہ ور گانے بجانے والوں کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ، جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے، یہ ذات بھی اونچے اور نیچے طبقات میں تقسیم ہوگئی اور اس ذات کے پیشہ ور گانے بجانے والوں کو دولت مند ہونے کا اور سماج میں اونچا مقام حاصل کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ اسنسارف لکھتے ہیں۔ "ذات پات کے نظام پر تحقیقی کام کرنے والے مقامی لوگ اکثر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ذات، دولت مند اور مفلس، پروفیسر اور کسان کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے۔۔ لیکن اس کے باوجود اس ذات سے تعلق کے نتیجے میں ذات کی وہ تمام پابندیاں بھی عاید ہوجاتی ہیں جن کی خلاف ورزی سے ذات باہر کردیے جانے کا خطرہ لاحق ہوتاہے۔ اس ذات کی گانے بجانے والی، ایک طوائف کے مقابلے میں سماج میں بدرجہا نچا مقام رکھتی تھی۔ اسی لیے غالب کے تذکرہ نگاروں میں اختلاف رائے ہے کہ وہ کس کے عشق میں گرفتار تھے مسلم معاشرے کے لیے مخصوص تکلف کی باریکیوں سے ناواقف معمولی اور سیدھی سادی ہندو لڑکی کے عشق میں یا پھر شعر و شاعری کی نزاکتوں سے واقف شائستہ اور طرح دار طوائف کی محبت میں۔ بعض کا خیال ہے کہ غالب نے جہاں "ڈومنی۔ کا ذکر کیا ہے ان کی مراد "طوائف۔ ہے، آخر تو دونوں ہی گانے بجانے والیاں ہیں۔ دوسروں مثلاً مالک رام کی رائے ہے کہ غالب نے دراصل دو مختلف معشوقاؤں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک تو عالی خاندان اور لطافت و شائستگی کی قدر و قیمت سمجھنے والی تعلیم یافتہ خاتون تھی جس نے اپنے اس عشق کے سبب خودکشی کرلی اور دوسری کوئی اونچی اڑان والی مغنیہ تھی۔

تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے طوائفیں دوسری عورتوں کے مقابلے میں کافی امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ طوائفوں کو اپنے شائستہ طور طریقوں اور پرلطف گفتگو پر قدرت کی وجہ سے شہرت حاصل تھی اور ان میں سے بہت سی واقعی شاعری سے حقیقی معنوں میں واقفیت رکھتی تھیں، اردو اور فارسی ادبیات کے مختلف دبستان ہائے شاعری اور رجحانات کی باریکیاں سمجھتی تھیں، غزل، ٹھمری، نغمہ، دادرا اور دوسرے پکے گانوں کی ادائیگی کی مختلف طرزوں پر قدرت رکھتی تھیں۔ بہت سے متمول خاندانوں میں اپنے نوعمر ارکان خاندان کو مشہور طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجنے کا رواج بھی تھا تاکہ ان پر وہاں اونچی سوسائٹی کی تہذیب کا رنگ و روغن چڑھے اور وہاں وہ شستہ و شائستہ طور طریقے سیکھیں۔

لکھنؤ میں طوائفوں کے کوٹھوں کے بارے میں رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔ "مگر وہ جو مثل ہے، نیک اندر بد، بد اصل ہے، لب معشوق مولویوں سے۔ وہ رنڈیاں، پری شمائل، زہرہ پیکر، مشتری خصائل، اس ناز و انداز، سحر کرامات غمزہ عشوہ، ادا، گات بانکی کہ ہاروت اور ماروت تو کیا، معاذاللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر اتر آئیں، ان کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں۔ گھڑی بھر ان سے زانو بہ زانو بیٹھے، توبۂ نصوحا نوٹے، ان کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لولی چرخ ان پر نثار ہے؛ ہر ایک حور کردار ہے، خوش مزاج، مردم شناس، روزمرہ شستہ، دم تقریر رمز و کنایہ، اسی کوچے کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش اثرِ صحبت سے کچھ کا کچھ ہوجاتاہے۔۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا نے آگرے میں بھی اور دہلی میں بھی ان دبستانوں سے سند تکمیل حاصل کی۔ ان کی خط و کتابت میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام وہ خطوط تلف ہونے سے رہ گئے جن میں وہ اپنی نوجوانی کے ان گناہوں کا ذکر کرتے ہیں: "تمھارے بارے میں سننے میں آتا تھا کہ تم بڑے بانکے نوجوان ہو اور بعنی مجھے یہ سب مغل جان نے بتایا جب وہ نواب حامد علی خان کی ملازمت میں تھی۔ ہم دونوں میں بے تکلفی تھی۔ اکثر میں اور مغل جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ اسی نے مجھے تمھارے وہ اشعار دکھائے تھے جو تم نے اس کی شان میں لکھے ہیں۔۔

انھیں مکتوب الیہ کو دوسرے خط میں مرزا پھر لکھتے ہیں: "اللہ! اللہ! ایک زمانہ وہ تھا کہ "مغل۔ نے تمھارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے حسن کے وصف میں لکھے تھے، تمھارے ہاتھ کے لکھے ہوئے، مجھ کو دکھائے تھے۔۔ اس خط کے ساتھ مرتب کا نوٹ ہے: "مغل جان طوائف تھی۔ دہلی میں وہ کچھ عرصے تک نواب حامد علی خاں کے

خاندان میں ملازم تھی۔ غالب کی اس سے ملاقات اسی خاندان میں ہوئی تھی۔ لیکن عام طور سے طوائفوں ۔
گانے بجانے کی محفلوں یا پھر بزم ناؤ نوش میں ہو سکتی تھی جو اس زمانے کی شہری تہذیبی زندگی کا ایک جزو لاینفک
ان محفلوں کا بیان مختلف مآخذ میں ملتا ہے۔ "چاندنی چٹکی ہوئی ہے، آسمان پر چاند پوری آن بان سے ضیا پاشی کر رہا
نظروں کے سامنے سفید سنگ مرمر کی ایک وسیع و عریض عمارت ہے، جس کے اطراف نہایت نفاست سے ترتیب
بہار پر ہے اور مشام جاں کو معطر کر رہا ہے۔ دیوان خانہ بلوریں فانوسوں کی روشنی سے منور ہے۔ اس کے سارے فر
دار کشمیری قالین بچھا ہوا ہے۔ دیوان خانے کی آرائش مشرقی طرز پر بڑی نفاست سے کی گئی ہے جا بہ جا تصویریں،
پھول سجا دیے گئے ہیں، دیواروں پر مشجر آویزاں ہیں۔ درمیان میں ہماری نظروں کے سامنے اپنی ساری دل فریبو
سترہ سال کی ایک مہذب اور شائستہ دوشیزہ ہے۔ وہ عنفوان شباب کی دہلیز پر ہے اور اپنی زندگی کی بہار کی طرف
انہار رہی ہے۔ وہ دھنک کے سبھی دل کش رنگوں والی پوشاک پہنے ہوئے ہے جو زری کے بیل بوٹوں اور ٹنکے ہو۔
سے جگمگا رہی ہے اور اس کے بدن کے دل فریب نقوش کو نمایاں کر رہی ہے۔ اس کے دائیں بائیں سنگت دینے
اپنی نشستیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ بائیں طرف سارنگی نواز، دائیں طرف طبلچی۔ اس کے شوخ ہونٹوں سے ایک مشہو
میٹھے بول جھڑ رہے ہیں۔ موسیقاروں کے اطراف اس محفل میں شریک موسیقی کے شیدائی ہر عمر کے مردوں کا
صاحب خانہ یا تو کوئی شہزادے ہیں یا نواب۔ خوش وضع اور شائستہ صاحب خانہ اپنے ہی جیسے ذی حیثیت احباب
مصاحبین میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک بے داغ ریشمی اچکن ان کے زیب تن ہے، ان کے سینے پر تازہ سفید
پھولوں کا ہار ہے۔ سر سے ان کی نگاہ میں ایک خاص چمک ہے۔ عطریات کی مدہوش کر دینے والی خوش
معطر ہے۔ محفل اپنے شباب پر ہے۔۔ مغنیہ کے گانے ہوئے ہر شعر کے بعد تعریف و توصیف کا غلغلہ اٹھتا ہے، ہے
واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں---- پھر انعام و اکرام کا دور شروع ہوتا ہے، فن کارہ کو اس کے شیدائی اشرفیوں ا
تحفوں سے نوازتے ہیں۔ آدھی رات کب کی ہو چکی، لیکن حاضرین محفل کے لیے گویا کہ رات ابھی شروع بھی نہیں
میں ابلتی ہوئی جوانی کا رنگ چھایا ہوا ہے اور ہر ایک، چاہے اس کی عمر کچھ بھی ہو، محسوس کرتا ہے کہ "ابھی تو میں
نواب پھر ڈومنی کی طرف آئیں۔ اس کے عشق میں گرفتار ہو کر مرزا نے اس سے بے تکلفانہ تعلقات قا
کوشش شروع کی۔ لیکن بہ قول الٰہی بخش خاں، جن کا ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں، اس لڑکی نے ایک عرصے تک ان
کان نہیں دھرا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ وہ فطرتاً حد درجہ خود دار اور غیرت مند تھی اور مرزا جذبہ محبت میں سرشا
یہاں تک کہ رسوائی تک، برداشت کرنے کے لیے تیار تھے اور ظاہر ہے کہ ایک صاحب ایمان کے لیے رسوائی سے
ہو سکتی ہے:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا

مرزا کے لیے، قریبی تعلقات قائم کرنے سے سختی کے ساتھ اس کا انکار خلاف توقع تھا اور اس سے ان
بھی بھڑک اٹھا:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں؟
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مشہور غزل (ردیف "ہی سہی") کی یہ ابتدائی شکل اس جذبۂ محبت کی، جس نے شاعر کو اپنی
گرفت میں لے رکھا تھا، بڑی عکاسی کرتی ہے۔ جیسا کہ غالب کے نسبتاً آخر کے کلام میں اکثر مشاہدے میں آتا ہے ابتدائی
کلام میں بعد میں شامل کیے گئے چند اشعار غزل کے راست اور زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی اسلوب میں تبدیلی لادیتے
ہیں۔ تاہم بہ قول الٰہی بخش حاکم خاں ذومنی نے بغیر متعہ غالب سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ملحوظ خاطر
رہے کہ مرد اور عورت کے درمیان اس طرح کے باضابطہ عارضی تعلق کا رواج صرف شیعوں کے پاس ہے۔ آگے الٰہی بخش
لکھتے ہیں کہ "وہ آخر کار مان گئی۔ گو کہ اس بات کا علم نہیں کہ آیا مرزا نے اس کا متعہ کا مطالبہ منظور کر لیا یا صورت حال کچھ
ور تھی۔ "اس کا مہنگی گانے والیوں میں شمار تھا اور اسے مسلمانوں کے مختلف گھروں میں اکثر بلایا جاتا تھا۔ معلوم نہیں
یوں سنیوں اور صوفیوں سے اسے نفرت تھی۔" بہ ہر حال مرزا سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں اپنے
گاہکوں کی نقالی کرتی، جو کچھ ان کے گھروں میں دیکھتی اس کا خاکہ اڑاتی۔ غالب کے اس شعر میں اسی طرف اشارہ ملتا ہے:

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

اس بیان میں بعض تفصیلات ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ ذومنی کو "سنیوں اور صوفیوں سے نفرت تھی"۔ لیکن
واضح نہیں کہ شیعوں کے تعلق سے اس کا رویہ کیسا تھا۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعے کا ماخذ محض یہ شعر ہو۔ یہ بھی
سکتا ہے کہ یا تو ذومنی شیعوں کی رسوم کے موقعے پر بلائی نہیں جاتی تھی یا پھر اس کے برعکس ہو سکتا ہے کہ اس کا میلان
پردہ یا علانیہ تشیع کی جانب رہا ہو۔ بیش تر تذکرہ نگاروں اور محققین کے خیال میں مذہب کے مسائل سے اپنی بے پروائی
اس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی پھسپھسی دین داری کے باوجود مرزا بہر حال اپنے کو شیعہ قرار دیتے تھے
ب کہ ان کے اقارب سنی تھے۔ انھوں نے شیعہ مذہب کب اختیار کیا، تذکرہ نگار اس سے ناواقف ہیں۔ حتمی طور سے یہ کہا
سکتا ہے کہ یہ ایران سے ان کے قلبی تعلق سے توافق رکھتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیعہ رواج کے مطابق متعہ کے مطالبے
مرزا کی شیعیت میں بھی کوئی ربط باہمی ہو۔ یا پھر یہ اپنے حد سے زیادہ عاشق مزاج پیروؤں کی سہولت کے لیے مذہب کی
ن سے فراہم کیا ہوا مسئلے کا آسان حل تھا، جس کی اس سمجھ دار لڑکی نے کماحقہٗ قدر کی؟ ان سوالات کا جواب دینا مشکل ہے۔

ایک بات بالکل صاف ہے، وہ دل فریب تھی اور قیاس غالب یہ ہے کہ وہ ذوم ذات کی معمولی " بت پرست۔" کافر۔ اور " بے دین۔ لڑکی تھی اور مرزا اس کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کے لیے تیار تھے۔

یاد روزے کہ نفس در گرہ یارب تھا
نالہ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا
بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
دیدہ گو خوں ہو، تماشائے چمن مطلب تھا
آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دل دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

غالب کا سارا کلام شدید، نورانی اور کرب ناک جذبہ عشق کے پیکرِ خیالی سے منور ہے۔ عشق کے مضمون سے ان کا ابتدائی اردو کلام بھرا ہوا ہے اور بعد کے اردو فارسی کلام میں بھی اس کی نوا نے دردناک صاف سنائی دیتی ہے۔ وارث کرمانی نے نشان دہی کی ہے کہ مرزا کے فارسی کلام میں معشوقہ کے پیکرِ خیالی میں " زرتشتی آتش ناکی۔ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ اس کا سبب عجم سے ان کی والہانہ محبت کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ " شاعر کی اوستا اور قدیم ایران سے عقیدت ان کی معشوقہ کو عجیب، غیر اسلامی خد وخال سے متصف کرتے ہیں۔ اس کی خیالی تصویر ہمارے سامنے زرتشتی تلازمہ خیال کے رشتوں کے ساتھ ابھرتی ہے اور اس زمانے کی مسلمان معشوقاؤں کے مروجہ پیکرِ خیالی سے قطعی مختلف ہے۔ اپنی معشوقہ کی انفرادیت کی توصیف کے لیے غالب اپنے کلام میں اس مذہب کے قدیم رسوم و رواج کا ذکر اور دوسری بت پرستانہ خصوصیات شامل کرتے ہیں۔۔

وارث کرمانی نے جن امور کی نشان دہی کی ہے ان کی توثیق واقعی بہت سی مثالوں سے ہوتی ہے لیکن اس سے اس امکان کی تردید نہیں ہوتی کہ " زرتشتیت۔ محض ان کی " کافر معشوقہ۔ کی عجمی قلب ماہیت تھی، جو ان کے ایک " بت پرست۔ سے عشق کی صورت حال کے پیش نظر بھی اتنی ہی فطری بات تھی جتنی " بلبل گلستان فارس۔ کے اس رول کے پیش نظر جو اپنی فارسی شاعری میں انھوں نے خود کے لیے چنا تھا۔

" معشوقہ آتش پرست۔ کی تصویر خیالی ان کی فارسی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایک قیاس آرائی بے جا نہ ہوگی۔ اگر " معشوقۂ آتش پرست۔ ہماری ذومنی یا اس کی یاد ہے تو اس تلازمہ خیال کی بنیاد ذوموں کے آگ سے متعلق ایک روایتی کام یعنی چتا کے لیے لکڑیوں کی فروخت پر ہو سکتی ہے۔

تا ہم زدل برد کافر ادائے
بالا بلندے کوتہ قبائے
زروشت کیشے آتش پرستے
برسم گزارے زمزم سرائے
چوں مرگ ناگہہ بسیار تلخے
چوں جان شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے
در دل ستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پورش پسندے
طاقت گدازے صبر آزمائے

غالب کے شاعرانہ وجدان کے سرچشموں پر غور و فکر کرتے ہوئے یوسف حسین خاں، مرزا کے کلام میں جذبۂ عشق
کے اظہار میں شاعر کے انفرادی تجربے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس امر میں غالب رسمی شاعری کی حدود
ار کر جاتے ہیں " غالب کے اشعار اور ان کے خطوط سے واضح ہے کہ ناگہانی اپنی گرفت میں لے لینے والے اور اپنے مظاہر
میں کلیتہ شخصی جذبۂ عشق نے، جس کی بزرگوں کی طے کی ہوئی سماجی پابندیوں سے بوجھل شادی میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی،
الفوں کے دستور کی بدولت اپنے لیے سبیل نکالی اور مرزا کے اس دور کے عشقیہ کلام کو اپنا ترجمان بنایا۔ اس معاشرے
کے نظریات سے اختلاف رکھتے ہوئے، جس کے وہ خود ایک رکن تھے، مرزا کا بہ ظاہر یہ عقیدہ تھا کہ محبت میں اہمیت صرف
سان کے شخصی اور ذاتی تجربے کو حاصل ہے۔ اس کے باوجود کہ جذبۂ عشق اور انسان پر اس کا زور اور اختیار سدا سے فارسی
اس کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کا موضوع رہا ہے، غالب کی غزلیات سے بالکل واضح ہے کہ ان کے کلام میں لفظ "عشق"
اطلاق نہ تو عشق الٰہی پر ہوتا ہے اور نہ ہی تاہل کے ان رشتوں پر جو میاں بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں۔ غالب کے لیے
ق شاعری کے معمولات میں شامل ایک رسمی بات بھی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی قوت ہے، جس کے محرک اس کے وہ
لی قوانین ہیں جو اسی میں مضمر ہیں---- عشق نفسانی کی اہمیت جذبے کی شدت میں ہے اور چناں چہ غالب ترجیح، عشق
ع کی مسرتوں اور رشک کی ان اذیتوں کو دیتے ہیں جو خلاف توقع اکثر ان کی شاعری کا موضوع ہے۔۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

خلاف توقع اس لیے کہ واقعی یہاں رشک کا کیا موقع ہے؟ مرزا جوان تھے، خوب رو، زندہ دل اور بے فکر تھے اور تاہل
رشتوں میں بندھے ہونے کے باوجود مسلمان مردوں کی سماجی حیثیت کو متعین کرنے والے معیاروں کے مطابق انھیں
خاصی آزادی عمل بھی حاصل تھی۔ انھیں یوسف حسین خاں کے الفاظ میں شادی نے ان کے لیے دہلی کے اعلیٰ حلقوں
رسائی کے راستے کھول دیے تھے۔ فراغت سے زندگی بسر کرنے کے لیے ذرائع خود بہ خود مہیا ہو جاتے تھے۔ اور جوانی
پورے جوش کے ساتھ مرزا اونچی سوسائٹی کی تفریحوں میں لگ گئے۔ جہاں تک طوائفوں کا تعلق ہے، جن کے ساتھ مرزا
ن کے ہم عمروں کا میل جول تھا، تو کہہ سکتے ہیں کہ "خورشید جمالوں" کے عشق کے زیر اثر گو کہ شاعر میں "آفتاب پرستی"
عان ضرور پیدا ہو رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ رشک کا اذیت ناک احساس اس کا قدرتی نتیجہ تھا۔ بر سبیل
اس کی تصدیق حاتم علی بیگ مہر کے نام غالب کے ان خطوط سے بھی ہوتی ہے جن کی سطور کا حوالہ ہم اوپر دے چکے
ن میں مغل جان اور اس کی وجہ سے ان دونوں کے مابین ایک گونہ رقابت کا ذکر ملتا ہے۔ مغل جان ظاہر ہے کہ نہ صرف
مد علی خاں کی توجہ کا مرکز تھی جن کی کوٹھی میں وہ ملازم اور مقیم تھی بلکہ شاعرانہ مزاج رکھنے والے مہر بھی، جنھوں
پنے اشعار میں اس کے حسن و جمال کی مدح سرائی کی ہے، اس سے دل چسپی رکھتے تھے باوجود اس کے، اس صورت
کے تعلق سے غالب کا رویہ خاصہ خوش دلانہ تھا۔ " بہر حال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو
نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں
ا میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر
سا پھر جاتا ہے---- کیا کہوں جی پر کیا گزری جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے اپنی زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا۔"
اس طرح کے تعلقات کی سرسری نوعیت اور اس زمانے کے ضابطۂ اخلاق میں تضاد بالکل نہیں ہے۔ غالب مہر کو
یں " ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور
ہیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔۔

لیکن شاید اس مروجہ ضابطہ اخلاق کے باوجود ڈومنی کے تعلق سے مرزا کا جذبۂ عشق سرسری نہیں بلکہ سنجی سوا۔ اس جذبے میں معشوقہ کو کھو دینے کا خوف بھی تھا، رشک بھی تھا، اور وہ تمام مسرتیں اور غم واندوہ بھی تھے عشق کی نشانی ہیں۔

جہاں تک ادبی روایت کا تعلق ہے، تو اس میں مرکز توجہ ہمیشہ سے عشق حقیقی۔ یا عشق الہی ہی تھا، بلندی بھی تھی اور حسن بھی، لیکن جس کے لیے محسوسات اور تجربات کے شخصی پہلوؤں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بلکہ بر عکس اہمیت اگر تھی تو ان کی ماہیت اور ان کی تعمیم کو۔ مختصر یہ کہ مثالی جذبۂ عشق کے لیے کوئی خاص انفرادی ردِ عمل درکار نہیں تھا، یعنی ٹھیک اسی شے کی ضرورت نہیں تھی جو عہد حاضر کے انسان کی نظروں میں اس جذبے کو معتبر بناتی ہے۔

مزید برآں یہ کہ نہ صرف خدا سے اور عورت سے محبت بلکہ بادشاہ وقت، ادب کے قدرداں امیر اور محسن سے قصیدہ خوانی یکساں الفاظ اور یکساں جوش و خروش کے ساتھ کی جا سکتی تھی۔ حافظ کی غزلیات کے ترجمے پر اپنے نو کندیریوا نے نشان دہی کی ہے کہ بہت سے اشعار جن میں شاعر نے انتہائی لطیف، پراسرار اور عرفانی انداز میں اظ کیا ہے، دراصل شیراز کے فرماں رواؤں کی خدمت میں انعام و اکرام کی درپردہ التجا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خود غال حضرات اہل بیت کی منقبت میں اور ہندوستان کے انگریز فرماں رواؤں اور یہاں تک کہ ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں قصیدوں کو پڑھتے ہوئے اس جوش و خروش پر قاری کو بارہا تعجب ہوگا۔ مگر کیا کیا جائے، تاریخی حقائق ہی ایسے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں سیدھے سادے اور فطری انداز بیان کو خال خال ہی اپنایا ایسے تکراو کا بیان کم ہی ملتا ہے جس پر انفرادیت کی چھاپ ہو۔ غالب بجا طور پر سے نظیری کو اعلیٰ درجے کا شاعر ما۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے بہت سے اشعار اتنے سیدھے سادے اور واقعی صورت حال پر مبنی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ دوسری ہی روایت کی پیروی کی گئی ہے۔

چہ خوش است بادو یک دل ، سرحرف باز کردن
گلہ گزشتہ گفتن ، سخن دراز کردن
اثر عتاب بردن ز دل ہم اندک اندک
بہ بدیہہ آفریدن ، بہ بہا نہ ساز کردن

اور یہ انصاف کی بات ہوگی اگر ہم تسلیم کریں کہ زندگی میں بھی اور ان کے اس عشق میں بھی ان کے جذبۂ رشک م اور ان کے کلام میں بھی غالب کی غیر معمولی بصیرت کا اظہار ان کے دریافت کیے ہوئے، دل کی گہرائیوں سے نکلے ہ ذاتی تجربے پر مبنی اس لہجے میں ہوتا ہے، جو بہ حیثیت مجموعی غیر روایتی ہے۔

نسبتاً بعد کے دور کے ان کے فارسی کلام میں ایک غزل ہے، جس میں انفرادی رنگ بہت وضاحت سے نمایاں ہے۔ خیالی پیکروں کے سڈول خدوخال اور حقیقت سے ان کا ربط قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور یہ وہی خص ہیں جو شاعر کے ابتدائی دور کے اردو کلام میں ابھی داخل نہیں ہوئی تھیں۔

گفتم ز شادی نہ بودم گنجیدن آساں در بغل
تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل
نازم خطر ورزیدنش واں ہرزہ دل لرزیدنش
چینے بہ بازی بر جبیں دستے بہ دستاں در بغل
آہ از تنگ پیراہنی کافزوں شدش تردامنی
تا خوی بروں داد از حیا گردید عریاں در بغل

تاہم ایک دوسرے کو پہچاننے، اور قربت باہمی کی ان مسرتوں کی قسمت میں پائیداری نہیں لکھی تھی۔ ڈومنی جلد
ں اس دنیا سے گزر گئی۔

پیرانہ سالی میں غالب، مہر کو جن کی محبوبہ ان کو داغ مفارقت دے گئی تھی اور جس کی موت کے لیے موخرالذکر خود
ذمہ دار سمجھتے تھے، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "بھئی، مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار
تے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور
م دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ
ٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا
تا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمد بس ست و آل محمد

بس ماسوا ہوس۔

مہر کے نام یہ مکتوب ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان لکھا گیا، چناں چہ ڈومنی کی موت کی تاریخ بہ ظاہر ۱۸۱۷ء اور
۱۰ء کے درمیان ہو سکتی ہے۔ مرزا کی ایک غزل ڈومنی سے معنون ہے، اس حقیقت کی توثیق سبھی تذکرہ نگاروں نے کی ہے
غزل کی صحیح تاریخ تحریر کا علم نہیں۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

یہ غزل مرثیے یا نوحے کی طرز میں لکھی گئی ہے اور اس لیے ساری غزل ایک ہی موضوع کی تابع ہے۔ غزل سے سچا حزن و ملال ٹپکتا ہے گوکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق مرنے والوں کی یاد میں ملول ہونے اور آنسو بہانے سے اُس دنیا میں ان کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے اور ان کو بے چینی ہوتی ہے۔ غزل میں دو جگہ مخفی پیمان وفا کا ذکر ہے، جس کی آواز بازگشت ہم کو الٰہی بخش خاں کے بیان میں ملتی ہے، اس رسوائی کا بار بار ذکر ملتا ہے جو اس لڑکی کے لیے لازمی تھی اور اس ذمہ داری کا تذکرہ ہے جو اس نے اپنے دوست کی غم گساری میں اپنے سر لی تھی۔

غزل میں ڈومنی کے شخصی اوصاف کا ذکر ہے، جن کی ہم پہلے بھی غالب کے دیگر اشعار اور خطوط کے حوالے سے جا بہ جا نشان دہی کر چکے ہیں۔ یعنی رازداری اور دکھاوے کی غفلت شعاری، جس کے پیچھے بہ ظاہر ایک تیز و طرار فن کارانہ مزاج پوشیدہ ہے۔ غزل کے مقطع میں ذوق خواری یعنی رسوائی کا مقابلہ کرنے کے ارادوں کا ذکر ہے۔ یہاں ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ عاشق، مجنوں کی طرح جنونِ عشق کی رسوائی اپنے سر لینے میں اور اپنے مفاد کو کلیتہً فراموش کر دینے میں ناکام رہا۔ غمِ عشق سے جی بھر کے لذت اندوز نہ ہو سکنے کا مضمون اس شعر میں بھی ملتا ہے جس میں اس زخمِ کاری کا شکوہ ہے جس کی لذت سے شاعر کا دل محروم ہی رہا۔ مختصر یہ کہ ان سب باتوں کے پسِ پردہ صریحاً شاعر کی زندگی میں پیش آنے والا کوئی ڈرامائی واقعہ کارفرما ہے، جس کے لیے شاعر خود کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس صنفِ سخن کی روایات کی بھی پوری طرح سے پابندی کی گئی ہے۔

اور حالاں کہ چالیس سال بعد مہر کے نام اپنے خط میں غالب اپنی زندگی کے اس ڈرامائی واقعے کا ذکر یوں سمجھیے کہ محض بر سبیل تذکرہ حافظے کے نہاں خانوں سے ابھر کر سامنے آنے والی ایک بات کی حیثیت سے کرتے ہیں، در حقیقت اس واقعے کے غم کو انھوں نے برسوں اور جذبات کی پوری شدت کے ساتھ جھیلا۔ ان کے مجموعے "پنج آہنگ" میں ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان تحریر شدہ مظفر حسین خاں کے نام ایک خط شامل ہے۔ بہ ہر حال یہ خط کتاب کے پہلے نسخے میں جو ۱۸۳۵ء میں اشاعت کے لیے مرتب کیا گیا تھا، شامل نہ تھا، لیکن اس میں ایک ایسی غزل کا شعر ملتا ہے جو ۱۸۳۸ء میں غالب کے فارسی دیوان میں شامل کی گئی تھی۔ نتیجتہً یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ خط ڈومنی کی موت کے تقریباً بیس سال بعد لکھا گیا۔

اس خط کا تعلق بھی ایک دردناک واقعے یعنی کسی کی موت سے ہے۔ غالب مکتوب الیہ کو اپنی دردناک کہانی کا رازدار

ہیں۔ خط اسلوب و زبان کی موزونی و صحت اور اپنی مخصوص ساخت کے اعتبار سے بھی ایک کافی دل چسپ ادبی تخلیق کی
رکھتا ہے۔ خط ایک طرح سے رواقیت یعنی راحت والم کے جذبات سے آزاد ہو جانے کی تلقین سے شروع ہوتا ہے، لیکن
واضح ہو جاتا ہے کہ خود مکتوب نگار ایسی مستقل مزاجی پر قادر نہیں ہے۔ اسے تسلیم ہے کہ وہ علائق دنیوی اور نتیجۃً رنج
کے جذبات کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ غالب لکھتے ہیں: "اگرچہ کہ میں جانتا ہوں کہ عقل مند علائق دنیوی کو زیادہ
نہیں دیتے اور سمجھ دار لوگ تنہائی اختیار کرتے ہوئے، اپنے دل کو دنیوی محبت میں، جو اس کے لیے سم قاتل ہے،
نہیں ہونے دیتے، مگر کیا کیا جائے اگر میں دستورِ وفا میں کوئی جدت پیدا نہ کر سکا اور جعل سازی پر اتر آنے والے کم
کی طرح میں نے اپنا دل دو مختلف جگہوں پر رہن رکھنا نہیں سیکھا۔ ان الفاظ پر، جو بے خیالی میں میرے قلم سے ٹپک
، فضول نکتہ چینی مناسب نہیں..... مجھے محبت کے اس جذبے پر فخر ہے، جو محفلِ وصال کی شمع روشن کیے بغیر، داغ
سے جھلس گیا۔

اس کے بعد غالب اپنی بیس سال پرانی کہانی سناتے ہیں اور ان کے بیان سے ظاہر ہے کہ ان کے زخم سے خون کا رسنا
میں ہوا تھا۔ "اب جب کہ نشترِ غم میرے قلب کے ریشے ریشے میں دھنس چکا ہے اور قلبِ حزیں سے جو نے خوں بہہ
میری آنکھوں سے نکل رہی ہے تو میں آہ وزاری سے خود کو کیسے روکوں، کس ترکیب سے اپنے دل کو اس گردابِ خون
لوں عہد جوانی میں جب میرے اعمال، میرے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھے اور سر میں پری رویوں کا سودا کوٹ کوٹ
را ہوا تھا، بد نصیبی نے تلخی سے بھرا ہوا ایک جام میرے سامنے بھی رکھ دیا اور اس چوراہے پر تڑپنے پر مجھے مجبور
، جہاں سے میری محبوبۂ غم گسار کا جنازہ گزر رہا تھا۔ روز روشن میں سیاہ ماتمی کپڑے پہنے اپنی محبوبہ کے غم میں آنسو
ہوا میں دری پر بیٹھا رہتا اور تنہائی کی شب تار میں پروانہ ساں خود کو تنہائی بے صدا کی شمع پر جلاتا۔
کیسی کھلی ناانصافی ہے کہ اس نازک اندام کو سپردِ خاک کرنا پڑا جو بسترِ راحت پر میری شریک تھی اور جسے وقت
ت رشک کے باعث خدا کو سونپنے میں بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔ کیسا غضب ہے کہ اس معشوقۂ پری تمثال کو شہرِ خموشاں
چھوڑنا پڑ رہا ہے جسے مجھے گل زار میں بھی تنہا چھوڑنے میں ہچکچاہٹ ہوتی تھی کہ کہیں نرگس کی ترچھی نگاہ نہ اسے
پہنچے!

خاک خوں باد کہ در معرضِ آثارِ وجود
زلف و رخ درکشد و سنبل و گل بار دہد

(تف ہے اس زمین پر جو اپنی صلاحیت تخلیق کی ڈینگ مارنے کی غرض سے کیسے کیسے حسین چہرے اور کیسی کیسی
زلفیں نگل جاتی ہے تاکہ ان کے عوض میں سنبل اور گلاب کو جنم دے)
جب جال پھٹا ہوا ہو اور صید پھندے سے نکل چکا ہو تو صیاد کی دل جمعی کیا مذکور؟ اگر گلاب کے پودے جڑ سے
لے گئے اور باغ باں کے پاس گلاب ہی نہیں تو فصل گل کا کیا مذکور؟
اگرچہ کہ حسینہ خود کو اپنے عاشق کے سپرد کر دیتی ہے لیکن اس خود سپردگی کا دام تو ساری عمر کی دل سوزی سے چکایا
ہے اور عاشق و معشوق جانتے ہیں کہ جشنِ محبت کی قیمت انھیں کتنی مہنگی دینی پڑتی ہے۔ یہ ٹھیک ہی ہے کہ معشوقہ نے
وفا کو نبھانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا، آخر وہ واجبی سے کہیں زیادہ قیمت کا بھی تو مطالبہ کرتی ہے اور جس کا بھی وہ دل
ہے وہ اس کی محبت میں زندگی سے ہاتھ دھوتا ہے۔ چاہے داغِ مفارقت دینے والی کا غم روح کو تڑپاتے اور اس کی دائمی

۱۔ دیکھیے نسخہ حمیدیہ کا یہ شعر۔ گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

مفارقت کا خیال دل کے ٹکڑے کر ڈالے، سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے لیے بے تاب رہنے والے حقیقت کے ادرا
نہیں دیتے۔ اور اس کرب روحانی اور دل کی اس بے قراری کے عالم میں ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کوئی دوا ایسی
ہے جو دل کی بے چینی کو کم کرے اور کوئی بھی بشر ایسا نہیں ہے جس کو موت کے پنجے سے رستگاری مل سکے۔۔ لیکن
زبردست طاقت کا اعتراف، اور اس طرح سے اپنے دیرینہ غم کو غلط کرنے کے بعد غالب " متوازی سر۔ کی طرف رجوع
ہیں اور مکتوب الیہ کو زندگی کی طرف واپس آنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

غالب روح کو خشک کر دینے والے ایسے رنج والم سے خبر دار کرتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ قلب کی بے حسی ہے
انسان کو ایسے ریگستان میں پھینک دیتا ہے جہاں بادِ سموم کا راج رہتا ہے۔

" مناسب ہو گا کہ اس جگر خراش افسردگی میں مصیبت زدہ خود اپنے صبر و تحمل کی تہذیب کرے۔ افسوس
افسوس! غور کا مقام ہے۔ عشاق اور حواس باختگان الفت کی ملکیت میں ایک ایسا دل ہے جسے کبھی تو مستقل مز
صبر و تحمل کی تعلیم دی جاتی ہے اور کبھی اس پر زلف گرہ گیر کی کمند پھینکی جاتی ہے۔ لیکن کیا مردہ جسم دلوں کو بے قرار
ہے؟ اور زلفِ گرہ گیر کس کام کی اگر وہ دلوں کو اپنا اسیر نہیں بنا سکتی؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں حد سے متجاوز یہ کرب،
آنکھوں کو گردِ ملال سے دھندلا نہ دے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ پھل نہ لائے جس کا نام دلِ مردہ ہے۔ رسوائے محبت
ہر گلِ نو شگفتہ کے عشق میں زمزمہ سنج ہوتا ہے اور پروانہ، جس کے چرچے ساری دنیا نے محبت میں ہیں ہر شمع کی طر
کا رخِ روشن دیکھتے ہی ہم آغوشی کے لیے دیوانہ وار لپکتا ہے۔ محفل میں کتنی شمعیں فروزاں ہیں اور چمن میں کتنے گلا
ہیں تو کیا پروانہ ایک ہی شمع کے غم میں جلتا رہے اور بلبل ایک ہی گلاب کے مرجھانے پر آہ وزاری کرتا رہے
تماشائے حسن، تماشائے رنگ و بو کے دیوانے ہیں، کسی ایک، اکیلی آرزو کے اسیر نہیں، اور مرحبا کہ محفلِ الفت میں
ترانۂ مسرت الاپنا شروع کرتے ہیں، ان خوب رویوں کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بازو پھیلا دیتے ہیں جن میں یہ ہ
ہے کہ اپنے عشاق میں ذوقِ حیات کو دوبارہ زندہ کریں اور خود بھی اس کا لطف اٹھائیں اور یہ سب اس غرض سے روبہ
جاتا ہے تاکہ ہماری اس مسرت سے دشمنوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور راقم السطور کا رشحۂ قلم یہ شعر فضا میں گو۔
کانوں میں مٹھاس گھولے۔

بر ما غم تیمار دل زار سرآمد
دیوانۂ مارا صنم سلسلہ مو برد

ہمارے لیے دل آزردہ کی غم گساری کا وقت پھر آگیا ہمارے دل دیوانہ کو زلف گرہ گیر والا ایک صنم اڑا لے گیا ہے
سب جانتے ہیں کہ جذبے کی شدت فطرت انسانی کی گہرائی اور لطافت کی نشانی ہے۔ لیکن جیسا کہ زبلوتسکی نے لکھا
" قلب متلون کی نشانیوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا صرف ایک فن کار کے بس میں ہے۔۔ اگرچہ کہ اس شدت
ہو گئی اور گردِ ایام نے اس کو قدرے دھندلا دیا لیکن اس عشق کی یاد شاعر کے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہوئی، غم
کی ماہیت کے ادراک نے شاعر کی ساری زندگی کی دائمی قدر کی حیثیت اختیار کر لی۔ نوجوان مغنیہ ہمیشہ کے لیے غالب کی
کا ایک جزو بن گئی اور اس کی جھلک کبھی ہم کو شوخ و طرار معشوقہ ستم پیشہ کے پیکر میں تو کبھی پوشاک کے معاملے
لاپروائی اور اپنی تنگ پیراہنی سے شاعر کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی دل فریب، زہرہ وش مغنیہ کے روپ
دکھائی دیتی ہے اور یا پھر شعر کا چست اور پھڑکتا ہوا آہنگ ہمیں اس کے وجود کی یاد دلاتا ہے۔

***

ڈاکٹر احمد محی الدین

محمد مارماڈیوک پکتھال

آج کل برطانیہ میں اسلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ عام انداز مخالفانہ ہے لیکن چند لکھنے والے باوجود
ری عصبیت کے فراخ دلی اور دیانت کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ اس رویے کی ایک مثال ذیل کی کتاب ہے۔

, MARMADURE PICKTHALL: BRITISH MUSLIM

Publisher QUARTET BOOKS LTD. LONDON 1986

Author PETER CLARCK. ISBN 0-7043-2514-4

مصنف نے خاصی تحقیق کی ہے اور اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ پکتھال کی قلمی پیداوار کی فہرست نامکمل رہی۔ باوجود
س کے کہ ناول، مقالے، تبصرے، وغیرہ کا شمار چار سو تک پہنچ گیا ہے اور ۱۸۹۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۴ء تک چھپا ہوا
ہے، گو پکتھال کا عرصۂ حیات ۱۸۷۵ء سے ۱۹۳۶ء تک ہی رہا۔ ۱۹۳۶ء تک تو براہ راست ان کے قلم سے لکھی ہوئی چیزیں شائع ہوئی
یں اور اس کے بعد ان کی مقبول ترین ناول The Fisherman Said جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی ۱۹۴۸ء میں اطالوی
بان کے ترجمے کی شکل میں نکلی۔ پکتھال کا سرمایۂ حیات ترجمۂ قرآن کریم The Meaning of the Glorious Koran
۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد کئی ادارے اسے بار بار طبع کرتے رہے ہیں۔ اس کے دو ترکی تراجم ۱۹۵۷ء میں نکلے
ر ایک اطالوی ترجمہ ۱۹۶۴ء میں۔ اس طرح ان کی قلمی حیات جاری ہے گو لوح مزار پر انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کندہ ہے۔ اگر کسی
اد کے دوران موت کو شہادت کا درجہ ملتا ہو تو یہ ثابت ہے کہ شہید زندہ رہتے ہیں۔ ویسے پکتھال نے ارضی وجود کے تقریباً
اٹھ سال کی مدت کے آخری چالیس سال عملی جد و جہد میں بھی گزارے۔ اس کی تفصیل کلارک Clark نے دی ہے۔ مجھے
ن کا خلاصہ پیش کرنا مقصود نہیں۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ پکتھال کے بارے میں چند فردی باتیں جو میں ذاتی
م و مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔

بات ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۸ء کے تعلیمی سال کی ہے اور مقام حیدر آباد (دکن) عہد میر عثمان علی خان آصف جاہ، نظام دکن کا
ر ادارہ The Government High School Chaderghat۔ اس مدرسے میں پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت
ت تعلیم دی جاتی تھی۔ جماعت آٹھ تا دس ثانوی تعلیم ہوتی تھی اور اس کے بعد نظامت تعلیمات کے انتظام کے تحت مک
ٹر کے لیے عام امتحان مقرر تھا۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا۔ گو اردو اور فارسی بھی درس میں شامل تھی۔ مدرسے کے طلبہ
کثر غریب یا ادنیٰ متوسط طبقے کے ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ خوش حال طلبہ چند اور مدارس کا رخ کرتے تھے۔ شہر بھر میں اس
درسے کی شہرت کھیلوں میں اور کسی قدر مادیت (کھیلوں، خصوصاً فٹ بال کے مقابلے کے بعد، دوسرے مدرسوں کے
ڑکوں کے خلاف) میں تھی۔ اس لیے ایک طرح سے یہ "بدنام اور گھٹیا" مدرسہ تھا۔ اور پکتھال اس کے پرنسپل تھے۔ اس
ہدے کا حق وہ اس طرح ادا کرتے تھے کہ کسی لڑکے کو تو کیا کسی مدرس کو بھی شاید گمان نہ ہوا تھا کہ حضرت کے اور بھی
مشاغل ہیں، اور ان کا اس سے قبل کا عہدہ بمبئی اور ہندوستان کے وسیع اخبار The Bombay Chronicle کے مدیر اعلیٰ کا

تھا۔ اور ان کے مراسم مصر، سلطنت عثمانیہ (ترکی)، اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے تھے۔ اور یہ بھی کہ وہ ممتاز ادیب و صحافی تھے، اور یہ کہ اسی دور میں حکومت نظام کی سول سروس کے منتخب افراد کی تربیت بھی کرتے تھے، میر عثمان علی خاں سے راست تعلقات تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ ترجمۂ قرآن کے کام میں غرق تھے۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ وہ کیسے بلاناغہ، سوائے جمعہ کی تعطیل کے، دن بھر مدرسے میں موجود رہتے، دوپہر کے وقفے میں نماز ظہر کی امامت بھی کرتے اور اسی گھنٹے میں سکول کے صحن میں کچھ دیر کے لیے لڑکوں سے بے تکلف گفتگو بھی کرتے تھے۔ گفتگو میں لطیف ظرافت جھلکتی رہتی ان کی مسکراہٹ طلبہ کو بھول نہیں سکتی۔

محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم کا دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ان کے نائب ہیری ہیرابیٹر بھی بیٹھتے تھے۔ اس کمرے میں صرف دو چھوٹی سی دفتری میزیں اور دو سادہ کرسیاں تھیں۔ ایک دوسرے کے مقابل، دروازے پر کوئی دربان تھا نہ پردہ اور نہ ہی کبھی دروازہ بند ہوتا۔ جس کسی کو بھی پرنسپل یا نائب پرنسپل سے کام ہو، سیدھا اندر چلا جاتا، اگر اندر کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی، اور کام ختم ہوتے ہی نکل آتا۔ میں ساتویں جماعت کا نظامت تعلیمات کا منعقدہ عام امتحان تیسرے درجہ میں پاس کر کے یعنی مجموعی طور پر چالیس فیصد سے کم نمبر حاصل کر کے، وہ بھی ایسے مدرسے سے جس کی "شہرت" اور بھی کم تھی اور جہاں سے دس جماعت سے آگے تعلیم کا انتظام نہ تھا، صدر مدرس کا دیا ہوا پرچہ لے کر دو میل دور واقع پکتھال کے دفتر میں جا پہنچا۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال کی تھی۔ اور پکتھال نے اسی وقت مجھے آٹھویں جماعت میں داخلہ دے دیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ ماہانہ فیس دو سو روپیہ تھی۔ اور یہ "بھاری" رقم میرے بس کی نہ تھی۔ ایک ذرا سینیئر (Senior) ہم محلہ لڑکے نے مجھ سے عرضی لکھوادی کہ فیس معاف کر دی جائے۔ اس پرچے کو لے کر میں پکتھال کے پاس گیا۔ بڑی خوش مزاجی سے ایک دو باتیں پوچھ کر انھوں نے اس کاغذ پر فیس کی معافی کا حکم لکھ دیا۔ اس احسان کا خیال کبھی دل سے گیا نہیں۔ تیسری بار میں پکتھال کے دفتر میں حسب قاعدہ بدن کے کسی علامتی نشان کو درج کروانے کے لیے گیا۔ ان دنوں میرے چہرے پر سیم (Pityriasis Versicolor) کے نشان تھے۔ میں نے کہا کہ "یہ امتیازی نشان ہیں۔ تو ہنس کر پکتھال نے کہا کہ "یہ تو چلے جائیں گے۔ کوئی مستقل نشان ہو تو بتاؤ۔"

ہر لڑکے کے لیے ایک ریکارڈ بک Record Book ہوتی تھی اور اس میں ہر سال دوبارہ امتحان میں نمبر حاضری کی شرح وغیرہ درج کر کے پرنسپل کے دستخط ثبت ہوتے۔ میرے ریکارڈ کی کتاب میں پکتھال کے دستخط روشنائی سے کیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک مد میں انھوں نے غلطی کو درست کر کے چھوٹی دستخط (M.P.) بھی ثبت کر دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح ہر لڑکے کے ریکارڈ کو غور سے دیکھا کرتے تھے۔ جب پکتھال رخصت لے کر مصر چلے گئے (تاکہ ترجمۂ قرآن پر مصری علما سے نظر ثانی کروائیں) تو ان کے جانشین کے ریکارڈ پر دستخط قلمی نہیں بلکہ مہر سے ٹھپہ لگائے ہوئے ہیں۔ آدمی وہ بھی اعلیٰ وضع کے اچھے تھے، مگر نہ ظہر کی نماز کی امامت کی نہ فرصت کے وقت صحن میں طلبہ سے بات کرتے نظر آتے۔ یہ تو پھر بھی "عوامی" پرنسپل تھے۔ ایک اور اسی سطح کے مدرسے کے پرنسپل صاحب کی وہ شان تھی کہ ان کے اجلاس میں اساتذہ تک حاضر ہونے سے جھجکتے تھے اور طلبہ تو شاید ہی کبھی کبھی ان کو دیکھ پاتے ہوں۔ میں ان دو حضرات کے نام مصلحتاً نہیں لے رہا ہوں۔

پکتھال لڑکوں کے اسپورٹ کے مقابلوں میں خاصی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ میرا ایک ہم جماعت جو اس میدان میں ممتاز تھا، ایک خاص مقابلے میں خلاف توقع دوسرے نمبر پر آیا اور بعد میں صحن کی گفتگو کے دوران اس نے کہا کہ نہ معلوم کیوں وہ ناکام رہ گیا۔ تو پکتھال نے ٹوکا اور کہا "تم نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔" ایک اور دن میرے دو ہم جماعت آپس میں لڑ پڑے۔ اور پکتھال کو لازماً خبر ہو گئی۔ دفتر چند قدم ہی پر تھا۔ جلد ہی اعلان عام ہوا کہ آخری گھنٹے کے درس موقوف، اور

تمام لڑکے اور اساتذہ صحن میں جمع ہوجائیں جب اجتماع ہوا تو وہ حریف سامنے لائے گئے اور ان کو مکہ بازی کے دستا
پہنانے گئے۔ پکتھال خود امپائر بنے اور کہا کہ اب جی بھر کر لڑو۔ دو تین منٹ تک بادل ناخواستہ حریفوں نے ہاتھ چلائے
کو چوٹ نہیں آئی اور تماشا ختم ہوگیا۔ اس کے بعد پھر مدرسے میں کسی کے لڑنے جھگڑنے کا سوال ہی نہ تھا۔

مدرسہ اور حیدرآباد چھوڑ کر پکتھال گئے تو گرما کی چھٹیوں کے دوران کوئی تقریب، کوئی رسم انہیں الوداع کہنے کی
ہوئی۔ مرد مومن کے لیے ایسی ہی مراجعت شایانِ شان ہوتی ہے۔ ۱۹۲۸ء کے بعد میں نے پکتھال کو دیکھا نہیں۔ لیکن
سال قبل Punch یا شاید The New Yorker (اب حافظہ کام نہیں کرتا) میں ایک مضمون اتفاقاً نظر پڑگیا اس کی لکھنے و
ایک عورت تھی جس کی ماں کی ملکیت کے مکان میں ۱۹۲۰ء کے قریب پکتھال اور ان کی بیوی میوریل Muriel (جو خود
اپنے شوہر کے قبولِ اسلام کے چند سال بعد ایمان لائیں) کرایہ پر رہتے تھے۔ مضمون میں لکھا تھا کہ پکتھال اکثر تصنیف
مسودہ کھڑے ہو کر لکھتے تھے اور کاغذ لیکٹرن Lectern (گرجاؤں میں لکھنے یا گانے کا ڈیسک) پر رکھا ہوتا تھا۔ ذرا احسا
لگائیں کہ سیکڑوں تصانیف جس کی ہوں اور وہ بھی ایسی کہ ایک ایک لفظ نظر ثانی اور ترمیم چاہے، تو یہ کیسی ریاضت ہوا
صرف ترجمۂ قرآن ہی کو دیکھیے کہ کسی سرکاری ادارے کی حمایت کے بغیر بھی آج تک وہ بار بار نئی نئی وضع سے چھپتا ہی ر
ہے۔ اس کا ایک نہایت مستحسن نسخہ تین کالموں میں ہے، دائیں طرف عربی متن، بائیں طرف پکتھال کا ترجمہ اور درمیا
میں محمد عبدالحلیم الیاسی (برنی اکاڈمی۔ حیدرآباد دکن) کا جدید نظام پر سلیس رومن رسم الخط میں عربی کا تلفظ۔ اس کی اشاع
ادارۂ اشاعت دینیات، نظام الدین، دہلی سے ہوتی ہے۔ انگریزی ترجمہ اور رومن رسم الخط میں عربی عبارت کی ترتیب ایک ما
ماہر فن سبرامنیم نے اس خوبی سے کی ہے کہ ہر صفحے پر تینوں عبارتیں پوری طرح سمائی گئی ہیں۔ اس کے لیے بعض صفحو
رومن ٹائپ کو چھوٹا کرنا پڑا۔ طباعت میں کوئی غلطی مجھے نظر نہیں آئی۔

پکتھال کے ترجمے پر چند اصحاب نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تنقید جائز ہی نہیں ضروری چیز ہے
نکتہ چینی کی بات اور ہے۔ ہر زمانے میں قرآن کے ترجمے ہوئے۔ تفاسیر عربی میں مرتب ہوئیں اور کوئی بھی ترجمہ لا محالہ
معانی اور تفسیر کے رنگ سے بچ نہیں سکتا۔ مترجم زمان و مکان کی قید میں ہوتا ہے اور مسلمان قرآن کو اس قید سے ب
مانتا ہے۔ اس لیے کوئی ترجمہ یا تفسیر حرف آخر نہیں ہو سکتی۔

باشعور قاریوں کے لیے کسی بھی تحریر کا عمل جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور ترجمہ قرآن کی ریاضت کا کہنا ہی ک
اگر کوتاہی پائی جائے تو آخر بشری عمل ہی تو ہے۔ ان باتوں کو بھولے بغیر اور سات دوسرے انگریزی تراجم سے ما
کرنے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پکتھال کے ترجمے میں ایک خاص کیفیت ہے جس کے بیان کے لیے الفا
نہیں ملتے۔ ویسے Arberry کا آزاد نظم کی صورت میں ترجمہ بھی خوب ہے اور محمد اسد کا ترجمہ عصری بھی ہے اور عالمانہ
اور ان کی اپنی جدا خوبیاں ہیں۔ انگریزی زبان و محاورے میں تدریجی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ پکتھال کے ترجمے کی زبان ۰ء
کے معیاری ادب کی زبان ہے جس میں خشوع کی چاشنی ہے۔ یہ ایک طویل بحث کی طالب ہے جس کا یہ مقام و موقع نہیں

آخر میں ایک انوکھا اور بالکل جدید تجربہ پکتھال کے نام سے متعلق مجھے ہوا۔ کراچی میں ایک صاحب نے مجھ
شکایتی سوال کے انداز میں کہا "پکتھال نے کیوں اپنے لیے کوئی اسلامی نام نہ چن لیا۔" وہ بھول رہے تھے کہ اس نے ا
نام کے آگے محمد کا اضافہ کرلیا تھا مگر بجائے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے، میں نے ان سے جواباً پوچھا "قبولِ اس
سے قبل صحابۂ رسول کے نام کیا تھے۔" اور یہ بھی پوچھا کہ "سکندر بیگ۔" "شیر خاں۔" "بدیع الزماں" وغیرہ قسم کے نام
طرح "اسلامی" ہوگئے۔ سوال کرنے والے صاحب تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں۔ جب ان کی سوچ ایسی ہے تو ہماش
کیا حساب؟ یہ ایک اور بڑا وسیع مضمون ہے۔

اس طرح صرف " نام۔ بدلنے کی شرط رکھنے سے غیر مسلم ممالک میں تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹیں کھڑی۔
اور مشرقی وسطیٰ اور افریقی ممالک میں ناموں کی وجہ سے غیر مسلموں کو بھی برصغیر ہندوپاک کے مسلمان "
کرکے پشیمانی مول لیتے ہیں۔ اسی طرح ہر " عربی۔ لباس والے کو " مقدس۔ ہستی خیال کرکے اپنی حماقت ثابت
بالکل ہمیشہ سوٹ پہنے رہتے تھے مگر نماز کے وقت جبہ اوپر سے ڈال لیتے اور سر پر ترکی ٹوپی بھی پہن لیا کرتے۔
سے تراشی ہوئی مونچھیں رکھ رکھی تھیں مگر داڑھی نہ تھی۔ " مولانا۔ نہ دور سے نظر آتے تھے نہ قریب سے۔ اور
نگاری کے حوالے سے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ:
" مگر آنکھوں میں ہنگام تبسم۔ ریا کی چشمکیں اللہ اکبر۔
قطعی نہ ہوتیں۔ ان کے تبسم کا خلوص اور اس کی معصومیت کون بھول سکتا ہے۔

(" خودگزشت۔ کا ایک باب)۔

اقبال متین

حسن چشتی

سنگ مرمر کا گداز

آج محبتیں مصلحت آشنا ہوگئی ہیں۔ چاہتوں کا کام بھی دل نے ذہن کو سونپ رکھا ہے۔ آنکھیں اشکوں کا کاسہ بھول گئی ہیں۔ تنفس زلف دوتا کی خوش بو سے اس درجہ ناآشنا ہوگیا ہے کہ ملیں (MILLS) دور ہوں تو بسوں، لاریوں موٹر کاروں کا کالا گاڑھا دھواں نتھنوں کے راستے سینے میں اتار دیتا ہے۔ اخلاص نما ریاکاری آدمی کے روپ میں پرچھائیوں کی طرح ملنے بچھڑنے والے ہر شخص کا مزاج بن گئی ہے۔ شخص مل بھی جاتا ہے تو شخصیت نہیں ملتی۔ آدمی آدمیت سے سروکار نہیں ہے۔ میرا عہد بے شجر تپتی زمین پر ہانپتا رہتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ بادل برسنے کے لیے ہیں امڈ امڈ کر چھانے اور چھٹ جانے کے لیے نہیں ہیں۔ ہم پیاسی آنکھوں سے خالی کٹوروں کو دیکھتے رہنے کے اس حد تک عادی ہوگئے ہیں کہ سوکھے ہونٹوں کی پپڑیاں اپنے ہی تھوک کی نمی کو ترستی ہیں لیکن وہ آج بھی، اس زمانے میں بھی، ان پرچھائیوں میں بھی، ایسے ایسے سناٹوں میں بھی، اسی طرح ملتا ہے جس طرح کبھی ملا تھا۔ اس کا نام ہے حسن چشتی قریب آکر نچھاور ہونے والا۔ دور جاکر یادوں کی چادریں تان لینے والا۔ اور پھر غریب الوطنی کی اجنبی اجنبی نیند کو اپنے وطن کے خوابوں میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر جاگنے والا اور جاگ جاگ کر پلکیں بچھانے والا۔ دیکھیے کس طرح میرا دوست ہوگیا۔

یہ شخص عجیب شخص ہے۔ پیاسوں کو تلاش کرتا ہے اور پھر کنویں لے کر ان کی طرف دوڑتا ہے۔ مجھ سے پہلی بار ملا تو ایسے ملا جیسے غرض مند ہو۔ اور وہ آیا تھا میری غرض پوری کرنے۔

منیرہ میری مرحوم بیوی قلب کے عارضے میں مبتلا ہوکر عثمانیہ ہاسپٹل کے یونیورسٹی وارڈ میں شریک ہوئی تھیں۔ یہ وارڈ مختص تھا جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ، متعلقین اور ان کے اہالیان کے لیے۔ میں بھی تو پروفیسر عالم خوندمیری کا پرستار تھا جس کو اب مرحوم لکھتے ہوئے قلم رکتا بھی نہیں ہے کہ انھیں جدا ہوئے زمانے بیت گئے لیکن ایک پھانس سی کلیجے میں چبھتی ضرور ہے۔

مختصر یہ کہ میں عالم کے توسط سے، منیرہ کو یونیورسٹی وارڈ میں شریک کراسکا تھا۔ اخباروں میں منیرہ کی علالت کی اطلاع چھپی تو ایک جامہ زیب سرخ و سفید بولتی ہوئی آنکھوں والا کوئی شخص دوسرے ہی دن مزاج پرسی کرنے چلا آیا۔

اس انگریز نما آدمی نے یہ نہیں کہا کہ میں آپ کا FAN ہوں کہنے لگا میں آپ کے افسانوں کے مداحوں میں ہوں۔ جہاں بھی آپ کی کوئی چیز نظر آتی ہے ضرور پڑھتا ہوں۔ آپ کی بیگم کی علالت کی خبر پڑھی تو یونیورسٹی وارڈ کا حوالہ تھا۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے انتظامیہ سے متعلق ہوں۔ سوچا آپ سے ملاقات بھی ہوجائے گی اور میں جتنی میری مقدرت ہے اس وارڈ میں آپ کو سہولت بہم پہنچا سکوں گا۔

مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے اخلاص کو جب اس کے ہونٹوں پر بکھیر رہی تھیں تو پتا بھی نہ چلا کہ اس چلک دمک

کے پیچھے کہیں اشک چشیدہ دل حزیں کی گھلاوٹ بھی شامل ہے۔ وہ سنگ مرمر کی مورت کی طرح سامنے کھڑا رہا جیسے میرے کسی بھی حکم کا منتظر ہو۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ پروفیسر عالم کے توسط سے یہاں منیرہ کو داخلہ مل گیا ہے اور وہ آرام سے ہے۔ فی الوقت اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ ڈاکٹروں نے بند کروادیا ہے۔

اس کو دیکھ کر دواخانے کے متعلقین اس کے اطراف جمع ہونے لگے۔ خدا جانے یہ اس کے عہدے کا اثر تھا یا اس کی ہر دل عزیزی کا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں وارڈ میں داخل ہوا تو وہ پیچھے تھا اور دواخانے کے دو تین لوگ اس کے پیچھے پیچھے۔

اس نے وارڈ سے باہر نکلنے سے پہلے دواخانے کے ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ وارڈ میں آئے تھے کچھ کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اطراف لگے اسکرین اور چوبی پردہ داریوں کو وسعت دینے کی بات کی۔ واپس ہوتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ نیک تمناؤں کا اظہار کچھ اس طرح کیا جیسے مجھ سے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود بزرگوں جیسی دعائیں دے رہا ہو۔

جا چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ متعلقہ ڈاکٹروں سے بھی مل گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس کے اثرات مجھے یونیورسٹی وارڈ کے اس حصے میں صاف دکھائی دے رہے تھے جو ہمارے لیے مختص تھا۔ چھوٹے سے وارڈ کو اسکرینوں اور چوبی پردہ داریوں کا فصل بڑھا کر کشادہ کر دیا گیا تھا۔ دو تپائیاں اور دو کرسیاں بھی رکھ دی گئی تھیں۔ بات آئی گئی ہوئی۔ دھیان نے دوسری راہ پکڑلی۔ زندگی نے اتنی فرصت نہ دی کہ اس اجنبی شخص کو ذہن کے کسی گوشے میں جگہ دوں۔ وارڈ کی وسعتوں سے بھی وہ اب کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اب تو سب کچھ روزمرہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ منیر کی بیماری بھی کچھ انھیں راستوں پر چل نکلی تھی۔

منیر کے بغیر گھر، منیر کے بغیر بچے، منیر کے بغیر بچوں کے اسکولس۔ منیر کے بغیر دستر خوان اور اس پر دھرا کھانا۔ ہر شئے میں کسی شئے کی کمی تھی اور اس کمی کو پورا کرنے کی لگن میں خود میں آدھا ہو رہا تھا۔ اس نصف وجود کا کسی کو پتا بھی نہیں تھا۔ اپنا دکھ اپنے ساتھ چھپا کر بھی کوئی چین سے نہیں جی سکتا۔ لوگ خوشیوں میں شریک ہو کر خوشیاں بٹورتے ہیں لیکن کسی غم کو سرے سے غم تسلیم ہی نہیں کرتے۔ کیا بتاؤں کسر نفسی کن داموں بک گئی ہے کہ ہر زیادتی کا جواز نکل آتا ہے۔

زندگی سمجھوتہ کر لینے میں بڑی بیسوا ہے جیسے اس کا اپنا کچھ ہے ہی نہیں۔ نہ مفر نہ پندار سو اس نے مجھے کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگا دیا اور میں دفتر بھی جانے لگا۔

ایسے میں کون حسن چشتی؟ کہ یکایک اس کا فون آیا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ ان صاحب نے کم سے کم اتنے دنوں میں چار چھ بار تو فون کیا ہی ہوگا۔ تمھارے دفتر میں رجوع ہونے کی تاریخ شاید انھوں نے رٹ رکھی تھی۔ ادھر تم آئے ادھر فون موجود۔ پہلے دستخط تو کرلو۔ رجسٹر چلا جائے گا۔ میری پوسٹ اتنی تھی کہ میں رجسٹر منگوا نہیں سکتا تھا۔ رجسٹر کے پیچھے دوڑ سکتا تھا۔ نام بڑے تھے، درشن بہت چھوٹے۔

اس نے فون پر معذرت کی، خیر خیریت تفصیل سے پوچھی۔ وارڈ کے انتظام کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ مجھ سے بات کر چکا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس کو بھی اپنی بے آرامی میں شریک کر لیا ہے اور وہ مجھے دعائیں دے رہا ہے جیسے میرا انجام جانتا ہو۔

پھر ہم ملتے رہے۔ وہ آتا رہا۔ منیرہ کے بعد وہ زیادہ ہی آنے لگا۔ دفتر سے اٹھا کر مجھے کسی رستوران لے جاتا۔
یرے گھر سے اٹھا کر اپنے گھر لے جاتا۔ غرض کہ طرح طرح میری کچھ اس ڈھنگ سے دل جوئی کرتا کہ دل جوئی کرتا ہوا نہ لگتا
نے۔ چوروں کی طرح غم چرا لینے میں بڑا ملکہ تھا اس کو۔ بچپن میں پڑھا تھا کہ ایسا ہی من چلا کوئی محمود گاواں بھی تھا جو
توں رات چھپ کر ضرورت مندوں کے گھر رقم کی تھیلیاں پھینکا کرتا۔ آج زندہ ہوتا تو وہ تھیلیاں پھینکا جاتا اور اس کے
گے بڑھتے ہی چور اچکے تھیلیاں سمیٹتے جاتے۔ دوسرے دن ساری تھیلیاں کسی پولیس تھانے سے برآمد ہوتیں اور وہ
ص جس نے تھیلیاں چن لی تھیں رات کی تاریکیوں سے بچ کر پولیس تھانے میں زیادہ محفوظ طور پر چھپا رہتا۔ غم چرا لینے
ا فائدہ یہی ہے کہ چور پولیس کی زد میں نہیں آتا اور چور کا اپنا اثاثہ بھی دوسروں کا ہو جاتا ہے۔

بہار کے ایک اوسط گھرانے میں اکتوبر 1930ء کی پندرھویں تاریخ کو حیدرآباد میں پیدا ہونے والا یہ بچہ خوں فاں
نکل کر باہر آیا تو سنگ مرمر کے ایک ایسے پتلے کی طرح تھا جس پر اس کے قابل افتخار باپ کی اصول پسندی نے گاندھی
نہرو کا پرتو ڈال رکھا تھا۔ اور یہ پرتو بھی غیر مرئی نہ تھا بلکہ کھادی کی کرتنی اور موٹے کھدر کی موٹی سی "چڈی" کی صورت میں
نے والوں کو صاف نظر آتا۔

آٹھویں جماعت تک حسن چشتی کے خوب صورت بچپن کے ساتھ کھدر پوشی نے کچھ ایسا برا سلوک نہیں کیا۔ ہمدردی
ان دوستی، محنت، تحمل، مسکراہٹوں کی سپر کے پیچھے چہرہ چھپا کر صعوبتوں کو ہزیمت شناسی سکھلانے والے تیور، اس
ابا حضور نے یہ سارا اثاثہ اس کے ساتھ کر دیا۔ حسن چشتی نے جو شاید موقع کی تاک میں تھا کھادی اتار پھینکی اور باقی
کچھ اپنا لیا۔

چلتے چلتے آپ سے ایک بات پوچھوں۔ آج کھادی پوش شخصیتیں آپ کے ذہن میں کیسا امیج بناتی ہیں؟ جواب دیجیے۔
ایے نہیں۔ بس یہی بات ہے۔ حسن چشتی کھادی نہ اتار پھینکتا تو اس طرح دلوں میں گھس گھس کر بیٹھ جانا اس کے بس
نہ ہوتا۔

ایک کھدر پوشی وہ بھی تھی جس پر حسن چشتی فخر کرتا تھا۔ اس نے اپنے بچپن میں کھادی اوڑھے ہوئے ہیولے کبھی
دیکھے۔ آنکھ کھولی تو اسے کھادی اوڑھی ہوئی ایسی صلابتوں سے واسطہ پڑا جن کا جسم گوشت پوست کا تھا لیکن روح فولاد

اس حیدرآبادی بیٹے کے ابا حضور بہاری تھے۔ ضلع گیا، ان کا وطن تھا۔ اپنے وقت کے کٹر NATIONALIST مسلم
۔ اردو کی پہلی جامعہ جو مادر عثمانیہ کے نام سے مشہور ہوئی اس کے پہلے منتظم۔ نام سمیع احمد اور خدا کے سوا کسی کو
نہیں مانا۔ قلندر صفت آدمی۔ ملنگ بابا۔ ملک پیٹ میں رہتے۔ صبح صبح گھر کے باہر چبوترے پر کمبل بچھا کر بیٹھ
۔ ایک شخص ملے پلی سے پاؤں پاؤں چل کر صبح چھ بجے سمیع صاحب کے ذوق سماعت کا سامان مہیا کرنے چلا آتا۔ آنے
کا نعرہ مستانہ تھا۔ TRAVEL AS YOU LIKE۔ نہ گھوڑا نہ گاڑی۔ ان ہی پاؤں پاؤں چلانے والی ٹانگوں کا کس بل تھا
ب علمی کے زمانے سے علی گڑھ میں اس شخص نے انگریز سرکار کو اس کے پیچھے دوڑ لگانے کے لیے مجبور کر رکھا تھا
ب تک انگریز سرکار نے اس کا تعاقب نہیں چھوڑا وہ باز نہ آیا۔ پھر سرکار خود بھاگ کھڑی ہوئی۔ سمیع صاحب سے
گاڑھی چھنتی تھی۔ سمیع صاحب اس کے معترف اور وہ تو سمیع صاحب کا دل دادہ۔ جانیے کون ہو گا۔ بڑا نام ہے بھئی۔
ت موہانی۔

ملے پلی کے جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کا کرایہ تھا پانچ روپے ماہانہ اور اثاثۂ حیات تھا ایک چٹائی، ایک
ا۔ حسرت موہانی کے علاوہ سمیع صاحب کا یارانہ ان کے جن ہم جنسوں سے تھا وہ سارے کے سارے کھتر نہیں

تھے۔ یاد تھے۔ احمد علی خاں جو بعد میں آندھرا پردیش کی کانگریس سرکار میں ہوم منسٹر رہے۔ شعیب اللہ خاں، جن کے قلم کی بیباکی اور جرأت مندی کو باطل کی قوتیں دبا نہ سکیں تو خود انھیں کو شہید کر دیا۔ مانی جائسی جن کی سخن وری کے چرچے تھے۔
صبیح صاحب اپنے وقت کے والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ ان سے ٹکر لینے والا ایک اور کھلاڑی بھی تھا جو کھیل کے میدان سے نکلا تو ساری زندگی ہی سے کھلواڑ کرتا رہا۔ یہ تھے دیہاتی زبان کے ایسے شاعر جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ میڈیا کچھ ہو خیال کی بلندیوں پر کمند سخن پھینکنا ہنر مندی کا پہلا وصف ہے۔ غلام علی نام تھا۔ علی صاحب میاں کے نام سے شہرت پائی۔

والی بال شروع ہونے سے پہلے نٹ باندھنا اور کھیل ختم ہونے پر نٹ کھول کر لے جانا حمایت اللہ کے فرائض میں تھا۔ قد دیکھ کر کام دیا گیا تھا۔ نٹ کھولنے اور باندھنے کا ملکہ اس لڑکے کو زندگی کی گتھیاں سلجھانے کے لیے ہاتھ بڑھانے کو اکسانے لگا۔ اس کام کے لیے ہتھیار چاہیے تھا سو اس نے بھی قلم کو چن لیا۔ آج وہ زندہ دلان حیدرآباد کی روح رواں ہیں۔ حیدرآباد کی مقامی کھری بولی کا ایسا شاعر ہے جس کو سن کر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بڑی شاعری کے امکانات محدود نہیں ہیں۔ اگر نظر میں وسعت ہو اور انسانی درد مندی زادِ سفر ہو۔

اس ماحول میں آنکھیں کھولنے والا شعوری اور غیر شعوری طور پر حساس اور حوصلہ مند تو ہوگا ہی۔ حسن چشتی کو اس تحمل و ضبط اور انسانی درد مندی نے عنفوان شباب کی یہی پہلی سوغات کچھ اس طرح سونپ دی کہ اس کا مزاج ہی چپ کے چپ کے دلوں میں اترنے کے جتن کرنے لگا۔ چناں چہ وہ نہ صرف اپنے خاندان میں، احباب میں، کلاس کے ساتھیوں میں، سب ہی میں چاہا جانے لگا بلکہ اسی اثنا میں اس نے اپنے ہی خاندان کی ایک حسینہ کے دل میں بس جانے کے لیے اپنا آپ اسے سونپ دیا۔ اس لڑکی نے بھی بڑی احتیاط سے حسن چشتی کو دل میں چھپالیا اور اس درجہ سنجیدہ ہو گئی جیسے وہ جنم جنم سے حسن کو اپنے ذہن و دل میں پرورش کرتی رہی تھی۔ لیکن غم جو دبے پاؤں زندگی میں داخل ہونے کا عادی رہا ہے حسن چشتی سے آہستہ آہستہ اس کی مسکراہٹوں کا سودا کرنے لگا۔ حسن چشتی کے دن وہ نہ رہے تھے جو کسی بھی حسن کو جلا بخشتے ہیں۔ ویسے اس کے عشق کی راہیں اس کے خاندان میں محصور تھیں۔ ماموں فوج میں بڑی خدمت پر تھے۔ سارا کروفر بنگلے پر تھا۔ سارا پندار تمغے لگی وردی میں۔ حسن چشتی قلم کی شاہی کا قائل۔ اس کا پندار اس کی کتر بیونت کر رہا تھا کہ قلم کی شاہی میں سب کچھ ہوتا ہے سوائے دولت و ثروت کے۔ اردو زبان کے شاعر و ادیب کو شعر و ادب کا پہلا سبق۔ یہی پڑھایا جاتا ہے۔ وہ جو کھلی کلی ہی دل کے کسی گوشے میں چٹکی تھی تیزی سے مرجھانے لگی اور بہت جلد اس کی سوکھی پنکھڑیاں یک جا ہو کر اتنی سخت ہو گئیں کہ اب یہ سوکھی کلی خار بن کر حسن چشتی کے دل کے اسی گوشے کو زخمی کرنے لگی جہاں اس نے چمن کھلا لینے کے خواب دیکھے تھے۔ حسن نے بہت چاہا کہ اس غنچے کو نکہت کی لو سے بچا کر تازہ دم رکھے۔ ماہنامہ "پاسبان" کی ادارت سنبھالی۔ کچھ نہ ہو سکا تو ذرا سا صورت بدل کر ماہنامہ "آکاش" کو چھو لیا۔ آکاش نے بھی نہ کہکشاں کے قریب آنے دیا نہ ایک ستارا ہی توڑ کر جھولی میں ڈالا۔ حسن چشتی، جمیل مظہری کا یہ شعر گنگناتے، گاتے، خود شاعر بن بیٹھا:

یہ میری شوخی قسمت کہ تم کو پا نہ سکا
غرورِ عشق امارت کے بت کو ڈھا نہ سکا

اس کی شاعری نے اس کو تسلی دی اور یہ دم دلاسا ہی کچھ دن زندگی کا حوصلہ بن کر حسن کے ساتھ رہا۔ اس نے نظمیں کہیں، غزلیں کہیں، گنگنا کر رو دیا، رو رو کر گنگنایا پھر خود ہی اپنے اس ہنر سے اس طرح اغماض برتا جس طرح کبھی خود ہی اعلان کرتا اور اتراتا تھا۔ وہ سوچتا ہی رہا جیسے اس نے اپنے ماضی کو یکسر بھلا دیا ہو۔ بھول گیا ہو کہ وہ کبھی کالج کے میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ بھول گیا ہو کہ اس نے کالج میں الکشن جیتے تھے اور ساتھیوں کی نظروں میں کچھ رہنے کی عادت اسے پڑ گئی

تھی۔ بھول گیا ہو کہ اس نے اپنی کہانیاں حیدرآباد لاسلکی سے نشر کی تھیں بھول گیا ہو کہ اس کی نظموں اور غزلوں پر مضامین لکھے جانے لگے تھے۔ اس زادسفر نے دنیائے شعروادب میں ابھی اس کا صحیح امیج بھی نہیں بنایا تھا کہ اس نے اپنی فعالیت کو اک ایسی ڈگر پر ڈال دیا جو اس کو معاشرے کی رگ جاں تک لے جاسکے۔

اس نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا اور وہ سب کچھ دیا جو اس کے ورثے میں ذہن کی تربیت بن کر ہاتھ لگا تھا۔ اپنا غم بھول کر دوسروں کا غم اپنا لینا کچھ اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ یہ کام حسن چشتی بڑی مشاقی سے کرتا ہے۔

شاید اللہ میاں کو اس کی یہی ادا پسند آگئی ہو کہ اس نے حسن چشتی کو اپنے کرم بے حساب سے کچھ اس طرح نوازا کہ تنگ آکر ۲۵ روپے ماہانہ کی نوکری کر لینے والا ایک صاحب نظر اور اصول پرست خاندان کا یہ چشم و چراغ جب عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوا تو جلد ہی منتظمی تک جا پہنچا۔

۱۹۶۳ء سے تقریباً چار سال جامعہ کی این جی اوز (.N.G.Os) یونین کا سکریٹری رہا۔ اس دور نے چشتی کو بڑی آزمائشوں سے گزارا۔ ملازمین جامعہ کی اقلیتوں میں اپنے مفادات کے عدم تحفظ کا شدید احساس انھیں دل برداشتہ اور مایوس کر رہا تھا۔ مسلمان ملازمین جامعہ کی ترقی معکوس روزمرہ کا وطیرہ بن گئی تھی۔ ان کی واڑدں بختی حسن کو بے آرام رکھتی تھی۔ پولس ایکشن ہوئے زمانے بیت رہے تھے لیکن ایک مذموم ذہنیت کہ ہندوستان اب مسلمان کا وطن نہیں ہے، ان اقتدار پرستوں کا شعار بن رہا تھا جو سکیولرازم کا نام لے کر فرقہ پرستی کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ایسے میں سنگ مرمر کے اس جیالے نے اپنے بچپن کی کھادی کی کرتنی اور چڈی کی لاج رکھ لی اور کچھ اس طرح رکھ لی کہ اس کے پتلون کی کریز پر ایک سل نہ پڑ سکی۔ اپنی راست بازی اور ہر دل عزیزی کا ہتھیار تھامے، اس نے اقلیتوں کی کس مپرسی کو انتظامیے کی باز پرسی تک پہنچایا۔

دیانت داری کو اپنے ابا حضور کا عطیہ سمجھ کر اپنے سینے پر تمغے کی طرح لٹکا رکھنے والا حسن چشتی چھپا کر دینے کا ہمیشہ رسیا رہا۔ چھپا کر لینا اسے آیا ہی نہیں۔ ملازمت میں اس کی طرف بڑھنے والی ہر بند مٹھی سے نفرت کرنے والے کو دوسرے کی طرف بڑھنے والی اپنی بند مٹھی کا بھرم بھی رکھنا تھا اور اپنی جامہ زیبی کی لاج بھی رکھنی تھی۔ چناں چہ ملازمت کے دوران ہی اس نے کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ ان دنوں سکندرآباد میں جے سہا گراونڈ کے قریب کرایے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں اس کا کاروبار جم گیا تھا اور تقریباً پانچ ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی تھی۔ اکثر کسی نہ کسی بہانے مجھے لے جاتا یا وعدہ لے کر انتظار کرتا۔

اس کی بیگم زینت اس کا دوسرا عشق ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اچھے برے میں حسن کا ساتھ دیا۔ حسن چشتی کو ٹوٹ کر چاہا تو حسن کے چاہنے والوں کو بھی اپنا سمجھا۔ میری تواضع میں کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ بھائی یہ لیجیے، بھائی وہ نہیں لیا آپ نے اور حسن اس تواضع پر صرف خوش نہیں ہوتا بلکہ اتراتا۔ زینت نے حسن کو اس طرح اپنایا کہ اس سے شعر کہنے کی کسک چھین لی جو چیز حسن نے کھو دی تھی، زینت نے تلاش کر کے اپنے روپ میں اسے دے دی۔ جب حسن چشتی اپنی پہلی محبت کی قسم بن کر نہ رہ سکا تو زینت کی محبت کے ساتھ اس کی وفاداری نے یہاں بھی اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔ شعر و سخن کی پردہ داری اسی سنجیدگی کے ساتھ گئی اور اب دوسری محبت دل کے ساتھ ساتھ گھر کی "زینت" بھی بن گئی تو سخن کے پردے سے جھانک جھانک کر حسن چشتی نے دور دور تک دیکھا۔ اب زندگی بہ انداز دگر اس کو بلانے لگی تھی۔

ہمت، حوصلہ، لگن، ذہانت اور محنت یہ سب کچھ رکھ کر بھلا تم کیا نہیں کر سکتے حسن۔ کوئی جیسے بار بار آواز دیتا تھا۔ وظیفے پر سبک دوش ہو کر وہ یکایک دوست احباب کی رفاقتوں کے افق ہی سے غائب ہو گیا۔ چوں کہ میں بھی انھیں دنوں حیدرآباد سے تبادلہ ہو کر بغرض ملازمت نظام آباد آچکا تھا تو دوریوں نے جواز پا کر گویا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں

غالباً ۱۹۸۲ء کے آغاز کی بات ہوگی۔ حیدرآباد پہنچا تو اس کی تلاش میں سے سہاگر اونڈ پر آتے آتے محسوس ہوا کہ اداسیاں آمد پہ کھینے کے لیے بڑھ رہی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی مکان کہہ رہا تھا کہ تم کہاں آگئے ہم خود مکینوں کو ترس رہے۔

جمیل کا گھر معلوم نہ عزیز کا۔ جمیل بہنوئی ہیں حسن چشتی کے اور عزیز ان کی یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے صرف ساتھی نہیں رفیق بھی۔ آخر ش معلوم ہوا کہ اس یار طرح دار نے ترک وطن کر دیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ چاہنے اور چاہے جانے کا سلیقہ اس شخص میں اتنا ہے کہ وہ جہاں جائے گا اپنی بزم سجائے گا لیکن اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بغیر ملے، بغیر اپنا آنسو میرے دامن میں جذب کیے بغیر میری آنکھوں کی سوغات لیے اس طرح چلا گیا کہ زینت بھی ساتھ ہیں۔ یعنی اس کے فوری لوٹ آنے کے امکانات نہیں ہیں۔

دن بیتے، مہینے بیتے، اب برسوں نے احتساب شروع کر دیا۔ معلوم ہوا حسن چشتی جدہ میں ہے اور بزم اردو کا صدر ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا، حسن چشتی دو روز کے لیے آئے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوا انھوں نے مجھے کس سے کہاں ڈھونڈا۔ میں ان دنوں شاید ضلع نظام آباد کے ایک مقام ردرور پر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حسن چشتی مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ میں برسرِ خدمت ہوں تو وہ وظیفے پر سبک دوش ہو ہی نہیں سکتے۔ شاید طویل رخصت لے رکھی ہو۔ اس آس بندھی کہ وہ آجائے گا۔

یکایک حسن چشتی کا خط آیا۔

پیارے بھائی میرے۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
(حسن چشتی)

اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاریخ بھی نہیں۔ مجھے پیار کے ساتھ غصہ بھی آیا۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تخلیقی ذہن شعور کے سوتے سوکھنے نہیں دیتا اگر اس کی بنیادی ضروریات کا سامان فراہم کرنے کی زندگی ضمانت دے دے لیکن ایک خدشہ اور لگا رہتا ہے۔ جب نعمتیں اس حد تک تعاقب کرتی ہیں کہ آرزو اور لفظ ہی زندگی کے لیے بے معنی ہو کر اس طرح رہ جائے کہ ہر چیز حاصل، ہر چیز دسترس اور بس میں ہو تو تمنا کا دوسرا قدم بھی دشتِ امکاں میں نقش پا تلاش کرنے سے جی چراتا ہوگا۔ 25 روپے ماہانہ کی ملازمت قبول کر کے زندگی سے نباہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جانے والا حسن چشتی آج جدہ میں برسرِ روزگار ہند و پاک کے مہاجرین میں سب سے بڑی تنخواہ والا عہدہ دار تھا۔

اس عہدہ داری نے اسے تن آساں کرنے کے بجائے اس درجہ فعال کر دیا تھا کہ بے کلی اور اضطراب اس کی سرشت ہو کر رہ گئی تھی۔

دیکھیے بعض تضادات کس طرح گھل کر بار پاتے ہیں۔ حسن چشتی اپنے کپڑوں کی کریز سے بے نیازانہ جی نہیں سکتا۔ حسن چشتی کی مانگ اس طرح جمی رہتی ہے کہ بال بیکا بھی نہ ہوا۔ اب اس کو کیا چاہیے تھا لیکن وہ مشتِ خاک جو تیز ہوا کے مقابل خود کو رکھ رکھ کر دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے۔ نچلی کہاں بیٹھے گی۔ بکھر بکھر کر سمٹے گی پھر سمت سمت کر بکھرے گی متواتر اور تکاب ایذا پسندی جان کا آزار بن کر رہ گا چتاں چہ یہی ہوا۔ حسن چشتی کے جی میں آئی کہ سارے سعودی عرب

ادی غریب الوطن ہیں ان کے بالوں میں کنگھی کی جانے ،ان کے کپڑوں کی شکنیں، سلوٹیں، سلیں درست کی جائیں۔
ولیے دھنتیں اور لباس سے دریدگی چھین لی جائے ۔اس متوالے نے جھوم کر جماہی لی اور چل پڑا۔ دل میں
کی کنگھی چھپالی اور سینے میں گرم استری کی حرارتیں بھر لیں۔ 1985ء کے آتے آتے ،جدہ میں حیدرآباد اسوسی
ادپڑی تو نورکنی اڈہاک کمیٹی نے گرماگرم بحث و تمحیص اور ردوقدح کے بعد حسن چشتی کو اپنا صدر منتخب کیا اور
نے ان دنوں سعودی عرب میں برسرروزگار حیدرآبادیوں کی مستند فہرست مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور کام
یا گیا تو ان کے اعدادوشمار ساٹھ ہزار سے متجاوز تھے ۔اس کے ساتھ ہی ان کی رقمی بچتوں کو کارآمد اور مفید
ں مشغول کرنے کی غرض سے ان کی رہبری اور رہنمائی کے لیے " ان وسٹ منٹ گائیڈنس بیورو
(INVESTMENT GUIDANCE کا تعاون حاصل کیا۔

یدرآباد اسوسی ایشن جدہ نے ناقابل فراموش رفاہی و فلاحی کام انجام دیے ہیں۔ حسن چشتی جو اس انجمن کے روح
اپنے دست راست شریف اسلم کے ساتھ دعاؤں میں شامل رہنے کے عمل کو کچھ اس طرح یقینی بنالیا کہ بے شمار
ایزدی میں اس کے لیے اٹھنے لگے ۔ سعودی عرب کے تمول سے اپنے دورافتادہ غریب ہم وطنوں کو متمتع و
رنے کا ایک انوکھا طریقہ حسن چشتی کے ذہن رسا نے سوچ نکالا۔

ں نے دیکھا کہ سعودی عرب کے بے شمار لوگ کپڑوں کے استعمال میں ضرورت مندی اور تن پوشی کا تصور دور دور
ہی نہیں رکھتے ۔ان کی دولت و ثروت ان کی خواہشات کو نت نئے لباس پہناتی ہے ۔ان کے پاس ایسی پوشاک کی کمی
جو اچھی حالت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی دانست میں ان کے بدن کو زیب نہیں دیتی اور ضائع کردی جاتی ہے۔
شتی، حسن گنگو بہمنی کی طرح گنگو تیلی سے وفاداری نباہنے میں جٹ گیا۔ حیدرآباد کی جھونپڑپٹی اور سلمس کے لوگ جو
ے کہیں زیادہ تصورات کا حصہ بن سکتے تھے ، جوق در جوق اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور اس نے اپنے
، دنیا انھیں رنگ برنگے کپڑے پہنا کر سجالی ۔چناں چہ اس نے اسوسی ایشن کی طرف سے پہنے اوڑھے لوگوں کو
ہی کی جانب نظر کرم اٹھانے کی دردمندی کچھ اس ادا سے سونپ دی کہ ایک ہفتے میں ڈیڑھ ہزار کلوگرام سے زائد
گیا۔ بعض اہل خیر نے مفت میں اس کپڑے کی پیکنگ (PACKING) کا انتظام کردیا تو حسن چشتی ایرانڈیا کے
رار عہدہ داروں کی طرف دوڑا۔ ان کا تعاون بھی حاصل ہوگیا اور جدہ سے بمبئی تک ہوائی کمپنی نے کرایہ نہ لیا۔ کسٹم
(CUSTOM CLEARANCE فری ہوگئی۔

ر جب دوسری کھیپ بھی چار ہزار کلوگرام کی بمبئی پہنچ گئی تو وہ چھ ہزار کلوگرام کی تیسری کھیپ کے منصوبے
کپڑوں کی یہ فصل بھی تیار کھڑی تھی۔

۱۹۸۶ء کا ہفتہ وار راوی جو بریڈفورڈ لندن سے نکلتا ہے اس نے "یوں بھی ہوتا ہے" کی سیڑھی لگا کر حسن چشتی کو
است حیدرآباد کے حوالے سے خراج تحسین و عقیدت پیش کی ہے وہ لکھتا ہے۔

..... "جو پارچہ جات استعمال میں نہیں تھے وہ اللہ کی مخلوق کے دوبارہ کام آنے لگے ۔
وصول کنندگان کے دلوں سے پارچہ جات کے اصل مالکوں اور حسن چشتی صاحب کے
لیے کیا کیا دعائیں نہ نکلی ہوں گی۔۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد کے ایک اور تراشے کا حوالہ دیتے ہوئے راوی لکھتا ہے:
" حیدرآباد اسوسی ایشن حج کے دوران قربانی کے گوشت کو ہندوستان روانہ کرنے کے لیے
اسلامک ڈیولپمنٹ بنک کے کارپردازوں سے بات چیت کر رہی ہے۔ ہمیں حج کی سعادت

تو ابھی نصیب نہیں ہوئی مگر سنا ہے اور اکثر درد مند لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ قربانی کا جانور حلال کرنے کے بعد ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ماضی میں کئی بار یہ کوشش کی گئی کہ اس گوشت کو مٹی میں دبانے اور ضائع ہونے سے بچایا جانے اور جدید تکنک کے مطابق محفوظ کر کے ضرورت مند علاقوں اور لوگوں تک پہنچایا جانے۔ خدا کرے حسن چشتی صاحب کی کاوشیں کامیاب ہوں۔ یہ بہت بڑا کام ہو گا کہ حج کے دوران ہونے والی قربانیوں کا گوشت ضرورت مندوں تک پہنچے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سہرا بھی حسن چشتی کے سر رہے۔۔

سنا ہے کہ یہ سہرا حسن چشتی کے سر آخر ش باندھا گیا۔

۱۹۸۵ء حسن چشتی کے سنہری کارناموں کا شاید روپہلا سال ہے۔ حیدرآباد اسوسی ایشن جدہ کے قیام۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس کی ساری کدو کاوش، جدو جہد، اس کی ساری ہنر مندی اس کی شخصیت کی ساری پراعتم اگر یہ کام نہ کر سکے تو گویا اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ لگاتار اسی کوشش میں رہا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ سعودی عرب سے راست فضائی سروس کا انتظام ہو۔ حسن چشتی نے وزیر اعظم اور مرکزی وزیر ہوابازی سے پرزور نمائندگی کی۔ آندھرا پردیش سے تعاون کا وعدہ لیا۔ ایرانڈیا سے اس بات کی طمانیت حاصل کی کہ انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے اگر ریاستی حکومتیں آپس میں اس پرواز کو طے کر لیں۔ چناں چہ حیدرآباد کی بیگم پیٹ طیران گاہ کو " انٹر نیشنل ایرپور تبدیل کرتے ہی حسن چشتی نے اپنی اسوسی ایشن کی ساری توانائیاں اپنے اس مطالبے کی عملی صورت گری کے لیے اور ۱۹/ ڈسمبر 1985ء سے جدہ تا حیدرآباد راست پرواز کا آغاز ہو گیا۔

ایرانڈیا کے وی۔آئی۔پی مہمانوں میں حسن چشتی اس پہلی پرواز سے حیدرآباد آنے۔ پانچ ستارے ہوٹل انھیں مہمان رکھا گیا۔ چناں چہ انگریزی، اردو اور عربی کئی اخباروں نے حسن چشتی کو خراج پیش کرتے ہوئے یہ خبر جل نکال کر چھاپی۔

میں حسن کی باتیں فی الوقت یہیں ختم کرتا ہوں کہ طوالت مانع ہے۔

***

بلراج کومل

پیڑ بن جاؤں گا

پیڑ تھا ایک سرسبز، گاتا ہوا، جھومتا
اس کی شاخوں پہ خوش رنگ اور خوش نوا
کچھ پرندے تھے
سر پر کھلے نیلے آکاش میں
نورِ مہتاب تھا
جگمگاتے ستارے تھے

دھرتی پہ
سونا لٹاتی ہوئی دھوپ تھی
بستیوں، کھیتیوں، وادیوں، مرغزاروں
بدلتے ہوئے موسموں میں
رواں تھی
شگفتہ و تازہ
حسین زندگی، نغمگی، روشنی

ہلکی ہلکی سی بارش بھی ہونے لگی
دیکھتے دیکھتے اک کلی کھل گئی
اُڑ کے صد رنگ تتلی بھی اک باغ میں آگئی
ایک پل تھی یہاں، دوسرے پل وہاں
پھر سے نکلا ہے اک ننھا منّا مسافر تعاقب میں
تتلی کے آج
اس کے ہمراہ تو میں چل نہ پاؤں گا شاید، مگر
اس کے پیچھے جہاں تک مجھے میرا مقدور لے جائے

آگ برسی تھی کل آسماں سے
یہاں جو تھا
سب کا سب جل گیا
کیسا اعجاز ہے
آج ٹھنڈی ہوا پھر سے چلنے لگی
اس میں پھر سے سہانی نمی آگئی

چلتا رہوں گا
یہ ممکن ہے میں
انتہائے مسافت پہ مٹی میں مل کر کوئی
پیڑ بن جاؤں گا اجنبی راہ رو
اس طرف سے جو نکلے گا، اس کے کسی
خواب میں آؤں گا

کاوش عباسی

○

اس شہر میں نے دیکھے ہیں دن تلخ بہت ناشاد بہت
تھے لوگ تمام آباد بہت میں پھرتا تھا ناشاد بہت

ہر نقش پہ شہر کے چسپاں ہیں کچھ کرچیاں میرے زخموں کی
ہر نقش کے عکس میں لرزاں ہے مری نسبت سے فریاد بہت

حالاتِ نصیب کے کانٹوں پر جو کچھ بھی ہماری ذات بنی
اس ذات کی محرومیت کے ہم بن کے رہے فرہاد بہت

یہ اپنی ہوا میں سدا بہتا، نت ٹھوکریں کھاتا ہوا مرا دل
میلے کرتا ہے خواب مجھے پھر رکھتا ہے ناشاد بہت

کاوش یہ شاعری یوں ہی، یہ فکرِ فغاں مری یوں ہی نہیں
کچھ واقعی جینا مشکل تھا کچھ دل تھا غم ایجاد بہت

○

ترا شعار تری دھج مرے خیال میں ہے
سبھاؤ غم میں مرے تمکنت ملال میں ہے

وہ تیرا کیفِ تبسم وہ والہانہ پن
مرے جنوں کی چمک بھی ترے جمال میں ہے

ترے تکلمِ رعنا و خوش خیال کی خیر
جو عیشِ زخم میں تھا، اب وہ اندمال میں ہے

ادائے ناز ہے تیری کہ ہجر میں اب کے
علاجِ ہر الم و یاس احتمال میں ہے

وہ بے خودی ہے کہ دل میں سماں سجا ہے کوئی
فراق ڈوبا ہوا مستیِ وصال میں ہے

فغاں کو زمزمہ کر دے جنوں کو شانت کرے
یہ رنگ بھی تو مرے یارِ خوش خصال میں ہے

بھروسہ ہی کفِ دریائے دل کا کیا کاوش
ابھی تو مانا کہ حد میں ہے اعتدال میں ہے

نعمت انور غوری

O

وہ اک نگاہ میں کیا کام کرگیا یارو
اڑا کے ہوش وہ دل میں اترگیا یارو

نہ جانے آج یہ کس کس کو لے کے ڈوبا ہے
ہمارے سر سے جو طوفاں گزرگیا یارو

اڑا ، اڑا سا ہے ہر سمت رنگ روئے چمن
کہ خونِ دل بھی ہمارا کدھر گیا یارو

سجا خیالوں میں کیا تھا جمالِ صبحِ وطن
جو خواب دیکھا تھا ہم نے بکھرگیا یارو !

ڑپ ، تڑپ گئے شب میں تمام دیوانے
یالِ صبحِ بہاراں جدھر گیا یارو

وہ اپنا درد کسی سے نہ کہہ سکا شاید
کوئی تو بات ہے با چشم تر گیا یارو

حال پوچھیے انور نگاہ نرگس کا
ں سے لائیں جو تھا دیدہ ور گیا یارو

***

جمیل نظام آبادی

کیوں میرے دل کا زخم کوئی سوکھتا نہ تھا
یادوں کا تیری اب تو کہیں سلسلہ نہ تھا

قاتل سے اور قتل کے حالات سے سبھی
واقف تھے لوگ کوئی مگر بولتا نہ تھا

میری طرف ہی سب کی تھیں نظریں لگی ہوئیں
آئینہ شہر بھر میں کوئی دیکھتا نہ تھا

دل ٹوٹنے کا غم میں کروں بھی تو کیوں کروں
دل ٹوٹنا تو کوئی بڑا سانحہ نہ تھا

تقدیر میں بچھڑنا تھا مل کر بچھڑ گئے
دونوں کے بیچ ویسے کوئی مسئلہ نہ تھا

بس اس خیال سے تجھے شرمندگی نہ ہو
اے زندگی میں تیری طرف دیکھتا نہ تھا

جرم وفا کا پیار کا اخلاص کا جمیل
اک تھا تو میں تھا میرے سوا دوسرا نہ تھا

***

معین الدین جینا بڑے

رنگ ماسٹر

اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اس کی کپکپاہٹ اور تھر تھراہٹ کمرے کی فضا میں بھی ارتعاش پیدا کر رہی تھی
شاید یہی وجہ تھی کہ جب سے اس پر لرزہ طاری تھا کمرے کی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس کی نظر بھی کانپ رہی تھی
اسی لیے اسے پورا کمرہ لڑکھڑاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہوئی تھی اور وہ یہ کہ کچھ فاصلے پوری طرح
ہو گئے تھے اور کچھ نزدیکیاں بڑی دور ہو گئی تھیں۔ اس کے کمرے کی چھت جس کا فرش سے فاصلہ نو دس فٹ تھا بالکل ا
کے سینے پر آگئی تھی اور وہ اس کے منوں وزن کے نیچے دب کر رہ گیا تھا لاکھ کوشش کے باوجود وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔
بھاری وزن سینے پر لے کر اٹھنا اس کے لیے ناممکن تھا...... وہ سرکس میں رنگ ماسٹر رہ چکا تھا، وزن اٹھانے
پہلوان نہیں۔ لیکن اگر آج اس کی جگہ وہ پہلوان بھی ہوتا تو چیں بول جاتا۔

اس نے اسی کو غنیمت جانا کہ اس کا سینہ، اس کا پلنگ اور اس کا فرش، تینوں اس وزن کے باوجود صحیح سلامت ہیں
لیتے لیتے، اس پتھر کی سل کے نیچے دبا، صرف اپنی گردن کو موڑ سکتا تھا اور ہاتھ کو جنبش دے پایا تھا۔ اس نے با
طرف گردن گھمائی۔ پلنگ سے لگے میز پر نیلی فون رکھا تھا اس نے چاہا کہ ایک فون کر لے اور کسی کو نہیں تو ڈاکٹر کو
خبر کر دے کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ نزدیکی دوری سے بدل گئی ہے اور وہ نیلی
اس کی پہنچ سے بہت دور ہو گئی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ مزید کوشش فضول ہے اس نے اپنے ہاتھ کو روک لیا۔ نیلی
کے برابر میز پر رکھی گوتم بدھ کی مورتی کو نظر بھر دیکھا اور گردن دوسری جانب موڑ لی۔

وہاں ساتھ والے پلنگ پر اس کی بیوی بیٹھی مالا کا جاپ کر رہی تھی۔ مالا کے دانوں کی چمک اور نائٹ بلب کی مد
روشنی، دونوں مل کر کمرے پر چھائی ہوئی رات کے اندھیرے کی سیاہی کو مات دینے کی کوشش کر رہے تھے اس کی نظ
دانوں پر جم گئی۔ بیوی کی بوڑھی انگلیاں بڑی مشاقی سے انھیں پھیر رہی تھیں اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس بے د
کے مالا کے جاپ اور بیوی کے انہماک کو دیکھ کر اس کے دل میں یہ خیال آئے بغیر نہیں رہ سکا کہ کہیں کل ڈاکٹر نے؛
سے وہ بات تو نہیں کہہ دی جو اکثر مریض سے چھپا کر اس کے عزیزوں کے کان میں کہی جاتی ہے ------ اور یہ میری بیوی
کے دانے نہ پھیر رہی ہو بلکہ میری بچی کھچی سانسوں کی الٹی گنتی کے عمل میں مصروف ہو۔ اور خود اسے معلوم نہ ہو کہ
کر رہی ہے۔

یہ ڈاکٹر بھی عجیب ہوتے ہیں جس کی خبر ہوتی ہے اسے تو سناتے نہیں اور ------! لیکن یہ ڈاکٹر ایسا نہیں کر سکتا۔۔
سمجھ دار آدمی ہے ایک کامیاب و تجربہ کار ڈاکٹر ہے اور انتہائی ذہین انسان ہے۔ میرا کیس ہر ڈاکٹر کے لیے معمہ بنا ہوا
لیکن اس نے اسے دو ہی ملاقاتوں میں حل کر دیا۔ اسے ڈاکٹر سے اپنی ملاقات یاد آئی۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا تھا۔

"آپ پوجا پاٹ کرتے ہیں۔"

"نہیں!"

"مندر یا کسی ایسی جگہ عبادت کے لیے......

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔۔

"آپ بھگوان کو تو مانتے ہیں؟"۔

"ڈاکٹر صاحب اس کا جواب میں نہ تو ہاں میں دے سکتا ہوں اور نہ نا میں ۔۔۔۔۔ زندگی پوری تمبو میں گزاری ہے ۔۔۔۔۔ اب کیا بتاؤں آپ کو ۔۔۔۔۔ لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ یہ بتایئے کہ مجھے دورے کیوں پڑتے ہیں۔۔

ڈاکٹر نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب میں اسی سلسلے میں پوچھ رہا ہوں مسٹر جے چند! کیا آپ جانتے ہیں ۔۔۔۔۔ ایک چور ہے جو ہم سب کے اندر چھپا بیٹھا ہے ۔۔۔۔۔ ایک ڈر ہے جس نے ہمارے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ اور ہم سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔۔۔ لیکن اتنے بے بس اور لاچار نہیں جتنے آپ ہوگئے ہیں'۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر ابھری۔ اس نے پوچھا۔

"یہ آپ کس ڈر کی بات کررہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"۔

کھڑکی کے راستے ہوا کے ایک جھونکے نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ میز پر رکھے پیپر ویٹ کے نیچے جے چند کا کیس پیپر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔

"موت کے ڈر کی بات کررہا ہوں مسٹر جے چند'۔

ڈاکٹر کا جواب سن کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا تھا گویا ڈاکٹر نے یہ بات کہہ کر ایک ایسی حماقت کی ہو جس کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہا۔

"ڈاکٹر آج میں ایک سرکس کمپنی کا مالک سہی لیکن میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ اصلا میں ایک رنگ ماسٹر ہوں ۔۔۔ میں نے تیس برسوں تک شیروں کو اپنے اشاروں پر نچایا ہے اور آپ مجھ سے ڈر کی بات کرتے ہیں'۔

ڈاکٹر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"مسٹر جے چند: مجھے آپ کی کہی ہوئی بات یاد ہے ذرا آپ مجھے یہ بتایئے پوری دنیا میں ایسے کتنے آدمی ملیں گے جنہوں نے تیس برسوں تک روز دن میں دو مرتبہ موت کی کھائی پار کی ہو اور دوبارہ زندگی کی وادی میں قدم رکھا ہو! ۔۔۔۔۔۔۔ مسٹر جے چند موت سے خائف ہر شخص ہے لیکن آپ کا معاملہ ذرا الگ ہے ۔۔۔۔۔ موت آپ کا Obsession بن چکی ہے۔

وہ اپنی اس حماقت پر بہت شرمندہ ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر ڈاکٹر کا مذاق اڑایا تھا۔ اس نے انتہائی احترام کے ساتھ سوال کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ پوجا پاٹھ اور بھگوان کی باتیں کیوں پوچھ رہے تھے؟"۔

ڈاکٹر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جے چند جی! جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح بڑا ڈر چھوٹے ڈر کو کھا جاتا ہے۔۔

"یعنی؟"۔

"یعنی یہ کہ خدا کا خوف انسان کا سب سے بڑا خوف ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ یہ صدیوں پرانا خوف اتنا بڑا ہے کہ موت کا ڈر اس کے آگے خود بہ خود اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔۔

پوری طرح ڈاکٹر کی ہمہ دانی کا قائل ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر میں نہ تو آستک ہوں اور نہ ناستک ۔۔۔۔۔۔

"آپ کے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ چاہے ان چاہے آپ نے صرف آدمی بنے رہنے کی کوشش کی ہے۔۔
"اس میں برائی کیا ہے ڈاکٹر؟"
"میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بری بات ہے لیکن جے چند جی یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی اچھی بات ہے۔۔
"ڈاکٹر صاحب' اچھے برے کی چھوڑیے۔ ستیہ اور آستیہ کی کہیے۔
سچ تو یہ ہے جے چند جی کہ ہمیں یہ کہنا کہ ہم بھگوان کو مانتے ہیں تہذیب نے سکھایا ہے۔
ہماری انا اور جذبۂ عزت نفس کو یہ گوارا نہیں کہ ہم کھلے بندوں اپنی کمزوری کا اعتراف کریں۔۔

کچھ دیر کے لیے دونوں خاموش رہے۔ دونوں یہ چاہ رہے تھے کہ دوسرا کچھ کہے تو بات آگے بڑھے۔ آخر گہری سوچ کے بعد ڈاکٹر نے بولنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔

"شاید سرکس کی دنیا ہمارے چہروں سے تہذیب کا نقاب اتارنے کا کام کرتی ہے۔
...... لیکن اس کا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ آخر وہ دنیا بھی اسی سماج سے جڑی ہوئی ہے .... میں کہہ نہیں سکتا میرا اندازہ کس حد تک درست ہے؟ آخر میں بھی ایک کمزور انسان ہوں۔۔

جے چند نے محسوس کیا دونوں کے درمیان ڈاکٹر اور مریض کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔

"کمزور تو میں نکلا ڈاکٹر دنیا والے ایک بڑے ڈر سے خائف ہیں اور میں ایک چھوٹے ڈر سے۔ فرق صرف اتنا ہے وہ سکون کی نیند سوتے ہیں اور میں ہررات ....

"ہررات جو کیفیت آپ پر طاری ہوتی ہے اور جس اذیت سے آپ گزرتے ہیں میرے نزدیک اس تعلق سے دو باتیں مثبت طور پر اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس حالت میں بھی آپ قدرے باحواس ہوتے ہیں اور دوسرے آپ کی سانس کی رفتار زیادہ متاثر نہیں ہوتی ....

اس نے بیوی کی طرف سے گردن موڑلی اور سوچا بہتر ہے کہ یہ مالا ہی جپتی رہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہا تھا اس کی موت کا خوف وہم بن کر دھیرے دھیرے اس کی بیوی کے دل میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ اور وہ اس کے جیتے جی بیوہ کی تصویر بنتی جا رہی ہے .... اور کل ڈاکٹر سے ملنے کے بعد شاید وہ اتنی گھبرا گئی .... کہ گھبرا کر اس نے اس بڑے خوف میں پناہ لے لی۔ اب وہ وقت بے وقت مالا جپنے لگی ہے۔ اس کا آنچل سر سے کبھی ڈھلکتا نہیں، ڈھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی گردن لیے ہر پل منہ ہی منہ میں وہ کچھ پڑھتی رہتی ہے۔ ممکن ہے جو خوف پہلے وہم بن کر آیا تھا اب اس نے لبادہ اتار دیا ہو'

اسے اپنی بیوی پر پیار تو کئی بار آیا تھا لیکن آج پہلی بار اسے اس پر رحم آیا۔ گردن سیدھی رکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ دل نے ایک مرتبہ پھر کہا کہ یہ ڈاکٹر ایسا نہیں کر سکتا اگر ایسی کوئی بات ہوتی بھی تو وہ اس سے کبھی نہ کہتا اور آج اس قسم کی کوئی بات کہنی ہوتی تو وہ گھوش بابو سے نہ کہتا؟ وہ بھی تو ساتھ تھے کتنے بھلے آدمی ہیں بیچارے گھوش بابو۔ اتنے پڑھے لکھے ہیں لیکن اینٹھ بالکل نہیں۔ پروفیسری سے ریٹائر ہونے بیس ایک برس تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ اس عمر میں بھی برابر کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ اگر پڑھ نہ رہے ہوں تو سوچ میں گم ہوتے ہیں۔ کبھی شانت اور نشچنت نہیں بیٹھتے ...... شاید فلسفے کے پروفیسر کا بڑھاپا ایسا ہی ہوتا ہے .... اور ممکن ہے رنگ ماسٹر کا بڑھاپا بھی کچھ میرے جیسا ہی ہوتا ہو

ایک مرتبہ یہی بات گھوش بابو نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہی تھی اس دن بھی وہ آج کی طرح جے چند کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر سے جے چند کی دوسری ملاقات تھی۔ گھوش بابو نے گھر لوٹتے وقت کار میں جے چند

ے دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

"جے چند جی آپ کو موت کا OBSESSION ہے اور مجھے زندگی کا۔"

ان کے اس جملے پر جے چند پل بھر کے لیے چکرا گیا تھا۔ اسے گھوش بابو پر ترس آگیا تھا کہ یہ شخص جو مجھے اور میری
ی کو جذباتی سہارا MORAL SUPPORT دینے کے لیے ڈاکٹر کے یہاں آتا ہے کہیں خود مریض تو نہیں بنتا جارہا۔ جے چند
ری ہوئی حالت دیکھ کر گھوش بابو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"جے چند جی، میری عمر فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے میں گزری۔ فلسفہ سمجھنے کی دھن اور کلاس روم میں لیکچر دینے کے
ں میں پتا نہیں کب میرے ہاتھوں سے زندگی نکل گئی۔......... بس فلسفہ باقی رہ گیا۔ اب میں پہروں بیٹھا یہی
چتا ہوں کہ جب زندگی ہی نکل گئی تو اس فلسفے کا میں کیا کروں "اور جب کچھ سجھائی نہیں دیتا تو تھک ہار کر دوبارہ کتابیں
ھنے لگتا ہوں کہ شاید کہیں میرے سمجھنے ہی میں کوئی غلطی نہ ہوئی ہو......... میں تو جے چند جی چوک گیا۔"

"میری کیسے۔"

"آپ نے چوکنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ آپ وہ خوش نصیب ہیں جس کا OBSESSION زندگی نہیں موت ہے۔
ھے اور سمجھ کا پھیر موت کے دروازے پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔ اسی لیے موت آج تک موت ہی رہی، فلسفہ نہیں بنی،
نے کی کوشش آج بھی جاری ہے............ لیکن وہ راز کی راز ہی رہی۔"

گھوش بابو کی باتیں جے چند پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ لیکن وہ ہوتی بڑی عجیب تھیں۔ جے چند کے لیے گھوش بابو
ے دلچسپ آدمی تھے اور گھوش بابو کے لیے جے چند۔ دونوں کے درمیان وقفے وقفے سے ایسی باتیں ہوتی رہتیں کہ دونوں
ے دوسرے کے لیے کچھ اور دلچسپ ہوجاتے تھے۔ ان کی شامیں اکثر ساتھ ہی گزرتی تھیں۔

آج شام بھی دونوں کافی دیر تک ساتھ تھے۔ دراصل آج جے چند کا جنم دن تھا اور گھوش بابو اسے سالگرہ کی مبارکباد
نے آئے تھے اور تحفے کے طور پر بدھ کی وہ مورتی لائے تھے جسے اس کی بیوی نے میز پر گھڑی کے برابر رکھا ہے۔ جتنی دیر
ش بابو آج جے چند کے یہاں رکے انھوں نے بدھ کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات نہیں کی۔ جے چند اس موضوع پر
ولتا بیٹھا سنتا رہا۔ کپل وستو کے راج محل سے تتھاگت بننے تک کی گوتم بدھ کی داستان تو وہ پہلے سے جانتا تھا لیکن آج گھوش
اس کے سامنے انھیں واقعات کو کچھ اس طرح بیان کر رہے تھے کہ وہ واقعات محض کتابی باتیں نہیں رہے بلکہ زندگی کا
جاگتا تجربہ بن کر اس کے شعور اور ادراک کے وسیلے سے اس کی ذات میں بہت اندر تک اترتے چلے گئے اور آخر میں جو
گھوش بابو نے اسے سنائی اس نے تو جے چند کو سراپا حیرت بنا دیا۔ اتنی دلچسپ کتھا اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔
سنتے وقت وہ ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوا تھا جس کے اثرات اب بھی اس کے حواس پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک
ی عجیب و غریب کہانی تھی جسے وہ پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اندر یہ احساس جڑ پکڑتا جارہا تھا کہ
ی کہانی اس کی سمجھ میں آگئی ہے اور اسی احساس نے اسے پریشان کردیا تھا۔ اس پریشانی کے پیدا کرنے میں کچھ ہاتھ
ش بابو کی اس تمہید کا بھی تھا جو انھوں نے کتھا سنانے سے پہلے باندھی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"جے چند جی! آج آپ کو بدھ کی ایک جاتک سناتا ہوں۔ یہ جاتک میں کئی پروفیسروں کو سنا چکا ہوں اور کئی پنڈتوں،
پنڈتوں کے کان میں انڈیل چکا ہوں لیکن آج تک یہ کسی کے دل میں نہیں اتری۔ دل تو دور رہا ان کی بدھی ہی میں نہ سما سکی
ھیے آپ کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ جو بھی ہو یہ طے ہے کہ ہم دوبارہ اس جاتک پر بات نہیں کریں گے۔ تو
ے

یہ اس وقت کی بات ہے جب بستیاں سہاگنوں کی مانگ کی طرح آباد ہوا کرتی تھیں ایسا ان سنیاسیوں کی تپسیہ کے

رستے میں ہوتا تھا جو ستیہ کی کھوج میں بستی کو تج کر جنگل کی راہ لیتے تھے۔ وہاں وہ خوب ریاضتیں کرتے تھے خود کو کڑی آلائشوں سے گزارتے تھے۔ اور جب ان کی ریاضت کی آگ میں تمام آلائشیں جل کر خاک ہو جاتیں تو وہ جنگل سے بستی کی طرف مراجعت کرتے تھے۔

ایسا ہی ایک جنگل تھا جس میں چار تپسوی تپسیہ کر رہے تھے انھیں وہاں تپسیہ کرتے ایک عرصہ بیت گیا۔ اتنا عرصہ ہوا کہ ان کی جوانیاں بڑھاپوں میں ڈھل گئیں لیکن وہ آگ روشن نہ ہوئی جس کی تپش وجود کو آلائشوں سے پاک کر دیتی ہے اور وہ کرن ان کے اندر نہ اتری جس کے اترنے سے سب کچھ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ اب ہر گھڑی انھیں یہ دھڑ کا لگا رہتا کہ پتہ نہیں کب موت آجائے اور ہم بستی کی طرف مراجعت کرنے سے رہ جائیں۔ ہمیں یوں نامراد ہی اس جہاں سے کوچ کرنا پڑے۔

آدمی کو جب کوئی دھڑ کا لگ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ ان چاروں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اب بار بار ان کی تپسیہ کھنڈت ہونے لگی۔ رہ رہ کر یہ خیال بجلی بن کر ان کے حواس پر گرنے لگا کہ انھیں نامراد ہی یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس خیال سے کیسے چھٹکارا پایا جائے وہ حیران تھے کہ یہ ایک اکیلا خیال کس طرح دبے پاؤں آکر ان پر قابض ہو گیا جب کہ وہ دنیا جہاں کے خیالوں کو کھدیڑ کر حواس کی حدوں کے باہر کر چکے تھے۔

دھیرے دھیرے نراشا کے اندھیرے ان کو جکڑنے لگے اور ان کا دم گھٹنے لگا۔ کئی دن اس طرح بیتے اور ایک صبح انھوں نے دیکھا کہ وہ اندھیرے انھیں گھیر گھار کر بد حواسی کی نگر پر لے آئے ہیں۔ کسی بھی لمحے وہ اس اندھی کھائی کے پیٹ میں سما سکتے ہیں۔ لیکن اسی پل دور کے ایک جنگل میں دھیان میں بیٹھے تتھاگت، خیال بن کر ان کے ذہنوں کے راستے سے گزر گئے اور وہ چاروں ایک ساتھ پر امید آواز میں چلا اٹھے "شاکیہ منی!۔

تتھاگت کے خیال نے ایک مرتبہ پھر انھیں آس کی ڈوری کے ٹوٹے ہوئے سرے سے جوڑ دیا اور ذرا سی دیر میں ان پر یہ بھی روشن ہوا کہ ڈوری کا دوسرا سرا تتھاگت ہی سے بندھا ہوا ہے۔ وہ چاروں کھنچے کھنچے تتھاگت کے حضور میں حاضر ہوئے۔ تتھاگت ابھی دھیان ہی میں تھے۔ ان کا چہرہ پورنیما کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ چاروں ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ تتھاگت کے غلافی پپوٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر آنے والوں کو دیکھا وہی چار بوڑھے سنیاسی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ چاروں کے چہروں سے ان کی عمریں ٹپک رہی تھیں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا ان کی عمروں میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا ایک کے بعد ایک اٹھنے والی سمندر کی چار موجوں میں ہو سکتا ہے۔

"پہلے سنیاسی۔ نے آگے بڑھ کر عاجزی کے ساتھ کہا۔

"میں نے سب جتن کیے اور ناکام رہا۔ آپ اپنی شرن میں لے لیں تو دیا ہوگی۔۔ بدھ نے اس کے ہاتھوں میں ایک کشکول تھمایا اور اسے بھکشوؤں کے صف میں کھڑا کر دیا۔

"دوسرے سنیاسی۔ نے آگے بڑھ کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"میں ستیہ کا کھوجی ہوں۔ آپ سے راہ پوچھنے آیا ہوں۔۔ تتھاگت نے کہا۔

"ستیہ کے کھوجی کو دنیا اور دھرم دونوں چھوڑنے ہوتے ہیں۔۔

سنیاسی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"چھوڑ دیے۔۔

تتھاگت نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ واقعی وہ دونوں کو چھوڑ چکا تھا۔

تتھاگت نے اس سے کہا۔

تو دنیا اور دھرم دونوں چھوڑ چکا ہے۔

بوڑھا بھی بہت ہوا ہے۔
ایسا کر
اب شمشان چلا جا۔ اور۔
جس دن تیری چتا جلے۔
میرے پاس لوٹ آنا۔
سنیاسی نے تیوری چڑھا کر کہا۔
"میں نے تجھے گیانی جانا تھا، تو تو ٹھٹھہ کرنے لگا۔ میں جنگل ہی میں بھلا تھا۔
میں وہیں رہ کر کچھ تپسیا اور کرلوں گا۔"
سنیاسی نے یہ کہہ کر جنگل کی راہ لی۔
تیسرے سنیاسی نے آگے بڑھ کر انکساری کے ساتھ کہا۔
"میں ستیہ کی پراپتی کی ابھیلاشا میں جی رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ابھیلاشا چھوٹ جانے اور ستیہ ملے۔
ناگت نے اس سے بھی دنیا اور دھرم چھوڑنے کی بات کہی۔ اس کی بھی آنکھوں میں جھانکا اور اس سے بھی کہا کہ وہ شمشان جانے اور جس دن اس کی چتا جلے وہ لوٹ آئے۔ سنیاسی نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔
"چتا جلنے کے بعد کبھی کوئی لوٹا ہے جو میں لوٹوں گا۔ لوٹنے سے تو رہا لیکن میں جاؤں گا ضرور۔ آپ کو گرو جو مانا ہے۔
۔ میں باقی دن شمشان میں ہی گزاروں گا۔"
یہ کہہ کر سنیاسی کبھی نہ لوٹنے کے لیے شمشان چلا گیا۔
چوتھے اور آخری سنیاسی نے آگے بڑھ کر کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔
"دنیا اور دھرم دونوں چھوڑ چکا ہوں۔
عمر بھی کافی ہو چکی۔
بغیر کسی پر بوجھ بنے۔
چاہتا ہوں
کہ
شمشان چلا جاؤں
اور
جس دن میری چتا جلے
آکر
تمھارے چرن چھوؤں"
تتھاگت نے اسے آشیرباد دیا اور کہا۔
"جس دن تمھاری چتا جلے
دھیان رہے
اس دن تمھاری
چتا ہی جلے!"
آشیرباد پاکر سنیاسی شمشان کی طرف مڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پورنیما کے چاند کا بسیرا تھا اور کانوں میں تتھاگت کے

وہ شبد گونج رہے تھے جو انھوں نے آشیرباد دیتے وقت کہے تھے۔
شمشان میں جاکر اس نے ایک اونچے ٹیلے پر آسن جمایا اور دھیان اوستھا میں بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی چتا کو دیکھنے کی غرض سے اس نے اپنی آنکھیں کھلی ہی رہنے دیں لیکن اس دن کے بعد سے اس کی آنکھوں نے چتا کے شعلوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا۔ اسے کبھی کسی نے پلک جھپکتے نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے کسی نے اپنی جگہ سے ہلتے ہوئے دیکھا۔ دھیان اوستھا میں بیٹھے بیٹھے اس نے ہزاروں چتاؤں کو جلتے ہوئے دیکھا کسی کے منہ سے پانچ ہزار چتاؤں کی بات سنی گئی تو کسی کے منہ سے دس ہزار کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی اس طرح سب کچھ تج کر اور پوری طرح وچار مکت ہو کر دھیان اوستھا میں بیٹھتا ہے تو یہ بتانا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس نے کتنی چتاؤں کو جلتے ہوئے دیکھا اس کے بارے میں تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس اوستھا میں کتنے دنوں تک بیٹھا رہا کیوں کہ اس کے دنوں کی گنتی بھی ایک مشکل کام ہوتا ہے۔

پتا نہیں کتنی بار کے اماوس کے اندھیارے کے بعد پونم کی وہ رات میں سنیاسی نے دیکھا کہ لوگ ایک بھی سجانے اور تھی پر اس کی لاش رکھ لاتے ہیں۔ چار آدمیوں نے مل کر اسے چتا کی لکڑیوں پر سلایا اور آنے والوں ہی میں سے کسی نے اسے اگنی سپرش دیا۔

ذرا سی دیر میں چتا نے آگ پکڑلی اور دیکھتے دیکھتے اس کے شعلے آسمان کو چھونے لگے۔ ہر چتا کی طرح اس کی چتا بھی جل کر کچھ دیر میں شانت ہوگئی اور جب لپکتے ہوئے شعلوں کی جگہ انگاروں کا ڈھیر رہ گیا تو اس نے اوپر آسمان کی طرف گردن اٹھائی اور دیکھا کہ وہاں پونم کے چاند کی جگہ تتھاگت کا مسکراتا ہوا چہرہ ہے اور اس مسکراہٹ کی کرنیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

اس نے وہیں اس ٹیلے پر دوزانو ہو کر زمین کو چوما۔ تتھاگت کا آشیرباد لیا اور بستی کی طرف مراجعت کر گیا۔۔

گھوش بابو تو کہانی سنا کر چلے گئے لیکن وہ کہانی جے چند کے اندر رچ بس گئی۔ یہ عجیب و غریب کہانی جے چند کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کتنا اچھا ہوتا اگر آج بدھ کا زمانہ ہوتا۔ اگر آج بدھ ہوتے تو میں ان سے جاکر پوچھتا کہ اس کہانی کو بغیر سمجھے میں یہ کیوں محسوس کرتا ہوں کہ اسے سمجھ چکا ہوں۔

جے چند کے ذہن کے اندھیرے میں بدھ کی مورتی تیرنے لگی، مالا کے دانے چمکنے لگے اور پیپر ویٹ کے نیچے رکھا کیس پیپر پھڑپھڑانے لگا۔ اسے ڈاکٹر کی باتیں یاد آئیں اور اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے تمام حواس کو سانس کی آمدورفت کے عمل پر مرکوز کر دیا۔ اس نے گنتی شروع کی ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات--------- کسی ایک گنتی پر آکر اس نے یہ محسوس کیا کہ چھت کی وہ منوں وزنی سل اسے تھپکیاں دے رہی ہے اور سائیں سائیں کرتی وہ ہوا اسے لوریاں سنا رہی ہے اور وہ کچھ جاگا جاگا سا اور کچھ سویا سویا سا پڑا سوچ رہا ہے۔............ کتنا اچھا ہوا گر تمام رات اسی طرح بیت جائے .... اس کے دل نے ہولے سے کہا .... کتنا اچھا ہو تمام عمر اسی عالم میں گزر جائے .... نیم بیدار اور نیم خوابیدہ! لیکن یہ کیسے ممکن ہے .... یہ کیسے ممکن ہے کہ آسمان پر جو جیسی گھنی شفق پھولی رہے۔ یا یہ کہ ہم تمام دن چڑیوں کی وہ چہچہاہٹ سنیں جو پو پھٹتے وقت سنائی دیتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ لمحہ آج تک نہیں آیا جو نیند اور بیداری کے بیچ کے عرصے کو محیط ہو اور پوری رات اس ایک لمحہ میں گزر جائے۔!

پتھر کی اس منوں وزنی سل کے نیچے لیٹے لیٹے وہ کچھ ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ لوریوں کی لے کے ساتھ ہلکے سُروں میں سرکس کے بینڈ کی دھن اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرانے لگی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس دھن میں کھو گیا۔ نیند گویا اسی انتظار میں تھی اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور خواب کی وادی میں لے گئی۔

وہ وادی بڑی حسین اور پر فضا تھی۔ چاروں طرف ہریالی بکھری ہوئی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں ایک ندی بہہ رہی تھی

ر پہاڑ سے کئی چشمے آکر اس ندی سے مل رہے تھے۔ بے شمار تناور درخت آسمان کی بلندی کو چھو رہے تھے۔ اور پوری وادی
دلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس وادی میں سرکس کا ایک بہت بڑا تمبو لگا ہوا تھا۔ اتنا بڑا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی سرکس کمپنی
کے دس تمبو اس میں سما جائیں۔ لوگ دور دراز کی مسافت طے کرکے وہاں آرہے تھے۔ ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا وہاں۔
س چھوٹی سی وادی میں مرد، عورت، جوان، بوڑھے، بچے سب کے سب بڑے اشتیاق کے ساتھ تمبو کی طرف بڑھ رہے تھے۔
ب کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ آج ہم وہ دیکھنے جا رہی ہیں جو اس سے پہلے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو اور سب کی زبانیں کہہ
ہی تھیں۔ رنگ ماسٹر تو ہر سرکس میں ہوتا ہے لیکن اس رنگ ماسٹر کا کمال سب سے نرالا ہے۔ اب جو کچھ سنا ہے وہ ایک
تبہ آنکھوں سے دیکھ لیں۔

جے چند نے سوچا خود میں بھی تو رنگ ماسٹر ہوں۔ اپنے سرکس میں شیروں کو آنکھ کے اشارے پر اٹھاتا ہوں۔
وٹے سے اسٹول پر تین تین شیروں کو کھڑا کرتا ہوں اور تو اور جلتے ہوئے آہنی حلقے میں سے انھیں چھلانگ لگانے پر بھی
بور کرتا ہوں۔ .... یہ سب وہ میری آنکھ کے اشارے پر کرتے ہیں۔ وہ تو میں رعب جمانے کے لیے کبھی کبھار ہوا
ں زور کا ہنٹر لہراتا ہوں ورنہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی۔ ان کے ذہنوں میں رنگ ماسٹر کے ساتھ ہنٹر کا تصور جڑ گیا ہے۔
ں لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ غیر ضروری طور پر ہی سہی اسے ہوا میں لہرایا جائے!

اب اس سے زیادہ ایک رنگ ماسٹر کیا کر سکتا ہے؟ وہ بھی لوگوں کی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ کھڑکی سے ٹکٹ لے
ندر تمبو ں داخل ہوا اور اس کا محیط دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا کہ اچھی سے اچھی سرکس کمپنی
، دس تمبوؤں جتنا اس ایک تمبو کا قطر تھا...... سب اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ بینڈ خاموش ہوا اور اعلان کیا گیا کہ
ے سے پہلے رنگ ماسٹر کا ایٹم دکھایا جانے گا اور یہ بھی کہا گیا کہ ایسا عوام کی پرزور فرمائش پر کیا جارہا ہے۔ سب اپنی اپنی
میوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ تمبو کے بیچوں بیچ مدور ڈائس پر سلاخوں کا ایک جنگلہ لایا گیا جو چاروں طرف سے بند تھا اور اس
ایک طرف دروازہ تھا۔ ایک گاڑی آئی اور گاڑی کا دروازہ جنگلے کے دروازے سے ملا دیا گیا۔ ایک ایک کرکے سات
گاڑی سے نکل کر جنگلے میں داخل ہوئے۔ جنگلے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ سب حیران تھے کہ شیر بھی آگئے جنگلے کا
زہ بھی بند ہوا اور ابھی تک رنگ ماسٹر کا پتہ نہیں۔۔۔۔ اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ اس کونے
رکھی ہوئی توپ داغی گئی اور اس میں سے گولے کی طرح نکل کر ایک آدمی سیدھے ان شیروں کے جنگلے میں جا گرا۔ اس
گرتے ہی ساتوں شیر سہم گئے اور لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اتنا بڑا تمبو تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجنے لگا۔ کافی دیر
تالیوں کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ ماسٹر جنگلے کے اندر ہی چاروں طرف گھوم کر ہاتھ ہلا ہلا کر ان تالیوں کا جواب دیتا رہا۔
اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو فضا میں کچھ اس طرح حتمی انداز میں جنبش دی کہ تالیوں کی گڑگڑاہٹ رک گئی اور وہ کچھ دیر
لیے ساکت و جامد ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ایک مخصوص انداز میں پوری سکت کے
، ہوا میں ہنٹر لہرایا اور پورے تمبو میں آواز کا ایک کوندا لپک گیا۔

جے چند نے متجسس نگاہوں سے رنگ ماسٹر کے سراپے پر نظر دوڑائی۔ اس کے لباس کی تراش خراش اور رنگت کا
لیا۔ اس کی نظریں رنگ ماسٹر کے ہنٹر پر آکر رک گئیں۔ جے چند نے اپنے ہنٹر کو پہچان لیا تھا! ایک رنگ ماسٹر سب کچھ
ں سکتا ہے لیکن اپنے ہنٹر کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ غیر ضروری طور پر ہی سہی وہ اس کی ایک لازمی ضرورت ہوتا ہے!!
اس کے جی نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اس رنگ ماسٹر سے اپنا ہنٹر چھین لے اور کچھ نہیں تو وہیں نشست پر بیٹھے
چلا کر یہ اعلان کرے کہ وہ جو آواز کا کوندا ابھی کچھ دیر قبل لپکا تھا......... وہ کوندا....... میرے ہنٹر کا کمال تھا۔
ے ہنٹر کا کمال......... اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اب کے جے چند

نے اپنی پیشانی کو پہچان لیا تھا! وہی فراخ ماتھا، جلد کی وہی رنگت اور اس پر بکھرے مسامات کے جال میں سے اپنا راستہ بناتی ہوئی وہ لکیریں جو وقتاً فوقتاً شکن بن کر ماتھے پر ابھرتی رہی ہیں اور جن کے تعلق سے جے چند آج تک یہ طے نہیں کرپایا تھا کہ یہ شکنیں لکیر کا راستہ طے کرتی ہیں یا لکیریں شکنوں کے نشیب و فراز کو متعین کرتی ہیں!"

جے چند کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس نے بڑے ہی سنبھلے ہوئے انداز میں جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے سے لگایا۔ بوندیں رومال میں جذب ہو گئیں۔ رومال کو دوبارہ جیب میں رکھ کر جے چند نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہرچند اس کا ماتھا اس رنگ ماسٹر کے ماتھے کی جگہ ہے لیکن وہ اپنے ماتھے سے محروم نہیں ہوا ہے۔ دراصل اپنے ماتھے کو چھو کر دیکھنے کا خیال اس کے دل میں اسی وقت آگیا تھا جب اس نے اسے رنگ ماسٹر کے ماتھے کی جگہ پر دیکھا تھا لیکن ایک نامعلوم سا خوف بار بار اس کے اٹھتے ہاتھ کو روک لیتا تھا اور جب اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھریں اور اس کے رومال نے انھیں اپنے اندر جذب کر لیا تو اسے اس انجانے خوف سے نجات مل گئی اور اس نے اس گلوخلاصی پر اطمینان کا سانس لیا۔

ابھی اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رک گیا۔۔۔۔اب کے جے چند نے اپنی ناک کو پہچان لیا تھا! وہی ستواں ناک جو اس کی شخصیت کو وقار عطا کرتی تھی اس رنگ ماسٹر کے چہرے پر تھی۔ جے چند کو اطمینان تھا کہ جب اس کی پیشانی اپنی جگہ پر ہے تو ناک بھی یقیناً اپنی جگہ ہی پر ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی ناک کا معاملہ ٹھہرا۔ اطمینان کر لینے میں کیا مضائقہ ہے؟ اس نے فوراً اپنی ناک ٹٹولی اور اسے اپنے آپ پر ہنسی آگئی کہ اسکی ناک کو تو اپنی جگہ پر ہونا ہی تھا، وہاں بھی ہوئی تو کیا؟ ہوا کرے!

جے چند نے پہلو بدلا اور ذرا سنبھل کر خود کو اپنی نشست پر جمایا۔ اس فاصلے ہی سے سہی اس نے باریک نظر سے رنگ ماسٹر کے پیکر اور خدوخال کا جائزہ لیا، اس کے چہرے بشرے اور ڈیل ڈول اور اس کے ہاؤ کا بغور مشاہدہ کیا تو اس پر منکشف ہوا کہ صرف اس کا ہنٹر، پیشانی اور ناک ہی نہیں بلکہ اس کا سب کچھ اس رنگ ماسٹر کے پاس ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کا دہن، اس کے گال، اس کا سینہ اور اس کے ہاتھ پیر۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی یہ کہ واقعتہً اس کا سب کچھ اس رنگ ماسٹر کے پاس ہے اور وہ خود اپنے کسی عضو بدن سے محروم نہیں ہوا ہے۔

جے چند کے لیے ایک بڑی ہی دلچسپ اور انتہائی حیرت افزا صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ وہ خود تماشہ گر تھا اور تماشائی بھی! شائقین سے کھچاکھچ بھرے ہوئے دس تمبوؤں جتنے بڑے اس تمبو میں اس کی حیثیت منفرد تھی۔ اب جیسے ہی اس پر اپنی انفرادیت آشکار ہوئی سیدھا سادہ جے چند اس مسئلے سے دوچار ہوا جس سے تقریباً ہر منفرد شخص کو سابقہ پڑتا ہے، وہ یہ کہ جب تک وہ ہستی دوسروں کو اپنی انفرادیت کا قائل نہیں کر لیتی اس وقت تک خود اس کے نزدیک اپنی انفرادیت مشکوک ہوتی ہے۔ جے چند نے اس خیال سے کہ کیوں نہ پہلے ساتھ والی نشست پر بیٹھے شخص کو قائل کر لیا جائے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے مخاطب کرنے کے لیے اس کے کان کے نزدیک دھیرے سے آواز دی۔

"بھائی صاحب!"

اس شخص نے جے چند کی طرف دیکھ کر کہا۔

بھائی جی! میں خود آپ کو آواز دینے والا تھا۔ ذرا میری طرف دیکھیے اور پھر اس رنگ ماسٹر کی طرف۔ میرا جڑواں بھائی معلوم ہوتا ہے۔ ابھی میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں لیکن یہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جے چند کے لیے جو صورت حال انتہائی دلچسپ اور حیرت افزا تھی وہ اب پریشان کن بن گئی۔ اس نے سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھا دوسری طرف ساتھ والی نشست پر ایک نوجوان عورت بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ جے چند

ں آواز میں خواتین کے لیے مختص احترام کے علاوہ ذرا سی اپنائیت کی چاشنی ملا کر دھیرے سے " بہن جی۔" کہا اور اس بچے کے گال پر ہلکے سے چپت لگائی۔ اس عورت نے اس کی طرف دیکھا، اس کی نظروں میں بھی اپنائیت تھی لیکن وہ کہہ ۔یں تمھیں جو کہنا ہے جلدی کہو، ہمارا مزید کیوں خراب کر رہے ہو، جے چند نے عورت کی نظروں سے کو بھانپتے ہوئے سے کہا۔

" بہن جی' اس رنگ ماسٹر کی صورت۔۔۔۔۔۔

.رت بول پڑی۔

" بھائی صاحب میں یہی تو کہنا چاہ رہی تھی اتنی ... کہ یہ رنگ ماسٹر تو بالکل میرے منے کے باپو جیسا ہے۔ وہاں ماحب آپ یقین مانیے میں جھوٹ نہیں کہہ رہی .... دیکھتے نہیں منا کس طرح ہمک رہا ہے اس طرف دیکھ .... پھر اس نے کچھ سلے جاتے ...

" آپ ہی سوچیے ... یہ بات کوئی عورت ہی کہے گی بھلا۔ میں سچ کہتی ہوں میری ایک چھوڑ تین تین نندیں ہیں۔۔۔ .ا غارت کرے۔۔۔۔۔۔ آپ کو نہیں ان تینوں کو۔۔۔۔۔۔ لیکن میری کوئی دیورانی یا جیٹھانی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیسے ہے وہ تو اپنے ماں باپ کے اکیلے لڑکے ہیں نا۔ ان دنوں وہ کلف میں ہیں۔۔

یہ تو پوری رام کہانی لے بیٹھی۔ اگر کچھ دیر اور اسے کان دے جائیں تو یہ اپنے سسرال کا پورا شجرہ سنا ڈالے گی۔ جے چند سی صورت بنا کر ہاں ہاں کہا اور منہ پھیر لیا اور مجمع کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ خلقت کے اس ہجوم میں تھ والے سے یہی بات کہہ رہا ہے اور سات شیروں کے جنگلے میں بند وہ رنگ ماسٹر وہاں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ جے .تھا کہ رنگ ماسٹری تو عمر بھر میں نے بھی کی لیکن جنگلے کے اندر کبھی مسکرا نہیں سکا!

نگ ماسٹر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور پورے تمبو میں سناٹا چھا گیا۔ کہیں سے ں رونے کی آواز آئی لیکن اسے بھی اسی لمحہ اس کی ماں نے خاموش کر دیا۔ پورا مجمع سراپا تجسس بنا بیٹھا تھا۔ سب ں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور رنگ ماسٹر کے چہرے پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس نے مائیک اپنے ہاتھ میں سے مخاطب ہوا۔

میں آج آپ کو ایسا کھیل دکھانے والا ہوں جسے کوئی بھی رنگ ماسٹر اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ دکھا سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ اسے دوسری مرتبہ نہیں کھیلا جا سکتا۔۔۔۔۔۔ اس کھیل کے ساتھ کھلاڑی بھی ختم ہو جاتا ہے۔۔ ے مجمع پر موت کی اداسی چھا گئی۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔ ہم تمھیں یہ کھیل نہیں کھیلنے دیں گے۔ اس نے

میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔۔۔۔ لیکن مجھے تو یہ کھیل کھیلنا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس تمبو میں آنے سے ب اسی کھیل کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔۔۔۔۔۔ سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے آپ سب۔۔

ں نے ایک مرتبہ پھر ایک آواز ہو کر کہا۔

لن اب ہم سب سراپا التجا بنے ہوئے ہیں۔ ذرا ہماری طرف دیکھو.............

ری آنکھوں میں جھانکو...... ہم دل و جان سے چاہتے ہیں کہ تم یہ کھیل نہ کھیلو.......... ہم تمھاری ہر ا کریں گے.......... لیکن یہ کھیل نہ کھیلو!۔

ہ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کیا اور آنکھیں موند کر کچھ دیر کے لیے دم سادھے کھڑا رہا۔ سبھوں ہلچل مچا رہی امید و بیم کی لہریں ان کے چہروں پر اپنا اپنا رنگ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ سب بڑی بے چینی سے اس

ے منتظر تھے کہ وہ آنکھیں کھولے اور کچھ کہے۔ یہ ذرا سا وقفہ ان کے لیے بہت طول کھینچ گیا تھا.......... یہ چند ثا
انھیں اپنی زندگی پر بھاری معلوم ہو رہے تھے.......... یہ کچھ پل ان کے لیے کئی صدیوں کے برابر ہوگئے تھے.......
.. اور ادھر وہ رنگ ماسٹر تھا کہ دم سادھے، آنکھیں موندے سات شیروں کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا تھا اس ک
سکوت موت بن کر پورے مجمع پر چھانے لگا.......... اور دفعتہ ان سبھوں کی سانس کی رفتار تیز ہوگئی.........
اپنی نشستوں پر بیٹھے وہ سب ہانپنے لگے.......... ہر لمحہ سانس لینا ان کے لیے دشوار سے دشوار تر ہوتا جارہا تھا....
... پورا تمبو ایک بہت بڑے پھیپھڑے میں بدل گیا.......... لیکن وہ پھیپھڑا.......... اب تو سانس لینا ا
اذیت بن گئی.......... ان کی نبضیں ڈوبنے لگیں.......
اگر چند لمحے اور یہ صورت حال برقرار رہتی تو وہ دنیا کے سب سے بڑا تمبو ایک بہت بڑے مردہ گھر میں بدل جاتا.......
لیکن اس سے پہلے ہی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان سبھوں نے دیکھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہا ہے اس کے آنکھیں کھو
ہی ان کی سانسیں درست ہوگئیں اور نبضیں بھی ٹھیک چلنے لگیں۔ پورے تمبو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے مائیکروفو
پر کہا۔

"آپ کا اصرار ہے تو میں یہ کھیل نہیں کھیلوں گا لیکن میری ایک شرط ہے.."

پورا تمبو ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ان سبھوں نے نظروں ہی نظروں میں اس سے کہا کہ ہمیں تمھاری ہر شرط منظ
ہے۔ وہ بہ آواز بلند یہ کہنا چاہتے تھے لیکن ابھی ابھی حبس اذیت سے وہ گزرے تھے اس نے کچھ دیر کے لیے ان سب کو گ
کر دیا تھا۔ وہ منہ کھول تو رہے تھے...... ان کی زبانیں بھی حرکت کر رہی تھیں لیکن ان کے حلق سے آواز نہیں نکل ر
تھی۔ اسی لیے انھوں نے اپنی بات نظر کے وسیلے سے اس تک پہنچائی اور وہ اس تک پہنچی بھی۔ اس نے اپنی شرط بیان کی۔

"آپ میں سے کوئی شخص میری مسکراہٹ کے معنی بتانے۔ ہے کوئی جو اس شرط کو پورا کرے؟"

اس نے "ہے کوئی" کو صلائے عام کے طور پر مجمع کی طرف اچھالا لیکن اسے جھیلنے کی سکت کسی میں نہیں تھی.....
۔ اس کی اس شرط کے سامنے وہ سب بے بس و لاچار تھے لیکن ہو اس شخص کی موت دیکھنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے
تمبو میں آنے سے پہلے کی بات اور تھی.......... انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ کھیل انھیں کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا ہے
.... موت کے سائے ان کی آنکھوں کے سامنے سرسرانے لگے۔ فضا میں کافور کی بو پھیل گئی۔ ان سبھوں کی حالت ا
غیر ہوگئی کہ اگر اس وقت انھیں آئینہ دکھایا جاتا تو وہ خود کو پہچان بھی نہ پاتے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ سب اس رنگ ماسٹر
پہچان رہے تھے۔ اس رنگ ماسٹر کو جیسے ان کی اس حالت پر مطلق رحم نہیں آرہا تھا اور اب بھی وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔
رنگ ماسٹر نے دیکھا کہ لوگوں کی نظریں باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہی ہیں اور وہ دبے پاؤں وہاں سے نکل بھاگ
چاہتے ہیں۔ اس نے وہیں سے حکم دیا کہ باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے جائیں اور ان کے دیکھتے دیکھتے تم
دروازے فوراً اندر سے مقفل کر دیے گئے۔

اب فرار کے تمام راستے بند تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اسے مرتا ہوا دیکھیں...... لیکن...
انھوں نے ایسا نہیں کیا...... سبھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں.......... اس کے
باوجود ان کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا اور وہ رو پڑیں.......... اور ان کے کانوں نے بہت کچھ سنا اور وہ سن ہوگئے پورا تم
ہچکیوں اور سسکیوں سے ماتم کدہ بن گیا۔ مرد، عورت، جوان، بوڑھے، بچے سب دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے..........
و شال تمبو میں ہر شخص ماتمی تھا...... کون کس کو دلاسہ دیتا...... عورتوں نے آنچل منہ میں ٹھونس لیے لیکن
ضبط کی ہر تدبیر بے سود ثابت ہوئی........ رہ رہ کر ان کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا........ آنسوؤں کے تار بندھ گئے تھے

نیا کا سب سے بڑا تمسو ایک بہت بڑا ماتم کدہ بن گیا تھا.......ایک کہرام مچا ہوا تھا۔

تماشائیوں کے اس مجمع میں جے چند اکیلا شخص تھا جو زندگی میں کسی وقت رنگ ماسٹر رہ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ نہیں ٹپکا اور نہ ہی وہ اس کرب و اذیت کا ساجھے دار بن پایا جو اس وقت اس مجمعے کا مقدر بن گیا تھا۔ سب بھول گئے تھے لیکن جے چند کو یاد تھا کہ اعلان کے مطابق رنگ ماسٹر کا آئیٹم پہلا ائیٹم تھا یعنی ابھی شو ختم نہیں ہوا۔

وہ منتظر تھا کہ بینڈ کی ماتمی لدھن کسی شوخ نغمے کی لے میں ڈھل جانے اور شو جاری رہے لیکن اس ماتمی دھن کے ساتھ ساتھ اسے دھپ دھپ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور ان سسکیوں کے ساتھ اس کے کانوں میں گھنٹیاں بھی بجنے لگیں۔ پھر تو یہ ہوا کہ ماتم کدے کا شور پس سماعت رہ گیا اور دھپ دھپ کی آواز اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن اس کے کانوں میں گونجنے لگی.......اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

کوئی مسلسل دروازے کو پیٹے جارہا تھا اور اسی کے ساتھ کال بیل بھی بجارہا تھا۔ جے چند کی آنکھ تو کھل گئی لیکن تمسو کے کہرام سے نکل کر اپنے بیڈروم تک آنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ اس دوران دروازے کا پٹنا اور کال بیل کا بجنا جاری رہا۔ اس کی بیوی بھی جاگ گئی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بیوی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "کہیں.........اور اس نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "ایسا ہی لگتا ہے........

ادھر آٹھ دنوں میں ان کے دو پڑوسیوں کو ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ایک ستر برس کا بوڑھا تھا اور ایک چالیس برس کا جوان۔ مرض دونوں کے مہلک تھے۔ اور آخری مرحلے میں پہنچ گئے تھے۔ دونوں کو ان ٹنسیو کیریونٹ (INTENSIVE CARE UNIT) میں رکھا گیا تھا۔ کسی بھی وقت دونوں میں سے کسی کے بھی تعلق سے ایسی ویسی خبر آسکتی تھی۔ بلڈنگ والے سانس روکے ہر پل اس ان چاہی خبر کے انتظار میں تھے۔

بیوی نے جے چند کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اس خبر کے لانے والے کے لیے میں دروازہ کھولنا نہیں چاہتی۔ کیوں نہ آپ ہی آگے بڑھیں.......جے چند نے دروازہ کھولا سامنے گھوش بابو کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے؟ گھوش بابو، صبح صبح......

"کیا بتاؤں جے چند جی! صبح صبح اپنے ان کا دیہانت ہو گیا۔

گھوش بابو نام بھولتے تھے۔ یہ پوری بلڈنگ جانتی تھی۔ اس قسم کے نازک موقعوں پر ان کی یہ عادت عجیب صورت حال پیدا کر دیتی تھی۔ جے چند سوچنے لگے۔ ان دونوں ہی میں سے کوئی ہے یا.......اگر کوئی اور نہیں تو ان دونوں میں سے کون ہے۔ انھوں نے گھوش بابو کا ہاتھ پکڑا۔ انھیں اندر لے آئے۔ صوفے پر بٹھایا۔ جب تک ان کی بیوی اندر سے پانی لے آئیں گھوش بابو اطمینان سے بیٹھ کر پانی پی چکے تو جے چند نے کہا۔ "اب کہیے!۔ گھوش بابو نے بڑی ندامت کے ساتھ کہا۔

"کیا بتاؤں جے چند جی.......میری یہ عادت.......وہ اپنی بلڈنگ کی تیسری منزل والے.........پچھلے دنوں سے یہاں لڑکا ہوا تھا.......کیا نام رکھا تھا اس لڑکے کا.........

جے چند سمجھ گئے کہ خبر ان کے کسی پڑوسی سے متعلق ہے۔ انھوں نے کہا۔

"گھوش بابو! یوں کہیے کہ ہمارے موہن بابو نہیں رہے.......موہن چندر شرما.......!"

"جی ہاں وہی نہیں رہے..........موہن بابو.......انتم سنسکار کی تیاریاں پوری ہو گئی ہیں.......مشکل یہ ہوئی کہ اسپتال والے DEATH CERTIFICATE کے ساتھ DEAD BODY نہیں لائے۔۔

"اس میں مشکل کیا ہے؟ وہ تو اب بھی مل سکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی جا کر......." جے چند جی ' یہی تو

مشکل ہے۔ کچھ ایسا ہوا ہے کہ یہ کام میرے ذمے آگیا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور میری یہ عادت۔۔۔۔۔۔۔۔کمزوری۔۔۔۔۔۔کہہ لیجیے اسے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔۔

جے چند نے حامی بھرلی اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ ابھی تو سو کر اٹھے تھے۔ گھوش بابو سے معذرت چاہی اور باتھ روم چلے گئے۔ ان کی بیوی نے گھوش بابو کو چائے کے لیے پوچھا لیکن انھوں نے انکار کیا۔ کمرے میں پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔ گھوش بابو صبح صبح خبر ہی کچھ ایسی لے کر آئے تھے۔ گھوش بابو کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ جے چند کے تیار ہونے تک وہ وقت کیسے گزاریں۔ ابھی صبح کا اخبار بھی نہیں آیا تھا۔ اور مسز جے چند سے بات کریں تو کس موضوع پر؟ انھوں سے یوں ہی مسز جے چند کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے کہا۔

" بھائی صاحب میں تو اچھی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔آپ اپنی اس عادت کا کچھ کیجیے۔ چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسے۔۔

گھوش بابو نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔

" بھابھی' چھوٹے تو میں آج چھوڑ دوں'۔

گھوش بابو اور جے چند دونوں ہسپتال پہنچے۔ بہت بڑا ہسپتال تھا۔ اپنے پڑوسی کی عیادت کے لیے وہ کئی بار یہ چکے تھے۔ انکوائری کاؤنٹر سے وہ سیدھے اس کلرک کے پاس گئے جس کا کام مریضوں اور مرنے والوں کے عزیزوں مختلف قسم کے سرٹیفیکیٹ حوالے کرنا تھا۔ وہ آنے والوں سے دو ایک ضروری باتیں پوچھ کر تیار شدہ سرٹیفیکیٹوں میں متعلقہ سرٹیفیکیٹ نکال کر ان کے حوالے کرتا تھا۔ اور ان سے اس کی رسید لکھوالیتا تھا۔ موہن بابو کے گھر والے موت سرٹیفیکیٹ کی درخواست بڑے ڈاکٹر کو دے آئے تھے۔ اور ڈاکٹر کا دستخط شدہ سرٹیفیکیٹ اس کلرک کی میز پر رکھے فائل میں سے ایک فائل میں رکھا تھا جس پر سیاہ فیتہ چڑھا تھا۔

جے چند نے کلرک کو اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ کلرک نے سیاہ فیتے کا فائل اٹھایا۔ جے چند کو بیٹھنے کے لیے کہ جے چند اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے اور گھوش بابو ان کے برابر کھڑے ہو گئے۔ کلرک نے سوال کیا۔

"مرنے والے کا نام؟"۔

اسے جواب ملا۔

"جے چند ولد ہری چند۔

کلرک نے دوسرا سوال کیا۔

"مرنے والے کی عمر؟"۔

اسے جواب ملا

"چونسٹھ سال۔

گھوش بابو کو آج تک صرف اپنی یادداشت سے شکایت تھی۔ اب انھیں اپنی سماعت بھی مشکوک معلوم ہونے لیکن انھوں نے بہت جلد خود کو سنبھالا اور بڑے اعتماد کے ساتھ جے چند کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جے چند جی یہ صاحب آپ کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں۔ موہن بابو کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اپ موہن چندر شرما۔" عمر چالیس سال۔۔

جے چند کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے گھوش بابو کی طرف ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ان کے چہرے مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر ابھری۔ انھوں نے گھوش بابو کو اس کرسی پر بٹھایا جس پر کچھ دیر پہلے وہ بیٹھے تھے اور مڑ کر اکیلے گھر کی طرف چل دیے۔

(آگے ص ۵۰ پر

ڈاکٹر مصطفیٰ علی فاطمی

فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو جلدوں میں "فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" کی تہذیب و ترتیب کر کے ایک گراں قدر
رنامہ انجام دیا ہے۔ فرہنگ کی جلد اول مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے فبروری 1991ء میں شائع ہوئی اور جلد دوم کی
ت 1993ء میں ہوئی۔ جلد اول کو مرتب کرتے وقت سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی تمام دست
طبوعات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں جامعہ عثمانیہ سے تالیف یا ترجمہ ہوئیں اور دارالطبع سرکار عالی یا دارالطبع
ثمانیہ میں چھپی ہیں۔ فرہنگ کے آخر میں ماخذ کے عنوان سے (124) مطبوعات کی کتابیاتی تفصیلات بھی دی گئی ہیں
ں دو کتابیں مجموعہ اصطلاحات ہیں۔ سلسلہ نمبر 124 مجموعۂ اصطلاحات علمیہ موضوع مجلس وضع اصطلاحات جامعہ
مطبوعہ 1926ء ہے۔ یہ پہلا مجموعۂ اصطلاحات ہے جو 1328ف تا 1332ف کی روداووں سے تیار کیا گیا ہے۔ عنایت
ں ناظم سررشتہ نے خاص خاص ہدایتوں کے ساتھ اس کی ترتیب کا کام منشی جانکی پرشاد صاحب صیغہ دار کے سپرد
دوسری کتاب (سلسلہ نمبر 123) پر بہ عنوان فرہنگ اصطلاحات علمیہ مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن، مطبوعہ
دو پریس 1925ء ہے جس کا شمار مطبوعات سررشتہ تالیف و ترجمہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ باقی 122 جامعہ عثمانیہ کی
ت (ترجمے اور تالیفات) ہیں۔ ان کا تعلق (32) علوم و فنون سے ہے جن میں سے سوائے معدودے چند عثمانیہ
ں کے نصاب تعلیم میں داخل تھے۔

رہنگ کی جلد دوم کے پیش لفظ کے بعد ماخذ کی فہرست میں (33) کتابیں معہ کتابیاتی تفصیل درج ہیں۔ سلسلہ نمبر
رہنگ اصطلاحاتِ علمیہ حصۂ دوم (عمرانیات، معاشیات، تاریخ و سیاسیات) مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی مطبوعہ
۔ ظاہر ہے کہ اس کو مطبوعات جامعہ عثمانیہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سلسلہ نمبر (11) پر فرہنگِ
ت کیمیا، شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی مطبوعہ 1939ء ہے جس کا شمار مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ میں نہیں

سلسلہ نمبر (24) پر فرہنگ اصطلاحات فن صحرا، سید عبدالواحد، دارالطبع سرکار عالی حیدرآباد دکن مطبوعہ 1945ء
ملتا ہے لیکن سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کے مؤلفین یا مترجمین کی فہرست میں سید عبدالواحد کا نام
یں ہے اور نہ ہی فہرست مطبوعات سررشتہ میں اس کتاب کا عنوان [illegible] ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے نصاب تعلیم میں
شامل نہیں تھا۔

ک اور ماخذ بسلسلہ نمبر (6) کا عنوان صرف "نشری اصطلاحات" ہے نہ کہ "جامعہ عثمانیہ کی نشری اصطلاحیں"۔ یہ
ت (حیدرآباد ریڈیو) کی جانب سے شائع ہونے والی پہلی فہرست ہے جس میں فنی اور پروگرام دونوں شعبوں کی
لو انگریزی حروف تہجی کے [illegible] سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ساری اصطلاحیں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں وضع ہوئیں

کمیٹی کے ارکان میں محکمے کے نمائندے (اشفاق حسین) کے علاوہ مولانا عبداللہ عمادی، ڈاکٹر ایشور ناتھ توپا، ڈاکٹر
الدین قادری زور اور ڈاکٹر حاجی غلام محمد تھے۔ بعد میں ایشور ناتھ توپا کی بجائے پروفیسر نصیر احمد صاحب عثمانی کو کم
شریک کیا گیا (حوالہ دیباچہ نشری اصطلاحات) ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد جلد 8 شمارہ 3 ، مارچ 1991 ء میں ش
عنوان کی غلطی فہرست ماخذ میں بھی در آئی ہے۔ اس کتاب کا شمار مطبوعات سررشتۂ تالیف و ترجمہ میں نہیں ہو سکتا

میر عثمان علی خاں فرماں روائے حیدرآباد کے فرمان مورخہ 14/ اگسٹ 1917 ء کے بموجب سررشتۂ
ترجمہ کا قیام جامعہ عثمانیہ کے پیش رو ادارے کی حیثیت سے بتاریخ یکم آبان 1326 ف م 6 ستمبر 1917 ء عمل
مولوی عبدالحق اس کے ناظم مقرر کیے گئے۔ اس وقت اس کے دو اہم ترین شعبے تھے۔ ایک دارالترجمہ اور دوسرا
وضع اصطلاحات۔ مجلس وضع اصطلاحات کے ذمے نصاب تعلیم میں شامل متعدد علوم و فنون کی کتابوں میں مستعمل
اصطلاحات مدون کرنا تھا۔ اصل کتابیں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں میں تھیں۔ ا
ان زبانوں کے علمی، سائنسی اور فنی اصطلاحات کے اردو مترادفات اور مساوی المعنی اصطلاحیں وضع کرنی تھیں در
زبانوں کی اردو میں نقل حرفی (TRANSLITERATION) بے مقصد اور بے فیض ثابت ہوتی۔ جب تک کہ اصطلاحات
اور منظور نہ ہو جائیں، ترجمے یا تالیف کا کام شروع نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرہنگ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ جلد اوّل کے عالمانہ پیش لفظ میں بڑی تفصیل سے
عثمانیہ کے قیام، سررشتہ تالیف و ترجمہ کے آغاز اور درپیش مشکلات اور ان سے عہدہ برآئی پر روشنی ڈالی ہے جس۔
معلومات کی وسعت اور تحقیقی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے کثرت رائے سے منظورہ، وضع اصطلاحات کے ا
عملی طریقوں کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے وقیع اقتباس سے زینت دی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی علمی بصیرت اور حقائق پسندی لائق تحسین ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں رقم طراز ہیں
"جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان کے ذریعے تعلیم دینے کا ایک بڑا تجربہ کیا گیا تھا۔ اور یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا
ذہن، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک بڑی تعداد اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئی۔ یہ ا
کامیاب تجربہ تھا کہ اس سے پاکستان میں پوری طرح استفادے کی ضرورت تھی لیکن چوں کہ ایسا نہیں ہوا اور ہم
انگریزی زبان کو غلامانہ افتخار کے ساتھ ذریعہ تعلیم بنائے ہوئے ہیں، اس لیے علمی و تعلیمی سطح پر ہم گہرے انتشا
ہیں اور اسی لیے آزادی کے بعد سے کسی شعبۂ زندگی میں ہم نے کوئی عظیم ہستی پیدا نہیں کی اور نہ کوئی قابل فخر کارنا
دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم ذہنی قیادت کے لیے صرف اور صرف دوسری اقوام کی طرف دیکھنے اور ان پر تکیہ
خدمت ضرور انجام دے رہے ہیں۔ یاد رکھیے کہ یہ صورت حال ہمیں کہیں نہ لے جائے گی۔"

یہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے دانش مند ذہن اور دردمند دل کی پرخلوص آواز ہے جس پر ہمیں بھی توجہ کرنے کی
ہے۔

بنیادی طور پر زیر نظر فرہنگ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ کی جلد اوّل دارالطبع جامعۂ عثمانیہ کی 122 مطبوعات (تا
تراجم) میں شامل فہرست اصطلاحات پر مبنی ہے۔ اس کی جلد دوم میں 33 مطبوعہ کتابوں میں منسلک فہرست اص
کو شریک کیا گیا ہے۔ اس طرح فرہنگ کی دونوں جلدوں میں 155 مطبوعات میں شامل علمی، سائنسی اور فنی اصطلا
احاطہ کیا گیا ہے۔

جلد اول کے (471) صفحات ہیں اور جلد دوم میں (417)۔ جملہ صفحات کی تعداد (888) ہوتی ہے۔ ہر
مسطر او سطاً 39 سطری ہے اور ایک صفحہ پر کم و بیش (78) اصطلاحات (انگریزی۔ اردو) درج کی گئی ہیں۔ اس ا

فرہنگ کی جلد اوّل میں (36838) اصطلاحات شامل ہیں۔ جلد دوم میں شامل جملہ اصطلاحیں (32526) ہوتی ہیں۔ دونوں جلدوں میں مندرجہ اصطلاحات کی تعداد (69364) کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ لیکن انگریزی حروف تہجی کے آخری چھ حروف (u. v w x y z.) کے صفحات پر مندرجہ اصطلاحات کم ہیں اس لیے اصطلاحات کی جملہ تعداد تقریباً 69000 انہتر ہزار شمار کی جا سکتی ہے۔ اس قدر کثیر اصطلاحات کی لغتی ترتیب (Dictionary Order) میں پیشکشی اور طباعت خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی مشکلات اور مسائل کو وہی اہل علم و فن جانتے ہیں جو لغت نگاری / فہرست سازی سے عملاً واقف ہوں۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ کی مدوّنہ و منظورہ اصطلاحات کی جملہ تعداد کیا ہے؟ اگر اصطلاحات کی فن واری تقسیم (SUBJECT-WISE BREAKUP) کی جانے تو ہر علم / فن یا شعبہ تعلیمی کی کتنی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ مضمون نگاروں اور محققین کے مابین اس مسئلے پر اختلاف رائے ہے۔

ڈاکٹر احمد حسین نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ پر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد سے پی ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ دارالترجمہ کی موضوعہ اردو اصطلاحات کی جملہ تعداد کے تعلق سے لکھا ہے

"مختصر یہ کہ دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کی مجلسوں نے تیس سال کے عرصے میں جملہ علوم و فنون کی تقریباً ایک لاکھ اصطلاحیں وضع کرکے صفحہ قرطاس پہ مندرج کردیں۔

(فن ترجمہ اور تراجم دارالترجمہ۔ غیر مطبوعہ مقالہ 1978ء ص 306)

ڈاکٹر مجیب الاسلام (مرحوم) نے اپنے تحقیقی مقالے (برائے پی ایچ۔ ڈی) میں لکھا ہے۔

"راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق مجموعی طور پر وضع اصطلاحات کمیٹی کی تین ہزار تین سو ایک (3301) میٹنگیں ہوئیں اور ان میں تمام مضامین کی منجملہ چھیاسی ہزار پانچ سو ترسٹھ (86563) اصطلاحیں وضع کی گئیں۔۔

(دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات اور اردو زبان وادب پر اس کے اثرات) ص ص 98-197 دہلی 1987ء)۔

میری اپنی تحقیق کے مطابق جس کا ذکر میں نے اپنے مقالے (بعنوان " سررشتہ تالیف و ترجمہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تشریحی کتابیات۔ عثمانیہ یونیورسٹی جون 1990ء (غیر مطبوعہ) ص 91 میں کیا ہے، مجالس وضع اصطلاحات کی بنائی ہوئی اردو اصطلاحات کی جملہ تعداد (91088) اکیانوے ہزار اٹھیاسی ہے جس میں زیر نظر ثانی اور غیر مطبوعہ کتابوں کی اصطلاحات شامل نہیں ہیں۔ اس کی مزید تصدیق ناظم سررشتہ ڈاکٹر نظام الدین کے شماریاتی اشاریے (NUMERICAL INDEX) مورخہ یکم مارچ 1946ء سے ہوجاتی ہے۔

فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی دونوں جلدوں میں کم و بیش (69000) اصطلاحات شامل ہیں۔ (91000) اکیانوے ہزار کے نشانے تک پہنچنے کے لیے کم از کم (22000) بائیس ہزار اصطلا: ت کی تلاش و جستجو کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو بھی اس بات کا اندازہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ تجویز رکھی ہے کہ " فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی باقیات۔ تیسری جلد کی صورت میں اہل دکن کو خود مرتب کرنی چاہیے اور وہ اس لیے کہ حیدرآباد میں بقیہ مواد ملنے کے امکانات ابھی زیادہ روشن ہیں۔ اگر مرتب چاہیں گے تو یہ جلد بھی یہاں سے شائع کردی جائے گی۔۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی دو جلدیں شائع کرکے تقریباً نصف صدی قبل موضوعہ علمی سائنسی اور فنی اردو اصطلا۔۔" کو حیات نو دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایسے خالص علمی اور حوالہ جاتی کام

... کی ... کے بعد زیادہ مشکل نظر نہیں آتے۔ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ مطبوعا
... فہرست اصطلاحات اور فرہنگوں کو سامنے رکھ کر اصطلاحات کا مجموعہ مرتب کر دیا گیا ہے۔ لیکن
... کتابوں کی تلاش سے لے کر اصطلاحات کی فن واری ترتیب کے بعد مجموعے کی فرہنگ الف
(DICTIONARY WI...) دی جانے تو قدم قدم پر تحقیقی، علمی، فنی اور عملی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ط
... ان ... وہ کسی قسم کی ہو جس دیدہ ریزی سے پروف ریڈنگ اور تصحیح کرنی پڑتی ہے، اس کا ایک عام قاری کے
... بھی مشکل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس علمی مہم کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کا
... کرنے کا تھا۔ اب عثمانینس کا اپنی مادر جامعہ کے تئیں یہ فرض بنتا ہے کہ ماہتی اصطلاحات کی سرگرم تلاش
... انہیں رہنما خطوط پر مرتب کر کے فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کو مکمل کریں اور اس علمی کام کو ڈاکٹر جمیل جالبی
ممنون کریں۔ میں نے اپنے تئیں اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔

***

(سلسلہ ص ۴۶ سے آگے)

اس رات جب جے چند اپنے بستر پر لیٹے تو کافی دیر تک انھوں نے انتظار کیا کہ وہ چھت کی سنوں وزنی سل ا
ہٹ کر ان کے سینے پر آجانے اور وہ پاس رکھا نیلی فون بہت دور چلا جانے۔ ہوا سائیں سائیں کرنے لگے۔ اور کمر
لگے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور جب انھوں نے دکھا کہ کچھ نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے چادر اوڑھ لی اور گہری نیند سو

***

: ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

فون: 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۶ اکتوبر نومبر۔ ڈسمبر ۱۹۹۴ء شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

فی پرچہ:	۷ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ:	۳۰ ڈالر
زر سالانہ:	۷۵ روپے	پاکستان، برما، سیلون:	۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے:	۱۰۰ روپے	انگلستان:	۱۲ پونڈ

ناشر: ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد: ۵۰۰۰۸۲

ڈیزائن پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس عابد روڈ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد سے شائع کیا

نمائش سوسائٹی

ٹیلی گرام : نمائش
فون : ۵۵۰۱۹۹
۵۵۳۱۹

کل ہند صنعتی نمائش

نمائش میدان مکرم جاہی روڈ۔ حیدرآباد۔500001

نمائش ہر سال پہلی جنوری سے پندرہ فبروری تک منعقد کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ہمہ مقصدی نمائش اور جنوبی ہند کے بڑے تجارتی مجموعوں میں سے ایک ہے جس میں 46 دنوں کے دوران پندرہ کروڑ روپے کی مجموعی بکری ہوتی ہے اور پچیس لاکھ سے زیادہ افراد اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

ایک غیر منفعتی ادارہ جو اپنی آمدنی تعلیم کے مقصد بالخصوص خواتین کی تعلیم پر صرف کرتا ہے اور حسب ذیل ادارہ جات کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔

1۔ کملا نہرو پالی ٹکنک برائے خواتین۔ حیدرآباد۔
2۔ سروجنی نائیڈو ونیتا مہاودیالیہ۔ حیدرآباد۔
3۔ سردار پٹیل کالج۔ سکندرآباد۔
4۔ لال بہادر کالج ورنگل۔ ضلع ورنگل۔
5۔ سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر، ضلع نلگنڈہ۔
6۔ سری وینکٹیشور کالج۔ سوریہ پیٹ۔ ضلع نلگنڈہ۔
7۔ کستوربا گاندھی کالج برائے خواتین۔ سکندرآباد۔
8۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس۔ سکندرآباد۔
9۔ وشویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ۔ سکندرآباد۔
10۔ راجیو گاندھی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نرمل، ضلع عادل آباد۔
11۔ روی نارائن ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، ضلع نلگنڈہ۔
12۔ شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول۔ حیدرآباد۔
13۔ ایل۔ این۔ گپتا میموریل ڈسپنسری۔ نمائش میدان۔ حیدرآباد۔
14۔ سری رام لنگیشور سوامی کالج گلک چرلا، ضلع رنگاریڈی۔

تجارت، کاروبار اور صنعت کی تشہیر اور مارکٹنگ کے لئے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد ہر سال منعقد کی جاتی ہے۔ یہ نمائش ریاست کے عوام کے لیے نئے سال کا تحفہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ٹی۔ وی۔ نارائنا

...ن ... مین

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: نتالیا پری گارنا

ترجمہ: اسامہ فاروقی

باب ۷

کائنات، شاعر اور شخصیت

کہانی کو سمجھنے کے لیے اس دیس کا سفر بھی ضروری ہے جہاں اس کہانی نے جنم لیا۔ اگنے

مرزا اسد اللہ خاں کے بالکل ابتدائی شعری تجربات ہی نے، اپنی ناپختگی کے باوجود، شاعری کے قدر دانوں کو فوراً یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ اردو ادبیات کے افق پر ایک ذہین و طباع شاعر نمودار ہوا ہے۔ اگلے چند برسوں میں اس کی خداداد قابلیت کے ارتقا نے قدر دانوں اور نکتہ چینوں دونوں کو غالب کی شاعرانہ انفرادیت کی امتیازی حیثیت کا قائل کر دیا۔ اس شوخ اور بے پناہ قوت متخیلہ سے "سبکِ ہندی" کی تمام خصوصیات سے واقف قارئین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غالب عظیم الشان پیکروں اور حد درجہ شدید جذبات کی ایک دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس دنیا کی اپنی جداگانہ جغرافیائی خصوصیات ہیں اس کا اپنا آسمان ہے اور زمین ہے، شہر ہیں اور باغ ہیں۔ فطری طور سے یہ جغرافیائی خصوصیات غالب کی شاعری کے میرِ افسانہ کی قلبی کیفیت سے مربوط ہیں اور اس کی کیفیت مزاج میں تبدیلی کے ساتھ ان کی بھی تشکیل نو عمل میں آتی ہے۔

آسمان سفلہ انسان دشمن ہے اور زمین سے اتنا قریب کہ انسان اس کا دباؤ ہر وقت محسوس کرتا ہے۔

گردش محیط ظلم رہا جس قدر فلک
میں پائمال غمزۂ چشم کبود تھا

زمین، آبادیوں، شہروں اور صحرا و بیاباں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ غالب کی دنیا کے نقشے میں صحرا و بیاباں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی بہتات ہے، وہ مشرقی شاعری کی روایات کے مطابق اس جنون عشق کی علامت ہیں جس میں نامراد قیس عامری گرفتار تھا۔ تاہم اگر مجنوں کے لیے ایک صحرا کافی تھا تو ہمارے غم زدہ عاشق کو کئی صحرا درکار ہیں

دل دررکابِ صحرا، خانہ خرابِ صحرا
موج سرابِ صحرا، عرضِ خمارِ صحرا

شہروں کے عین قرب و جوار ہی میں ہر وقت نئے صحرا و بیاباں معرض وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی انسان پر جنونِ عشق طاری ہوتا ہے، اس کی خاک، وہ خاک جس سے اس کی تشکیل ہوئی ہے، ایسے اٹھتی ہے جیسے بادِ سموم

گر ہو بلد شوق، مری خاک کو وحشت
صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں

لیکن بہتر تو یہ ہے کہ وقت پر کام آنے کے لیے بیاباں بالکل پاس گھر ہی میں، موجود ہے:

ضعف جنوں کو وقت تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

جنون عشق سے بے قابو ہو کر، سبک ہندی کے عہد متأخر کی شاعری کی روایات کے مطابق، شعر کے مرکزی کردار پر ایسا ضعف طاری ہو جاتا ہے کہ اس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ کسی طرح گھر کے دروازے تک پہنچے اور مجنوں کی طرح صحرا نوردی کے لیے نکل جائے اور خود صحرا میں، خاص طور سے اگر وہاں معشوق شوخ و شنگ شکار میں مشغول ہو، ہر قدم پر سراب ملتے ہیں اور دام مکر و فریب بچھے ہوتے ہیں۔ تب صبح قیامت کو بھی ان مصائب کے مقابلے میں ہیچ سمجھنا چاہیے جن کا صحرا نورد مسافر کو سامنا کرنا پڑتا ہے:

صبح قیامت ایک دم گرگ تھی اسد
جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

خود دشت میں اور اس کے اطراف و اکناف میں مختلف بستیاں بکھری ہوئی ہیں: انتظار آباد یعنی انتظار کی جگہ، خمستان، یعنی شراب کو ذخیرہ کرنے کے بڑے بڑے دو دستہ ظروف کا شہر، افستان یعنی پیراہنوں کا ملک۔ چمنستان، محلات، سبزہ زار اور گلستان ان کے علاوہ ہیں لیکن بالعموم گلستان، چمن اور سبزہ زار میں قدم قدم پر دغا و فریب کا سامنا ہے، کہیں جال بچھے ہیں اور پھندے لگے ہیں تو کہیں صیاد کمیں میں ہے اور چمنستان کا منظر مسرت و انبساط سے زیادہ غم و اندوہ کی یاد دلاتا ہے، مثال کے طور پر وہاں چراغاں کے لیے جنون الفت میں گرفتار عاشق صحرا نورد کے پاؤں کے وہی آبلے کام آتے ہیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

مسلمانوں کی قصہ گوئی کی روایت میں، خاص طور پر اردو داستانوں میں، محل وقوع اور منظر کی توصیف کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور اس میں دنیا کے عجائبات یا اس کے مناظر کی تبدیلیوں کا انحصار طلسماتی یا رومانی موضوع کے تقاضوں پر ہوتا ہے۔ بلاشبہ غزل سے ہم اس کی توقع نہیں رکھ سکتے جو ہمیں بیانیہ انداز کی طویل نثری اور منظوم تخلیقات میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اس سے ہم محل وقوع کی منظر کشی میں منطقی تسلسل اور یک رنگی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ تاہم نکولائی باتسکی کی فلسفیانہ شاعری کی طرح ایسی بھی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ ان میں فضا ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک ہی طرح سے نظم کی ہوئی ہوتی ہے اور محل وقوع یعنی "درختوں کے جھنڈ" "سبزہ زار" "مدفن" "چڑیا گھر" اور "دوسرے گوشہ کائنات" کی مختلف نظموں میں پائی جانے والی توصیفیں باہم دگر مربوط ہوتی ہیں، متعین محل وقوع میں خلل نہیں ڈالتیں، محض دنیا کی ایک مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ خداداد شعری صلاحیت کی پختگی اور دنیا اور کائنات کے بارے میں شاعر کے نظریے کی استقامت کا ثبوت ہے۔

غالب کی ابتدائی شاعری ایک حد تک اس کے بالکل برعکس رجحان کو ظاہر کرتی ہے، اس میں ہمیں مختلف ذہنی رویوں کی کشمکش اور دنیا کے مختلف تصورات کا تصادم دکھائی دیتا ہے، ایک ہی دیوان میں دنیا کے مختلف نمونہ ہائے مکانی ملتے ہیں، جیسا کہ خورشید الاسلام کا خیال ہے تصوف کا آئینہ خانہ اور زندگی کی مادی مسرتوں کا سبزہ زار ایک دوسرے سے متصل

گلشن یہاں مختلف نوعیت کے ہیں، دل کش بھی ہیں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے بھی، ایسے بھی ہیں جن کو دیکھ کے اس مادی اور ظاہری دنیا کی بے اصلی کا احساس ہوتا ہے اور جن کا پر فریب حسن، بلند صوفیانہ مقاصد کی آرزو مند روح کو تذبذب میں نہیں ڈال سکتا:

میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

بعض گلشنوں میں دامانِ باغباں سے الجھنے والے کانٹے ہی کانٹے اگتے ہیں۔

پیراہنستان یعنی "ملکِ پیراہن" میں ایک غیر معمولی نوعیت کا باغ ترتیب دیا گیا ہے۔ پیراہن، شاعری میں، حضرت یوسف کے قصے سے تعلق رکھنے والی، ایک پیچیدہ علامت ہے۔ ان کے قصے میں تین پیراہنوں کا ذکر ملتا ہے: پہلا وہ خون آلود پیراہن جسے حضرت یوسف کے بھائی ان کو کنویں میں ڈھکیلنے کے بعد اپنے باپ حضرت یعقوب کے پاس انھیں یقین دلانے کے لیے لائے تھے کہ یوسف کو بھیڑیے نے مار ڈالا۔ دوسرا پیراہن یوسف وہ جسے ملکہ مصر زلیخا نے یہ بات باور کرانے کے لیے پھاڑا تھا کہ یوسف نے اس کی عزت پر دست درازی کی کوشش کی تھی جب کہ واقعتاً پیراہن پیچھے سے پھٹا تھا اور یوسف کی پاک دامنی کا شاہد تھا۔ تیسرا پیراہن یوسف وہ جو حضرت یوسف نے مصر سے بیٹے کے غم میں اندھے ہوجانے والے اپنے باپ کے پاس بھیجا تھا اور جس پیراہن کی خوشبو اور چہرے پر جس کے لمس سے ان کی بینائی بحال ہوگئی تھی۔

نابینا شاعر رودکی ان تین پیراہنوں کے بارے میں لکھتا ہے:

یکے از کید شد پر خوں دوم شد چاک از تہمت
سوم یعقوب را از بوئے روشن کرد چشم تر
رخم ماند برآں اول، دلم ماند برآں دوم
نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

(ایک کو مکر نے خون آلودہ کیا، دوسرے کو تہمت نے چاک کیا، تیسرے کی خوشبو سے نابینا یعقوب کی بینائی بحال ہوئی۔ میرا چہرہ پہلے پیراہن کی مانند ہے، میرا دل دوسرے پیراہن جیسا ہے۔ کیا ہی خوب ہو اگر وصل میں تیسرے پیراہن کا پانا میری قسمت میں لکھا ہو۔)

غالب کے لیے پیرہن کا مضمون اتنے ہی گہرے اور پراسرار مفہوم سے مملو ہے جتنا کہ ان کے پیش روؤں کے لیے روح کے کرب، غم واندوہ اور ناامیدی کی مثال غالب ان خون آلودہ اور پھٹے ہوئے پیراہنوں کے ملک سے دیتے ہیں جو ایک طرح سے شاعر کی زندگی میں بارہا پیش آنے والے اس تصادم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو حضرت یوسف کے قصے میں بھی پایا جاتا ہے، جس میں فریب بھی ہے، دغابازی بھی، آنسو بھی ہیں اور غم واندوہ بھی۔

بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسد
دے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

حضرت یوسف کا قصہ اگر اپنی نوعیت کا واحد نہیں تو شاید عالمی ادب کے ان گنے چنے قصوں میں ہے جن کا انجام خیر ہوتا ہے۔ نظامی اور جامی کی مثنویات سے لے کر ماسکو میں واقع کریملن کے ایوان تراشیدہ کی دیواری تصویر اور طامس مان کے ناول "یوسف اور برادران یوسف" تک، عالمی ثقافت کے کتنے شاہ کاروں کو اس قصے نے جنم دیا ہے!

حافظ اپنی اس مشہور غزل میں جس کی ردیف "غم مخور" ہے لکھتے ہیں:

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

غزل کا محور خیالِ امید ہے۔ امید کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین ردیف "غم مخور" کے ذریعے دہرائے جانے والے

پیام سے ملتی ہے۔ غزل کے محولہ بالا مطلع کی تعمیر پہلے اور دوسرے مصرع کے موضوعات کے تقابل اور متوازیت پر ہوا ہے۔ پہلے مصرع میں یوسف کی گم شدگی یعنی ایک دردناک واقعے اور کنعان کو ان کی واپسی یعنی ایک پر مسرت واقعے کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا گیا ہے، جب کہ دوسرے مصرع میں غم واندوہ اور مسرت وانبساط کی علامتوں، کلبۂ احزاں اور گلستاں کو۔

متوازیت اس امر میں ہے کہ پہلے مصرع میں یوسف گم گشتہ کا موضوع دوسرے مصرع میں "کلبۂ احزاں" کے موضوع سے جڑا ہوا ہے اور اسی طرح سے کنعان کو واپسی کا موضوع گلستاں کے موضوع سے۔ اس طرح سے شعر کی متوازن بناوٹ سے خیر وشر کے تضاد کا بھی اظہار ہوتا ہے اور یہ یقین دہانی بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں ہر دردناک اور الم ناک واقعے کی خیر اور امید خیر کے وسیلے سے تلافی لازمی ہے۔

یوسف گم گشتہ کی واپسی اور ماتم کدے کی مسکن انبساط و امید میں تبدیلی کے موضوع کو غالب نے اپنے کلام میں بڑے انوکھے ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔

گل زار "پیراہنستاں" کی یاد دلاتا ہے، اس میں گل ہائے خون آلودہ و صدچاک کھلتے ہیں۔ دے کا مہینہ، یعنی ایرانی شمسی تقویم کا دسواں مہینہ، لگ بھگ 21/ دسمبر سے لے کر 21/ جنوری کے عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ جاڑے کا یہ مہینہ اپنے ساتھ ٹھنڈی، برفیلی ہوائیں لاتا ہے، جن کے زرغے کے نتیجے میں گلاب اور دوسرے پھولوں کی پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں۔ خود گل زار ("پیراہنستاں")، کلبۂ احزاں ہی کی طرح، ناامیدی کا استعارہ ہے۔ یوسف کی خبر، یا شاعر کے الفاظ میں "بوئے یوسف" سے بھی کوئی تسلی نہیں ملتی، کیوں کہ یہ تو گل زار کی پژمردگی کی اور "پھٹے ہوئے پیراہنوں" کی خبر ہے۔

مختصر یہ کہ جیسا کہ مندلشتام نے کہا ہے:

روٹی زہر بن گئی ہے اور ہوا ساری خرچ ہو گئی ہے،
زخموں کا علاج کتنا مشکل ہے،
بازار مصر میں بکنے کے بعد یوسف بھی
اتنے دل گیر نہ ہوئے ہوں گے

سرد ہوا کے اثر سے جھڑ جانے والی گلاب کی پنکھڑیاں، غم واندوہ کا ایک اور استعارہ ہیں، کیوں کہ گل کدہ، چاہے رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہی کیوں نہ ہو، آخر کار گل کدہ ہی تو ہوتا ہے۔ دے کی ہوا نے سرد اپنے ساتھ یوسف کے مصائب کی خبر لاتی ہے، لیکن یہ نہ صرف پہلے دو پھٹے ہوئے پیراہنوں کی خبر ہے، بلکہ مشام جاں کو معطر کرنے والے تیسرے پیراہن کی بو بھی ہے۔ خود یوسف کے نام میں خوش خبری مضمر ہے، اس امر کی خوش خبری کہ موسم سرما کے مہینوں کے بعد بہار کے مہینے بھی آئیں گے، پھولوں کے مرجھانے کے موسم کے بعد ان کے کھلنے کا موسم بھی آئے گا۔ اور اس بہار کی دل ربی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا:

طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

موسم بہار میں گلستاں پر بارش سے بوجھل گھٹا چھا جاتی ہے، بجلی چمکتی ہے، ابر بہاری کی گرج سنائی دیتی ہے، رگ گل میں پھر خون دوڑنے لگتا ہے، مختصر یہ کہ سب کچھ پھر سے دہرایا جاتا ہے:

بہار رنگ خون گل ہے ساماں اشک باری کا
جنون برق نشتر ہے رگ ابر بہاری کا

ابر گلاب کے لیے اشک بار ہے: اس فرض سے کہ موسم بہار میں گلاب شگفتہ ہوں اور ان کی پنکھڑیوں کی رگوں میں خون دوڑے "جنون برق سا ابر بہاری کی رگ کے لیے نشتر کا کام دیتا ہے تاکہ اسے کچھ سکون ملے۔ یہ پیچیدہ تشبیہہ "سبک ہندی" کی علامات میں سے ایک ہے لیکن شعر میں مذکور افسردگی سے مملو تصادم کے باوجود تصویر خیالی پھر بھی روشن ہے، موسم بہار کی بارش، کھلتے گلاب اور تجدید فطرت کا موضوع روایت کے عین مطابق ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

دنیا زمزمہ سنج ہے، دل فریب رنگوں سے جگمگا رہی ہے۔

سبزہ ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

زندگی ایک مفہوم پنہاں کی حامل دکھائی دیتی ہے، اس میں سب کچھ باہم دگر مربوط ہے، ایک ایک ذرے کا اپنا مقصد ہے، مصائب بجا ہیں، ان کا روشن رخ بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

لالے کے اندر کی چتی دہکتے لوہے سے لگائے ہوئے داغ کی یاد دلاتی ہے۔ زرد رنگ کا زرِ گل گویا کہ چراغ کی طرح روشن لالے کا فتیلہ ہے۔ اس تصویر میں دکھ درد کی بھی اپنی ایک جگہ ہے۔ دکھ درد تو مستقبل کے سکون و اطمینان کا نقطہ آغاز ہے۔ خورشید الاسلام لکھتے ہیں: "خدا کو غالب مادی مظاہر میں، فطرت کے کاروبار اور اس کی موزونیت میں تلاش کرتے ہیں اور ان کے اشعار میں انبساط وجود سنائی دیتا ہے۔" آسمان اور زمین کا قرب ہمیشہ بلاواسطہ ہے، ان کا تعلق باہمی ایک طرح سے راست لازم و ملزوم کا ہے، یہاں پاؤں کے آبلوں اور آسمان پر تاروں کے جھرمٹ کی اصل تقریباً ایک ہی ہے یا کم از کم وہ ایک ہی نظام توافق میں واقع ہیں۔ اچانک ایک سہانی شام کو محمل جیسی ملائم رات، اس منزل پر جس کا کب سے انتظار تھا، اتارے جانے والے محمل کے چھتر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شب اختر قدح عیش نے محمل باندھا
باریک قافلہ آبلہ منزل باندھا

لیکن قوت متخیلہ کے وسیلے سے معرض وجود میں آنے والی اس عجیب و غریب دنیا کا سب سے بڑا معجزہ خود شاعر کا قلب زندہ و مضطرب ہے:

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پرزدن تپش میں ہے کار قفس تمام

گرفتار قفس چڑیا بھی آزادی کے احساس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ بہ شرطے کہ وہ قفس کی تیلیوں کو فراموش کرتے ہوئے پوری طاقت سے پر مارے اور پھڑ پھڑائے اور پھر نہ قفس ہی رہے گا اور نہ خود چڑیا۔

عاشق کی ناتوانی کے روایتی موضوع کو اپنی ابتدائی شاعری میں غالب کما حقہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ نئے مضامین کا اضافہ بھی کرتے ہیں: سرور آگیں خود سپردگی، رسوم و رواج سے بے اعتنائی اور آرزو کی نار [11] نوجوان غالب کی غنائی شاعری کے ہیرو افسانہ کو غزل کے روایتی عاشق سے ممیز کرتی ہے۔

جلد ہی غالب کی شاعری کے عاشق کی سمجھ میں یہ بات آنے لگتی ہے کہ فلک کج رفتار یا معشوق کے ظلم و ستم کے

رات کے شکوے ایک طرح کی ایسی دریوزہ گری ہیں، جس کے نہایت غیر متوقع نتائج نکل سکتے ہیں

دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سرو سامانی
ایجادِ گریباں ہا، در پردۂ عریانی

افلاس، جب انسان کے پاس تن ڈھانکنے کو بھی کچھ نہ ہو اور اسی طرح سے اپنے عشق کی بے پناہ روحانیت میں ہر طرح کے ظاہری آرام و آسائش کو تج دینے والے مجنوں کی عریانی، یہ ایک مخصوص طرزِ زندگی اور فلسفۂ حیات کی علامت ہے عریانی سے دست برداری اور گریباں۔ کے حصول کی آرزو، روحانیت سے بے وفائی ہے۔ عریاں اور بے سرو ساماں انسان تمام بے حقیقت، فانی اور ناپائیدار علائق سے آزاد ہے۔ جیسا کہ ناصر علی کہتے ہیں

زبے برگی شکایت چیست باید در عدم رفتن
کہ پیراہن دہد زائل شدن تصویر عریاں را

بے سرو سامانی کی کیا شکایت، جب کہ عدم کا سفر در پیش ہے، کفن کے نیچے تو عریانی غائب ہو جانے گی اسی لیے مادی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مادہ پرستانہ فوائد کی خواہش اور عاشق کے نظریہ حیات میں تناقض لازمی ہے۔ ان فوائد میں عاشق غم واندوہ کے ایک نئے سرچشمے اور علامت کے علاوہ کیا مل سکتا ہے۔ جب تک وہ عریاں ہے اور بے لباس ہے اسے مایوسی کے اظہار کے لیے کم از کم اپنا گریباں چاک کرنے کی تو ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ سازو سامان کی ملکیت ہی تو تخلیق گریباں ہے۔ اس شعر کی طرح ایک اور غزل میں بھی اس خیال کی شاعرانہ دلیل کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے

شوق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس لیے والہانہ خود سپردگی اور نتائج و عواقب کی پروا نہ کرتے ہوئے جاں نثاری کے لیے آمادگی میں بے پایاں مسرت مضمر ہے

تیغ در کف، کف بہ لب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد 'اے آرزوئے مرگ غالب مژدہ باد'

لیکن ترکِ طلب اور خواہشات سے دست برداری کے ساتھ ہی عاشق کی آزادہ روی اور رسوم و رواج سے اس کا بیر نہ معلوم کیسے خود بہ خود واضح ہو جاتا ہے۔ اگر قیس عامری یعنی مجنوں کو ہمیشہ سے مثالی عاشق مانا گیا ہے تو عاشقانِ صادق کی صف میں کوہ کن یعنی فرہاد سنگ تراش میں کچھ ایسی کوتاہیاں تھیں جن کا کفارہ وہ اپنی موت سے بھی نہیں دے پایا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا

یہ شعر کی ابتدائی شکل ہے جس میں رسوم و رواج کی پابندی کی مذمت کی گئی ہے۔ خود شاعر کو اس راستے پر چلنے سے قطعاً انکار ہے

میں دور گرد عرض رسوم نیاز ہوں
دشمن سمجھ، ولے نگہ آشنا مانگ

لیکن دوسری طرف یہ بھی تو ہے کہ ہمت، مستقل مزاجی اور وفا شعاری میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

اس میں شک نہیں کہ غالب کے ابتدائی کلام میں سعی و کوشش کی لاحاصلی، دنیا سے فرار، دنیا سے قطع تعلق اور
تنہائی جیسے متعدد متصوفانہ مضامین کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان سبھی مضامین سے ہم عہد متاخر کی فارسی شاعری کے
ذریعے بھی بہ خوبی واقف ہیں لیکن جیسا کہ خورشید الاسلام کا خیال ہے غالب میں ابتداء ہی سے ایک ایسی شخصیت کے
خد و خال نمایاں ہیں جس کا رویہ حقیقت کی تلاش میں آزادانہ ہے۔ غالب کی شاعری کے مرکزی کردار کے لیے یہ تصور کہ دنیا کی
اصل کا ادراک نہ تو کسی کو ہے اور نہ ہی شاید ہو سکتا ہے، ایک حیرت انگیز انکشاف بن جاتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
خاک بازیِ امید کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بہ خندہ وا پایا
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا
کیوں نہ وحشتِ غالب باج خواہِ تسکیں ہو
کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

بھوپال میں دریافت شدہ نسخوں میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جنھیں عام طور سے غالب کے اس دور سے منسوب
کیا جاتا ہے جب کہ ان کی ذہنی نشوو نما مکمل ہو چکی تھی، اور ان کا متداول دیوان کے مایۂ ناز اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن
ان اشعار میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو غالب نے 1821ء سے پہلے لکھے۔ ذیل میں اس غزل کی ابتدائی شکل پیش کی جا رہی
ہے، جس کی ردیف "کرے کوئی" ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بہ سر
کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست

نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سربر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشت طبیعت ایجاد نالہ خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اس غزل میں جیسا کہ پاکستانی غالب شناس فیاض محمود کا خیال ہے، جوش محبت اور شاعرانہ ترنگ کو غلبہ حاصل ہے لیکن اس کے علاوہ اس غزل میں اور بھی قابل توجہ خصوصیات ہیں۔ قاری کو اس میں احساس کی شدت اور روح شاعر کی جذباتی خود سپردگی بہ طور خاص متاثر کرتی ہے۔ شاعر مختلف مظاہر خیالات کے فرق کو پہچانتا ہے اور کائنات اصغر یعنی خود اپنی زندگی اور ماورائے لامحدود کے درمیان مماثلت کی نشان دہی کرتا ہے۔ چناں چہ فیاض محمود کے الفاظ میں غزل کا دوسرا شعر،

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیال طرہ لیلا کرے کوئی

"انسان کی "انا" کے نظارے یا تصور کے آفاق میں عالم اکبر یعنی ساری کائنات کو خود میں سمو لینے کی حد تک توسیع کی بہت عمدہ مثال ہے۔ سارا عالم محض وہ غبار ہے جو ناقابل حصول معشوقہ کی تلاش میں کسی دیوانے کی دشت نوردی کے نتیجے میں اٹھا ہے۔"

انا ماریہ شمل کا خیال ہے کہ اس غزل میں "نفس سرکش" کی تہذیب کے طریقے کی نشان دہی کی گئی ہے، اس نفس کی تہذیب کی جو صوفیہ کے نظریے کے مطابق اطاعت و فرماں برداری کے مرحلے سے اس دور میں گزر رہا ہوتا ہے، جب اسے سلوک یعنی فقر و درویشی اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہو۔ شمل کا خیال ہے کہ لخت ہائے جگر سے صحرا میں ہر خار کے شاخ گل سے مشابہ ہونے کی خیالی تصویر دراصل ان مصائب کا استعارہ ہے جن کا سالک کو تزکیہ نفس کی راہ پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔

متداول دیوان کی ترتیب کے دوران حذف کر دی جانے والی ایک اور غزل کا بنیادی موضوع عشق یعنی زندگی کا وہ عظیم راز سربستہ ہے جس سے ہر وہ انسان دوبہ دو ہوتا ہے، جو فیاض محمود کے الفاظ میں، اس امر کا ادراک رکھتا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان عشق اس عالم گیر اصول حیات کا محض ایک پہلو ہے۔ آگے وہ لکھتے ہیں "ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب بیس سال کے تھے تو اس مسئلے سے بہ حیثیت مجموعی ان کو زیادہ دل چسپی تھی اور جزویات کو، جن میں ان کے ذاتی تجربے کو بھی شامل رکھنا چاہیے، وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی غزل میں حرکت ہمیشہ جذباتیت اور آپ بیتی کی عکس کشی کے برخلاف معروضیت اور واقعیت کی طرف ملتی ہے، اگرچہ کہ نوجوانی میں اول الذکر رجحان ہی ان کے لیے اظہار ذات کا مرجح وسیلہ تھا۔ اس غزل کو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

حاصل دل بستگی ہے عمر کوتاہ اور بس
وقف عرض عقدہ ہائے متصل تار نفس

ہر نفس کے ساتھ انسان کی عمر کوتاہ ہوتی ہے، اور تار حیات کی گرہیں غم کی علامت ہیں۔ اس طرح سے زندگی عبارت ہے اس امر سے کہ انسان غم سے عہدہ برا ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن عقدہ ہائے متصل کو کھولتے کھولتے اس کی زندگی بھی مختصر ہوتی جاتی ہے۔

کیوں نہ طوطی طبیعت نغمہ پیرائی کرے
باندھتا ہے رنگ گل آئینہ بر چاک قفس

طوطی کا جسم قفس ہے اور چاک قفس یا بہ الفاظ دیگر خانہ چشم سے جھانکیں تو آئینے یعنی اس جہان کو دیکھنا ممکن ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں طوطے کے مقابل آئینہ رکھ کر اسے بولنا سکھایا جاتا ہے، لہذا یہاں آئینہ، خوش بیانی یعنی شاعری اور " نغمہ پیرائی" کی علامت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آئینہ اس جہان سے عبارت ہے اور رنگ گل، خون کے رنگ اور غم واندوہ سے۔ مختصر یہ کہ طوطی شعر کے لیے ماحول تو کافی ساز گار ہے، قفس میں روزن بھی ہیں اور اشک ہائے خونیں کے گلاب بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ بس تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے نغمہ پیرائی کے لیے ترغیب دلانے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

اے او انبہاں! صدا ہے تنگی فرصت سے خوں
ہے بہ صحرائے تحیر، چشم قربانی جرس

یہاں غالب نے اپنا ایک پسندیدہ مضمون باندھا ہے جس کی بنیاد تصوف کے نظریۂ وحدت الوجود پر یا باوزنی کے الفاظ میں مظاہر کی رنگا رنگی کے " کائنات کی بے رنگ وحدت" سے عبارت ہونے پر ہے۔ وجود غیر منقسم کے اس مجمع میں علامت اور اس کے مطلب میں مطابقت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، عمل پیرا تو صرف کلیے ہوتے ہیں۔ لہذا رنگ اور صدا میں دراصل کوئی فرق نہیں ہے، خون آلود چشم قربانی اور دردناک آواز جرس کی حقیقت ایک ہی ہے۔

تیز تر ہوتا ہے خشم تند خوباں عجز سے
ہے رگ سنگ فسان تیغ شعلہ خار و خس

خار و خس کی بے بسی اور ان کے بے حقیقت ہونے سے شعلہ بھڑکتا ہے اور گویا کہ خار و خس شعلے کی لمبی لمبی تلوار جیسی لوؤں کی دھار کے لیے سنگ فساں یعنی سان کا کام دیتے ہیں۔ یہ شاعرانہ استدلال کی ایک مثال ہے: عاشق کے عجز سے خوبان طرح دار کا غصہ شعلے کی طرح بھڑکتا ہے۔ اگر آگ میں گھاس پھوس ڈالیں تو تیغ شعلہ یوں دمکنے لگتی ہے جیسے اسے ابھی ابھی سان پر رکھ کر تیز کیا گیا ہو۔

سختی راہ محبت منع دخل غیر ہے
پیچ و تاب جادہ ہے یاں جوہر تیغ عسس

غیر کو " بربادی" کے راستے پر گام زن ہونے سے کیسے خبردار کیا جائے؟ بلکہ شاید یوں کہنا بہتر ہوگا کہ خود کو رقیب سے کیسے چھٹکارا دلایا جائے؟ اگر خود عاشق نامراد کو جادۂ عشق کی تمام مشکلات اور پیچیدگیوں سے عبارت تیغ برہنہ لیے ہوئے پاسبان گرفتار کرنے کے لیے تیار گھوم رہے ہیں تو معشوقۂ دل نواز کے ہاں پہنچنے سے رقیب کو کیسے روکا جائے؟ اگر شاعری میں رقیب بالعموم خوش قسمت واقع ہوئے ہیں اور اعتماد کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت جب کہ عاشق نامراد پاسبان کو اپنا مدعا سمجھا رہا ہوگا، رقیب کب کا معشوقہ کے پاس پہنچ گیا ہوگا اور ملاقات سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔

اے اسد خود ہم اسیر رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیاد ناداں ہے گرفتار ہوس

اور چناں چہ جب سبھی حیلہ سازیوں اور چال بازیوں کا اس خوبی سے پردہ فاش ہو چکا اور ہر طرف پھیلے ہوئے جال اور

شش جہت اس دنیا کا استعارہ ہے جو شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب، بلندی اور گہرائی پر محیط ہے۔ آئینہ یہاں وجود کا ہم معنی ہے، جس کے لیے ناقص و کامل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تاہم وجود صرف حسن ابدی و ازلی کا آئینہ ہے جس کا مشاہدہ صرف اس صورت میں ممکن ہوتا اگر فرد اور موضوع مشاہدہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہوتا لیکن مشکل تو یہ ہے کہ پردہ حائل ہے اور یہ پردہ طالب کی خود اپنی نگاہ ہے یا دوسرے الفاظ میں نگاہ کی وہ بے بسی ہے جس کی وجہ سے وہ مطلوب کا اس جگہ، جہاں وہ موجود ہے، مشاہدہ نہیں کرپاتی۔

معلوم ہے کہ روایت صرف عشق الٰہی کو عشق حقیقی تسلیم کرتی ہے لیکن غالب کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ معشوق حقیقی کی تلاش میں وہ ان ارضی اور مادی پیکروں کی طرف رجوع ہوتے ہیں جن میں یہ حقیقت ایزدی جلوہ فگن ہو سکتی ہے۔ کائنات کے ظاہری یا صوفیہ کی اصطلاح میں "مجازی" حسن، حسن نسوانی اور اسی طرح کے دیگر مظاہر کے اس وقت تک تصور اور مشاہدے کا حق، جب تک کہ نگاہ ظاہری پیکر سے قطع نظر کرتے ہوئے مظاہر کی ماہیت کو دیکھنا سیکھ نہ جائے، "صورت" اور "ذات" کے متصوفانہ نظریے پر مبنی ہے۔

حسینان ارضی سے میل جول اتنا آسان نہیں ہے، عاشق و معشوق کے درمیان طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ چہرے پر "اکبر شاہ ثانی کے دور کے غازے" والی ناقابل حصول پری اور روایتی محبوبہ نزاکت شعار و نرم دل میں فرق نسبتاً آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے ہاں ان کی شوخ و ستم پیشہ محبوبہ زیادہ تر سنگ دل قاتل، ظالم اور ستم گر کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کے اطراف ہمیشہ رقیبوں کا جم غفیر ہوتا ہے، شاعر کی اس سے ملاقات پر ہمیشہ قدغن لگی رہتی ہے، اس ستم ظریف کو اپنی محفل سے شاعر کو اٹھا دینے میں کبھی کوئی پس و پیش نہیں ہوتا اور اس کے گھر کے دروازے شاعر کے لیے ہمیشہ بند رکھے جاتے ہیں۔

ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستم گر، ناخدا ترس، آشنا کش ماجرا کیا ہے؟

غالب کے ابتدائی کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے اشعار میں ہمیں غزل کے روایتی مضامین کی نہیں بلکہ غالب کی محبت ارضی کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ اس امر کے باوجود کہ غزل میں پہنچ کر اس عشق ارضی و مجازی کے پیکر خیالی کی اس صنف شاعری کے اصول کے مطابق قلب ماہیت ہو جاتی ہے، اس پیکر خیالی کی امتیازی خصوصیات کی پھر بھی نشان دہی کی جا سکتی ہے: غالب کا محبوب سب سے پہلے ایک شخصیت ہے۔ اس کی عقل توانا ہے، یعنی وہ معاملہ فہم بھی ہے، مردم شناس بھی اور موقع و محل کے مطابق عمل کرتا ہے، یعنی وہ بلاضرورت نہ ہم دردی کا اظہار کرتا ہے اور نہ تغافل برتتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی سرشت میں خود مختاری ہے اور دوسروں کی ترنگوں اور صحیح یا غلط خیالات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننا اسے منظور نہیں۔ اس کو فتح کرنا بہت دشوار ہے۔

جیسا کہ خورشید الاسلام لکھتے ہیں اٹھارہویں صدی کی فارسی اور شاید اس کے اثر سے اردو غزل کے عاشق میں "چند خامیاں ایسی ابھر آتی ہیں جو اسے ایک صحت مند آدمی اور معیاری عاشق بننے سے روکتی ہیں۔ یہ عاشق میر، سودا، مصحفی اور قائم کو چھوڑ کر اس دور کی اردو غزل کے بیشتر حصے پر قابض نظر آتا ہے۔ وہ مبتلا زیادہ ہے اور عاشق کم ہے۔ اپنی محبت کے دوران میں وہ کسی ایک منزل پر ٹھہر جاتا ہے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی کوئی ایک جذباتی کیفیت اس کی ذہنی اور عملی قوتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ آپ اپنا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ بہت کم کھلی روشنی میں دکھائی دیتا ہے، بلکہ عام طور سے کسی اندھیری گلی میں یا اپنے دماغ کے تاریک گوشوں میں ملفوف نظر آتا ہے۔ اس کے لیے گویا کہ اس کے اور خارجی دنیا اور اس کے اختیارات، حقوق، کاروبار اور عمل سے تمام رشتے منقطع ہو چکے ہیں۔ نتیجتاً اس کا عشق محدود

اور غیر فطری ہو کر رہ جاتا ہے۔

اپنے اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے خورشید الاسلام یوں طرزِ دقیقہ سنجی دیتے ہیں تاہم: "عاشق کی سیرت بیشتر مواقع پر محبوب کے مقابلے میں مجموعی طور پر زیادہ روشن اور زیادہ مکمل ہے اور اسے دیکھ کر قوت اور ترقی کا احساس ہوتا ہے۔"

غالب کے ابتدائی کلام میں عاشق بے حسی، تحیر، ہجر و وصال، اپنے آپ پر اور اپنے محبوب پر اعتماد اور بے اعتمادی، افسردگی اور اولوالعزمی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے تسلسل کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عاشق ان مراحل سے گزرا۔ وہ ایسے دشت و بیاباں سے گزرا جہاں ہر قدم پر خطرات کا سامنا تھا، لیکن کبھی کبھی "گل فروش" بھی مل ہی جاتے تھے اور اس سفر کی منزل، منزلِ عشق تھی۔

اور اختتام پر وہ آخری غزل جس پر غالب کے ابتدائی کلام کے بارے میں اپنی گفتگو ہم تمام کرنا چاہیں گے۔ غزل کا تعلق غالب کی اس دور کی وارداتِ قلبی سے واضح ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ وہ مذکورہ بالا ذومنی سے صریحاً منسوب ہے۔ اس میں جذبۂ عشق کی تصویر کشی کی مختلف "اقسام" اس زمرہ بندی کے مطابق مل جائیں گی، جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ روایتی اور محبوب کے صنفِ سخن کے مطابق شستہ و شائستہ روپ کی تصویر کشی بھی اور وہ پرخلوص، جیتی جاگتی تصویر کشی بھی جو ہمارے خیال میں، سچے ارضی جذبۂ عشق کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

اس دل فریب غزل کا ابیات کی تعداد کے اعتبار سے مختصر غزلوں میں شمار ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ غزل کو وحدت عطا کرنے والے تلازمِ خیالات کا سلسلہ بھی اس میں خاصہ واضح ہے۔

غزل کے مطلع کا موضوع اس صورت میں اور واضح ہو جاتا ہے جب اسے مقطع میں اتمام تک پہنچایا جاتا ہے۔ ... بت میں طرفین کے درمیان باہمی جذباتی تعلق کا موضوع ہے، جیسے اس شعری روایت کی رو سے یک طرفہ محبت کا موضوع ... سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم یک طرفہ یا ناکام محبت میں انسان کی قلب ماہیت کر دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بے شک ذرے، قطرے اور مختلف "اربابِ عجز" محض ایک تمثیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ان افراد کی تمثیل ہے جن میں جذبۂ عشق خود اعتمادی ... کی لگن اور اپنی قدرت اور عظمت کے احساس کو جگاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جیسا کہ غالب کے ہاں بیشتر ہوتا ہے، بعد

پروفیسر مسعود حسین

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر ایک نظر

مرتبہ : ڈاکٹر جمیل جالبی

فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" موجودہ معلومات کے مطابق اردو کا واحد قدیم ترین نسخہ قلمی ہے جو فی الحال انجمن ترقی اردو (پاکستان) کا مخزونہ ہے۔ یہ ۱۹۳۱ء میں پہلی بار حیدرآباد (دکن) میں دریافت ہوا۔ اس کا پہلا مختصر سا تعارف نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اکتوبر ۱۹۳۱ء کے رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں "بہمنی عہد کا ایک دکھنی شاعر" کے عنوان سے کرایا تھا۔ انھیں اس قلمی نسخے کو دیکھنے کا موقع لطیف الدین ادریسی، حیدرآبادی کے ذخیرۂ کتب میں ملا تھا، جس سے انھوں نے کچھ "نوٹس قلم بند کرلیے تھے"۔ غالباً یہی نسخہ ہوگا جو بعد میں محمد عمر یافعی حیدرآبادی کی ملکیت رہا اور ان کے توسط سے مولوی عبدالحق کے پاس پہنچا، جسے وہ تقسیم ہند کے بعد اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ مولوی صاحب کی دلی خواہش تھی کہ کوئی ذی علم اس کی ترتیب و تہذیب کرے۔ قاضی احمد میاں کو اس کام پر مامور کیا گیا، مگر کچھ نہ ہوا۔ سن رسیدگی اور غم اردو کی وجہ سے خود ان میں دم خم نہیں رہا تھا۔ البتہ انتقال سے پہلے (۱۶/ اگست ۱۹۶۱ء) وہ اس مخطوطے کو قدامت کی سند دے گئے تھے۔

--- "اگر معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے تو دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب فخر دین (جسے وہ فخر دین لکھتے ہے) نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ ہے۔"[۱]

نئی تحقیقات کی رو سے اب معراج العاشقین سے قطع نظر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیقی منطق کے علی الرغم معراج العاشقین کا ترقیمے کے مطابق ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء سے قبل لکھا جانا مسلم ہے، چند دیگر داخلی شواہد کے پیش نظر بھی اسے بندہ نواز کی تصنیف قرار نہیں دیا جا سکتا۔[۲]

مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد اختر حسین صاحب کے دوران صدارت قلمی نسخے کے فوٹو عکس شائع کر کے ہند و پاک کے محققین کے پاس بھیجے گئے لیکن پھر بھی کوئی مرد کار از غیب بروں نہ آمد۔[۳]

مولوی عبدالحق کی نیک نیتی اور اردو کے ساتھ ان کا عشق بالآخر رنگ لایا اور اردو کے ایک غیر پیشہ ور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے "ہمیں گو نے و ہمیں چوگاں"، کے مصداق میدان تحقیق میں قدم رکھ دیا۔ وہ اس نسخے سے مولوی صاحب کے انتقال کے چھ سال بعد پہلی بار روشناس ہوئے اور چار سال کی محنت شاقہ کی بہ دولت ۱۹۷۱ء میں اس کا مبیضہ تیار کرلیا۔ ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اسے اس اہتمام کے ساتھ شائع کیا کہ ایک طرف مخطوطے کا فوٹو عکس ہے اور دوسری جانب جمیل جالبی کی قراءت شعر۔ اس ترتیب اشاعت کے باعث، ان کے بقول "یہ نادر و نایاب نسخہ اب سب کی ملکیت بن جاتا ہے۔" سب کی ملکیت۔ کے اسی احساس نے مجھے آمادہ کیا کہ میں بھی اس پر طبع آزمائی کروں اور اس کے مرتب کا جو حق ہے اس کو دوں اور مخطوطے کا جو حق ہے اس سے از سر نو بحث کروں۔

بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ سعی تحقیق اردو مخطوطات شناسی کی "ماؤنٹ ایورسٹ" سر کرنے سے کم نہیں اور اگر انھوں نے اس کی تکمیل کے بعد یہ محسوس کیا، تو بجا محسوس کیا :

"اس مخطوطے کو انتہائی دیدہ ریزی و محنت سے پڑھنے کی منزل سر کر کے مجھے وہی خوشی حاصل ہوئی ہے جو ایڈ منڈ ہلاری کو دنیا کی سب سے بڑی چوٹی، ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے ہوئی تھی، اور یہی خوشی میری محنت کا ثمرہ ہے۔"
میں نہایت اعتماد کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ جمیل جالبی کا یہ کارنامہ اردو مخطوطہ شناسی کی تاریخ میں کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ جس مخطوطے نے بہتیروں کی "ہیچ مدانی" کھول دی، پیشہ ور محقق نہ ہوتے ہوئے اپنے علمی ذوق اور "شوق فضول" کی بدولت انھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ البتہ سر ایڈ منڈ ہلاری اور جمیل جالبی کے کارناموں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش نظر رکھنا ہوگا کہ سر ایڈ منڈ ہلاری "کردم و شد" کے مقام سے گزر چکے ہیں جب کہ اردو مخطوطہ شناسی کی "ماؤنٹ ایورسٹ" کے مکمل طور پر سر کرنے میں ابھی کئی مراحل باقی ہیں۔ آج اس مختصر سے مضمون میں انھیں مراحل کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے۔

(۱)

جمیل جالبی نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں ذیل کے عنوانات کے تحت اس مثنوی سے سیر حاصل بحث کی ہے۔
(۱) زمانۂ تصنیف (۲) مثنوی کا نام (۳) نام و حالات مصنف (۴) اشعار کی تعداد (۵) مثنوی اور اس کا خلاصہ (۶) املا و کاتب (۷) اردو زبان کی پہلی تصنیف (۸) لسانی مطالعہ (۹) تلمیحات (۱۰) مرہٹی زبان کے اثرات (۱۱) پنجابی کا اثر (۱۲) گجراتی کا اثر (۱۳) سرائیکی، سندھی کا اثر (۱۴) قواعد کی خصوصیات۔

زمانۂ تصنیف

نظامی کی مثنوی کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں محققین میں خاصا اختلاف رائے رہا ہے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس کا تعلق بہمنی دور سے ہے۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ یہ کس بہمنی بادشاہ کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ حمد اور نعت کے اشعار کے بعد مثنوی کا تیسرا عنوان " مدح سلطان علاء الدین بہمنی نوراللہ مرقدہ" دیا ہوا ہے۔ نظامی نے اسے "بڑا شاہ" کہا ہے جس نے "دکھن دھرن" کو "شاد" کیا ہے۔ اس کے بعد دس اشعار تک اس "بڑا شاہ" کی عظمت، اس کی قوت تسخیر اور داد و دہش کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بڑا شاہ کون ہے۔ کیا اشارہ مرحوم و مغفور بانی سلطنت بہمنیہ علاء الدین حسن بہمنی شاہ (۱۳۴۷ تا ۱۳۵۸) کی جانب ہے، جس کے ایک بیٹے کا نام احمد خاں تھا، جسے تخت کبھی نصیب نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں "شاہ احمد کنوار" (شعر ۶۴) کا اشارہ اس کی جانب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مرتب کا خیال ہے کہ "نوراللہ مرقدہ" کا اشارہ بانی سلطنت ہی کی جانب ہے۔ عام طور پر مثنویات میں مدح شاہ وقت کی ہوتی ہے نہ کہ کئی نسلوں پہلے کے بانی سلطنت کی۔ اگر ایسا ہے تو یہ ایک نئی روایت ہوگی۔ "شہنشہ بڑا" کی مدح کے بعد کے تین اشعار (نمبر ۶۴، ۶۵، ۶۶) نے موضوع سخن کو اور گنجلک بنا دیا ہے۔ ان میں دو احمدوں کا ذکر ہے۔ پہلا "شاہ احمد کنوار" (شعر ۶۴) اور دوسرا شاہ احمد بھجنگ، (شعر ۶۶) جس کی مزید تفصیل اگلے مصرع میں اس طرح دی ہے :

لقب شہ علی، آل بہمن ولی

نصیر الدین ہاشمی نے ان اشعار سے یہ تاریخی نتیجہ اخذ کیا کہ "خاندان بہمنی کے سلسلے سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارھویں حکمراں علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی ایسا حکمراں نہیں ہوا جس کا لقب علاء الدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔"

ہمایوں شاہ (۱۴۵۸ تا ۱۴۶۱ء) ، تقریباً ساڑھے تین سال حکمراں رہا۔ تاریخ میں بارھویں بہمنی بادشاہ کا نام نظام شاہ (۱۴۶۱ تا ۱۴۶۳ء) ملتا ہے لیکن اس عہد کے سکوں پر نام احمد شاہ مسکوک ہوا ہے۔ اسی بنا پر ہاشمی اور عبدالحق نے اس

مثنوی کو اس کے عہد سے منسوب کیا ہے۔ اس سیاق میں ہاشمی کا یہ اشارہ بھی بہت با معنی ہو جاتا ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص نظامی، شاہ وقت نظام سے منسوب کر کے رکھا ہو گا۔ سخاوت مرزا اسے علاء الدین احمد دوم (۱۴۳۵ تا ۱۴۵۸ء) دسویں بادشاہ کے عہد سے منسوب کرتے ہیں جو شہاب الدین احمد شاہ ولی کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت میں "نور اللہ مرقدہ" کا اشارہ اس کی جانب ہو جاتا ہے جو احمد شاہ اول تھا۔ ان تمام قیاسات کے خلاف کلیدی لفظ "ولی" (شعر ۶۶) کا ہے۔ اور تاریخ میں یہ شہرت صرف احمد شاہ اول کو حاصل تھی جس کی نماز استسقا کی بہ دولت قحط سالی میں موسلا دھار بارش ہوئی تھی، جس کے بعد عوام میں ولی کے نام سے اس کی شہرت ہو گئی تھی۔ اس طرح مجھے جمیل جالبی کا یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسی بادشاہ کے عہد (۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵ء) کی تصنیف ہے۔ احمد شاہ اول ہی نے گلبرگے کی سکونت ترک کر کے بیدر (محمد آباد) کو راج دھانی بنایا لیکن یہ واقعہ ۱۴۲۴ء کا ہے نہ کہ ۱۴۳۰ء کا، جیسا کہ مرتب نے مذکور کیا ہے، یعنی تخت نشین ہونے کے دو سال بعد کا۔ اس طرح اس مثنوی کا بیدر میں تصنیف کیا جانا اور نظامی کا بیدری ہونا (پرت نامے کے مصنف فیروز بیدری کی مانند) قرین قیاس ہے۔

ایسی صورت میں "نور اللہ مرقدہ" کا اشارہ بانی سلطنت بہمنیہ کی جانب تسلیم کرنا ہو گا۔ ہر چند اس کا نام علاء الدین حسن بہمنی شاہ تھا اور عنوان میں صرف "سلطان علاء الدین بہمنی" مرقوم ہے جو سلسلہ بہمنیہ کا کوئی بھی بادشاہ ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ "بڑا شاہ" یا "شہنشہ بڑا" کی صفتیں ان میں سے کئی پر لگائی جا سکتی ہیں۔ لیکن "ولی" کے کلیدی لفظ سے کسی دوسرے کے تعین کی گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ ایک گتھی پھر بھی بغیر سلجھے ہوئے رہ جاتی ہے، دونوں شعروں میں جہاں کنور (یا کنوار) احمد کا تذکرہ آیا ہے (شعر ۶۴ اور ۶۵) "شاہ" کا لفظ بھی لکھا گیا ہے۔ کیا شہزادے کے لیے "شاہ" کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے؟

مثنوی کا نام

جمیل جالبی نے نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے مثنوی کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" بتایا ہے۔ حالاں کہ ہاشمی صاحب نے ابتدا تا آخر اپنی تحریروں میں اس کا نام "کدم راؤ اور پدم" لکھا ہے۔ یہی نام پروفیسر عبدالقادر سروری نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو (جلد اول) میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کا نام صرف "پدم راؤ" بھی لکھا ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" نام دراصل مولوی عبدالحق اور سید ہاشمی فرید آبادی کے اندراجات ہیں۔ مثنوی کے دو اہم کرداروں کی مناسبت سے بہر حال یہی نام مروج ہے۔ اس کا ایک نام مثنوی نظامی بیدری بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جالبی نے اپنی مرتب شدہ مثنوی کے پہلے ایڈیشن (۱۹۷۳ء) میں سرورق پر رقم کیا ہے۔

نام و حالات مصنف

اس عنوان کے تحت جمیل جالبی نے مبسوط اور مدلل انداز میں ثابت کیا ہے کہ نظامی کا اصل نام فخر دیں تھا نہ کہ فخر الدین جیسا کہ مولوی عبدالحق اور دیگر حضرات صحت کی خاطر لکھتے رہے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری صرف نظامی، تخلص پر اکتفا کرتے ہیں۔ محی الدین قادری زور نے نظامی بیدری کے نام سے یاد کیا ہے۔ فخر دیں جس نام سے وہ خود کو یاد کرتا ہے، ان حضرات کے گلے سے نیچے نہیں اتر سکا، حالاں کہ اس انداز کے نام پنجاب تا دہلی عام رہے ہیں۔ دور کیوں جائیے خود دکن کا ایک معروف شاعر، "پرت نامہ" کا مصنف فیروز خود کو "قطب دیں" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری   تخلص سو فیروز ہے بیدری

(۹۷۳ھ مطابق ۶۶/۱۵۶۵ء)

املا اور کاتب

مثنوی کا کاتب کم سواد، بد خط اور بد املا ہے۔ ترقیمہ نہ ہونے کی شکل میں اس کے سنہ کتابت کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر جمیل جالبی کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے کہ انجمن ترقی اردو میں اسی کاتب کے قلم سے لکھا ہوا ایک اور نسخہ "سیف الملوک بدیع الجمال" موجود ہے، لیکن ترقیمہ اس کے آخر میں بھی نہیں ہے "تو یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ کدم راؤ پدم راؤ کے اس نسخے کی کتابت کا زمانہ ۱۰۳۵ھ (مطابق ۳۶/ ۱۶۲۵ء) کے قریب قرار پائے گا۔ املا کے نقطۂ نظر سے یہ اعراب کے استعمال کا زمانہ ہے۔ اس سے کچھ ہی قبل شاہی کاتب کا لکھا ہوا عبدل کا ابراہیم نامہ دستیاب ہے، جس کا سنہ تصنیف ۱۶۰۳ء ہے لیکن ابراہیم نامہ کا کاتب الفاظ کے تلفظ اور اہمیت سے بہ خوبی واقف ہے اس لیے اس کے یہاں بد املائی کی مثالیں نہیں ملتیں۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے کاتب کی جہالت کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ن۔ نہ منہ۔ میں نہیہ۔ نہیہ (محبت) دنی۔ دنیا ہمت۔ ہمت

کھری تھے۔ کھڑا تھا موتینہ۔ موتین (جمع موتی)

وہ حرف کے تحت تین نقطوں (...) کا استعمال نہ صرف معکوسی آوازوں کے لیے کرتا ہے مثلاً ور۔ ڈرے۔ بلکہ (گ) کے اظہار کے لیے بھی کرتا ہے مثلاً کیپائیں۔ گسائیں۔ کیرریا۔ گزریا۔ اکھوررانی۔ آگھوررلنے۔

لیکن املا کے ان خود ساختہ التزامات کا وہ ہر جگہ لحاظ نہیں رکھتا، مثلاً بعض اوقات (گ) کو ایک مرکز کے ساتھ لکھا ہے۔ معکوس (ٹ) کو صرف (ت) لکھتا ہے۔ (ج) اور (چ) میں نقطوں کا امتیاز نہیں کرتا۔

اس کی کم سوادی کا سب سے بڑا ثبوت وزن شعر سے ناواقفیت ہے۔ مثنوی کا وزن فعولن فعولن فعولن فعل / فعول ہے لیکن وہ اکثر اشعار کو خارج از وزن لکھ جاتا ہے، اس طرح کہ مرتب کو اپنی تمام تر سخن فہمی کے باوجود اعتراف ہے کہ وہ اس کے تمام کھانچے نہیں بھر سکے ہیں۔

لسانی مطالعہ

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ شعریت کے نقطۂ نظر سے دوسری قدیم مثنوی نوسرہار (۱۵۰۳/ ۴ء) کی مانند گئی گزری تصنیف نہیں ہے۔ اس میں شاعرانہ تخیل کی لالہ کاری ملتی ہے۔ زبان اور محاورات کے استعمال پر بھی شاعر کو پوری قدرت حاصل ہے لیکن اس کی اصل اہمیت ایک لسانی دستاویز کی ہے، جس میں پندرھویں صدی عیسوی کی دکھنی اردو کے خد و خال نظر آتے ہیں۔ دکن میں خسرو کی "زبان دہلی" کو پہنچے ہوئے ابھی مشکل سے سوا سو سال کا عرصہ گزرا تھا۔ شمال سے علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے لشکریوں کے ساتھ جو زبان چودھویں صدی کی ابتدا میں دولت آباد، گلبرگہ اور بعد کو بیدر پہنچی ہے۔ وہ نہ تو ایک بولی پر مبنی تھی اور نہ اس کا یکساں محاورہ تھا۔ خسرو کی "حضرت دہلی" کئی بولیوں کے سنگم پر واقع ہے شمال اور شمال مغرب میں یہ کھڑی بولی اور ہریانوی سے محصور ہے۔ جنوب میں تھوڑے فاصلے پر برج بھاشا کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ان سب کے اثرات دکن پہنچتے ہیں۔ قیادت ترک اور افغانوں کی تھی جو امیر خسرو کی "زبان لاہوری" سے متاثر رہے ہیں۔ اس طرح پنجابی کے اثرات کا نفوذ کر جانا بھی بعید از قیاس نہیں، البتہ مرتب نے جو وکالت سرائیکی اور سندھی کی کی ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ چند لفظوں یا قواعد کی بعض شکلوں کا اشتراک اس بات کی دلیل نہیں بنتا کہ یہ الفاظ قواعدی شکلیں فلاں زبان سے لی گئی ہیں۔ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اسی قسم کے لسانی مغالطے کا شکار ہوئے اب اس کی توسیع سرائیکی اور سندھی تک کر دی گئی ہے۔ یہ تو ہند آریائی زبان کے ارتقا کے مسلمات کو ٹھکرانا ہے۔ دراصل اس قسم کا اشتراک ایک خاندان کی تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ سندھی، سرائیکی اور پنجابی یہ سب زبانیں ہند آریائی خاندان سے

زائیدہ ہیں۔ اسی طرح نواحِ دہلی کی بولیاں۔۔ کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا کا بھی تعلق اسی خاندان سے ہے۔ چناں چہ جب محمود شیرانی یہ کہتے ہیں کہ پنجابی اور دکھنی اردو میں امر کا قاعدہ ایک ہے یعنی علامت مصدر گرادی جانے تو باقی جو رہ جاتا ہے وہ امر کا صیغہ ہوتا ہے جیسے چلنا سے چل، مرنا سے مر وغیرہ۔ اس کا جواب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں میں نے یہ دیا تھا کہ امر بنانے کا یہ قاعدہ بنگال تا ہمارا شٹر یکساں طور پر ملتا ہے تو کیا وہ ایک دوسرے سے ماخوذ قرار دی جا سکتی ہیں؟ اس قسم کے مشترک قواعد تو صرف ان کی مشترک اصل کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور بس۔ میں اپنی اس بحث کے ثبوت میں بعض ایسی خصوصیات کا ذکر کرتا ہوں جنھیں مرتب نے پنجابی یا سرائیکی سے مخصوص کیا ہے لیکن نواح دہلی کی بولیوں میں وہ قدیم زمانے سے رائج رہی ہیں۔ اس سلسلے میں میری بحث کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ اگر کوئی لفظ یا قواعد کی کوئی شکل نواح دہلی کی بولیوں میں موجود ہے تو اس کی تلاش پنجابی یا سرائیکی میں عبث ہے۔ فاضل مرتب نے اس کو ہند آریائی زبانوں کے "مادا عظم مشترک" کے نام سے یاد کیا ہے، اور بجا طور پر کیا ہے۔ لیکن دکنی اردو کے ارتقا کے سلسلے میں جب اس کے سررشتوں کا پتہ چلایا جائے گا تو نظر لوٹ پھر کر امیر خسرو کی "زبان دہلی و پیرامنش" اور "حضرت دہلی" کی جانب اٹھے گی۔[۲۰]

"پنجابی کے اثر" کے تحت چند اسما، افعال و حروف قطع نظر (سوں۔ تم، کدھیں۔ کبھی، کیتا۔ کیا، دیسنا۔ دکھائی دینا، بدل۔ بادل، انکھیاں۔ انکھیاں۔ انکھیاں وغیرہ جو نواح دہلی کی بولیوں میں عام رہی ہیں) اہم مسئلہ "سی" سے مرکب زمانہ مستقبل کا ہے۔

مثلاً نہوسی۔ نہ ہو گا نہوسی کدھیں پانچ انگل سمان
رہسی۔ رہے گا نہ رہسی جو دیسے کچھو نقش نانو
جاسوں۔ جا سکتا ترے پاؤں کہوں چھوڑ جاسوں کہیں

"سی" سے مرکب یہ شکلیں دکھنی میں نظامی تا نصرتی مسلسل ملتی ہیں۔ وجہی کی "سب رس" ان سے بھری پڑی ہیں۔ یہ خالص مستقبل میں ہو گا، رہے گا اور سکتا کا بھی مفہوم دیتی ہیں جیسا کہ جاسوں، نکرسوں وغیرہ ملتا ہے۔ میں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں ان کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔[۲۱]

"مستقبل مطلق" کی بناوٹ میں (س) سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ یہ دکنی اردو کی خصوصیت ہے۔ اس (س) کا تعلق سنسکرت کے زمانہ مستقبل کے (س) سے ہے۔ راجستھان کی بعض مشرقی بولیوں میں مادے کے ساتھ (س) لگا کر اس طرح کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔۔۔۔ اس صیغے کے سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) دکنی اردو میں "سی" "سے" "سوں" اور "سیں" عموماً "نا" یا "نہ" (نفی) کے ساتھ آتی ہیں۔
(۲) ان سے فعل مستقبل کے علاوہ "سکتا" فعل امدادی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

نہ ہوسی کدھیں پانچ انگل سمان (کدم راؤ پدم راؤ)
سبھی حوراں نہ آسیں آج تج سم (کلیات محمد قلی قطب شاہ)
تج سار کہیں جگ میں پریزاد نہ ہوسے (کلیات غواصی)
"اس کتاب کو سینے پر تے ہلاسی نا، اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلاسی نا۔ (سب رس)

گجراتی کے اثرات کے بارے میں جو کچھ فاضل مرتب نے لکھا ہے وہ چاہے اسما سے تعلق رکھتا ہے یا افعال و ضمائر سے، ان سب کی توجیہ نواح دہلی کی دوسری بولی برج بھاشا سے کی جا سکتی ہے۔ جے (جو)، ماہنہ (میں)، ترت (فوراً)، دوسجے (دوسرا)، پچھو (پیچھے) یہ سب الفاظ اسی طرح برج بھاشا میں رائج ہیں۔ یہی صورت ان کے بیان کردہ سرائیکی اور سندھی اثرات کی ہے۔

اچھ۔ ہو (اچھنا۔ ہونا)، منجھار۔ درمیان، تلہار۔ نیچے ہئیں (ہیا۔ دل) وغیرہ کی سرائیکی یا سندھی سے تخصیص نہیں، برج بھاشا اور اس کی بولیوں میں عام ہیں۔

فاضل مرتب نے سابقوں، لاحقوں اور غنّہ کے بارے میں کسی بولی کی تخصیص نہیں کی ہے لیکن یہ بھی نواحِ دہلی کی بولیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاص طور پر غنّے کا دکھنی اردو میں کثرت سے ہر دور میں استعمال رہا ہے۔ یہ مرض آج تک دہلی والوں میں رہا ہے۔ جہاں کی عوامی بولی میں آج بھی ستراں (سترہ)، سولاں (سولہ)، کونچہ (کوچہ)، حتیٰ کہ تخاطب تک میں 'بھانیو' اور 'بہنو' کے بجائے ثقہ حضرات تک 'بھانیوں' اور 'بہنوں' بولتے ہیں۔

لسانی مطالعے کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ علامتِ جمع کا اٹھایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دکھنی اردو میں مسلسل اور عام طور پر جو جمع کی علامت استعمال ہوتی رہی ہے وہ (اں) ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ جمع کی یہ شکل پنجابی میں بھی پائی جاتی ہے اور فارسی میں بھی ذی روح اشیا کے لیے۔ دکھنی اردو کے بعض محققین نے اسی لیے اسے فارسی زبان کی دین بتایا ہے حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ فارسی سے مستعار لی گئی ہے اور نہ پنجابی سے۔ یہ ہریانوی اور دوآبہ کی کھڑی کی قدیم زمانے سے اہم شکل رہی ہے۔ برج بھاشا میں یہ (ن) سے مرکب ہو کر بنتی ہے جو دکھنی میں کم تر استعمال ہوئی ہے، لیکن ہوتی رہی ہے۔ مثلاً کدم راؤ پدم راؤ میں یہ اس قسم کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

پردیسی۔ پردیسین جو پردیسین تھے ذرے وہ ندان (شعر ۱۰۳)

اسی طرح "اکھر" کی جمع اکھرن لکھی گئی ہے اور موتی کی موتین (شعر ۶۰) جمع کا یہ ڈول کدم راؤ پدم راؤ کے مقابلے میں اشرف بیابانی کی "نوسرہار" میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے، جس سے ہمارے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ دکن میں شمال سے ایک سے زائد بولیاں پہنچتی ہیں، ان کی آنکھ مچولی عرصہ دراز تک جاری رہتی ہے تاآں کہ ایک معیاری شکل دبستان گولکنڈہ اور بیجاپور کے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں پیدا ہو جاتی ہے۔

اسماء ضمیر کی مختلف شکلوں کا سلسلہ پنجابی یا سرائیکی سے ملانے کے بجائے فاضل مرتب ان کے بارے میں صرف تشریحی نوٹ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ تمام شکلیں تیں (تو)، ہوں (میں)، تمھن (تم)، ہمن، تمن، جے (جو) وغیرہ کا تعلق نواحِ دہلی کی بولیوں سے ہے۔ یہی صورت حروف کی ہے، لگ (تک) تھیں، تے (سے)، منہ، مانہ، ماں (میں)، سیتی، سیتیں (سے)، تد، جد (تب جب)، کیرا، کیری (کا، کی) کا بھی تعلق دہلی سے ہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض پنجابی کے حروف سے اشتراک رکھتے ہیں۔

افعال و متعلقات فعل بھی نواحِ دہلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصدر کی علامت "نا" کا تعلق کھڑی بولی سے ہے اور (ن) بن، اڑن، گمن (جانا) دھرن (دھرنا) بچارن وغیرہ برج بھاشا سے ماخوذ ہیں۔

(۲)

میرے تنقیدی جائزے کا دوسرا حصہ "کدم راؤ پدم راؤ" کی قراءت متن سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں اس کا اظہار ابتدا ہی میں کر چکا ہوں۔ زبان کی قدامت اور کاتب کے کم سواد، بدخط اور بداملا ہونے کے سبب اس کے متن کی قراءت واقعی ایک کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے اور غالباً یہ ڈاکٹر جالبی کے لیے ممکن نہ ہوتا اگر وہ اس زمانے میں اپنی تاریخ ادب اردو (جلد اول) کے سلسلے میں دکنی کے مخطوطات نہ کھنگالتے ہوتے، جس کا ایک ضمنی پھل ان کی "قدیم اردو کی لغت" ہے۔ اس قدر وسیع پیمانے پر دکنی ادبیات کا مطالعہ عبدالحق اور محی الدین قادری زور کے بعد شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ واحد قلمی نسخے کے متن کی قراءت کے وقت مرتب کو کئی قسم کی دقتیں پیش آئیں۔ مصرعوں میں جہاں کھانچے تھے وہاں [ ] میں رکھ کر الفاظ کو درج کرنا پڑا۔" جہاں مصرع کو وزن میں لانے کے لیے کسی حرف یا لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے وہاں ( ) بریکٹ کا استعمال کیا گیا۔ جہاں مصرع کو مکمل کرنے کے لیے ان دونوں سے کام نہیں چلا ہے وہاں ایمان داری کے ساتھ سوالیہ نشان (؟) قائم کر دیا گیا ہے۔" جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اشعار کو اوزان میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں قافیے واضح طور پر ایک دوسرے سے

تال میل نہیں رکھتے وہاں قیاس سے کام لے کر صحیح قافیے کی تلاش کی ہے۔ بعض اوقات ناکامی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً "سیں" اور "درباش" کا قافیہ (شعر ۵۹)۔ تدوین و تحقیق کی ان تمام "مساعی جمیلہ" کے باوجود ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی کے اکثر اشعار کی "بامعنی" قراءت نہیں کر سکے ہیں، لہٰذا مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا تاکہ قاری، جس کے پیش نظر مخطوطے کا فوٹو عکس بھی ہے، خود دیکھ سکے کہ طبع شدہ متن کہاں تک بامعنی کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں کثرت سے دی جا سکتی ہیں، لیکن یہ اس مختصر سے مضمون میں نہیں سمائی جا سکتیں، لہٰذا صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
باقی آئندہ :

شعر ۶

سرا میں تری جب اگنتی ہوئی   ہتیں ساکھ ہو کر نہ آنیں دوئی

پہلے ایڈیشن (۱۹۷۳ء) میں اس کی قراءت یہ تھی

سوانی تری جب اگنتی ہوئی   ہتیں ساکھ ہو کر نہ آنیں دوئی

حالاں کہ مثنوی کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۷۹ء) پہلے کا فوٹو عکس ہے لیکن مرتب نے دعوا کیا ہے کہ اس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ غالباً اس قسم کی لفظی ترمیمات کی جانب اشارہ کیا ہے لیکن ان کے بعد بھی شعر معنی کے اعتبار سے جہاں کا تہاں رہتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ بھی فرہنگ سے غائب ہیں۔

شعر ۵۶

چکن لگے جب کنک ہتیر   چڑھاوا کیا دھرت آکاس پر

پہلے ایڈیشن میں اس کی قراءت اس طرح کی گئی ہے :

چکن لگے جب کنک ہت پر   چڑھاوا کیا دھرت آکاس پر

خط کشیدہ الفاظ غیر واضح ہونے کی وجہ سے دونوں قراءتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

پہلے ایڈیشن کی قراءت میں "کنک" اور "ہت" علاحدہ علاحدہ کم از کم بامعنی تو ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں مخطوطے کے املا کے پیش نظر "ہتیر" کر دیا گیا جو معنی کے اعتبار سے فہم سے بالاتر ہے۔ فرہنگ بھی یہاں ساتھ نہیں دیتی۔

شعر ۱۱

کہ یہ کون مانس جو بجہ بچپن   سنا نھا نو تجہ آنے سودھے اپن

مخطوطے کے عکس میں اس شعر کو بالاستیعاب دیکھیے تو "بجہ بچپن" کے درمیان ایک (ر) بھی ملتی ہے جو حساب میں ہیں لگائی گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں "نھانو" بغیر جزم کے ہے دوسرے میں غنہ بنانے کے لیے "نو" پر جزم لگا کر لفظ نھانو بے معنی جگہ (نھاؤں) کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ شعر مبہم ہے۔

شعر ۷۷

مصرع   کر جوڑ دھن پات ہنوی سنار

ظاہر ہے مصرع خارج از وزن ہے۔ فوٹو عکس کو دیکھیے تو وہاں صاف "کر جوڑ" لکھا ہوا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ مصرع کا وزن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ محاورہ بگڑ جاتا ہے، اس لیے کہ کر (ہاتھ) جوڑنا بامعنی ہے اور کر جوڑنا بے معنی ہے۔ مرتب نے محاورہ کے پیش نظر وزن کا خون کر دیا ہے۔

فرہنگ میں "دھن پات" کے معنی عورت ذات، مہارانی دیے ہیں اور "سنار" کے معنی حسین عورت۔ لیکن ہنوی کو نظر انداز کر دیا ہے! "سنار" س (اچھی) نار (عورت) کا مرکب ہیں بلکہ سنسکرت کے "سورن کار" سے ماخوذ جس کے معنی بصورت کے ہوتے ہیں۔ (فیلن)

شعر ۵۱

میں "سیس۔ کے ساتھ" در باش۔ قافیہ لکھا گیا ہے اور اس کے معنی دور باش! دیے گئے ہیں۔ قافیہ اور معنی دونوں لحاظ سے شعر مہمل ہے لیکن اس کی ذمہ داری مرتب پر نہیں کاتب پر ہے۔ البتہ مرتب کو سوالیہ نشان لگانا چاہیے تھا۔

شعر ۹۳

کاتب کا "بھول۔" بھول۔ ہی رہنے دیا گیا ہے حالاں کہ اس کا یہاں کوئی محل نہیں۔ یہ لفظ "بول" ہے۔

یہی بول کہہ راؤ مندر گیا

ہانے زایدہ کی روایت کے پیش نظر دکھنی میں "بول۔" بھول۔ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ تلفظ کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مرتب نے بلا مبالغہ فرہنگ الفاظ پر بڑی محنت کی ہے۔ بعض اوقات ضرورت سے زاید معنی فراہم کر دیے ہیں جو قراءت کے نقطہ نظر سے غیر ضروری ہیں، صرف اس لیے کہ لغات میں وہ بھی دیے ہوئے ہیں۔ ان غیر ضروری معنوں سے قاری کو اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

تاہم مثنوی کے اکثر الفاظ جو نہیں کھل سکے ہیں داخل فرہنگ نہیں، حالاں کہ سوالیہ نشان لگا کر انھیں دوسرے محققین کی طبع آزمائی کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا۔ ایسے غیر حل شدہ الفاظ میں سے چند کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

بہمن (۲۷) گیبیر (۳۵) اران (۳۶) کبیر (۶۷) سمین (۸۰) تھیپ (۸۳)

اگھر (۸۸) تھپن (۱۱۷) ترس (۷۳) راندری (۱۳۹)

مثنوی کا وزن اکثر جگہ حرف نفی "نا۔ سے پورا ہوتا ہے لیکن مرتب نے کاتب کی پیروی کرتے ہوئے ہر جگہ "نہ۔ قایم رکھا ہے۔ ~~نہ~~

میرے خیال میں مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ۔ کی ذیل کے خطوط پر از سر نو تدوین و تہذیب کی ضرورت ہے۔

(۱) ہر شعر کے تحت اس کا مطلب ترجمے کے انداز میں سلیس نثر میں لکھا جائے۔

(۲) مشکل الفاظ نہ صرف شامل فرہنگ کیے جائیں بلکہ ان کے تشریحی معنی فٹ نوٹ میں بھی فراہم کیے جائیں تاکہ قاری بہ یک نظر متن کو سمجھ سکے۔

(۳) فرہنگ میں ہر لفظ کے سامنے ان شعروں کے نمبر درج کیے جائیں جہاں جہاں وہ استعمال ہوا ہے۔

(۴) جو الفاظ نہیں کھل سکے ہیں ان پر دوسروں کے غور کرنے کے لیے سوالیہ نشان (؟) لگایا جائے۔ بعض الفاظ پر یہ نشان لگایا گیا ہے لیکن اکثر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

(۵) ایسے اشعار پر سوالیہ نشان لگایا جائے جو گنجلک رہ گئے ہیں۔ مرتب نے یہ عمل کیا ہے لیکن بہت بڑی تعداد میں مکھی پر مکھی مار کر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ان اشعار کی تفہیم کا اندازہ اسی وقت ہو گا جب ان کا ترجمہ ان کے نیچے دیا جائے اور ان کے مشکل الفاظ پر حواشی لکھے جائیں۔

(۶) ترتیب متن میں املا جدید بنایا جائے بہ شرطیکہ اس عہد کے تلفظ پر زد نہ پڑتی ہو۔ مثلاً انچہ (انچ۔ اونچا) دنہ (دنو۔ دونوں) وغیرہ۔

اس عمل سے ان مقامات کا علم بیک نظر ہو جائے گا جہاں سے نسخہ ناقص ہے یا جہاں جہاں مرتب کی تدوین متن سے قاری کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایسے اشعار کا جھول بھی واضح ہو جائے گا کہ شعر بلا وزن ہے یا بلا قافیہ۔

بلا قافیہ شعر ۹۹

ایہیں راکھ یہ بات وہ بات کہہ جو ناگن کیا چھند سو چھند کہہ

شعر ۱۵

بڑی کھلبلی سندریاں رانیاں تل اوپر ہو یاں داسریاں ، چیریاں

بلاوزن شعر کی تو مثالیں بے شمار ہیں اس لیے کہ کاتب، وزن شعر سے ناواقف معلوم ہوتا ہے اس لیے اکثر الفاظ حذف کر جاتا ہے۔ کہیں کہیں مرتب نے ان مقامات پر الفاظ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن بے شمار مقامات پر انھیں بھی ۔۔۔۔ کے نشانات لگانے پڑے ہیں۔

اردو کی تدوین متون کی تاریخ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا بلاشبہ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی تدوین متن کا کام ابھی جاری رہے گا۔

یہاں نمونے کے طور پر مثنوی کے ایک بند بہ عنوان " مدح سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ۔" کے صرف چند اشعار کے طریقہ تفہیم کی جانب اشارہ کروں گا جس سے اس بات کا بہ خوبی علم ہو سکے کہ اردو کے اس قدیم ترین نسخہ خطی کی قراءت کے تقاضے کیا ہیں۔

شعر ۵۲

بڑا شاہ وہ شاہ ہے جیسے جگ (دنیا) قدم بوسی کرتے ہوئے سدا سیوا کرتا رہے گا۔

حواشی : جرم۔ سدا۔ قلیل الاستعمال لفظ ہے۔ نظامی کے بعد صرف فیروز بیدری کے پرت نامے میں ملتا ہے۔

اچھو منجھ اپر چھانو تیرا جرم

کہ آدھار میرا سو تیرا کرم

لیکن تلفظ میں (ر) متحرک ہے۔ اس لفظ کے ماخذ کا علم نہ ہو سکا۔ کراچی کی اردو لغت میں بھی نظامی کی مثنوی کا یہی شعر نقل کیا گیا ہے اور ماخذ پر سوالیہ نشان لگا دیا گیا ہے۔ مرتبین لغت کی رسائی فیروز بیدری کی مثال تک نہ ہو سکی۔ محمد قلی قطب شاہ نے ان معنوں میں " جم " کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شعر ۵۳

اسی بادشاہ نے دکھن کی سرزمین کو شاد کیا اور اسے آسمان و زمین جیسی بھری افواج سے تسخیر کیا۔

حواشی : اس شعر میں واضح لغات کے باوجود دوسرے مصرع کا مفہوم صرف کھینچا تانی سے کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ کرن، مصدر معنی کو اور زیادہ گنجلک بنا دیتا ہے۔ یہاں ماضی کا صیغہ کیا، کیتا وغیرہ ہونا چاہیے۔ پہلے مصرع میں " شاد کیا " میں یہ صیغہ موجود ہے۔ " دل " فوج کے معنوں میں سنسکرت، ہندی اور مراٹھی وغیرہ میں مستعمل رہا ہے۔ " دھرن " سنسکرت کی " دھرنی " سے ماخوذ ہے۔ مراٹھی میں بھی یہ اسی تلفظ کے ساتھ رائج ہے۔

شعر ۵۴

عطارد (جو دبیر فلک ہے) قلم پکڑ کر تابع ہوا اور سورج کے ہاتھ میں علم دے کر اس پر قبضہ کیا گیا۔

حواشی : مراد ہے شہنشاہ کا سکہ آسمان تک چلتا ہے۔ عطارد ہو کہ سورج اس کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ " سور " سنسکرت کے " سوریہ " سے سورج کی بہ نسبت قریب تر ہے۔ یہ لفظ اسی تلفظ کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ نے بھی استعمال کیا ہے۔ عبدل کے ابراہیم نامہ (۱۶۰۳ء) میں " سرج " ملتا ہے۔

شعر ۵۵

سورج آسمان (گھن) پر علم گاڑ کر سربلندی کے ساتھ نکلا اور بادل نے طبل (ڈھول)، قرنا (برغو) اور تونبل بجایا۔

حواشی : مخطوطے کے فوٹو عکس میں صاف " گھن " ہے۔ مرتب نے اپنے متن میں زبر کو مرکز جان کر " گھن " کر دیا، حالاں کہ یہ خالص سنسکرت لفظ (घन) ہے جس کے معنی آسمان کے ہوتے ہیں۔ (پلیٹس)۔ ایک اور لفظ جو شرح طلب ہے

"توں" ہے۔ جو سنسکرت کے (۶-۹) سے ماخوذ ہے۔ تمب یا تومڑی وہ بین ہوتی ہے جو کدو وغیرہ کے خول سے بنائی جاتی ہے اور پھونک کے ذریعہ بجائی جاتی ہے۔ "تمب" سے "تم" "توں" اس کا ارتقا ہے۔ (پلیٹس)

شعر ۶۴

وہ بڑا شہنشاہ ہے اور شاہ احمد اس کا شہزادہ (کنوار۔کمار) ہے۔ وہ سنسار کا پالنے والا ہے۔ آقا ہے اور سہارا ہے۔

حواشی: سنسکرت "کمار" سے ماخوذ پنجابی میں کنور کے ساتھ کنوار بھی تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہ تلفظ اور کئی بولیوں میں بھی رائج ہے۔ نظامی اگلے شعر ۶۵ میں "کنور" بھی لکھتا ہے۔ اس شعر میں شہزادے کو بہ یک وقت "کنوار" اور "شاہ" لکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر مصرع کی قراءت یوں کی جائے کہ "شہنشہ بڑا شاہ، احمد کنوار" تب مصرع کا پہلا حصہ گلے سے نیچے نہیں اترتا۔ نظامی شعر ۶۵ میں "شاہ احمد" کی ترکیب پھر لاتا ہے۔

کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

مخطوطے میں "سنسار" کے بجائے "سنسیا" لکھا ہے۔ مرتب نے بجا طور پر (ر) کا اضافہ کر کے "سنسار" بنا دیا ہے کوئی اور لفظ یہاں نہیں بیٹھتا۔ شعر کے دوسرے مصرع میں ایسی صفات رقم کی گئی ہیں جو عام طور سے خدا سے منسوب کی جاتی ہیں۔ پالنے والا، مالک اور سہارا۔۔۔ لیکن شاہ وقت شاعر کے لیے کسی خدا سے کم نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے یہ صفات "بڑے شہنشہ" کی ہیں نہ کہ اس کے شہزادے کی۔

شعر ۶۵

تاج کا مالک کون ہے؟ وہ بادشاہ جو ناقابل تسخیر ہے اور شاہ کا شہزادہ قوی بازو شاہ احمد ہے۔

حواشی: اس شعر میں "بھجنگ" کا لفظ محل نظر ہے۔ مرتب نے نہ معلوم کہاں سے اس کے معنی فرہنگ میں قوی اور طاقت ور لکھ دیے ہیں۔ کوئی لغت "بھجنگ" کے یہ معنی نہیں دیتی۔ ہر جگہ کالا، کالا سانپ دیا ہوا ہے، جو یقیناً شاہ احمد پر کسی طرح چسپاں نہیں ہوتا۔ سیاق سے تو قوی اور طاقت ور ہی کے معنی نکلتے ہیں۔ سنسکرت میں "بھجنگم" سانپ کو کہتے ہیں۔ "نگ" مادہ کے معنی لہرا کر چلنے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ فتح یاب ہو گا اگر اس لفظ کے معنی قوی اور طاقت ور کے نکال لیے جائیں۔ شبد ساگر میں کسی دوسری لغت کے حوالے سے اس کے ایک معنی "پتی" اور "خاوند" کے بھی دیے ہیں جو آقا کا بدل ہو سکتا ہے۔

شعر ۶۶

شاہ (احمد) کا لقب "آل بہمن ولی" ہے (لیکن) اس کی فراست ولی سے بھی زیادہ ہے۔

حواشی: ایک ولی کے لفظ سے اس بات کا تیقن ہو جاتا ہے کہ نظامی کا اشارہ نویں بہمنی بادشاہ، شہاب الدین احمد شاہ ولی بہمنی (۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵ء) کی جانب ہے ورنہ جیسا کہ سخاوت مرزا اور دوسروں کا خیال ہے۔ یہ دسواں بادشاہ علاء الدین احمد شاہ ثانی (۱۴۳۵ تا ۱۴۵۸ء) بھی ہو سکتا تھا۔ بہمنی خاندان میں چار احمد ہوئے ہیں۔ پہلا علاء الدین حسن بہمنی شاہ، بانی سلطنت کا بیٹا تھا جسے تخت نصیب نہیں ہوا اور جو "کنور" ہی رہا۔ دوسرا احمد شاہ ولی (اول) تھا جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، جو نواں بادشاہ تھا۔ تیسرا علاء الدین احمد شاہ ثانی تھا جو دسواں بادشاہ ہوا ہے۔ چوتھا پندرھواں بادشاہ احمد شاہ ثالث تھا۔ لیکن ان میں سے ولی کا لقب صرف نویں بادشاہ شہاب الدین احمد شاہ کا ہی تھا۔ جس نے اپنی نماز استسقا سے بارش کر وادی تھی اور اس کرامت کی وجہ سے وہ تا حیات اور بعد مرگ بھی "ولی" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

لفظ "تد" کے معنی لغت نگاروں نے عام طور پر یہ "وہ" "اس" "اس" دیے ہیں جو یہاں نہیں بیٹھتے۔ پلیٹس نے ایک معنی اس کلا کی بھی دیے ہیں جو یہاں بہ خوبی کھپ جاتے ہیں یعنی اس کی عقل (بدھی) ولی سے بھی زیادہ تھی۔

شعر ۶۷

اس آل بہمن ولی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے ابن نظامی لکھتا ہے : اے شاہ تو جہاں گیر ہے ، ذی وقار ہے اور شیر کے مانند ہے۔ تیرا دل اور جسم دونوں سمندر کی طرح وسیع ہیں۔

حواشی : اس شعر میں "گزوا۔ "کہبیر۔ اور "منوکت۔ تین لفظ توجہ طلب ہیں۔ مرتب نے مخطوطے کے "گروا۔ کو "گزوا۔ بنا دیا ہے ، حالاں کہ بڑائی اور عظمت کے معنوں میں یہ سنسکرت کے "گرو۔ سے مشتق ہے۔ "گزوا۔ تو پانی کا تنگ منہ کا وہ برتن ہوتا ہے جس میں پھول لگا کر بسنت پنچمی کے تیوہار کے موقع پر گانے اور ناچنے والیاں بخشش مانگتی ہیں۔ (پلیٹس)

کیہر سنسکرت کے "کیسری۔ سے مشتق ہے جس کے معنی شیر کے ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نظامی نے اسے کیہیر باندھا ہے اور "سریر۔ کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ اس قسم کی تقلیب صوت کی مثالیں دکھنی اردو میں عام ہیں۔

"منوکت۔ کے معنی مرتب نے فرہنگ میں باطن اور روح کے دیے ہیں۔ "سریر۔ اور "منوکت۔ کے تلازمے سے یہ معنی ضرور نکلتے ہیں۔ "من۔ کا لفظ بھی باطن کی جانب اشارہ کر رہا ہے لیکن "منوکت۔ کی ترکیب کسی لغت میں نہیں ملتی۔ البتہ یک مرکب "منوگت۔ ہندی لغات میں ضرور ہے جس کے معنی خواہش یا اچھے کے دیے گئے ہیں۔ (شبد ساگر)

شعر ۶۸

(اے بادشاہ) تو من کا بھی سمندر ہے اور جسم کا بھی اور تو ایک ایسا بادشاہ ہے جو باوقار ہے ، عظیم الشان ہے اور انند شیر ہے۔

حواشی : کیہر (کیسری) کے لیے کیہیر کا سلسلہ اس شعر میں بھی جاری ہے۔ مرتب نے یہاں بھی "گروا۔ کو "گزوا۔ رقم ہے۔ "سمندر۔ کا لفظ بار بار شاہ وقت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ "دریا دل۔ جہاں تک من کا تعلق اظہار کے لیے بہت چھی ترکیب ہے لیکن "دریا بدن۔ (جسم) بے معنی ہو جاتا ہے۔ نظامی کے پیش نظر غالباً بادشاہ کی دریا دلی، وسیع القلبی اور جسمانی تبار سے اس کا گراں ڈیل ہونا ہے۔ "سمندر۔ کی اشاریت بہرحال مزید وضاحت چاہتی ہے۔ دل کے لیے با معنی ہے۔ "دریا بدن ر (جسم) کی صفت کے اعتبار سے اجنبی سی لگتی ہے۔

شعر ۶۹

اس شاہ کے جسم کو بڑی طاقت دی گئی ہے اور بے حد بل بھی۔ بادشاہ کی ذات جہاں افروز ہے اور اس کا شہزادہ نور) اس کے زیرنگیں ہے۔

حواشی : "کنور شاہ تھل۔ کا ٹکڑا محل نظر ہے۔ اگر تھل، تل (زیر، تحت) کی ہائیہ شکل ہے تو اس کے وہی معنی نکلتے جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اور اگر تھل سنسکرت کا ستھل (؟) ہے جس کے معنی "جگہ۔ "مقام۔ کے ہوتے ہیں تو معنی زیادہ بے ربط ہو جاتے ہیں۔ مرتب کی قراءت بھی وہی ہے جو اوپر دی گئی ہے۔ فرہنگ میں تھل کے معنی "تل۔ یعنی زیر تحت ہی کے دیے ہیں۔ حالاں کہ شاہ وقت کو جہاں افروز کہنے کے بعد اس کے ولی عہد کو اس کے زیرنگیں بتانا بے تکا سا لوم ہوتا ہے۔

کدم راؤ پدم راؤ کے مخطوطے کی قراءت ابھی مکمل نہیں۔ وہ حصے تو مکمل ہو ہی نہیں سکتے جہاں کاتب نے الفاظ کو ف کر دیا ہے۔ مرتب نے جا بجا پر کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اس کے باوجود بے شمار مقامات پر نقطے ڈال کر چھوڑ دیے ہ۔ بے شمار مصرع اور اشعار ایسے ہیں جن پر فاضل مرتب کو (؟) نشان لگانا پڑا ہے۔ میرے خیال میں اس نشان کی ابھی اور رورت تھی۔ اگر میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ نصف سے زاید اشعار مثنوی کے ایسے ہیں جو تسلی بخش انداز میں قاری کی نت میں نہیں آتے۔ اسی طرح بے شمار الفاظ ہیں جن کے معنوں کے لیے فرہنگ سے مدد نہیں ملتی۔ مذکورہ بالا صرف چند ار کی قراءت سے تدوین کی دقتوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔

ایسی صورت میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقی کوہ کنی کو پوری داد دینے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

کی قراءت کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔ اس کے فوٹو عکس چھاپنے کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ :

جلوۂ عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

حوالے اور تشریحات

۱۔ دیکھیے مثنوی نظامی دکنی، مرتبہ جمیل جالبی کے پہلے ایڈیشن پر لکھا ہوا جمیل الدین عالی، معتمد اعزازی، انجمن ترقی اردو (پاکستان) کا "حرفے چند"۔ ص۔ ب۔ یہ "حرفے چند"۔ مثنوی کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۷۳ء دہلی) سے خارج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن سے عنوان "مثنوی نظامی دکنی" بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۔ معراج العاشقین کا مصنف : حفیظ قتیل (حیدرآباد، ۱۹۸۰ء دوسرا ایڈیشن)

۳۔ بحوالہ "حرفے چند"۔ تشریح نمبر ۱

۴۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۱

۵۔ دکن میں اردو (چھٹا ایڈیشن، لکھنؤ) ص ۴۰

۶۔ دکن کے بہمنی سلاطین، ہارون خاں شیروانی ص ضمیمہ الف

۷۔ دکن میں اردو (چھٹا ایڈیشن، لکھنؤ) ص ۳۸

۸۔ دکنی ادب کی تاریخ (اردو اکیڈمی، کراچی) ص ۱۴

۹۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۰

۱۰۔ یہاں اس بات کی وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ جمیل جالبی نے بھی مصنف کا نام فخر دین (بہ اعلان نون) رقم کیا ہے حالاں کہ مثنوی میں نظامی نے ہر جگہ فخر دیں (غنہ) لکھا ہے۔ پرت نامے کے مصنف نے بھی اپنا نام قطب دیں قادری باندھی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ محض ضرورت شعری کی خاطر تھا یا اس قسم کے ناموں کا تلفظ غنہ کے ساتھ ہوا کرتا جس طرح آج کل "خان" اور "خاں" دونوں رائج ہیں۔

۱۱۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (۱۹۸۷ء ایڈیشن، علی گڑھ) ص ۲۱۰

۱۲۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایضاً) ص ۲۶۲

۱۳۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایضاً) ص ۱۳۰

۱۴۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (دوسرا ایڈیشن) ص ۶۳

۱۵۔ مثلاً کہ جب نہ کرے سیو، تجہ کم نہ ہونے (نا) شعر ۱۴

نہ تتا کدھیں کھاؤں نہ جل مروں (نا) شعر ۱۴

مرے بول کے کان نہ گھنٹ کر (نا) شعر ۹۳۹

(بہ شکریہ "فکر و نظر" علی گڑھ)

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

کلمۃ الحقائق پر چند کلمات

دکنی ادب کے ذخیرے میں کلمۃ الحقائق کو مختلف وجوہ سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں برہان الدین
نے سوال و جواب کے پیرائے میں تصوف کے اہم مسائل اور حیات و کائنات کے اسرار پر روشنی ڈالی ہے۔ دل جو
ہر حیات ہے اور سندان عشق ہے اس کی تشریح و تعبیر نہایت عارفانہ انداز سے فرمائی ہے۔ پھر خود عشق کے مسئلے کو لیا
ہے اور نہایت عالمانہ انداز سے عشق کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ وہ محبت کو آگ اور عشق کو "بھڑکاء" کے لفظ سے تعبیر کرتے
۔ یہی بات یہ ہے کہ تصوف کے پردے میں انھوں نے بندے اور خدا کے تعلق کو کما حقہٗ اجاگر کیا ہے۔ اسلام کی تشریح کی
۔ عشق و محبت، توحید و شرک، مشاہدہ و مراقبہ اور ذات باری پر روشنی ڈالی ہے بلکہ مثالوں سے اپنی باتوں کو مدلل کیا ہے۔
ید سوال کرتا ہے اور پیر جواب دیتے ہیں مگر دراصل مرید بھی حضرت ہیں اور پیر بھی۔ ذرا غور فرمایئے کہ اتنے قدیم دور
ں وہ بھی اردو کی ابتدائی تاریخ میں مکالمہ لکھنا اور سوال و جواب کے انداز میں حقائق کائنات پر روشنی ڈالنا خود مصنف کے
، اور ہمارے ادب کے لیے فخر کی بات ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ اس نے کلمۃ الحقائق گجری زبان میں تصنیف کی ہے۔ گجری کون سی زبان ہے؟ اس کو طے کرنا
ن نہیں۔ اہل نظر کے نقاط نظر اس بارے میں مختلف ہیں۔ بہ ظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو اردو زبان گجرات میں پروان
ی وہ گجری ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے "لغات گجری" کے نام سے اس زبان کا ایک قدیم مخطوطہ بھی شائع کیا
مگر پروفیسر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ جب اکبر نے احمد آباد پر قبضہ کیا اور گجرات کی مسلم آزاد حکومت ختم ہوگئی تو
اور اہل علم گجرات سے ہجرت کر کے دکن کے درباروں تک پہنچے اور اس بنا پر ان اہل ادب کی زبان گجری کہلائی۔ یہ بات کچھ کچھ
ی آتی ہے۔ ویسے گجرات، مرہٹواڑہ اور دکن سب متصل علاقے ہیں۔

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے اس بارے میں بالکل نیا نظریہ قائم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دکن میں لوگ
گاہوں پر بازار قائم کر لیتے یہاں عوام جمع ہوتے ہیں یہ بازار گجری کہلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گزر گاہ سے گجری نکلا ہے۔
طرز کے عوامی بازار اکثر شہروں میں قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً الہ آباد میں ایسا ہی ایک بازار ہے جو گدڑی بازار کہلاتا ہے۔
حال اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا آسان نہیں ہے۔

حضرت برہان الدین جانم نے ارشاد نامہ اور کلمۃ الحقائق دونوں میں اپنی زبان کو گجری قرار دیا ہے۔ چناں چہ اس
میں فرماتے ہیں کہ

" سبب یو زبان گجری نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق خلاصہ بیان و تجلی عیاں روشن انشاء اللہ تعالیٰ خدا نے تعالیٰ قدیم
یم کیوں تھا ذات و صفات و کل مخلوقات ابتداء و انتہا، باقی و فانی، قدیم و جدید، با ہمہ و بے ہمہ بہ ایں سوال و جواب روشن
علایا ہے"۔ (مقدمہ ارشاد نامہ)

مصنف نے سوال و جواب کے انداز میں کتاب اس مقصد سے لکھی ہے کہ مسائل کو واضح کر دے۔ کتاب تصوف کی
حات سے پر ہے۔ احادیث نبوی اور آیات قرآنی بغیر ترجمے کے جگہ جگہ موجود ہیں یا وہ احادیث جو ضعیف یا موضوع ہیں

کثرت سے بیان ہوئی ہیں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تصوف کے بڑے بڑے ائمہ ضعیف احادیث سے کیوں احتجاج کرتے ہیں۔ اگر اس لحاظ سے کلمۃ الحقائق کا جائزہ لیا جائے تو اس میں وہ ساری احادیث آجائیں گی جو اہلِ تصوف میں مقبول اور رائج ہیں۔ یہاں میں چند احادیث نقل کرتا ہوں:

۱۔ کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف۔

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا تو میں نے پسند کیا کہ میں جانا جاؤں اس لیے عالم کو تخلیق کیا۔)

۲۔ انا من نور اللہ و کل شئی من نوری۔

(میں اللہ کے نور سے ہوں اور ہر شئے میرے نور سے ہے)۔

۳۔ الانسان سری و انا سرہ۔ انسان میرا راز ہے اور میں اس کا راز ہوں۔

۴۔ خلق الانسان من صدرہ الرحمان۔ (انسان خدا کی شکل سے بنایا گیا ہے۔)

۵۔ قول علی علیہ السلام۔ القرآن علی اربعۃ لوجہ۔ العبادات للعوام الاشارات للخواص والحقائق للاولیاء و اللطائف للانبیاء و العارفین۔

(حضرت علی کا قول ہے کہ قرآن کی چار شکلیں ہیں: عبادات عوام کے لیے، اشارات خواص کے لیے، حقائق اولیا کے لیے اور لطائف انبیاء اور عارفین کے لیے ہیں۔)

٦۔ قلوب المومنین عرش اللہ تعالیٰ۔ (مومنین کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش ہے)۔

۷۔ تفکر ساعۃ خیر من عبادہ ستین سنۃ۔ (ایک گھنٹہ غور و فکر کرنا ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے)۔

۸۔ من شغلک عن الحق ضمک (قول)۔ (جو تم کو ذکر حق سے الگ کرے وہ تمھارا بت ہے)۔

۹۔ الانبیاء و الاولیاء یصلون فی قلوبھم دائمون۔(حدیث)۔

(انبیاء اور اولیاء ہمیشہ اپنے دل میں عبادت کرتے ہیں)۔ حضرت جنید بغدادی۔

۱۰۔ من لم یکن للوصال فکل احسانھا ذنوب۔ (حضرت جنید بغدادی)۔

(جو وصالِ الٰہی کے کام نہ کرے اس کے سارے نیک کام گناہ ہیں)۔

۱۱۔ من عشقی و انا عشق۔ (حدیث)۔

(جو مجھ سے عشق کرے میں اس سے عشق کرتا ہوں۔ یا میں خود عشق ہوں)۔

۱۲۔ من لم یکن لہ سر فھو مضر۔ (قول) (جو بھید نہ ہو وہ مضر ہے)۔

۱۳۔ اول ماخلق اللہ نوری۔ (حدیث)۔ (سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا)۔

۱۴۔ خواجہ شبلی نے مولانا روم سے پوچھا کہ: قال ماالتوحید؟۔ (توحید کیا ہے)

قال من اجاب عن التوحید من ھو مشرک و لم یعرف ذالک من ھو کافر و سال عند منہو جاہل۔

(کہا کہ جو توحید کے بارے میں جواب دے وہ مشرک ہے، جو توحید کو جانے وہ کافر ہے اور جو اس کے بارے میں پوچھے وہ جاہل ہے)۔

۱۵۔ قال علی: عرفت ربی بربی (ص-بوید) (میں نے اپنے رب کو اپنے رب سے پہچانا۔)

١٦۔ قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم: تفکروا فی صفات اللہ و لا تفکروا فی ذات اللہ۔

(اللہ کی صفات کے بارے میں سوچو۔ اس کی ذات پر غور نہ کرو)۔

۱۷۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔(حدیث)۔ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔
۱۸۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔(حدیث) (اے نبی۔اگر آپ کی پیدائش مقصود نہ ہوتی تو میں آسمانوں کی تخلیق نہ کرتا)۔

مذکورہ احادیث میں چند صحیح ہیں باقی ضعیف ہیں۔ان کے یہاں آیات بھی کثرت سے ہیں مگر کتاب پر فارسی کا غلبہ ہے۔کتاب کا ربع حصہ فارسی میں ہے۔وہ اردو لکھتے لکھتے فارسی لکھنے لگتے ہیں اور فارسی لکھتے لکھتے اردو کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں۔اس بنا پر ضرورت تو اس کی تھی کہ مرتب و مدوّن کتاب پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی جنھوں نے کلمۃ الحقائق شائع کی ہے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے، بہتر ہوتا کہ عربی عبارتوں کے ترجمے بھی لکھ دیتے اور فارسی کی بھی تشریح کر دیتے ورنہ یہ کتاب عام اردو داں کی فہم و استعداد سے بلند ہے۔صوفیانہ اصطلاحات کے علاوہ کتاب میں ہندی فلسفے کے اثرات اور ہندی اصطلاحات بھی موجود ہیں۔

دل کا بیان

مصنف نے انسان کے قلب کی عظمت واضح کی ہے۔اس لیے کہ قلب الہام الٰہی کا مہبط (اترنے کی جگہ) ہے آپ خود حضرت جانم کی زبان حق ترجمان سے قلب کی عظمت سنیے۔فرماتے ہیں:

سوال:۔ نفس الرّحمان کجاست؟

جواب۔ "بر قلوب المومنین، اگر اس نفس رحمان کے بھاؤتے میں پڑتے پس چناں باشد کہ خدا کے بھاؤتے میں پڑتیا کہ نفس الرّحمان بر دل آدمی بجو نائب است۔۔۔۔۔ (ص۔۸۶)

حضرت جانم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نفس انسان کے دل میں ہے اس لیے کہ انسان نائب خدا ہے۔پھر فرماتے ہیں کہ

"دل خدا کا نور ہے۔دل انسان کی ذات میں معرفت کا خزانہ ہے معرفت متحرک کو نفس کہا جاتا ہے اور معرفت مقیم کو دل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ دونوں اس پر شاہد ہیں کہ روح خدا کا حکم ہے۔انسان کے دل میں علم لدنی پیدا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا حکم ولی اللہ کے دل پر نازل ہوتا ہے۔اس لیے کہ وحی کا نزول دل پر ہوتا ہے اور پوشیدہ طریقے سے۔وحی دو طریقے سے نازل ہوتی ہے۔ایک تو یہ وہ لائی جاتی (جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام لے کر آتے تھے)، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ دل پر نازل ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر انبیا کے بعد کسی پر وحی نازل ہوتی تو شعرا پر ہوتی کہ میری امت کے شعرا خدا کے تلامذہ ہیں۔ایک دل تو وہ ہے جو بائیں طرف گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو نظر آتا ہے۔مگر اصل دل یہ نہیں ہے اصل میں یہ دل مردہ ہے۔وہ جو دل معرفت الٰہی سے سرشار ہے وہ نظر نہیں آتا پس دل حقیقی اور دل مجازی میں بڑا بُعد ہے۔(فارسی سے ترجمہ۔کلمۃ الحقائق ص ص ۹۶،۹۷)۔

سوال:۔ قلبی ذکر کیوں؟

جواب:۔ اللہ کا نام زبان پر اور قلب پر جاری رہنا چاہیے مگر چوں کہ قلب کا ذکر دل کا فعل ہے لہٰذا افعال قلب دوسرا شخص نہیں جان سکتا۔

سوال۔ وہاں کا مراقبہ و مشاہدہ چیست؟

جواب۔ دل میں ایک خیال کا آغاز کرے اور دل کے اندر غائب ہوجائے کہ باہر نہ نکلے۔جو تم کو حق سے مشغول کرے وہ تمہارا بت ہے۔مشاہدہ ذکر میں مشغول ہوجانا ہے۔حدیث قدسی ہے کہ انبیاء و اولیاء اپنے دل میں ہمیشہ نماز پڑھتے رہتے ہیں۔

سوال۔ منزل ملکوت کا حال کیا؟
جواب۔ جب عبادت وطاعت کے سبب سے مومنین کی ارواح ملائکہ کی صحبت کے باعث بلند ہوجاتی ہ
خوشی برابر ہوجاتی ہے اور اس وقت دل خوف ورجا (امید) کی حالت میں آجاتا ہے جو ایمان کی اصل شان ہے۔ صاح
غیب سے ندا آتی ہے کہ حق کی طرف سے یہ نماز کا وقت ہے یا نماز کا وقت نہیں ہے۔ صوفی کا ظاہر اعمال باطن
کرتا ہے۔ بہ ظاہر عبادت کا نقصان نظر آتا ہے مگر وہ باطن میں احسان و نیکی ہے۔ پس منزل ملکوت وہ ہے جب
کے لیے مدح و ذم اور سکھ اور دکھ سب برابر ہوجائیں۔ جب یہ منزل آجائے تو وہ مقام روح ہے۔ (کلمتہ الحقائق

روح کی عظمت کا بیان

اس مقام پر پہنچ کر عارف ذکر روحی میں مشغول ہوجاتا ہے اور اس کے سارے اعمال وصال حق کے
جاتے ہیں اس بنا پر خواجہ جنید بغدادی نے فرمایا کہ جو شخص وصال حق کے لیے کوشاں نہ ہو اس کے نیک کام
جاتے ہیں۔ (کلمتہ الحق ص ۹۹۔ ترجمہ)۔

سوال۔ روح کون و روحی ذکر کون و مراقبہ و مشاہدہ کیا؟
جواب۔ روح امر خداوندی ہے خدا کا حکم ہے۔ اصل روح محل مشاہدہ ہے اور ذکر روحی یہ ہے کہ مشاہ
خود یہ تصور کرے کہ اس جگہ مقام حضوریت ہے۔ مراقبہ یہ ہے کہ عارف ہر طرف نظر ڈالے اس کو خدا کے سوا کچھ
خواجہ خرقانی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر یہ کہ اس میں اللہ کو پایا۔ مشاہدہ یہ ہے کہ ذکر روحی
ہوجائے اس کے بعد جبروت کی منزل ہے۔

سوال۔ منزل جبروت کا حال کیا ہے؟
جواب۔ عارف مشغولات حق میں غرق ہوجاتا ہے وہ دیکھنے میں مجنوں معلوم ہوتا ہے مگر اندر سے ہوش
منزل ناسوت اور منزل جبروت میں اصل فرق یہ ہے کہ منزل ناسوت میں انسان ظاہر و باطن دونوں میں مجنوں ر
منزل جبروت میں ظاہر میں مجنوں مگر باطن میں باہوش رہتا ہے۔ ایک گھنٹہ ہوشیار اور دو گھنٹے مست۔ ایسا
معرفت کو پالیتا ہے۔

سوال۔ ذکر اسری کیا ہے؟
جواب۔ عشق کا بیان۔

اب حضرت جانم اس طرح تصوف کے مدارج طے کرتے ہوئے حقیقت عشق کے راز کا انکشاف کر
ایک عجیب بات یہ ہے کہ جہاں ان کو جوش آیا ہے فوراً فارسی زبان شروع کردیتے ہیں۔ یہ ساری بحثیں اور نہایت
فارسی میں ہیں چوں کہ ان کا تعلق روح تصوف سے ہے اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ کلمات الحقائق کی ؛
بنیادی عناصر کو ناظرین کے سامنے پیش کروں۔

ذکر سری پر پہنچ کر وہ محبت اور عشق پر روشنی ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں:

" محبت کہ حدیث قدسی من عشقنی وانا عشقہ و ذکر سری آنست کہ محبت میں سگے محبت یوں لوڑے گر خا
نفی کریا اپس میں خدا کوں چوں کہ بند سمند میں یا سمند بند میں پس چناں باشد کہ انا الحق و من سبحانی و لیس فی جبّۃ
لاہوت است۔

محبت کی شان یہ ہے کہ خود کو فراموش کرکے مجنوں کی طرح خود لیلیٰ بن جائے ہر شخص کا چہرہ اس کو لیلیٰ

ہو۔ ہر شئے میں اس کو لیلی نظر آنے۔ یہ ہے "مراقبہ و مشاہدہ جوق تری۔ محبت یہ ہے کہ اپنی خدا میں مل ایک ہونے جو کافور مل گیا جوت میں یا نمک در آب۔ (ص ۱۰۲-۱۰۱) پھر خود حضرت جانم عشق و محبت کے فرق کو واضح فرماتے ہیں اور سو انھاتے ہیں۔

سوال۔ در محبت و در عشق تفاوت چہ؟

جواب:۔ "محبت آگ ہے اور عشق بھڑکا، محبت میں سلگنا اور عشق میں جلنا۔ عشق مقام قربت کا دروازہ ہے یہی جگہ مقام نور ہے اور نور کے پاس رب العالمین ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ:

أن في جسد ابن آدم المضغة و في المضغة قلب و في القلب روح و في الرّوح سرو فی السر نو ر۔(ص ۱۰۵)۔

"ابن آدم کے جسم میں ایک بوٹی گوشت ہے اس بوٹی میں دل ہے اور دل میں روح ہے اور روح میں بھید ہے اور بھید میں نور ہے"۔

محقق و مدوّن کلمۃ الحقائق پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب نے کتاب کا خلاصہ بڑے جامع انداز سے اپنے مقدمے میں پیش کیا ہے مگر انھوں نے ان موضوعات کو جن کو میں نے تفصیل سے پیش کیا ہے ہاتھ نہیں لگایا اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے اردو والے حصے کی طرف توجہ مبذول فرمائی مگر فارسی عبارتوں کی طرف التفات نہیں کیا لیکن روح تصوف کی حامل اس کتاب میں فارسی عبارتیں ہیں جو نہایت جوش بیان کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اب میں اختصار سے کتاب کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جو صدیقی صاحب کے خلاصے کا خلاصہ ہے۔

حضرت برہان الدین جانم سے ان کے مریدین سوالات کرتے تھے خدا کے قدیم القدیم ہونے اور اس کی ذات و صفات کے بارے میں جواباً وہ فرماتے ہیں کہ خدا اول سے ہے آخر تک رہے گا۔ وہ شکل و صورت سے منزّہ ہے۔ اس نے عالم کو لفظ کن سے پیدا کیا۔ اس نے چاہا کہ خود اپنے نور کا مشاہدہ کرے لہٰذا نور محمدی کو پیدا کیا۔ پھر اسی نور سے ساری کائنات کی تخلیق کی۔ اس نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی چار عناصر کی تخلیق کی۔ یہ سب بہ لحاظ صفات لازم و ملزوم ہیں اور فنا کے بعد ایک ہوجائیں گے۔ اس لیے کہ ان سب کا مادّہ ایک ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ خدا کو اپنے آپ میں پہچانے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے، حضرت عیسی کو بغیر نطفے کے اور انسان کو نطفے سے پیدا کیا۔ جن، ملک اور حور کو اس نے نور سے پیدا کیا یہاں حضرت جانم سے ایک فاحش غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ جن کو اللہ نے نور سے نہیں آگ سے پیدا کیا اور اس بنا پر شیطان جو جنوں میں سے تھا اس نے کہا کہ اے اللہ تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے اور اس نے مٹی کو حقیر تصور کرکے حضرت آدم کو سجدہ نہیں کیا)۔ جو روح ہمارے اندر موجود ہے اور اپنی غفلت کے باعث ہم کو دکھائی نہیں دیتی۔ وجود کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ واجب الوجود۔ (مٹی)۔
۲۔ ممکن الوجود۔ (وقت میثاق کا)۔
۳۔ ممتنع الوجود۔ (جس کا اظہار ممکن نہیں)۔
۴۔ عارف الوجود۔ (جو شئے کو جانتا ہے)۔

ممکن الوجود اپنے ظاہری حواس سے محسوس کرتا ہے۔ جسم اجنّہ و شیاطین بھی رکھتے ہیں۔ اس جسم میں نفس کی موجودگی انسان کو اچھے اور برے کاموں کے لیے جواب دہ بنا دیتی ہے۔ انسان کو نفس پر قابو پانے کے لیے سمجھنا چاہیے کہ اس کی اصل نور ہے۔ یہ نور قدیم ہے اس کا ادراک عقل مقیم یعنی معرفت کر سکتی ہے۔ جب عارف نور کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کو احساس نہیں ہوتا محو ہوجانے کے باعث۔ احساسِ مشاہدہ ہونا ظلمت ہے۔ ابتدا نے سلوک میں خدا کو دیکھنے کی عارف

کو آرزو ہوتی ہے مگر وہ ذات منزہ بے صورت سے۔ لہٰذا عارف کو خدا کا مشاہدہ اپنے اندر کرنا چاہیے جیسے آئینے میں صورر دکھی جاتی ہے۔ خدا اپنی قدرت میں محیط ہے جیسے ہم اپنی ادراک انا میں محیط ہیں۔ پس جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا۔ نفس کی چار قسمیں ہیں۔ نفس امارہ انسان سے برائی کراتا ہے۔ نفس لوامہ انسان کو پاکی کی طرف لے جاتا ہے نفس مطمئنہ صبر کی تلقین کرتا ہے اور نفس ملہمہ شکر گزاری سکھاتا ہے۔ روح انسانی پر تو ذات ہے۔ روح آدم جب جسم میں داخل ہوئی تو اس نے خدا کا پر تو دیکھا اور سجدہ کیا۔ مگر ذات حق منزہ رہی۔ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے مگر چوں کہ بندے کو اختیار دیا گیا ہے لہٰذا وہ اعمال کا ذمہ دار ہے۔ تقدیر کا علم اس کو نہیں دیا گیا مگر انسان برے کام کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے۔ تقدیر پر بھروسا نہیں کرتا مگر نیک کاموں کے بارے میں تقدیر پر بھروسا کرتا ہے۔

ایمان یہ ہے کہ بندہ زبان سے اعلان کرے اور دل سے اس کو مانے۔ خدا نے عرفان، ایمان اور اسلام بندے پر فرض کیا ہے۔ خدا کی قدرت کو اور اپنے نفس کو پہچاننا عرفان ہے۔ ایمان خدا کو قادر مطلق تصور کرنا ہے اور ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے۔ اسلام تعمیل احکام ہے۔ سر عبادت فکر ہے۔ اس فکر سے فنائیت پیدا ہوتی ہے۔ فکر کی دوسری قسم فرائض کو درستگی سے ادا کرنا ہے۔ سالک جو واصل بحق ہوتا ہے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ارتقا کرتا ہے۔ ایک مقام شیطانی ہے۔ دوسرا مقام قرب ہے۔ ان دونوں کے درمیان چار راستے اور چار منزلیں ہیں۔

(۱) ایک راہ شریعت و منزل ناسوت (۲) دوم راہ طریقت و منزل ملکوت (۳) سوم راہ حقیقت و منزل جبروت (۴) چہارم راہ معرفت و منزل لاہوت۔

ان منازل کی تشریح کے بعد مصنف نے ذکر، مراقبہ اور مشاہدہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ذکر جلی و خفی، اسمائے الہٰی کے ذکر کا طریقہ، لطیفہ قلبی اور شیخ کامل کی ضرورت ان تمام موضوعات پر حضرت جانم نے عارفانہ بحثیں کی ہیں اور ان کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

یہ ایک سرسری نظر ہے کلمتہ الحقائق کے موضوعات پر مگر یہ کتاب لسانی نقطہ نظر سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ دکنی ادب میں اس کتاب کی زبان و بیان اور الفاظ و تراکیب اہم ہیں اور دکنی گرامر کی تدوین میں اسے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے دکنی زبان کی قواعد کے مندرجہ ذیل اصول کلمتہ الحقائق سے اخذ کیے ہیں۔

۱۔ ماضی مطلق بنانے کے لیے مصدر سے نا نکال کر یا بڑھا دیا ہے۔ مثلاً دیکھنا۔ دیکھیا۔ کرنا سے کریا۔

۲۔ ماضی مطلق میں ہائے مخلوط کو حضرت جانم حذف کر دیتے ہیں۔

باندھنا۔ باندیا، بوجھنا۔ بوجیا۔

۳۔ اگر مضاف الیہ جمع ہوں تو ضمیر اضافی اور حروف اضافت دونوں کو استعمال کیا گیا ہے جیسے سرکیاں آنکھیاں۔ (سرکی آنکھیں)۔

۴۔ واحد کے آگے الف نون لگا کر جمع بناتے ہیں۔ مثلاً کام سے کاماں۔ ہ کو ی سے بدل دیتے ہیں بندہ کی جمع بندیاں۔

۵۔ تذکیر و تانیث میں آزاد ہیں جس طرح چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ مستقبل کے لیے علامت مصدر گرا کر "وے گا" بڑھاتے ہیں۔ جیسے آوے گا، جاوے گا۔ وغیرہ۔

۷۔ عموماً حرف اضافت کو وہ حذف کر دیتے ہیں: یو عقل۔

۸۔ "کی" کا استعمال "کیوں کہ" کے معنی میں بھی اور کاف بیانیہ کے معنی میں بھی ہوا ہے۔

۹۔ "کر" مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً میں تو کون ہوں کر جانتا یعنی یہ کہ میں کون ہوں۔

۱۰۔ اکثر حرف ربط حذف کر دیتے ہیں۔ ۔ آرسی قدرت سوں بار کیا یا تو اپس دیکھ۔ یہاں دونوں جگہ علامت مفعول کو حذف کر دیا ہے۔

دکنی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کے تلفظ میں قاموس کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ جس طرح وہ تلفظ عوام میں رائج ہے اسی طرح لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ کیفیت دکنی کی تمام کتابوں میں عام ہے۔ کلمتہ الحقائق میں املا میں بول چال کے تلفظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً۔ وہ "ہاتھ"۔ کو "ہات"۔ لکھتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی ادب میں قواعد اور خصوصیت کے ساتھ تلفظ کی تسہیل کا رجحان عام ہے۔ تلفظ کو آسان بنا کر ایسے حروف چھانٹ دیے جاتے ہیں جو ثقل کا باعث ہوں۔

اس کتاب میں ایک رجحان اور ملتا ہے یعنی ہندوستانی پن کا۔ اس میں ہندو فلسفے کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ شمال و جنوب دونوں میں صوفیوں نے ہندی فلسفے کو اسلامی فلسفے سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ ملک محمد جائسی نے کرشن کنھیا پر کتھاوت لکھی۔ اس میں بھی کوشش اسی انداز کی ہے۔ کلمتہ الحقائق میں "آکار"۔ "نرانکار"۔ اور "بھوتا کار"۔ وغیرہ الفاظ اس رجحان کے غماز ہیں۔

شاعرانہ ذوق کا یہ عالم ہے کہ کبھی شعر میں پوچھتے ہیں اور کبھی جواب شعر میں عنایت فرماتے ہیں۔ الغرض کتاب حسن و خوبی کا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ مگر بہت سے الفاظ جو کلمتہ الحقائق میں استعمال ہوئے ہیں وہ متروک ہو چکے ہیں۔

عام اردو دانوں کو قاموس کے بغیر کتاب کی زبان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ دکنی کتابوں کو شرح کے ساتھ شائع کیا جائے۔ پھر کلمتہ الحقائق تو شرح کی یوں بھی مستحق ہے کہ اس کا معتدبہ حصہ فارسی میں ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

رفیعہ آپا

سرسوتی کو علم کی دیوی سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن میں نے علم کو جن چند نسوانی ہیکروں میں مجسم اور مشخص پایا ہے ان میں ایک رفیعہ آپا ہیں۔ رفیعہ آپا جن کو دنیا ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کہتی ہے جو جامعہ عثمانیہ میں صدر و پروفیسر شعبہ اردو ہی نہیں، کلیہ فنون کے ڈین کے باوقار منصب پر بھی فائز رہیں۔ لیکن وہ کچھ رہی ہوں، میں اور میرے جیسے کئی طالب علموں کے لیے وہ صرف رفیعہ آپا رہیں!

خود میں آپا کو کب سے جانتا ہوں یاد نہیں۔ مجھ کو اپنی حقیقی بڑی بہنوں کی محبت اور شفقت حاصل ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں انھیں کب سے جانتا ہوں۔ ظاہر ہے جب سے کچھ جاننے پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے اپنی ماں کی طرح اپنی بہنوں کو بھی پہچانتا ہوں۔ یہی حال آپا کے بارے میں ہے ---- میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میرے تصورات کے افق پر ایک سنگین، پر شکوہ اور مہتم بالشان عمارت دھیرے دھیرے ابھر رہی ہے۔ یہ جامعہ عثمانیہ کا کلیۂ فنون ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت! ---- یہاں سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہو چکے ہیں، سیراب ہو رہے ہیں اور سیراب ہوتے جائیں گے۔ آیئے ہم بھی، علم کے اس مندر پر ایک تقدس کی نظر ڈالتے اور اس کی چوکھٹ پر اپنی روح کو جھکانے اس کے پر جلال باب الداخلہ سے ہوتے ہوئے اندر جائیں۔ لیکن نہیں، دوسری منزل پر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اب حال کی بات ہے کہ شعبۂ اردو دوسری منزل پر آچکا ہے۔ ۱۹۵۷-۵۸ء میں جب ہم نے بی۔ اے میں داخلہ لیا تھا (اس وقت آرٹس کالج میں بی۔ اے کی تعلیم ہوتی تھی) باب الداخلہ سے گزرنے کے بعد سامنے کشادہ اور صاف ستھری سیڑھیوں سے دوسری منزل پر جانے سے قبل بس بائیں جانب مڑ جانیے اور چند قدم بعد دائیں سمت! جی ہاں۔ آپ صحیح تاڑے۔ یہیں ان دنوں شعبہ اردو تھا۔ یہ صدر شعبہ سروری صاحب کا کمرہ اور یہیں تھا سید محمد صاحب کا کمرہ (خدا ان دونوں کو قرب خاص سے سرفراز فرمائے اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے)۔ قتیل صاحب اور شطاری صاحب کے کمرے بھی یہیں تھے۔ (یہ دونوں بھی خلد آشیاں ہو چکے)۔ رفیعہ آپا کا کمرہ بھی یہیں تھا۔ میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے، دونوں آرٹس کالج سے کیا ---- رفیعہ آپا ایم۔ اے میں تاریخ ادب اردو پڑھاتی تھیں۔ ان کی تدریس کا انداز نہایت گھریلو اور بڑی اپنائیت کا حامل تھا۔ یوں تو ایم۔ اے کی کلاس میں ہم چار ہی طالب علم تھے لیکن رفیعہ آپا کے طریق تدریس کے باعث محسوس ہی کہاں ہوتا تھا کہ ہم کلاس میں ہیں۔ لگتا کوئی بہن اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو کہانی سنا رہی ہو۔ دل نشیں اور دل نواز پیرایۂ بیان! ایک مدت گزر چکی آج بھی جب کبھی تاریخ ادب پڑھنا یا پڑھانا ہوتا ہے تو ذہن میں کتاب کے اوراق کا نہیں، رفیعہ آپا کی کلاس کا تصور کر لیتا ہوں۔ شیشۂ ذہن پر رفیعہ آپا کا پیکر ابھر آتا ہے۔ جیسے وہ لکچر دے رہی ہوں، میں بھی لکچر دینے لگتا ہوں ---- رفیعہ آپا نے کلاس روم تدریس (Classroom teaching) کے روایتی انداز سے کام ہی نہیں لیا۔ تدریس کا ان کا اپنا اسلوب ہوتا۔ وہ موضوع میں اپنی شخصیت کو کھو دیتیں اور کلاس روم میں موضوع کی فضا پیدا ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ طالب علم بھی اپنے آپ کو موضوع سے ہم آہنگ پاتے اور رفیعہ آپا کے لکچر سے بقدر ظرف استفادہ کرتے۔

رفیعہ آپا، نہ تو کلاس میں اور نہ کلاس سے باہر اپنی علمیت سے مرعوب کرنا چاہتیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کے وقار کی حامل علمی شخصیت سے ان کے طلبہ ہی نہیں، سمپوزیم، سمیناروں اور ادبی محافل میں سامعین بھی مرعوب اور ہونے بغیر نہیں رہتے۔ انھوں نے علم و ادب کو یوں اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ رفیعہ آپا کی ذات میں علم اور عورت، کا تقدس یک جا ہے!

(۵۶)

آپا کی گفتگو کا انداز بڑا معقول اور مدلّل ہوتا ہے۔ میں نے انھیں ادبی جلسوں میں تقریر کرتے سنا ہے۔ وہ تقریر کرتے ، جوش و جذبات سے کام نہیں لیتیں۔ وہ غیر ضروری طور پر رواں دواں نہیں ہوں گی۔ ان کا رویہ سنبھلا ہوا اور پر تمکنت ۔ ان کی شخصیت ہی کی طرح!۔۔۔ وہ دلیل کے بغیر آگے نہیں بڑھیں گی اور پھر دلیلوں کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ ان کی کتابیں، اس کا روشن ثبوت ہیں۔۔۔۔۔ ایک ادبی جلسے کی بات ہے۔ رفیعہ آپا صدارت فرما رہی تھیں۔ مجھ کو مقالہ پڑھنا میرے مقالے کے اختتام پر رفیعہ آپا نے صدارتی تقریر کا آغاز کیا۔ (میرے لیے یہی اعزاز کیا کم تھا کہ رفیعہ آپا اس ں صدارت فرمائیں جس میں میرا مقالہ ہو) رفیعہ آپا نے ازحد سلجھے ہونے پیرائے میں سلاست اور وضاحت کے پراز معلومات تقریر فرمائی۔ یہی نہیں کہ انھوں نے میرے مقالے کے اچھے پہلوؤں کی ستائش کی بلکہ مقالے کے ، میں جہاں بھی ان کو اختلاف تھا نکھرے ہونے انداز میں میری توجہ دلائی۔ خاصی دل نشینی کے ساتھ ۔۔۔ ہمیشہ کی میں نے ان سے استفادہ کیا۔ یہ بات یوں ہی نہیں لکھ رہا ہوں، اس جلسے میں شرکت سے قبل میری جو ادبی سطح تھی، س کا آج بھی بڑے فخر سے اظہار کرتا ہوں کہ اس جلسے میں رفیعہ آپا کی تقریر سننے کے بعد، میری ادبی سطح کچھ بڑھ ہی گئی'

اور یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ دلی یونیورسٹی میں ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے ۲۷/ تا ۲۹/ اکتوبر دکنی ادب کی تدریس پر تھا۔ پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اس کے ڈائرکٹر۔۔ دکنی ادب، رفیعہ آپا کا ایک خصوصی موضوع رہا ہے۔ (ان بہ برہان الدین جانم کی "کلمتہ الحقائق" اور "دکنی نثر پارے" وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں) بھلا ان کی شرکت اس میں کیوں نہ ہوتی۔ انھوں نے سمینار میں شرکت کی۔ سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت فرمائیں اور "دکنی نثر میں ں کے مسائل" پر ایک پر مغز اور فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ اس سمینار میں رفیعہ آپا کی جو مان دان ہوئی اس سے ظاہر ہوتا تھا ب بھر کے ادبی حلقوں میں ان کو کتنا اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے انھیں اسٹیج پر مدعو کرتے ہونے کہا یعہ آپا تو ہماری دنیا میں ایک LEGEND کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ رفیعہ آپا نے تو اس طرف ایسی توجہ نہیں دی لیکن یہ ، میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میں اس LEGEND کا شاگرد ہوں۔۔ اور پھر یہی نہیں، ملک بھر کی نہ جانے کتنی جامعات فیعہ آپا کی علمی خدمات سے استفادہ کیا۔ بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بر صغیر میں اردو تدریس اور تحقیق کو رفتار اور دینے میں رفیعہ آپا کا اپنا حصہ رہا ہے۔ اور پھر کیوں نہ ہے۔ دکنی ادب کے علاوہ رفیعہ آپا نے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی ، سے کام کیے جن کا ڈھنگ سے محاکمہ اور اعتراف کیے جانے کی ضرورت ہے۔ سنا کہ آپا کبھی شعر بھی کہتی تھیں۔ ہم نے تو کے شعر کبھی نہیں سنے اور نہ کبھی جراءت کی کہ آپا سے اس خصوص میں دریافت کرتے یا اشعار کی فرمائش کی جاتی۔ ہاں آپا سانہ نگاری اور ڈراما نگاری سے سب واقف ہیں۔ "کچے دھاگے" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "بھاگ متی" اور "دو د ؤ محفل" ان کے ڈرامے ۔۔۔ ان کی اہم تحقیق، پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے ان کا مقالہ "اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ و نیز اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ" اور "کلیات احسان" لائق ذکر ہیں۔ تنقیدی مین کے مجموعے "فن اور فن کار" اور "مضامین" کے علاوہ "اقبال سخن" کو بھی اہمیت ملے۔ انھوں نے بھگتی تحریک ۔دو شاعری پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ بچوں کے لیے ان کی کتاب "حیدرآباد" کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ اور نہ جانے مضامین ہیں جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوں گے۔ و نیز کتنے مسودات ہوں گے جو آپا ہی کے ہاں ہوں۔ لیکن لگتا ہے ن سب چیزوں سے بے نیاز کچھ صوفی مزاج ہو گئی ہیں۔

مجھے تو کسی ایسے انٹرویو میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا جس میں رفیعہ آپا سلکشن کمیٹی کی رکن رہی ہوں لیکن
ایک ایسے انٹرویو کمیٹیوں کی روداد سننے کو ملی جن میں رفیعہ آپا سلکشن کمیٹی کی رکن تھیں۔ رفیعہ آپا کے سوالات بڑے
معقول اور مناسب ہوتے ہیں کہ امیدوار کی صلاحیتیں آئینہ ہوجاتی ہیں اور جب رفیعہ آپا پرکھ لیتی ہیں کہ فلاں امیدوار اس
ہے کہ اس کا انتخاب کیا جانے تو پھر کسی مصلحت یا سمجھوتے سے کام نہیں لیتیں۔ وہ ایسے میں نہ کسی کی سنتی ہیں اور
سفارش سے متاثر ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اسی امیدوار کا انتخاب عمل میں آیا جس کے حق میں رفیعہ آپا کا ووٹ تھا۔ بعد
حالات واضح بھی کر دیتے ہیں کہ رفیعہ آپا کا انتخاب صحیح ہوتا ہے۔ اور آج جب مختلف یونیورسٹیوں میں جانے کے مواقع
ہیں تو کسی نہ کسی طرح رفیعہ آپا کی باتیں ہوتی ہیں اور لوگ رفیعہ آپا کی شخصیت کے انہی پہلوؤں کے رطب اللسان ہوتے
----اس سلسلے میں ایک بات عرض کروں، ایک بار وہ ہماری یونیورسٹی میں سلکشن کمیٹی کے لیے تشریف لائیں۔ میں
کارکن تھا نہیں۔ سلکشن کمیٹی میں جانے سے قبل انھوں نے اس خصوص میں گفتگو کی۔ میں نے اپنی کوئی رائے نہیں
لیکن انھوں نے جس امیدوار کا انتخاب کیا وہ ہر زاویے سے موزوں تھا۔

رفیعہ آپا، تروپتی کئی بار آچکی ہیں۔ ایک مرتبہ غالباً کچھ تاخیر ہوگئی۔ وہ طیران گاہ سے سیدھے یونیورسٹی چلی آئیں۔
والے نے گیٹ کے پاس چھوڑا اور کرایہ لے کر چلتا بنا۔ ظاہر ہے وہ خود اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا لے چلیں۔ میں
انھیں دور سے دیکھا، دوڑا دوڑا ان کے پاس پہنچا۔ اور ان سے سوٹ کیس لینا چاہا۔ وہ آمادہ نہیں ہوئیں۔ کہنے لگیں۔
تمھاری یونیورسٹی ہے۔ تم یہاں استاد ہو۔ یہاں تمھاری پوزیشن ہے۔ کوئی تمھیں سوٹ کیس اٹھاتے دیکھے گا تو کیا کہے
میں نے کہا آپا یہ صحیح ہے۔ یہ میری یونیورسٹی ہے میں یہاں استاد ہوں۔ پوزیشن و وزیشن میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت
میری استاد ہیں اور میں آپ کا شاگرد۔ کوئی کچھ کہے، مجھے اس کی پروا نہیں۔ میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ سوٹ کیس
اٹھا کر چلیں۔ بہرکیف میں نے سوٹ کیس لے لیا اور انھیں جہاں جانا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس دوران میرے طلبہ
انھوں نے میرے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھا تو لینا چاہا لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر نہیں دیا کہ میں تمھارا استاد ہی ل
میری استاد کا سوٹ کیس ہے اور میرا حق ہے کہ اس کو اٹھاؤں۔ آج بھی میرے اس دور کے طلبہ جب ملتے ہیں تو رف
اور ان کے سوٹ کیس کا ذکر ضرور آتا ہے اور میری توقیر اس وجہ سے بھی ان کی نظروں میں کچھ اور فزوں ہوجاتی ہے۔

ایک مرتبہ اور رفیعہ آپا تروپتی آئیں۔ نہ جانے کس سلسلے میں۔ دو، تین روز ان کا یہاں رہنا ہوا۔ میں تو چاہتا ت
رفیعہ آپا میرے غریب خانے پر قیام کریں لیکن یہ سوچ کر کہ گیسٹ ہاوز میں انھیں زیادہ سہولت ہوگی ان کا انتظام گ
ہاؤس میں کر دیا گیا لیکن ہر روز ایک دو مرتبہ میں انھیں اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا۔ ان دنوں میری ماں حیات
اور وہیں تروپتی میں رفیعہ آپا ان سے بھی ملیں۔ ان دو، تین دنوں میں یونیورسٹی کی مصروفیات کے بعد رفیعہ آپا تر
پہاڑیوں پر جانا چاہتی تھیں، کچھ بازار کی سیر اور خریداری کا بھی ارادہ تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا اور وہ رفیعہ آپا کے
ہو گئیں۔ پتہ نہیں کہاں خریداری میں، میری بیوی نے تھوڑے بہت پیسے خرچ کر دیے اور رفیعہ آپا دیں تو نہیں۔ بار
گئی ہوگی، لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اس کے بعد جب میں حیدرآباد گیا اور رفیعہ آپا سے نیاز حاصل کرنے "پھول بن" پ
رفیعہ آپا پھر انہی پیسوں کو لے بیٹھیں اور اصرار کرنے لگیں کہ میں وہ لے لوں۔ بھلا میں ان سے یہ پیسے کیسے لیتا۔ مجھے
کی دعائیں درکار تھیں۔ ان دعاؤں سے میں نے اب تک نہ جانے کتنے پیسے بنالیے۔

رفیعہ آپا کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی نہایت فراخ دلی سے ہمت افزائی کرتی ہیں
شاگردوں کے حق میں ہمیشہ کلمہ خیر استعمال کرتیں، اپنی تحریروں میں بھی طالب علموں کا حوالہ دیتیں اور دیگر جامعات
جہاں ان کا جانا ہوتا ہم لوگوں کی صلاحیتوں کو اور ہمارے کام کو سراہتیں۔ یہ حضرات بعد میں ملتے تو اس کا تذکرہ کرتے۔
طرح لوگوں پر ہماری بڑائی ظاہر ہوتی لیکن اس سے دراصل رفیعہ آپا کے کردار کی عظمت مترشح ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں تلگو کے ایک پروفیسر تھے جو بعد میں ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، پروفیسر این۔ ریڈی صاحب، نہایت لائق، نیک اور ہمدرد شخصیت کے مالک۔۔۔ جی۔ این۔ ریڈی صاحب مختلف سلسلوں میں جا عثمانیہ آتے رہتے۔ رفیعہ آپا سے بھی ان کا ملنا ہوتا۔ چوں کہ ان سے میرے خاصے مراسم تھے اس لیے رفیعہ آپا سے گفتگو میں میرا تذکرہ آنا تھا ہی۔ رفیعہ آپا نے ان سے میرے حق میں پتہ نہیں کیا کیا تعریف و توصیف کے کلمات استعمال کردیے۔ جی۔ این۔ ریڈی صاحب نے ایک مرتبہ ملاقات پر ان کو دہرایا۔ اور خود لگے رفیعہ آپا کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کی تحسین کرنے۔ انھوں نے مجھ سے یہ تک کہہ دیا کہ "مجھے خوشی ہے آپ پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے شاگرد ہیں۔۔

رفیعہ آپا کے دولت کدے پر جب بھی حاضری دیتا، اس دوران ان کی نظر سے میرا کوئی مضمون گزرتا تو اس کی خوب خوب داد دیتیں کہ اپنے لکھنے لکھانے پر رشک آتا۔۔۔ رفیعہ آپا کے دولت کدے پر یاد آیا۔ رفیعہ آپا نے اس علاقے میں پلاٹ کا انتخاب کرکے جس طرح اپنے گھر کی تعمیر کی ہے اور پھر جس طریقے سے اس کی تزئین کی ہے اس سے ان کی خوش ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے گھر کا نام "پھولبن" رکھ کر دکنی شعروادب اور تہذیب سے اپنی وابستگی کا اعلان کیا ہے "پھولبن" کا ڈرائننگ روم مکینوں کی خوش ذوقی، فنون لطیفہ سے دلچسپی، نفاست پسندی، وسعت قلبی اور تہذیبی اقدار کے رکھ رکھاؤ کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ "پھولبن" کی مہک اور تازگی کو برقرار رکھنے میں رفیعہ آپا کے شوہر محمود بھائی کا برابر کا حصہ ہے۔

سچ پوچھیے تو رفیعہ آپا کے بارے میں کہنا اس وقت تک مکمل ہو ہی نہیں سکتا تاآں کہ محمود بھائی کا تذکرہ نہ کیا جائے عبدالمحمود صاحب ریاستی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوشی کے بعد سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ، لائبریری کے سربراہ اور دیگر کئی اداروں سے وابستہ۔۔۔ نہایت آن بان، تزک و احتشام اور وزن و وقار کی ملازمت کی لیکن گھر جائیے تو معلوم ہو گا محمود بھائی صرف محمود بھائی ہیں۔ نہایت مہمان نواز، خوش طبع، منکسر المزاج اور شعروادب کے شستہ و شائستہ ذوق کے حامل۔ صرف شعروادب کا ذوق نہیں اردو زبان و ادب کو اپنے انداز سے فروغ دینے کی تگ و دو میں مصروف۔ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کی اسکیموں میں غلطاں۔ کبھی کیسنس کی تیاری تو کبھی کتابوں کی اشاعت میں منہمک۔ گھر جائیے اور محمود بھائی ہوں تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں کا وقت کیسے گزر گیا۔ محمود بھائی کی قابل رشک صحت، ان کا باوقار انداز سے مسکرانا اور شعروادب کے مختلف موضوعات پر گفتگو، بھرپور، پر مغز اور بے لاگ۔۔۔ واپس ہوتے ہوئے، گویا ہم "پھولبن" سے اپنے دامن میں علم و آگہی کے کچھ پھول لیے ہوتے:

رفیعہ آپا اور محمود بھائی حیدرآبادی تہذیب کے مکمل اور نمائندہ مظہر ہیں۔ ملنے ملانے، رہن سہن، آداب و اسالیب مہمان نوازی میں ان کی مثال صرف انھیں سے دی جا سکتی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ رفیعہ آپا کے ہاں دعوت میں بھی شریک ہونے کا موقع ہوا لیکن جب بھی جائیے نمکین، منھائی اور چائے یا شربت سے تواضع۔۔۔ یہ چیزیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں، جتنا کہ ان کا پیش کیا جانا۔ وہ ملازمین بھی کچھ ایسے باذوق اور مہذب رکھتے ہیں کہ تہذیبی اقدار کا بھرم برقرار رہتا۔

رفیعہ آپا کو یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے بھی دیکھا اور ان کے گھر میں بھی۔۔۔۔ لیکن ان کی وہ جو ڈین کی حیثیت ہے وہ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ڈین کے اجلاس پر بھی ایک آدھ مرتبہ رفیعہ آپا سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کسی کام کے سلسلے میں نہیں، بس یوں ہی۔ یہاں رفیعہ آپا اسی اہتمام سے رہتیں جو اس عہدے کے لیے ضروری تھا۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ میں یہ منصب صرف انھیں کے حصے میں آیا تھا۔ یہی نہیں وہ جامعہ عثمانیہ کی پہلی خاتون ہیں جو ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے پر فائز رہیں۔ اس کے علاوہ کئی طرح سے انھیں اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پہلی خاتون ہیں جو کسی شعبے میں پروفیسر اور صدر ہوئیں۔

رفیعہ آپا چاہتیں تو وظیفے پر سبک دوشی کے بعد اور چند سال یونیورسٹی سے وابستہ رہ سکتی تھیں لیکن وہ اس چکر میں

(آگے ص ۶۴ پر)

یوسف ناظم

التماس

O

اے امن کی دیوی! تجھے کچھ یاد تو ہوگا
مدت ہوئی ہم نے تجھے بھیجا تھا یہ پیغام

لکھا تھا کسی روز ادھر سے بھی گزرنا
بھولے سے سہی ہم کو کبھی یاد تو کرنا

رہ جائیں گے ہم لوگ ترستے ہی وگرنہ
اس قریہ ویراں کو ضرورت ہے ہوا کی

پھولوں کی ہری دوب کی اور بادصبا کی
یہ قریہ ویراں ہے بہت دیر سے شاکی

چلتی ہے یہاں گرم ہوا وہ بھی بلا کی
حاجت ہے اسے اب تو کسی دست شفا کی

آزردہ و افسردہ ہے ہر کوئی یہاں پر
نالوں ہی سے فریاد ہے ہر اک کی زباں پر

سر جوڑ کے اے لوگو ذرا یہ بھی تو سوچو
کس سمت لیے جاتے ہو تم اپنے وطن کو

مظہر مہدی

نظمیں

○

یہ دھرتی بھی
دوسری دھرتیوں سے مختلف کب تھی
وہی آبشاروں جیسے آبشار
وہی سرسبز وادیاں
وہی بانہوں جیسی ٹہنیاں
چشموں سے ابلتا ذائقہ دار پانی
کوہسار
وہ لذت کہ ان کو یہ ایک سمت دے
اس کی کمی تھی
پانیوں کو تشنگی کی رسم
نبھانے کا طریقہ معلوم نہ تھا
ہواؤں کو پھول چومنے کا سلیقہ معلوم نہ تھا
پھول ہوا کے رخ پر جنگلوں میں
خیمہ زن تھے
وہ اپنی خوشبوؤں سے ناواقف
نہ اپنی تقدیس سے آگاہ
یہ کوہسار
اپنی بے مائگی پہ حیران تھے کہ
ان پر کوئی کھڑا ہو کر
اذاں دے
اور انھیں بھی معتبر بنا دے
اس زمیں کو بھی حسنِ لازوال دے

○

میں کچھ لفظوں کے بیج
بوئے جا رہا ہوں
شاید ان سے کچھ
نئے ذائقوں کے پھل آئیں
اور جب
یہ درخت بھی سوکھ جائیں
تو انھیں کاٹ دینا
یہ زمین اور بھی
زرخیز ہو جائے گی۔

●●●

حامد مجاز

خالی جگہ

میرے پہلو میں
چپ چاپ
لیٹی ہوئی
سرد
خالی جگہ

سرد
خالی جگہ
پُر ہوئی
جی اٹھی
ایک خوشبو سی
سانسوں میں گھلنے لگی

●●●

بے بسی

سنائی دے
تو
چل پڑوں

●●●

تمہارا اپنا
نہیں کوئی جسم
جس میں پل بھر
سما سکوں میں
نجات پالوں

●●●

سراب دیدہ

کھڑا ہوں
دشت میں
اسی
امید میں
اچھلتے
پانیوں کی
گونج کر

وصال

بادباں کھلے
لہو میں ڈولتا
وصال
تیز رو ہوا
ابد کی
وسعتوں میں
کھو گیا

●●●

کاوش عباسی

○

عجب بگولے اٹھے دلوں میں ، عجیب تدبیری جاگ اٹھیں
نصیب سوئے رہے مگر قیدیوں کی زنجیریں جاگ اٹھیں

مزاج عصر و جہاں کو اپنے نہ میں نے جانا کبھی ، نہ مانا
خطائے مبہم پہ میری آخر تمام تعزیریں جاگ اٹھیں

شب آنکھ اچانک کھلی مری تو ہوائیں باہر سنک رہی تھیں
ترے چمکتے مہکتے غم کی لہو میں تنویریں جاگ اٹھیں

بجھے ، تھکے ماندے راستوں پر ، یہ موج نوراک مچلتے خوں سی
گلی کا موڑ اس کو میں کہوں یا کہوں کہ تقدیریں جاگ اٹھیں

کل اک دریچے کی چھاؤں میں یوں لگا کہ جیسے تمہارا گھر ہو
مری نظر میں مری تمہاری وہ ساری تصویریں جاگ اٹھیں

میں کمتری و ریا کی ہر موج یوں پیے جارہا ہوں کاوش
کہ جیسے مجھ میں بدن دریدہ تمام تحقیریں جاگ اٹھیں

راہی فدائی

○

میرے بچپن ، اب تو سوجا
باتیں بس ، سپنوں میں کھوجا
اپنے سب گھر چھوڑ چکے ہیں
اب تو بھی جاتا ہے تو ، جا !
دیکھیں گے ہم تیرا کرشمہ
پانی میں انگارے بوجا
ساری خدائی تیرے بس میں
پہلے تو خود اپنا ہوجا
دس گننے سے پہلے آنا !
کہتا ہوں میں اب اک دو ، جا
محنت ہی سے پھل ملتا ہے
کل ہے اس کا جس نے کھوجا
راہی ، دنیا اس کی پجارن
وہ کہتا ہے ، تف ! نکو ، جا !

ڈاکٹر راہی قریشی

○

در و دیوار پر اک رنگ صبح و شام کیسا تھا
اسی گھر میں مکینوں کے لیے آرام کیسا تھا
کسی خنجر سے بچنا تھا اندھیرے میں ، اجالے میں
میری تقدیر میں لکھا ہوا یہ کام کیسا تھا
اسی تحریر کو تاریخ کا رتبہ عطا ہوگا
لہو سے لکھ سلوکِ گردشِ ایام کیسا تھا
یہاں ہر سانحے کی ہم سے کیوں وابستگی نکلی
یہاں جو حادثہ تھا وہ ہمارے نام کیسا تھا
سحر سے کچھ سنو ، یا ڈوبتے سورج سے کچھ پوچھو
مرا آغاز کیسا تھا ، مرا انجام کیسا تھا
صلیب و دار تو مظلوم کی تقدیر ہیں ، لیکن
جو قاتل تھے ، سو ان کے واسطے انعام کیسا تھا
یہی دل ایک مدت سے تمنا ؤں کا خرابہ ہے
اسی خاموش بستی میں کبھی کہرام کیسا تھا

یہ دوری اور مجبوری بتادے گی کبھی راہیؔ
کہ اک عمرِ رفاقت کا یہاں انجام کیسا تھا

بے حس الہ آبادی

در سے تمہارے جاتا ہوں، رسوائیوں کے ساتھ
کچھ دور تم بھی آؤ تماشائیوں کے ساتھ

اب دیکھ کر بھی مجھ کو نہ پہچان پاؤ گے
میں تم سے ملنے آؤں گا پرچھائیوں کے ساتھ

حکمت سے خالی کارِ جنوں تم نہ پاؤ گے
دیوانگی کا ناطہ ہے، دانائیوں کے ساتھ

قوس و قزح سے کہیے کہ چومیں وہ دستِ ناز
اٹھے ہیں فرش گل سے وہ انگڑائیوں کے ساتھ

دنیائے خیر و شر میں ہیں ہر اک طرح کے لوگ
کچھ جھوٹ بھی ضروری ہے، سچائیوں کے ساتھ

دیوار و در سے پوچھتے ہیں آخر وہ کون تھا
جو آیا اور چلا گیا پرچھائیوں کے ساتھ

ہم لوگ کچھ نہیں ہیں گرانی کی قید میں
سب لوگ ہیں جڑے ہوئے مہنگائیوں کے ساتھ

بے حس بھلا کسی کا بچے کیسے جان و مال
چڑھ کے محافظ آئیں جو بلوائیوں کے ساتھ

خواہ مخواہ حیدرآبادی

زمین تنگ بہت تھی جہاں سے آیا ہوں
گراں تھا سانس بھی لینا وہاں سے آیا ہوں

کسی جگہ مجھے جاں کی امان مل جائے
اسی لیے وطنِ بے اماں سے آیا ہوں

پناہ لینے کو جھوٹی انا کی پستی میں
بلندیوں کے وسیع آسماں سے آیا ہوں

نصیب میں ہے لکھا میرے در بہ در پھرنا
مکاں ڈھونڈتا میں لامکاں سے آیا ہوں

تلاش ہے مجھے اب دشمنانِ مخلص کی
نکل کے انجمنِ دوستاں سے آیا ہوں

مجھے یہ ڈر ہے کوئی خواہ مخواہ نہ بھٹکا دے
حرم کو ڈھونڈتا کوئے بتاں سے آیا ہوں

پتہ تو چل ہی گیا ہوگا خواہ مخواہ سب کو
دیارِ غیر میں آخر کہاں سے آیا ہوں

رئیس الدین رئیس

○

حق نوا کوئی صداقت کی سزا پانے کو ہے
یا صلیبوں پر چراغاں صرف بہکانے کو ہے

آنکھ کے سادہ ورق کو دے کوئی تصویرِ خواب
رات کا پچھلا پہر بھی اب گزر جانے کو ہے

بوڑھے برگد کی سلگتی شام نے مجھ سے کہا
اب ہر اک طائر مری شاخوں سے اڑ جانے کو ہے

تیرتی ہیں پیشِ منظر میں کئی پرچھائیاں
آنکھ کی پتلی تجھے پھر خواب دکھلانے کو ہے

میں بھی اپنے خوف کے پیکر میں چھپ جانے کو ہوں
میرا سایہ بھی بضد مجھ میں سما جانے کو ہے

عمر بھر اوروں کی خاطر رنگ برسایا رئیس
گو مرا ہر اک ورق بے رنگ کہلانے کو ہے

خالد عبادی

○

دل کب تک چھوٹا کرتے
تنکے ہی یکجا کرتے

کس نے دیکھا ہے تم کو
زخموں کو اچھا کرتے

پھولوں کا موسم آتا
آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے

دل میں جتنی باتیں ہیں
ان سب کو نغمہ کرتے

اپنوں کو اپنا لیتے
غیروں کو اپنا کرتے

مقتل ہو یا مے خانہ
تھوڑا ہنگامہ کرتے

جان تو یوں بھی جاتی ہے
رسمِ وفا زندہ کرتے

تجھ کو پا لینے کے بعد
اک سچا سجدہ کرتے

●●●

جیلانی بانو

آگہی

کھلاڑی تیزی سے گیند کی طرف جھپٹا۔ ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں گیند اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔
کیسے۔۔؟ کیسے۔۔؟ یہ سب کیسے ہوا؟
کیمرہ تھم گیا۔ تیزی سے دوڑنے والا کھلاڑی جیسے ہوا میں اڑتا ہوا گیند کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھوں کو چھوتی ہوئی دور جا پڑی۔ ایک بار۔۔ دو بار۔۔۔ دس بار۔۔۔ ستارہ ایک گیند بنتی۔ کھلاڑی کی مضبوط گرفت سے بھاگ نکلتی۔ بھاگتی۔ تی۔ کسی پناہ کی تلاش میں۔ مگر تماشائیوں کو تو صرف کھلاڑی سے دلچسپی ہے۔ بچ نکلنے والی گیند کی ہیبت پر داد کون دیتا ہے۔
نہیں نہیں۔۔ بچی نہیں۔ کھلاڑی کے پنجے میں ہے۔ اور ستارہ پھر دوہراتی۔۔۔
میں آفس کے ٹائیلٹ میں گئی۔ دروازہ بند کر چکی تو میں نے دیکھا۔ وہ اندر چھپا کھڑا ہے۔ مجھے اپنی طرف۔ میری ساڑی ٹ کے گندے پانی میں۔۔
ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں لاکھوں آنکھیں ٹی۔ وی کے اسکرین پر اس منظر کو دیکھ رہی ہیں۔ لوگ بار بار مشین بند ے پھر اس منظر کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کھلاڑی کے گیند پر جھپٹنے کا منظر۔ ٹائیلٹ کے گندے پانی میں ساڑی کا پلو ڈوب ندر سے چیخوں کی آواز پر لوگ دوڑے ہوئے آنے۔ یہ دیکھو۔۔ کلائی پر ٹوٹی چوڑی کا گھاؤ۔
اس دن ستارہ یوں گھر آئی جیسے راون کو جلا کر آئی ہو۔
تھر تھر کانپتی وہ خالد سے لپٹ گئی۔
"جانتے ہو آج آفس میں کیا ہوا۔۔ آج۔۔
وہ ہانپ رہی تھی۔ بال کھلے۔ چہرہ لال بھبھوکا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری۔
ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے دیکھا کہ اسے دیکھ کر خالد نے جو خط جیب میں رکھا ہے اس پر کینیڈا کی ی۔ جب وہ خالد سے لپٹی تو رضوانہ کا محبت بھرا خط جیسے ان دونوں کے بیچ میں آ گیا تھا۔
"کیا ہوا۔۔؟ خالد نے اتنے اطمینان سے پوچھا جیسے وہ ستارہ سے بہت دور رضوانہ کے ساتھ کینیڈا میں بیٹھا ہو۔
"خالد۔۔۔ خالد۔۔۔ وہ خالد کی بانہوں میں یوں چھپ جانا چاہتی تھی جیسے لوگ لاٹھیاں لیے اس کے سر پر کھڑے

"بتاؤ تو آخر ہوا کیا۔۔؟"
ایکشن ری پلے۔۔۔
"وہ جو آفس میں عادل ہے نا۔۔۔
"عادل۔۔؟ کون عادل۔۔۔؟"
"ہے ایک کتا۔ سور کا بچہ۔۔۔ اس نے آج مجھ پر۔۔۔ مجھے۔۔۔
ستارہ رو رہی تھی۔ ہانپ رہی تھی۔ جیسے میلوں بھاگی ہو۔ آج اس نے زندگی کے ایک نئے تجربے کا سفر کیا تھا۔ مرد

کا سب سے خوفناک روپ دیکھا تھا۔

خالد نے گھبرا کر اپنے کاندھے سے اس کا سر جھٹک دیا۔ ایک دہشت ناک خیال نے اسے لرزا دیا۔

"میں آفس کے ٹائیلٹ میں گئی تو۔۔ تو۔۔

"ارے تو کیا ہوا۔۔۔ بتاتی کیوں نہیں۔۔۔ اخالد چلانے لگا۔ ایک شوہر کے لیے یہ کتنا صبر آز ما لمحہ تھا۔ ستارہ کیا جانے۔ وہ تو ایک لمحے میں دہکتے آگ کے شعلوں میں گھر گیا تھا۔ اور ستارہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اپنے اوپر اعتماد کی جو چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی وہ عادل نے آج چھین لی۔ اب وہ صرف ایک عورت کا بدن تھی۔

"اس نے اندر سے بولٹ لگا دیا اور میرے ساتھ بد تمیزی۔۔۔

تمہارے ساتھ۔ کیا کیا اس نے۔۔۔؟"

خالد کی آنکھیں کھل کر خود دہین جیسی بڑی ہوئی تھیں اور وہ ستارہ کے چہرے پر بکھرنے والے خوف و ہراس کے رنگ دیکھنے لگیں۔

"وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں بھلا اسے ہاتھ لگانے دیتے! میں نے اسے بہت مارا۔ لاتوں سے۔ گھونسوں سے۔ پھر میری آواز پر سب لوگ اکٹھے ہوگئے۔ اللہ نے مجھے بچالیا۔ ہمارے باس بھی آگئے۔ وہ اس منظر کو یاد کر کے پھر کانپنے لگی، اور خالد سے یوں چمٹ گئی جیسے اب سارے خطروں سے دور ہو چکی ہو۔

"اتنی ہمت اس کمینے کی۔ پھانسی پر چڑھا دوں گا اسے۔۔ خالد نے ستارہ کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اور چاروں طرف وہ تلوار ڈھونڈنے لگا جسے اٹھا کر اس کے آباواجداد دشمن پر وار کرتے تھے۔

"دیکھو۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ ستارہ اپنے زخمی کلائی دکھائی جہاں چوڑی ٹوٹنے سے ایک گہرا زخم ہو گیا تھا۔

مگر خالد نے وہ نہیں دیکھا وہ تو زمین پر گھور رہا تھا۔ جہاں ٹائیلٹ کی گندگی میں ساڑی کا آنچل ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے رضوانہ کا وہ خط اٹھا کر جیب میں رکھا، جو ستارہ کے بار بار لپٹنے سے نیچے گر پڑا تھا۔

"ختم کر ڈالوں گا اس الو کے پٹھے کو۔۔۔ خالد کا غصہ اس کے جلتے ہوئے دل پر برف کی ڈلیاں رکھ رہا تھا۔

"تم نے مجھے اسی وقت فون کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ ڈالو۔۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ جان سے ختم کر ڈالوں گا حرام زادے کو۔۔ وہ خوں خوار بھیڑیے کی طرح چلا رہا تھا۔

پھر خالد کے دوست رشتے دار آئے۔ محلے کی عورتیں، اس کی ساس کی سہیلیاں اکٹھی ہوگئیں۔

"جانے دو یار۔ سمجھ داری سے کام لو۔ ایسی باتوں کو کورٹ تک نہیں لے جاتے۔۔

خالد کے دوست یوں دبی آواز میں سمجھا رہے تھے جیسے کسی اور کو نہیں سنانا ہے۔۔ "آنٹی اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور۔۔۔۔

"ہونہہ۔۔۔۔ اس کی ساس نے گلا صاف کرنے کے بہانے اسے آگے کہنے سے روک دیا۔ مگر ستارہ کے اندر تو غم و غصے کا ایک سیلاب امڈ رہا تھا۔ وہ تو ساری دنیا کو پکار پکار کر یہ بات سنانا چاہتی تھی کہ آج اس نے کتنی بہادری سے اپنی عزت بچائی ہے۔ اب مصلحت اور سمجھوتے کے کوئی بند اسے نہیں روک سکتے۔ "میں تو اس کتے کو موت کی سزا دلواؤں گی بھلا کوئی حد ہے۔ یہ دو کوڑی کے مرد کیا سمجھتے ہیں کہ جب چاہیں کسی عورت کی عزت پر حملہ کر دو اب اسے معلوم ہو گا کہ مذاق نہیں ہے میری اس طرح توہین کرنا۔۔

"ارے میں نے بہت سر پیٹا تھا کہ گوری چٹی بیوی کو نوکری مت کرواؤ۔ مگر دو ہزار تنخواہ کے لالچ میں آگیا میرا بیٹا۔

"بیٹی۔۔۔ ابا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، اس نے میری عزت پر حملہ کیا تو اس کی سزا نہیں ملنا چاہیے اسے۔۔۔"
"اسے کوئی سزا نہیں ملے گی بیٹی۔۔ اس کے ابا نے سر جھکا کر جیسے خود کوئی سزا قبول کر لی۔"
"اس سماج میں مرد کے لیے یہ ایک مذاق ہے۔ ہزاروں جھوٹے ثبوت مل جائیں گے اسے اپنی بے گناہی کے۔۔"
"نہیں نہیں۔۔۔ ستارہ کو یوں لگا جیسے ٹائیلٹ میں بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو۔ اب دیواروں سے سر ٹکرانا ہے۔"
ڈاکٹر آیا۔ اس نے سکون کی دوا دی۔ اس کی ماں نے گرم دودھ پلا کر لٹا دیا۔
"وہ بہت گھبرا گئی ہے۔ کہیں دماغ پر اثر نہ ہو جائے۔۔"
"میں کیوں گھبراؤں!"
جہاں کہیں شجاعت اور خودداری کا ذکر ہوتا، وہ اپنے آپ کو وہاں کھڑا دیکھتی۔
شادی ہوئی تو چھوٹا سا، زندگی کی تمام آسائشوں سے خالی گھر اسے ذرا اچھا نہ لگا۔ پھر جب خالد رضوانہ سے اپنے عشق کی کہانی سناتا تو خالد کی اداسی دیکھ کر وہ رو پڑتی۔ بیچارہ، ایک عورت کی بیوفائی سے ٹوٹا ہوا مرد، اس کی شرن میں تھا۔ بات بات غصہ۔۔ شک شبہ۔۔ اپنی بد قسمتی پر رونا۔ کسی بات میں دلچسپی نہ لینا۔ ستارہ کو پھر سے انگلی پکڑ کے خالد کو چلنا سکھانا پڑا۔ خا اس کے لیے کانٹوں میں گھرا گلاب تھا۔ پاس کرو تو چبھ جائے توڑ ڈالو تو من مہکے۔
پھر اس نے بچی کو گود میں لے کر ٹہل ٹہل کر بی۔ اے کی اسٹڈی کی۔ رزلٹ آیا تو دفتروں کے چکر لگانے لگی۔ سا تو بچی رہی کہ خاندان میں کسی عورت نے نوکری نہیں کی تھی۔ مگر خالد چپ رہا۔ گھر میں دو ہزار روپے کی آمدنی بڑھ گئی۔ جہیز کم لانے کا دکھ کچھ تو کم ہوا۔۔۔ نوکری ملتے ہی وہ پھل سے بوجھل شاخ کی طرح جھکتی گئی، منہ اندھیرے گھر کا کام نبٹا ساس کی خوشامد، خالد کی چیخ پکار کو ہنس کر ٹال دیتا۔ شام کو گھر آتی تو پھلوں اور سبزیوں سے باسکٹ بھری ہوتی۔
وہ آفس کا سب کام بے حد ذمہ داری سے کرتی تھی۔ اس کا باس ایک سخت مزاج آدمی تھا۔ مگر ستارہ کے کام۔ وہ خوش تھا۔
اب وہ بھول چکی تھی کہ کینیڈا میں بیٹھی رضوانہ خالد کے خواب دیکھتی ہے۔ وہ تو خالد کے سارے رنگوں کو اپنے آ میں گھول چکی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے من میں شہد کے قطرے سے ٹپکتے تھے اور وہ ایک انوکھی مٹھاس ڈوب گئی تھی۔ ہر وقت گاتی گنگناتی۔ خوش رنگ ساڑیاں، سلیقے سے کیا ہوا میک اپ اور خود اعتمادی سے چمکتا ہو چہرہ۔ س اسے مڑ مڑ کر دیکھا کرتے تھے۔
وہ ساری کائنات کی مالک بن بیٹھی تھی۔
پھر اس نے بے بی کو کلیجے سے لگالیا۔
"ممی آج آپ کو کس نے مارا ہے۔؟" اس کے پاس لیٹ کر بے بی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
"ایک غنڈے نے میری۔۔ میرے۔۔۔"
"اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ کیا بہت خون تھا" بے بی اس کی کلائی کا زخم بھرنے لگی۔
جلا بھنا خالد کمرے میں آیا۔
"بچی کو ابھی سے کیوں ستا رہی ہو۔۔۔؟"
"اب ابھی کو ستانا ہے اسے تو ضرور بتانا ہے کہ ہر ہر قدم پر کتنے عادل اس کا راستہ روکیں گے۔" مگر یہ بات اس نے سے نہیں کہی۔
سارا دن آفس اور پولس اسٹیشن کے چکروں میں گزر گیا۔
خالد بستر پر آیا تو ستارہ اس سے چمٹ گئی جیسے وہ سارے خطروں اور دکھوں سے بچانا چاہتی ہو۔ خالد نے اس کی با نہا

کو ہنا کر کہا:
"آفس میں جب عورتیں کہتی تھیں کہ وہ کمینہ آدمی ہے تو تمہیں کیوں نہیں یقین آیا۔۔ ؟" خالد نے اس کی ہتھیلی سے ہاتھ نہیں ہٹائیں۔ ستارہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو اب کہاں رکھے۔۔!
"بڑی شرافت سے ملتا تھا نا وہ۔ کئی بار میرا اوور ٹائم دیا۔ میرے پروموشن کی فائل تیار کر دی۔۔"
"اچھا۔۔ ؟" خالد نے چلا کر کہا۔ "تو یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا۔۔؟"
"سلسلہ۔۔ ؟ کون سا سلسلہ۔۔ ؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"ایکشن ری پلے۔۔۔"
بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ ٹائیلٹ کے گندے پانی میں ساری کا پلو۔۔۔ایک شیطان اس پر پھر جھپٹ پڑا۔ یہ سلسلہ دوبارہ کب شروع ہوا؟ آج صبح اس نے خالد کی جیب میں رضوانہ کا خط دیکھ کر پوچھا تھا تو خالد نے ہنس کر خط چھپاتے ہوئے کہا۔
"کینیڈا سے دو تین خط آچکے ہیں۔ اب ہماری یاد نے بے قرار کر دیا ہے محترمہ کو۔۔"
وہ چپ ہو گئی۔ اور کیا پوچھتی۔ خالد نے اس سے کہہ دیا تھا کہ۔ "میں جیسا ہوں تمہیں معلوم ہے۔ میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔"
"میں بھی کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔۔"
"تمہاری توجہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا ہو گا۔ پتہ نہیں وہ پولیس کو کیا بیان دے گا۔۔۔ ؟" خالد تکیے پر سر پٹکنے لگا۔
ستارہ کو یوں لگا جیسے گھپ اندھیاری میں پاگل کتوں نے اسے گھیر لیا ہے۔ پھر وہ ایک اونچے بانس پر جا کھڑی ہوئی۔ ساری خلقت اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی، انوکھے کرتب دکھانے والی عورت کو۔
اب خالد کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔
جیسے کمرے میں دوسرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ پیار دینے کی جزا اور نہ دینے کی سزا میں بالکل بھگوان جیسا تھا اس کا پتی دیو۔ خوش ہو تو بھرا بادل۔ روٹھ جائے تو پیاسی ندی سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ اس کا بدن ہی تو ایک فرض تھا خالد کے لیے۔ وہ اپنے بدن کے سوا اور کچھ نہ تھی۔
"تم ستارہ ہو۔۔۔ ؟" کہنے والا عادل تھا۔ دو کوڑی کا آدمی۔۔۔ مگر وہ ایک مرد ہے۔ ایک مرد جو خودداری کے پہاڑ پر کھڑی عورت پر ایک نظر ڈال کر ٹائیلٹ کے گندے پانی میں ڈبو سکتا ہے۔ ایک مرد جو خالد کی طرح منہ پھیر کر سو جائے تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔ سارے گھر پر کیسا سناٹا چھایا ہے۔ آج سب کی گردنیں جھک گئی ہیں۔
"تمہارا شوہر بڑا اچھا آدمی ہے۔۔۔" آفس میں اس کی ساتھی کلرک نرگس نے کہا۔
"اگر میرے ساتھ ایسی بات ہوتی نا تو میرا میاں تو طلاق ہی دے دیتا۔ بڑی اونچی ناک والا ہے وہ۔۔"
ستارہ سر جھکائے سفید کاغذ پر سیاہ لکیریں کھینچتی رہی۔
"ایسی باتیں ہو جائیں تو پتی کے کان میں کیوں ڈالو۔" ٹائپسٹ میری نے ہنس کر کہا۔
"میرا خیال ہے تمہیں عادل بیچارے کو ایک چانس دینا چاہیے تھا۔"
"سنا ہے عادل کی بیوی لوگوں سے کہتی پھر رہی ہے کہ یہ سلسلہ جانے کب سے چل رہا تھا۔ اس دن کسی نے رنگے ہاتھوں دونوں کو دیکھ لیا تو بیچارے عادل پھنس گئے۔۔"
"اب کیس عدالت میں جانے والا ہے۔ کیوں نہ ہم کیس واپس لے لیں۔۔"
رات کو کھانے کی میز پر سب آئے تو خالد کے ابا نے آہستہ سے کہا:
میں اسے پھانسی کے تختے پر چڑھواؤں گی۔ اسے معاف نہیں کروں گی۔ اس نے مجھ سے میری ہر چیز چھین لی ہے۔ میرے

(آگے ص ۶۱ پر)

جس موڑ پر تختی لگی رہتی ہے کہ راستہ بند ہے وہی موڑ ایک پی ایچ۔ ڈی کے امیدوار کی زندگی میں اہم ہوتا ہے۔ ایک اچھے
موضوع کی تلاش میں میں کتنے سال سرگرداں رہا۔ اس کی خاطر کئی گھروں کے چکر کاٹنے۔ ویسے بھی میں چکر کاٹتا ہی رہتا
ہوں لیکن ان کی غرض و غایت غیر ادبی ہوتی ہے۔ مقصد ہوتا ہے غیبت۔ لیکن اب شہر میں اچھے غیبت کرنے والوں کا فقدان
ہوتا جارہا ہے۔ شہر میں قاتل تو بہت ہیں لیکن وہ ایک قاتل جس کا شہرہ دور دور تک تھا تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہیں آتا۔ وہ
ہمدم دیرینہ۔ واقعی بہت یاد آتا ہے۔ کچھ لوگوں کے فن میں انسانی ہمدردی کا تھوڑا بہت جذبہ باقی ہے۔ ٹیلی فون پر مخاطب
ہو کر کسی کی غیبت ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں اس غیبت کا وقار نہیں ہوتا جو بالمشافہ غیبت میں ہوتا ہے۔ سامنے تپائی پر
چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی ہوں۔ دو چار ادیب شاعر بیٹھے ہوں (ان میں محقق کوئی نہ ہو کیوں کہ محقق غیبت کے معاملے میں
ابلہ ہوتے ہیں وہ ہر بات کی سند چاہتے ہیں جب کہ غیبت خود دلیل غیبت ہوتی ہے)۔ محفل رنگ پر ہو، بازار فوج داری چائے کی
طرح گرم ہو۔ پیالیوں میں سے بھاپ نکل رہی ہو اور شرکائے محفل (شرفائے محفل نہیں) کے دلوں کا غبار نکل رہا ہو۔
غیبت کے لیے اچھا ماحول بھی چاہیے۔ ٹیلیفون پر جو غیبت کی جاتی ہے وہ اڑی اڑی رنگت والی غیبت ہوتی ہے۔ میں ایک اچھے
موضوع کی بات کررہا تھا۔ میں نے عرض کیا نا کہ نیت اچھی ہو تو آدمی کو غیبی امداد بھی مل جاتی ہے۔ حال ہی میں کسی
رسالے کی ورق گردانی کررہا تھا تو فہرست مضامین میں ایک عنوان پر میری نظریں جم کر رہ گئیں بلکہ یوں کہیے کہ دم بخود
ہو گئیں۔ عنوان تھا "اردو کے معمر و مسن ادیب"۔ مضمون دیکھا تو معلوم ہوا یہ ان ادیبوں کی فہرست ہے جو عمر کے ستتر
(77) زینے طے کرچکے ہیں۔ یہ علمی اور تحقیقی کام مجھے پسند آیا۔ پھر میں نے سوچا یعنی دل میں سوچا کہ اتنے زبردست علمی و
تحقیقی کام کے لیے مجھ جیسا بے بضاعت شخص قطعی غیر موزوں ہوگا۔ پھر دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ اب تو یہ کام ہوچکا یعنی
آتھرس لسٹ (Authors list) تیار ہوچکی۔ مانا کہ ادب میں ایک ہی موضوع پر کئی کئی لوگ اپنے اپنے ڈھنگ سے کام
کرتے ہیں اور یہ بڑا مستحسن طریقہ ہے اور کئی زاویہ نگاہ اور کئی نقاط نظر سامنے آتے ہیں لیکن ادیبوں کی درازی عمر کے موضوع
میں صرف تصحیح کی گنجائش ہے کسی مثبت اور منفعت بخش نقطہ نظر یا زاویہ نگاہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے تاریخ پیدائش
کی تصحیح کا کام مجھے جچا نہیں اور نہ یہ بات میرے دل کو لگی کہ میں 77 سالہ ادیبوں کی صرف تاریخ پیدائش لکھ کر پی ایچ۔ ڈی
ہو جاؤں۔ یہ خیال بھی آیا کہ ایسی فہرست مرتب کرنے اور اس کے شائع ہونے کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اس سے فائدہ
اٹھا کر قدرت چند ادیبوں کو خارج از بحر و بر کردیتی ہے اور محقق کو ان کے بارے میں مراسلے لکھنے پڑتے ہیں۔ اس لیے میں
نے اسی سمت میں اپنے ذہن کو کئی دن تک مصروف سفر رکھا (یہاں میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ صرف ذہن کی بنا پر
محقق بن ہوجانا ضروری نہیں ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا)۔ کئی دن بعد آخر کار ایک موضوع میرے ہاتھ لگا۔ "اردو کے
ادیبوں کی بیویاں"۔ اس مقالے میں بیویوں کے صرف نام ہوں گے۔ کوئی دوسری تفصیل نہیں دی جائے گی۔ خاص طور پر ان
کا زر مہر تو ہرگز ہرگز نہیں لکھا جائے گا۔ ایک تو یہ سوال کرنا ہی معیوب ہے۔ دوسرے اس کے ذکر میں صراحت کا عنصر کم
اور قباحت کا زیادہ ہے۔ لوگوں کی ساری دلچسپی زر مہر ہی پر مرکوز ہوجائے گی اور طرح طرح کی موشگافیاں بطور غیبت استعمال
ہوں گی۔ یہ مہر خلاف شرع ہے۔ اوہ اتنا مہر۔ یہ صاحب اسے ادا کیسے کریں گے۔ شاید معاف کروالیا ہو۔ افوہ یہ مہر ہے یا شادی
کرنے کا جرمانہ۔ یہ تو میں نے معمولی مثالیں دیں ورنہ زر مہر کے بارے میں تو لوگ پتہ نہیں کیا کیا باتیں کرتے اور باتیں
کرتے وقت خود اپنے اور اپنے برادران نسبتی (دونوں طرح کے برادران) کے زر مہر کو سراسر فراموش کردیتے۔ (بہادر شاہ
ظفر نے کیا خوب کہا تھا کہ آدمی خود کے بارے میں سوچے تو نگاہ میں کوئی شخص بھی برا نہ رہے۔ یہاں مجھے اپنے پی ایچ۔ ڈی
دوست کی یاد آگئی جو بہادر شاہ ظفر کو ہمیشہ ظفر شاہ بہادر کہتے رہے اور اسی غلط فہمی میں ان کا انتقال ہوگیا)۔ زر مہر کے
اندراجات سے خواتین پر مختلف قسم کے احساس بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً احساس برتری یا احساس کمتری۔ یوں بھی پی ایچ۔ ڈی
کے مقالوں میں حتی الامکان سہولت اور آرام کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور معلومات کی حد تک کنجوسی سے کام لینا چاہیے۔

(آگے ص ۹۴ پر)

تحقیق میں ہمیشہ اہم کام دوسروں کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔ یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ صرف بیویوں کے نام معلو
بڑا تحقیقی کارنامہ ہوگا۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ خود ادیبوں کی
پیدائش کا ٹھکانہ نہیں ہے تو مستورات کی (جو پہلے واقعی مستورات ہوتی تھیں اور چوڑیاں پہنتے وقت بھی پردے
سے صرف اپنی کلائی باہر نکالتی تھیں) تاریخ پیدائش کیسے معلوم کی جاسکے گی۔ میرا خیال ہے۔ بیویوں کے نام حا
تو ایک طرح سے پبلک ریلیشننگ بھی ہوجائے گی (لیکن اسے شاید پرائیویٹ لیڈرز ریلیشننگ کہنا مناسب ہوگا لیکن
منفعت بخش ثابت ہوسکتی ہے)۔

میں نے ادیبوں کی بیویوں کے مسئلے پر ہمدردانہ نقطہ نظر سے غور کیا۔ (یہ ہمدردانہ نقطہ نظر صرف سر
نہیں ہے) تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کے ساتھ ناانصافی کا سلسلہ پرانا ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذو
تو ہونا چاہیے کہ ان کے محبوب اور پسندیدہ ادیب کی پشت پر ہاتھ رکھنے والی شخصیت کا نام کیا تھا۔ یہ سب کہنے کی
نام میں کیا رکھا ہے۔ نام میں بہت کچھ رکھا ہوتا ہے بشرطیکہ نام نسوانی ہو۔ ویسے میں شخصی طور پر مردانہ ناموں
ہوں۔ اس حد تک میں مانتا ہوں کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ میں نے یہ ضرور سنا ہے کہ بعض ادیب ایسے بھی ہو
پیٹھ پر خاتون محترم کا ہاتھ ہی نہیں ہاتھوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں لیکن میں اپنے مقالے میں یہ سب کچھ
والا ہوں۔ یہ بات تو غیبت کے شق میں آتی ہے اور اس محفل کے لیے موزوں ہے جو خاص اس مقصد کے لیے منا
اور اس میں وہ لوگ حصہ لے رہے ہوں جو آپس میں بظاہر دوست ہوں۔ میرا کام میں سمجھتا ہوں اس لیے بھی آ
بہت سے نام مجھے پہلے ہی سے معلوم ہیں کوئی 60، 70 نام اور جمع ہوجائیں تو اچھی خاصی طویل فہرست تیار ہو
مطبوعہ شکل میں کسی بھی ڈیمائی سائز کے رسالے کے 4، 6 صفحوں پر تو پھیل ہی جائے گی۔ پی ایچ۔ ڈی کے
کافی ہے۔ اپنے مقالے کو مزید پرکشش بنانے کے لیے میں ان بیویوں کے وہ نام بھی درج رجسٹر کروں گا جو ا
ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد سسرال کی طرف سے انھیں عطا کیے گئے تھے۔ میرا خیال ہے اس مع
والوں کی مصلحت یہ تھی کہ اب دولھن اپنے میکے کو بھول جائے۔

چوں کہ یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھا جائے گا اس لیے قاعدے کے مطابق مجھے ا
بھی ضرورت پیش آئے گی۔ یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار جانتے ہیں (جبھی تو چپ ہیں) کہ پی ایچ۔ ڈی کے مقالوں
کار کا دخل کتنا ہوتا ہے۔ (کچھ مقالے اسی لیے واقعی مقالے ہوتے ہیں کہ نگران کار کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی)۔
کے لیے میں سمجھتا ہوں ایک خاتون گائیڈ بہتر ثابت ہوگی تاکہ صنف نازک سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی د
آئے۔ بیویوں کا نام معلوم کرنے کے لیے ان کے شوہروں کا بیان بھی قلم بند کیا جاسکتا ہے لیکن مجھے بتایا گیا۔
کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس میں وہی ذرائع استعمال کیے جائیں جو معتبر ہوں۔ (مجھے چند وجوہ کی بنا پر بیویاں ز
اعتماد معلوم ہوتی ہیں)۔ مجھے اپنے ایک دوست کا یہ مشورہ بھی پسند آیا کہ اس مقالے کی تیاری میں الٹے پاؤں چا
اسی دہے کے ادیبوں سے بات شروع کی جائے اور آہستہ آہستہ سال بہ سال متقدمین کی خانہ تلاشی لی جائے۔ چن
جانے کے بعد بیویوں کے نام تو نہیں معلوم ہوں گے البتہ محقق کو (جو میں خود ہوں) آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو
کام جتنا بھی ہوجائے بہت ہوگا۔ اپنی نوعیت، اپنی ماہیت اور اپنے ڈھنگ کا چھوتا ہوگا۔ اس کا ایک فائدہ ی
بیٹیوں کا نام رکھتے وقت یہ مقالہ بہت کام آئے گا۔ مقالہ نگار کی علمی قابلیت کا الگ رعب پڑے گا۔

میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ آخر میں یعنی اشاریے کے باب میں ادیبوں کی بیویوں کے سارے نام حر
لحاظ سے بھی دہرا دیے جائیں۔ اس طرح حروف تہجی کی ترتیب کا بھی آموختہ ہوجائے گا جس کی مقالہ نگار کو بھی ض
د آگے

جی ایم احمد خواہ مخواہ

ضعیفی

انسان کی زندگی بچپن، جوانی اور بڑھاپے پر مشتمل ہوتی ہے۔ بچپن لاشعوری طور پر گزر جاتا ہے، جوانی جو دیوانی ہوتی ہے کم و بیش دیوانگی ہی میں گزر جاتی ہے۔ لیکن بڑھاپا اتنا ظالم ہوتا ہے کہ بالآخر انسان کو مار کر ہی دم لیتا ہے۔ اس آخری اور تکلیف دہ دور کو ہم ضعیفی جیسے لفظ کا کیپسول چڑھا کر ڈھلتی عمر، کمزور دل اور ٹھنڈے جذبات کو آسودگی بخشنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ انسان کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو اس کے دل میں دو آرزوئیں ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ جوان رہے اور دوسری یہ کہ وہ لمبی عمر پائے۔ وہ دی گئی زندگی کو ٹھیک طرح سے گزارنے کی بجائے لمبی عمر کی خواہش میں ہر روز مرتا رہتا ہے۔ خواہشات کی مناسبت سے انسان کو اپنی عمر ہمیشہ کم لگتی ہے۔

مرد کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ پچیس سال تک ماں باپ اس سے پوچھتے رہتے ہیں۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس کے بعد تمام عمر بیوی پوچھتی رہتی ہے کہ "تم کہاں سے آرہے ہو؟" اگر اس کے بعد بھی وہ زندہ رہ گیا تو قرض خواہ پکارتے ہیں "کہاں ہو تم ذرا آواز دو ہم یاد کرتے ہیں۔" اس معاملے میں خواتین عمر کے آخری لمحے تک خود کو جوان اور خوب صورت ظاہر کرنے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ کسی مشہور خاتون نے، جو اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی تھیں، اپنی گزری ہوئی عمر کے بارے میں کہا تھا۔ "پیدائش کے بعد سے اٹھارہ سال کی عمر تک سمجھ بوجھ رکھنے والے والدین نے انھیں بنا سنوار کر خوب صورت رکھا۔ اٹھارہ سے پینتیس سال کی عمر تک وہ خود اپنے آپ کو بہر صورت قبول صورت رکھنے کی کوشش میں مصروف رہیں۔ پینتیس سے پچپن سال کے بعد مرتے دم تک انھیں کم سے کم بوڑھی دکھائی دینے کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کی ضرورت رہتی ہے۔ اس طویل تجزیے میں وہ جس اہم نکتے کو فراموش کر گئیں وہ ایک بہترین شریک زندگی کی رفاقت ہے جس کے بغیر یہ سارا تجزیہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ بہر حال، خواتین کو بچپن سے بڑھاپے تک صرف یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ خود کو دوسری ہم عصر اور ہم عمر عورتوں سے خوب صورت بنا کر پیش کریں۔ نتیجتاً وہ بڑھتی عمر کو کم دکھانے کی کوشش میں ہر سال عمر کے جتنے مہینے، دن اور گھنٹے کم کرتی ہیں اتنی ہی تعداد ان کے حجم اور وزن میں جمع ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مردوں سے ان کی آمدنی اور عورتوں سے ان کی عمر نہیں پوچھنا چاہیے۔ جہاں تک مردوں کی آمدنی کا سوال ہے، مرد اگر بیوی کو اپنی آمدنی، اصل آمدنی سے کم بتاتا ہے تو وہ اس کو دوسرے کماؤ پوت مردوں سے کم تر سمجھتی ہے، اگر صحیح بتاتا ہے تو جھوٹا سمجھتی ہے اور اگر زیادہ بتاتا ہے تو بے دریغ خرچ کرنے پر اتر آتی ہے۔ عورتوں سے ان کی عمر نہ پوچھنے کے مقولے پر ہم اتنی سختی سے پابند ہیں کہ آج تک اپنی بیگم سے منہ کھول کر یہ تک نہ پوچھا۔ "بیگما! آپ ہم سے کتنے سال بڑی ہیں؟" بلکہ بڑھتی ہوئی عمر میں بھی انھیں از سر نو مائل بہ شباب دیکھ کر ان کی پذیرائی ہی کرتے رہے ہیں۔

عورتیں اپنی حسب مرضی اور موقع و محل کی مناسبت سے اپنی عمر کو کم کرنے میں کس قدر ماہر ہوتی ہیں اس بات کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے اپنی بیگم کی دو سہیلیوں کے درمیان ہوئی گفتگو اتفاقاً سن لی تھی۔ رشیدہ، رضیہ سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے طے کیا ہے کہ جب تک تیس برس کی نہ ہو جاؤں شادی نہیں کروں گی۔" رضیہ نے جواب دیا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے تو یہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک میری شادی نہ ہو جائے پچیس سال کی ہی رہوں گی۔ اسی طرح ایک سیاح دوران

سیاحت افریقہ کے جنگل میں پیش آنے ایک واقعے کا تذکرہ کررہا تھا۔" دوستو! بڑا نازک لمحہ تھا۔ مجھے اور میری بیوی کو آدم خور وحشیوں نے گھیر لیا تھا۔ جب ان کے سردار نے مجھے دیکھا تو بولا کہ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کے آدمی کو نہیں کھانے گا اور شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار میری بیوی نے اپنی صحیح عمر بتائی اور اس طرح ہم دونوں آدم خوروں کی خوراک بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شادی ایک خاص عمر کو پہنچنے پر ہی کرلینی چاہیے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد شادی کرنے والے، ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتوں سے فیض یاب نہیں ہو پاتے۔ اس کلیے سے انگریز مستثنیٰ ہیں۔ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا (لندن) کی ایک اخباری اطلاع کے مطابق جب ایک سو ایک سال کی عمر کے نوجوان دولھا مسٹر آرنالا سے پوچھا گیا کہ "آپ کو اس کم عمری میں اکیاسی سالہ دوشیزہ مس جوانیس پریس کو اپنی شریک حیات کی حیثیت سے قبول کرتے کیسا لگا۔؟" انھوں نے جواب دیا۔" میں اپنے آپ کو چاق وچوبند محسوس کرتا ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً وہ اس وقت کافی نروس ہوتا۔ لیکن، چوں کہ یہ میری تیسری شادی ہے اس لیے اب مجھے کچھ عادت سی ہوگئی ہے۔۔" یہی سوال دولہن سے پوچھا گیا تو اس اکیاسی سال کی دوشیزہ نے شرمانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔" ہمیں اپنے دو سال کے رومانس اور کورٹ شپ کو بہرحال کسی نہ کسی خوش گوار انجام کو پہنچانا ہی تھا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے فطری تقاضوں کو جلد از جلد پورا کرنا چاہتے ہیں۔۔" مزید برآں، دولہا دولہن ایک دوسرے کے چال وچلن سے اس لیے بھی مطمئن تھے کہ دونوں کو چرچ میں وھیل چیر یعنی پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لائے گئے تھے۔

اب آیئے مردوں کی اور بالخصوص شوہروں کی چار روزہ عمر دراز کا تجزیہ کریں۔ کہتے ہیں کہ قدرت نے ہر شادی شدہ شوہر کی طبعی عمر صرف چالیس سال ہی طے کی تھی لیکن جب لوگ شادی ہی چالیس سال کی عمر میں کرنے لگے تو قدرت نے اپنے قانون میں بھی بعد از نظر ثانی ترمیم کرتے ہوئے مزید دس سال کا اضافہ کر دیا۔ لیکن حرص کے بندے نے درخواست کی کہ دس سال کے اس مختصر عرصے میں وہ زندگی کی نعمتوں سے نہ خود کما حقہٗ فیض یاب ہو سکے گا اور نہ اپنی شریک حیات کی خاطر خواہ خدمت کرسکے گا لہٰذا بہتر ہوگا کہ مقررہ پچاس سالہ میعاد زندگی میں اضافہ کیا جائے۔ انسان کی اس درخواست پر قدرت بھی شش وپنج میں پڑ گئی۔ اس لیے کہ وہاں بھی پرمٹ اور کوٹہ سسٹم، درازی عمر کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لے دے کے یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ دوسرے جاندار اپنی حیات مقررہ میں سے کچھ سال انسان کے کھاتے میں جمع کرائیں۔ اس تجویز پر سارے انسانوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے بھی آگے بڑھ کر اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی رضاکارانہ طور پر اپنے ساتھی انسان کو مستعار دینا پسند نہیں کیا۔ سب ایک دوسرے کی صورت ہی دیکھتے رہ گئے۔ جب یہ تجویز اشرف المخلوقات کے نزدیک ناقابل قبول ٹھہری تو ارزل المخلوقات یعنی جانوروں نے اس پر لبیک کہا۔

سب سے پہلے ایک گدھے نے اپنی عمر کے دس سال انسان کو یہ کہہ کر دان دیے کہ۔" میں چاہے سو سال تک زندہ رہوں لیکن رہوں گا گدھے کا گدھا۔ ساری عمر دھوبی کے گھر اور گھاٹ کے درمیان بوجھ ڈھو ڈھو کر گمنام مرجاؤں گا۔ اس لیے اگر میری اس فالتو زندگی کے دس سال انسان استعمال کرلے تو اس انسانی زندگی سے انسان شاید مجھ جیسے محنتی مگر سیدھے سادے بھائی بندوں کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور انھیں گدھا کہنے سے باز آئے۔۔" اس طرح ساٹھا پاٹھا کہلانے جانے کے خیال ہی سے انسان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور نتیجتاً اس نے قدرت سے، اپنی عمر میں مزید اضافہ کرنے کی اپیل دائر کی۔ انسان کی اس حریص اور لالچ زدہ ذہنیت پر پاس ہی کھڑے ایک خارش زدہ کتے کو ترس آگیا۔ اس نے کہا۔" میں لاکھ زندگی بھر وفادار رہوں لیکن دنیا میں بہ استثنائے چند اعلیٰ نسل کے کتوں کے، اس حد تک حقارت کی نظر سے دیکھا جاؤں گا کہ انسان اپنی ہی طرح کے کسی انسان کو ذلیل وخوار کرنا چاہے گا تو اسے میرے نام سے پکارے گا۔ یہی نہیں، میری ٹیڑھی دم

میں جیتا ہوں۔

ابھی عمر میں میری دماغی صلاحیت بھی اتنی گئی گذری نہیں ہے۔ میں ہر صبح پہلے اخبار کا آخری صفحہ پڑھتا ہوں، اس لیے کہ انسان کی تعمیری اور ترقی کے کارنامے اور کھیل کود میں کامیابی کی خبریں اسی صفحے پر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتی ہیں جب کہ صفحہ اول پر تباہی، ہلاکت، قتل اور غارت گری کی لرزہ خیز خبریں بھیانک تصویروں کے ساتھ جلی حروف میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی نظر آتی ہیں۔ہاں! کبھی کبھی میرے نواسے اور پوتے مجھے ٹوک دیتے ہیں کہ میں جو اخبار پڑھ رہا ہوں وہ گزشتہ کل کا ہے۔ اس قسم کی معمولی بھول چوک تو سبھوں سے ہو جاتی ہے۔

ان دنوں میری بیگم بھی مجھ سے خفا رہنے لگی ہیں کہ میں ان کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا ہوں۔ ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔ سنی ان سنی کر دیتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ دراصل ان کی باتیں ہی اس قسم کی رہتی ہیں کہ خواہ مخواہ بے اعتنائی برتنے کو جی چاہتا ہے۔ راشن ختم ہو رہا ہے۔ گیس کا سلینڈر آج بھی نہیں آیا۔ واپسی میں ترکاری لیتے آیئے۔ بھاجی دیکھ کر خریدیے پرسوں کی طرح سڑی گلی اٹھا کر نہ لایئے۔ ملازم تنخواہ بڑھانے کی مانگ کر رہا ہے۔ دھوبی کا حساب کر کے رکھ دیجیے۔ ٹیلیفون آفس جا کر شکایت درج کرایئے کہ رانگ نمبر آنے لگے ہیں۔ مجھے ایسی فالتو اور غیر ضروری باتوں کے بارے میں سوچنے یا ان پر عمل کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ میرا دماغ تو ان دنوں دنیا میں پائیدار امن کے قیام، ایٹمی اسلحہ میں کمی۔ ملک میں سوکھے اور سیلاب کی وجہ سے پیدا شدہ نازک صورت حال، شہر میں پانی کی قلت، بجلی کے بڑھتے ہوئے داموں کے سبب عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور ان سب سے زیادہ ادبی رسالے کے لیے مضمون اور مشاعرے کے لیے چٹ پٹی غزل لکھنے جیسے اہم ترین سیاسی، معاشی، ثقافتی اور ادبی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں الجھا ہوا رہتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اب بھی آپ مجھے ضعیف یا مائل بہ ضعیفی سمجھتے ہوں تو آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ ضعیف ہونے کے لیے کافی وقت لگتا ہے اور فی الحال میں اتنا مصروف ہوں کہ ضعیف ہونے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

(سلسلہ ص ۵۰)

پاس کچھ نہیں رہا۔۔۔ وہ میز سے ٹکرا ٹکرا کے چلانے لگی اس کا چہرہ خون میں ڈوب گیا۔ سب گھبرا گئے۔ اس کے دیور نے زبردستی روکا!

اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ مگر خالد نہیں اٹھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ابھی تک میز پر جھکا بیٹھا تھا۔

سارے گھر میں سناٹا چھا گیا۔

رات کو خالد بستر پر آیا تو اس نے ستارہ کے زخمی چہرے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ آج تمھیں کیا ہو گیا تھا! تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ عادل نے صرف تمھارا ہاتھ پکڑا تھا۔ مگر آج سب کے سامنے کہہ رہی تھیں کہ اس نے تمھاری ہر چیز چھین لی۔۔۔"

ہمیشہ کی طرح اس وقت خالد کے سوالوں پر وہ کانپی نہ گھبرائی۔ گونگے بہروں کی طرح چھت کو تکے جا رہی تھی۔ ایکشن ری پلے۔۔۔ اچانک اس پر وہ لمحہ پھر نازل ہوا جو اسے زہری زہر پلا دیتا تھا۔ مگر اب سارے وجود میں ایک مٹھاس سی گھول رہا تھا۔

وہ خوفناک لمحہ جب عادل کے سخت ہاتھ میں اس کی کلائی تھی اور اس کی ساڑی کا آنچل ٹائلٹ کے گندے پانی میں۔۔۔ وہ لمحہ ایک چمکتی سچائی کی طرح اس پر نازل ہوا اور جیسے کسی کوہ طور سے ٹکرا کر اس پر دنیا کے سارے اسرار کھول گیا۔

وہ اندھی پاگل کی طرح اٹھی، دروازوں کے بند کواڑ کھولے اور عادل کے گھر کی طرف دوڑنے لگی۔

عادل اسے دیکھ کر خوف کے مارے کانپنے لگا۔

"آپ۔۔۔ یہاں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ آپ کی بدولت میں ساری دنیا کو جان سکی۔۔۔

فاطمہ عالم علی خاں

ہم کہتے ہیں۔ تم بھی تو سنو

عالیہ خان کی کتاب "ہم کہتے ہیں تم بھی تو سنو" سترہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہم نے اس کو بہت توجہ سے بھی پڑھا
ر ورق گردانی بھی کی پھر جب عالیہ نے جناب پروفیسر مغنی تبسم صاحب کا یہ مشورہ ہم تک پہنچایا کہ فاطمہ عالم علی سے
بصرہ لکھوائیے سب رس میں شائع کرنا ہمارا ذمہ (ہمارے متعلق خوش فہمیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں) تو ایک ایک سطر پر انگلی
ھ کر کتاب پڑھی یعنی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی یا پڑھ کر سمجھنا چاہا خیر بات ایک ہی ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے
امت شکن واقعہ ہوئے ہیں اس لیے یہاں بھی یہ تبصرے کے بندھے ٹکے اصول و قواعد ہمارے بس کے نہیں۔ ہاں
ُرات پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سو حاضر ہیں۔

کتاب ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب مرحوم کے نام معنون کی گئی ہے۔ نہ کی جاتی تو تعجب ہوتا۔ کیوں کہ انھیں کی جوہر شناس
ہوں نے عالیہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچانا اور ڈاکٹر زینت ساجدہ نے جلا بخشی۔ ورنہ عالیہ خان تو سائنس کی طالبہ رہی ہیں۔
B.S کے بعد B.Ed. کیا اور درس و تدریس میں جٹ گئیں۔ اردو کی طرف ان دونوں نے نہ صرف مائل کیا بلکہ ایم۔اے کے
ے تیار بھی کیا۔ محترمہ زینت ساجدہ (اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا دم چھلا ان کو پسند نہیں) کی محنت اور توجہ اور عالیہ کی لگن
ے لائی درجہ اول میں ایم۔اے بھی کامیاب کیا اور ایم۔فل بھی اور اب خیر سے ڈاکٹر بھی بن گئی ہیں۔

عالیہ خان کا تعلق عالموں، مفکروں، مدبروں اور مدرسوں کے خاندان سے ہے جسے دیکھیے دل و جان سے خدمت
ِ میں لگا ہوا ہے اور یہ جذبہ عالیہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہاں، کب، اور کس کے درد کا درماں بنیں یہ کسی کو کانوں
ن خبر نہیں ہوتی (کردار کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا میں نے ضروری سمجھا) ایک بات ایسی بھی ہے جو عالیہ کو اپنے
ران میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کا قلم ہے۔ جہاں تک میری معلومات کی پہنچ ہے۔ ان کے خاندان میں کوئی صاحب کتاب
ن پیدا نہیں ہوئیں۔ یہ بات عالیہ کے لیے باعث افتخار ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی چھ مضامین تعلیم و تربیت اور کتابوں سے متعلق ہیں جو عالیہ کا شوق ہے۔ یہ صرف تنخواہ کے لیے
ہیں پڑھاتیں۔ یہ پڑھانے کے طریقوں میں ایسی جدت پیدا کرنا چاہتی ہیں جو بچے کا ذہن آسانی سے قبول کر سکے۔ نو عمری
ِ ذہنی تربیت کے لیے وہ دستکاری کو اہمیت دیتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ "جسمانی اعضا اور حواس میں ہم آہنگی ضروری ہے۔
ِ بچوں کو تکلیف دہ شرارتوں سے باز رکھنے کے لیے ایسے کھیل یا مشاغل میں مصروف رکھا جائے کہ ذہن سوچے اور اعضا
ِ سوچ کو عملی شکل دیں گویا ایک پنتھ اور دو کاج والی بات ہو۔

"کتاب خانے" بھی ایک معلوماتی مضمون ہے کتابوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت اور کتاب خانوں کی
ئی پر توجہ دینے پر اصرار کیا ہے۔

"بچوں کی کتابیں اور ان کی افادیت" بڑا کارآمد مضمون ہے اس میں بچوں کے لیے ایسی کتابوں کی فراہمی کی تجویز رکھی
ہے جو موجودہ دور کی ایجادات اور بڑے بڑے کارناموں کو آسان سے آسان مختصر دلچسپ کہانی کے پیرائے میں پیش
ں کرے پڑھتے وقت بچے میں اتنا تجسس پیدا ہو اور وہ پوچھے کہ "پھر کیا ہوا۔ عالیہ خان کی رائے میں بچوں کے رجحان کو سمجھ کر

آدم بیزاری پر ایک دلچسپ مضمون بہ عنوان "بوریت اور اس کا علاج۔ خوب ہے۔ بوریت کے مختلف اسباب بتاتے ہوئے علاج تجویز کیا ہے یعنی کوئی نیک مقصد اپنالیں تو سکون مل سکتا ہے لیکن رونا تو یہی ہے کے پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مشورے تو بہت دیے جا سکتے ہیں لیکن ہر ایک کے لیے قابل عمل ہوں یہ ضروری نہیں۔ "نوکری آئی۔ اس مضمون میں عالیہ خان نے واقعی انشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس میں شگفتگی بھی ہے حسن و لطافت بھی، شوخی بھی ہے اور شرارت بھی۔ اس کو تو بس پڑھتے رہیے اور لطف اٹھاتے رہیے۔ یہ یاد رکھیے کہ یہ "قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ عالیہ خان نے اچھا کیا کہ اس سے پہلے کہ نئی نسل کے لیے یہ باتیں ناقابل یقین بن جائیں ان کو قلم بند کر دیا۔

"زندگی ایک۔ رنگ ہزار۔ زندگی سے رنگوں کے رشتے کی نشان دہی کرتے ہوئے رنگوں کے اثرات اس کے استعمال کا صحیح وقت اور موقعہ اور مزاج سے رنگوں کی مناسبت کو پیش کیا ہے جگہ جگہ لوک گیت اور دیہاتی گیتوں کے ٹکڑے شامل کر کے مضمون کو اور بھی دل پذیر بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی علمی سرگرمیوں پر ایک مضمون بہ عنوان "ذاکر صاحب ایک معلم اور ماہر تعلیم ہے۔ ذاکر صاحب (سابق صدر جمہوریہ) عالیہ کے دادا کے سگے بھائی تھے۔ ظاہر ہے یہ مضمون معلومات کا ذریعہ ہے ایک طالب علم کے لیے۔ ذاکر صاحب کی تجاویز رہبری کا ذریعہ ہیں مثلاً عالیہ لکھتی ہیں "خود جامعہ میں عملی طور پر سارے خیالات کو برت کر ان کے نتائج سے قوم کو واقف کرایا تھا۔

"میرے پیارے پپا۔ امتیاز حسین خاں۔ عالیہ کے والد کی اتنی تعریفیں سنی ہیں کہ ان کا ذکر آتے ہی ذہن کے پردے پر ایک فرشتہ صفت انسان کا ہیولا ابھر آتا ہے۔ ان کے بارے میں غیروں سے بھی اتنا سنا ہے کہ سوچتی ہوں کاش! میں بھی ان سے ملی ہوتی۔ اپنی بیٹیوں پر جان چھڑکنے والے باپ پر واقعی قلم اٹھانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اگر عالیہ اس مضمون کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ نہ جانے کتنی بار آنکھیں بھیگی ہوں گی۔ دل سے ہوک اٹھی ہوگی۔ لکھتے لکھتے کہاں کہاں پلکوں پر ٹھہرے آنسو کے قطرے تحریر کو دھندلا گئے ہوں گے۔ تب کہیں جا کر عالیہ نے یہ چند سطر لکھی ہوں گی۔ جو بھی لکھا جتنا بھی لکھا کم از کم ان کے لیے بہت معلومات آفریں ہے جو امتیاز حسین خاں صاحب مرحوم سے کبھی ملے ہی نہیں۔ ایسی ہستیاں بار بار پیدا نہیں ہوتیں لیکن ان کے حالات سے ہر زمانے میں روشنی ملتی رہتی ہے۔ "رفیع روف صاحبہ۔ شفیق معلم۔ اس مضمون میں عالیہ نے شاگردی کا حق ادا کر دیا جہاں کی مٹی لکھی ہو انسان بے ارادہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ رفیع مرحومہ بھی امریکہ واپسی کی نیت سے گئی تھیں لیکن مٹی وہاں کی تھی تو واپس کیسے آتیں۔ رفیع روف صاحبہ کو اللہ نے دین و دنیا دونو جہاں کے علم کے خزانے عطا کیے تھے۔ دینی اجتماع ہو یا کالج کی کلاس بڑی ایمانداری، جانفشانی اور بھرپور اعتماد کے ساتھ علم بانٹتی رہیں۔ جس رفتار سے زمانہ بدل رہا ہے۔ ان جانے والوں کی جگہ پر ہونا مشکل ہی ہے۔

آخری مضمون "پکنک میڈم ہے۔ نام نہیں لکھا لیکن اندازہ کہتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں بہت ہر دلعزیز رہی ہوں گی۔

اس کتاب میں عالیہ نے کئی موضوعات کو یک جا کر دیا ہے۔ تعلیم و تدریس کے مسائل بھی ہیں اور سماجی بھی، شانیے بھی ہیں اور خاکہ نگاری کے نمونے بھی اس لیے کتاب پڑھتے وقت نورتن چٹنی کا مزہ آتا ہے۔

دیکھیے عالیہ خان کے تقریباً سب ہی مضامین پر ناچیز نے اظہار خیال کی جراءت کی ہے۔ عالیہ کا قلم چل پڑا ہے اب کئے نہ پائے۔ دعا ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

oOo

[illegible] کر کے انھیں محفوظ [illegible] ت اور ادبی و [illegible] سے ساتھ [illegible] کیا ہے۔
حکایات لطیفہ۔ میں ڈاکٹر افضل اقبال کی [illegible] بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پروئے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے
یہ کہ دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی ادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کرے گی۔ ادبی تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی
رکھنے والوں کے لیے یہ تصنیف ایک دلچسپ اور قیمتی تحفہ ہے۔

(پروفیسر سیدہ جعفر)

کتاب کا نام: ایوان شاد کا ایک مشاعرہ (تمثیل) مصنف: غلام جیلانی
[illegible] (تصویر) صفحات: 42 اشاعت: فبروری 1994ء
قیمت: -/15 روپے ناشر: ادبی ٹرسٹ معرفت روزنامہ "سیاست" حیدرآباد۔

زیر تبصرہ کتاب "ایوان شاد کا ایک مشاعرہ۔ (تمثیل) ایک کتابچہ ہے جو غلام جیلانی کے قلم کا رہین منت ہے۔ یہ
تمثیل مختصر ہے لیکن اختصار کے باوجود نہایت مفید ہے۔ اردو کے ہر طالب علم اور قاری کے لیے جو ادبی اور تاریخی امور
خصوصاً مشاعروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم ریاست حیدرآباد شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ وہ ایک ممتاز شاعر بھی تھے اور
شعرا کے مربی بھی۔ ان کے دربار سے ریاست حیدرآباد اور شمالی ہند کے کئی ممتاز شاعر وابستہ تھے۔ ان کے محل میں
اکثر مشاعرے منعقد ہوا کرتے۔ غلام جیلانی صاحب نے تمثیلی طور پر مشاعرے کی ایک محفل سجائی ہے جس میں دربار سے
وابستہ تمام شعرا کو یکجا کر دیا ہے۔ حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن میں "ایوان شاد" کے مشاعرے کی نمائش پہلی بار 12/
جولائی 1991ء میں بمقام رویندرا بھارتی تھیٹر اور دوسری بار جناب عابد علی خاں صاحب کی خصوصی دلچسپی سے 30/ نومبر
1991ء کو چار مینار کے دامن میں ہوئی۔ ٹیلی ویژن پر بھی اس تمثیلی مشاعرے کو دکھلایا گیا۔ خواص و عوام نے اس تمثیلی
مشاعرے کو بہت پسند کیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تمثیلی مشاعرے کو دستاویزی شکل میں محفوظ کر لیا جائے چنانچہ
غلام جیلانی نے اپنے تیار کردہ اسکرپٹ پر نظر ثانی کی اور فبروری 1994ء میں ادبی ٹرسٹ کے اہتمام سے انتخاب پریس حیدرآباد سے
اسے زیور طبع سے آراستہ کیا گیا۔ غلام جیلانی نے از راہ عقیدت مندی اس کتاب کو جناب عابد علی خاں صاحب مرحوم کے نام
انتساب کیا ہے۔

اردو کے ممتاز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" لکھا تھا۔ اس مشاعرے کا اہتمام
مولوی کریم الدین نے کیا تھا اور نواب زین العابدین خاں عارف نے جو مرزا غالب کے خواہر زادہ ہوتے تھے اس مشاعرے
میں ان کی سرپرستی اور مدد کی تھی۔ مشاعرہ مولوی کریم الدین کے چھاپہ خانے کی وسیع عمارت میں منعقد کیا گیا تھا جسے
زین العابدین عارف نے اپنے حسن انتظام سے آراستہ کیا تھا۔ تقریباً 70 سال قبل مرزا فرحت اللہ بیگ کے لکھے "دلی کے
آخری یادگار مشاعرہ" کو بابائے اردو مولوی عبدالحق، پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے دور میں ان ہی کے کالج میں پیش
کیا گیا۔ عثمانیہ کالج کے لائق اساتذہ نے اس میں حصہ لیا۔ [illegible] کے بعد محترم غلام ربانی صاحب مرحوم نے بھی
اس مشاعرے میں حصہ لیا۔ [illegible] جیلانی نے [illegible] اس مشاعرے کو [illegible] میں سٹی کالج میں نواب اعظم جنگ بہادر کے
[illegible] میں [illegible] پیش کیا گیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق سٹی کالج کے اکثر [illegible] کے طالب علم [illegible]
نے [illegible] بھی اس مشاعرے میں غلام جیلانی نے [illegible] کے بعد غلام جیلانی [illegible]
[illegible] ہونے کے [illegible] تمثیلی مشاعرہ "ایوان شاد" کی [illegible]

"اب عجیب اتفاق ہے کہ جنگ ۔۔۔ برس پہلے کے حیدرآباد کے ایک تمثیلی مشاعرے کی تحریر اور تیاری بھی میرے ہی حصے میں آئی۔ جناب عابد علی خاں کی خواہش کے مطابق اور جناب زاہد علی خاں صاحب کی شخصی دلچسپی سے ادبی ٹرسٹ اسے کتابی شکل دے رہا ہے۔ جناب زاہد علی خاں صاحب معتمد ادبی ٹرسٹ کے علاوہ میں جناب سید ہاشم علی اختر صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے بہ حیثیت صدر ادبی ٹرسٹ کتاب کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔۔ اس تمثیل میں نظم طباطبائی، تراب یار جنگ سعید، عزیز یار جنگ عزیز، ضامن کنتوری، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، محمد حسین آزاد، عابد مرزا بیگم، غلام مصطفے رسا، جگر مرادآبادی، کیفی حیدرآبادی، حیرت بدایونی، نرسنگ راج عالی، یگانہ چنگیزی، امجد حیدرآبادی، ترکی علی شاہ ترکی، فصاحت جنگ جلیل اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد جیسے عالی مرتبت ۱۵ شعرا کے کلام انتخاب غلام جیلانی کے ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ نادر و کم یاب تصاویر سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

کاغذ بہت عمدہ، گٹ اپ جاذب نظر اور شان دار ہے۔ اس کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں قاری قدیم حیدرآبادی تہذیب کو دیکھ سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور یہ مقبول ہوگی۔

(پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ)

(مسلسل ص ۴۱)

...

نہیں پڑیں۔ وہ تعلیم اور تعلیم کے بعد دائرۂ ملازمت میں داخل ہوئیں۔ غالباً ان ہنگاموں سے دور رہ کر وہ ایک خاموش اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ چناں چہ چند سال سے وہ صرف رفیعہ آپا ہیں۔ نہ صدر شعبہ اردو، نہ یونیورسٹی کی پروفیسر اور نہ ڈین آف آرٹس، صرف رفیعہ آپا۔۔۔ پڑھنے پڑھانے میں مصروف۔ ایک حد تک باہر کی دنیا سے باخبری رکھتے ہوئے گھریلو زندگی گزارنے والی۔ محمود بھائی اور اپنے نواسے نواسیوں کی دلچسپیوں میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے۔

رفیعہ آپا اگرچہ ادبی محفلوں وغیرہ میں شرکت کم کر رہی ہیں لیکن ان سے جب بھی ملیں ان کی گفتگو ان کی شفقت سے دل آسائی محسوس ہوتی ہے۔ لگتا ہے ہم علم اور الطاف و عنایات کی گھنی چھاؤں تلے آ گئے ہیں۔

(مسلسل ص ۵۶)

شرمندہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ یہ مصیبت سب کی ہے۔ خاص طور پر پی ایچ۔ ڈی حضرات کی۔

اس عنوان میں "جا رہا ہوں"۔۔ کے الفاظ بالکل مناسب ہیں کیوں کہ پی ایچ۔ ڈی ہونے کے لیے مجھے کہیں نہ کہیں تو جانا ہی پڑے گا۔

000